لطائفِ قرآنی

بہ برکت عرفانِ عارفیؒ

(حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ خلیفۂ مجاز مولانا اشرف علی تھانویؒ)

سیّد مظفر احمد اشرف

(مجاز صحبت جناب ڈاکٹر محمد عبدالحئی عارفی رحمۃ اللہ علیہ)

اکادمی بازیافت



لطائفِ قرآنی

سیّد مظفّر احمد اشرف

لطائفِ قرآنی

به برکت عرفانِ عارفیؒ

(حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفیؒ خلیفۂ مجاز مولانا اشرف علی تھانویؒ)

سیّد مظفر احمد اشرف

(مجاز صحبت جناب ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ عارفی رحمۃ اللہ علیہ)

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : مارچ ۲۰۰۵ء
کمپوزنگ لیزر پلس، فون: 2751324
قیمت ۴۰۰؍ روپے

Lataif-e-Qurani
(Quranic Studies)

By : Syed Muzaffar Ahmed Ashraf

Kitab Market, Office# 17, St # 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph. (92-21) 2751428
e-mail mukalama@cyber net pk

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

قرآنِ مجید کی اوّلین مفسر وہ ذات ہے جس کا یہ کلام ہے اور جو اپنی کتاب کے ہر لفظ میں ہم سے خطاب کرتی ہے۔ یہ خطاب کتاب کی ماہیت اور انداز و اسلوب کو ہم پر واضح کردیتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِالْكِتٰبِ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(سورۂ اعراف)

یہ وہ کتاب ہے جس میں علم کے ساتھ الگ الگ کر کے تمام باتیں واضح کردی گئیں جو اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت ہیں۔

اس کتاب کا متکلم جو تمام اسالیب کا موجد ہے وہ اِس کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ کتاب ''عربی مبین'' میں نازل کی گئی ہے۔

اور متکلم کے بعد اِس کتاب کی تفسیر اُس کا عطیہ ہے جس کے قلبِ مبارک پر یہ کلام نازل کیا گیا ہے۔ احادیث کے ہر معتبر مجموعے میں کتاب التفسیر اِس کتاب کے نکات و لطائف ہم پر آشکار کرتی ہے۔ پھر وہ ذات جس کو اُس کے رب نے معلم بنا کر بھیجا تھا اُس کے شاگردوں نے ایمان اور ذہنِ رسا سے اِس کتاب کے دقائق کو ہمارے لیے روشن کیا۔ اُن سب سے اللہ راضی ہو۔

یوں یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ علم

کے حدود میں اضافہ ہوتا جائے گا، انسان کے معاملات نئے نئے قالبوں میں ڈھلتے جائیں گے اور زمانے کے سمندر میں قرآن کا جہاز سفر طے کرتا چلا جائے گا۔ اس کی سطح خود بخود بلند تر ہوتی جائے گی۔

قرآن ہر سطح، ہر ذہن اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق افراد کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہے گا۔ مفکروں کو اِس میں قانون و دستور کے نکات ملیں گے، حکمرانوں کو حکومت کے طریق ملیں گے، عالموں کو اپنے شعبۂ علم کے بلند ترین رموز نظر آئیں گے، ماہرینِ معیشت کو اقتصاد کے نکتے ملیں گے، اہلِ تصوف کو تزکیۂ باطن کے طریقے حاصل ہوں گے اور رموز و بیان کے وابستگانِ دامن کو فصاحت و بلاغت اور ابلاغیات کے راز حاصل ہوں گے۔

گزشتہ پندرہ صدیوں میں قرآنِ حکیم کا مطالعہ ہمارے بلند ترین ذہنوں نے اپنے رجحانات کے پیشِ نظر کیا ہے۔ کسی نے اِس کتاب کے صنائع بدائع کو پیش کیا، کسی نے اِس کے دلائل اور طریقِ دعوت پر غور وفکر کیا، کسی نے انسانی معاشرت کی پیچیدگیوں کو قرآنِ حکیم کی مدد سے سلجھایا، کسی نے مستقبل کو اِس کے آئینے میں دیکھا اور دکھلایا۔

قرآنِ حکیم کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے والوں میں وہ سعید روحیں بھی شامل ہیں جنھوں نے اِس کتاب کی روشنی میں سلوک و احسان اور تزکیۂ نفس کے راستوں کو اپنایا اور اِس کتاب اور رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی کی روشنی میں ہماری راہوں کو رشد و ہدایت سے منور فرمایا۔

مختصر یہ کہ مسلمان کی زندگی کی اساسِ محکم قرآنِ حکیم ہے۔ ہمارا پیشہ کچھ ہو، ہمارا شعبۂ حیات کچھ ہو، ہماری زندگیوں کو صورتِ وحدت قرآنِ کریم سے حاصل ہوتی ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآن میں تفکر ہمیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے۔ صاحبانِ رشد و ہدایت اِسی کتاب سے وہ نکتے اخذ کرتے ہیں جو اُن کے متوسلین کا راستہ بنتے ہیں۔ کوئی عہد ایسے

صاحبانِ رشد و ہدایت سے خالی نہیں رہا۔ ماضیِ قریب میں ہمارے اِسی شہر میں حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی کی ذاتِ گرامی کے ذریعے طالبانِ حق کو حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے علوم و معارف سے روشناس ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اُن کی حکمت دقائق و معارف کو عام زندگی کی سطح پر آشکار کرتی تھی اور ذہنوں کے ساتھ قلوب کو بھی روشنی اور حرارت کے تحفے ملتے تھے۔ مولانا عارفی علیہ الرحمۃ سے فیض یاب ہونے والوں میں سیّد مظفر احمد اشرف بھی شامل تھے۔ اللہ تا دیر انھیں ہمارے درمیان باقی رکھے تاکہ بزرگوں کی حکمتِ قرآن اُن کے ذریعے آگے بڑھتی رہے۔

ڈاکٹر عبدالحئی عارفی کی محفلوں نے اُن میں ذوقِ قرآنی پیدا کیا۔ آدمی اگر قرآنِ حکیم کے سامنے اپنی روح کو نقشِ سادہ کے طور پر پیش کرے تو نقوشِ ہدایت اُس کی ذات اور شب و روز میں اُبھرتے جائیں گے۔ اِس عمل کو مولانا سیّد ابوالحسن ندوی علیہ الرحمۃ نے کتاب اور رسولِ کتاب و عالم کی ''مشعل افروزی'' کہا ہے۔ اللہ تو نور السماوات و الارض ہے اور یہی نور اُس کی کتاب اور آخری رسول کے ذریعے میراثِ بنی آدم بنا ہے۔ اِس سے مستفید ہونے کی صورت یہ ہے کہ آدمی قرآنِ کریم میں غور کرے۔ تدبرِ قرآن اور فکر فی القرآن کی دعوت اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں بار بار دی ہے۔

اِسی تدبرِ قرآن کا نتیجہ زیرِ نظر کتاب ''لطائفِ قرآنی'' ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی باضابطہ تفسیر نہیں بلکہ فکرِ قرآنی کو سمجھنے والے ایک صاحبِ بصیرت کے شب و روز کا حاصل ہے۔ یہ وہ رموز و لطائف ہیں جو قرآنِ حکیم کے مطالعے نے سید مظفر احمد اشرف کو عطا کیے ہیں۔ اِس میں دنوں کا پیچ و تاب بھی ہے اور شبوں کا گداز بھی۔

اِس کتاب کے مسودے کے سرسری مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ اِس کے پڑھنے والوں کی الجھنیں دور ہوں گے اور اِس کے توسط سے پڑھنے والوں میں قرآن فہمی اور مطالعۂ قرآن کا داعیہ پیدا ہوگا اور یوں کتاب کا نور ہماری زندگیوں کو روشن بنائے گا۔

قرآنِ مجید کو رب العزت نے ''ہدیٰ''، ''موعظہ''، ''شفا''، ''نور'' اور ''بصائر''

کہا ہے۔ ان شاء اللہ یہ کتاب اپنے بڑھنے والوں کو اِس سرچشمۂ ہدایت سے قریب تر کرے گی، اُن کے قلوب کو شک و شبہ کے امراض سے شفا حاصل ہوگی اور یہ نور افراد کے قلوب کو منور کرتے ہوئے ہمارے معاشرے کو بھی روشن کرے گا۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

قرآن مجید کتابِ زندگی ہے جو ایک فرد کی دنیوی اصلاح اور اس کی اُخروی نجات کی ضامن ہے۔ قرآنی تعلیمات کے زیرِاثر جن افراد کی تربیت ہوتی ہے، ان کا معاشرہ حسن وخوبی کا مرقع ہوتا ہے۔ کبھی چشمِ فلک نے ایسا ہی معاشرہ دیکھا تھا، مگر آج کتابِ زندگی سے ہمارے تعلق کے کمزور ہونے کا نتیجہ ہے کہ افراد کی اصلاح کا مومنانہ معیار موجود نہیں اور نتیجتاً ہمارا معاشرہ خیر القرون کے نمونے سے بہت دور جا چکا ہے۔ خوش بخت ہیں وہ افراد جو قرآن مجید سے واقعی گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس پر غور وفکر کرتے ہیں اور اس کے فیض سے نہ صرف اپنا دامن بھرتے ہیں بلکہ اس فیض کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ماضی قریب میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم ان بزرگانِ دین میں سے تھے جنھوں نے اسلام کی مضبوط دینی روایت کو اس کے پس منظر میں آگے بڑھایا اور قرآن مجید کا پیغام عام کرنے کے لیے "بیان القرآن" جیسی بلند پایہ تفسیر قلم بند کی۔ مولانا کی حکیمانہ مساعی میں فرد کی ذاتی اصلاح کو جو بنیادی مقام حاصل تھا، اس کا اظہار خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون کے حاضر باشوں کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ مولانا تھانوی کے خوانِ علم و اصلاح کے متعدد مستفیدین میں سے ایک ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی بھی تھے، جنھوں نے کراچی میں بیٹھ کر افراد کی ذاتی اصلاح اور معاشرے کو پاکیزہ بنیادوں پر استوار کرنے کی اپنی سی

کوشش کی۔ زیرِنظر کتاب کے مؤلف جناب سیّد مظفر احمد اشرف نے ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی کے توسط سے خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ سے فیض پایا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر غور و فکر عنفوانِ شباب سے ہی ان کی زندگی کی اہم ترین دلچسپی رہی ہے۔ سال ہا سال کے غور و فکر سے انھوں نے قرآن مجید سے جو کچھ سمجھا، زیرِنظر کتاب کی شکل میں دوسروں کو اس میں شریک کر رہے ہیں۔

قرآن مجید ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ ہر شخص بقدرِ علم و استطاعت اس سے فیض پاتا ہے۔ جناب سیّد مظفر احمد اشرف نے قرآن مجید کی آیت بہ آیت شانِ نزول بیان کرتے ہوئے تفسیر تو نہیں لکھی، البتہ سلسلہ وار مختلف آیات پر اپنے غور و تفحص کا حاصل آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اس نے جہاں ان کی اپنی زندگی کو سنوارنے میں حصہ لیا ہے، وہیں ان کے قارئین بھی قرآن مجید کی برکات سے مستفید ہوں گے۔

ظفر اسحاق انصاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للّٰہ الذی نزل الکتٰب علٰے عبدہ ولم یجعل لہٗ عوجا. والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبدہ ورسولہ سیدنا محمد وعلٰے الہ واصحابہ.

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ کرم اور احسان ہے کہ اُس نے اِس ناچیز کو بلا کسی استحقاق کے اپنی بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں جن میں سے ایک بڑی نعمت قرآن شریف سے خاص تعلق ہے اور دوسری بڑی نعمت حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صدیقی عارفی قدس اللہ سرہٗ کے حلقۂ ارادت سے وابستگی ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی قبل جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر سنا تھا لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا اور میں ان سے شرفِ باریابی حاصل نہیں کرسکا تھا۔ تقریباً اسی زمانے سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات اور مواعظ پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی اور اس کے بعد سے ان کے وصال تک براہِ راست یا بذریعہ خط و کتابت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور حضرت کی شفقت سے فیض یاب ہوتا رہا۔ بحمد اللہ اس کی برکات اب بھی جاری ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ قدس اللہ سرہٗ کے اسی فیض کا نتیجہ ہے۔ یہ تفسیر کی کتاب نہیں ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے میرا معمول رہا ہے کہ کبھی کبھی جب فراغتِ وقت کے ساتھ قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہوں اور کسی آیت سے متعلق کوئی

بات یا کوئی نکتہ میری سمجھ میں آتا ہے تو میں اسے لکھ لیتا ہوں مثلاً کسی آیت کی تلاوت کے وقت میرا خیال سانحۂ مشرقی پاکستان کی طرف متوجہ ہوا کہ یہ ہماری شامتِ اعمال کے سبب ہم پر ایک طرح کا عذاب تھا تو میں نے اس کو لکھ لیا۔ یا کبھی حضرت عارفی رحمتہ اللہ علیہ یا حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی ارشاد کردہ کوئی بات اس آیت سے متعلق یاد آ گئی تو میں نے اسے لکھ لیا۔ کبھی کبھی جب زیادہ فرصت ہوئی تو مختلف تفاسیر میں اس کو دیکھ لیا۔ چونکہ یہ صرف اپنی یادداشت کے طور پر ہوتا تھا اس لیے میں نے حوالہ ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں کی۔ رفتہ رفتہ یہ ذخیرہ بہت بڑا ہو گیا اور خیال ہوا کہ اس کو مرتب کر کے چھپوا دیا جائے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ تحریر آیاتِ قرآنی کی تفسیر نہیں ہے، اگر آپ ان کو تفسیر سمجھ کر پڑھیں گے تو ہوسکتا ہے آپ کو اس میں بہت غلطیاں نظر آئیں۔ تفسیر اور نکات و لطائف میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ تفسیر کسی آیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے بارے میں احادیث اور روایات میں جو ذکر ہوتا ہے اور علمائے سلف نے جو تفسیریں لکھی ہیں ان کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ لیکن لطائف و نکات میں کسی آیت کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی اس آیت کی تلاوت سے کسی اور بات کی طرف ذہن چلا جاتا ہے تو اس کا ذکر کردیا جاتا ہے۔ یہ فرق ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔

سورۂ احزاب کی آخری دو آیات جن میں ''امانت'' کا آسمانوں اور زمین پر پیش کیا جانے، ان کے انکار کرنے اور انسان کے قبول کر لینے اور اس کے ظلوماً جھولا ہونے کا ذکر ہے۔ ان آیات کی جو تفسیر حضرت تھانوی رحمتہ اللہ نے کی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امانت کو (''یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں'') آسمانوں اور زمین اور پہاڑ کے سامنے پیش کیا (''یعنی ان میں کچھ شعور پیدا کر کے'') کہ اگر مانو گے تو انعام و اکرام سے نوازے جاؤ گے اور اگر نہیں مانو گے تو عذاب ہوگا، تو ان سب نے عذاب کے خوف سے احکام کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کردیا اور انسان نے (''بوجہ اس کے علمِ الٰہی میں اس کا خلیفہ ہونا مقرر تھا'') اس کو اپنے ذمہ لے لیا اور انسان کا ظالم اور جاہل ہونا

باعتبار اکثر افراد کے ہے۔ دوسرے مفسرین نے بھی ان اوصاف کو خاص ان افراد کی صفت قرار دیا ہے جو احکامِ شریعت کی اطاعت میں پورے نہیں اترے۔ لیکن ایک مجلس میں حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ رحمتہ اللّٰہ علیہ نے ان آیاتِ کریمہ کے بارے میں فرمایا کہ علما کہتے ہیں کہ یہ امانت ''اختیار'' تھا اور صوفیا کہتے ہیں کہ یہ امانت ''محبت'' تھی۔ دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح ہے کہ انسان میں محبت کا عنصر رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے ''اختیار'' کی امانت اٹھا لی۔ میں نے اس نکتے کو تفصیل کے ساتھ لکھ لیا۔ بہت دنوں بعد مفتی محمد شفیع رحمتہ اللّٰہ علیہ کی تفسیر میں دیکھا کہ تفسیرِ مظہری میں حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللّٰہ علیہ اور دوسرے صوفیائے کرام سے اس طرح کا مضمون منقول ہے کہ ''لفظ ظلوم اور جہول اس جگہ بھولے بھالے کے معنی میں بطور محبانہ خطاب ہے کہ اس نے اللّٰہ جل شانہٗ کی محبت اور اس کے مقامِ قرب کی جستجو میں اور کسی انجام کو نہیں سوچا۔'' الحمدللّٰہ اس طرح میرے شیخ رحمتہ اللّٰہ علیہ کے قول کی تصدیق حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللّٰہ علیہ کے قول سے بھی ہوگئی۔

چونکہ اس تحریر میں درج اکثر باتیں ذوقی اور وجدانی ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کچھ قارئین کو بعض باتوں سے اختلاف ہو۔ لیکن میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ میں کوئی فقہی مسئلہ بیان نہ کروں۔ اپنی تسلی کے لیے میں نے اس تحریر کو کئی ثقہ لوگوں کو دکھلایا۔ ان کی رائے بھی یہی ہوئی کہ یہ چھپ جائے تو لوگوں کے لیے نافع ہوگا۔ چند علمائے کرام کو بھی میں نے اسے دیکھنے کی زحمت دی۔ بحمد اللّٰہ تعالیٰ کسی نے اس میں کسی غلطی کی نشان دہی نہیں کی۔ اگر کسی صاحب کو کوئی ایسی غلطی نظر آئے جس سے پڑھنے والے کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو تو براہِ کرم مجھے ضرور مطلع فرمائیں۔

اللّٰہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو قبول فرمائیں اور اسے میرے لیے اور قارئین کے لیے نافع بنائیں۔ آمین۔ وصلے اللّٰہ تعالےٰ علےٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وعلےٰ اله واصحابه اجمعین۔

سیّد مظفر احمد اشرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں صفات ایسی ہیں کہ ان پر بار بار ہمیں توجہ دلائی جاتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو اور شکر کے جذبات بیدار ہوں، اور انسان واقعی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوجائے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے، انا عندظن عبدی بی، ایک مسلمان نماز میں دن بھر میں سو بار سے زیادہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ بسم اللہ میں اور سورۂ فاتحہ میں۔ جو واقعہ بھی ہو رہا ہے جو معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہو رہا ہے جو نعمتیں مل رہی ہیں جن چیزوں کو ہم سے دور رکھا جا رہا ہے جو آزمائشیں ہماری ہو رہی ہیں، یہ سب ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے کیوں کہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے جو رحمٰن بھی ہیں اور رحیم بھی۔ اگر انسان کا اس پر پختہ یقین ہوجائے تو پھر وہ اس بات کا مشاہدہ بھی کرے گا کہ واقعی ہر غیراختیاری واقعہ اس کے لیے خیر ہی ہوتا ہے اور اسے زندگی کی وہ آسائش میسر آئے گی جو معدودے چند لوگوں کو میسر آتی ہیں، خواہ کتنی ہی بے سر و سامانی کیوں نہ ہو۔ برخلاف اس کے جو شخص ہر واقعے پر ناگواری کا اظہار کرتا ہے، ہمیشہ اپنی حالت کا رونا روتا رہتا ہے کہ ہائے ہمارے پاس یہ نہیں ہے، ہمارے پاس وہ نہیں ہے، دوسروں کو کتنا دیا ہے نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''ہمارے پاس کیا ہے کہ ہم شکر کریں۔'' ایسے لوگوں کی زندگی ہمیشہ پریشانی میں گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور مسلمانوں کو ناشکری کے وبال سے محفوظ رکھیں۔ (آمین)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O (سورۃ الفاتحہ، آیت ۱)
سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے

جب آدمی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اس بات کے احساس سے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نماز پڑھنے کی توفیق دی اور حضوری نصیب فرمائی، بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلتا ہے، الحمد للّٰہ رب العالمین۔ اور نماز کے بعد آدمی غور کرے گا تو پتا چلے گا کہ اس ایک نماز پڑھنے میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہوتی گئیں اور اس کا فضل شاملِ حال رہا، تب یہ کھڑا ہونا نصیب ہوا۔ مثلاً وقت پر نیند ٹوٹنا، کسل مندی دور ہونا، عافیت میں ہونا، صحت کی حالت میں ہونا، پانی ملنا، صحت خانہ جانا، وضو کی توفیق ہونا، مسجد جانے کی توفیق ہونا، وقت پر مسجد پہنچنا، وقت پر نماز شروع ہونا، اس کے علاوہ توبہ کی توفیق ہونا، تجدیدِ ایمان کی توفیق ہونا، جس زبان سے گناہ سرزد ہوتا رہتا ہو اور لایعنی باتیں ہوتی رہتی ہوں، اس زبان سے اللہ تعالیٰ کا نام ادا ہوجانا اور اس کا بدتمیزی میں شمار نہ ہونا کہ اس ناپاک منھ سے اس اعلیٰ و برتر کا نام لیا، پھر کعبے کا قبلہ ہونا، قرآن شریف کا بقدرِ ضرورت علم ہونا، فانی کا باقی کے حضور پیش ہونا، بندے کا آقا سے formally (باضابطہ) ہم کلام ہونا وغیرہ وغیرہ۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ O (سورۃ الفاتحہ، آیت ۲)
جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اللہ تعالیٰ اتنے ارحم الراحمین ہیں، ایسے رحمٰن ہیں اور ایسے رحیم ہیں کہ ہمارا تمام وجود اُن کی اِن صفات کا مظہر ہے، وہی ہمارے اور تمام کائنات کے رب ہیں، ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن کی صفت وسعتِ رحمت کو ظاہر کرتی ہے۔ (رحمتی وسعت کل شیٔ، نیز دیکھیے سورۂ رحمٰن) اور رحیم کی صفت رحمت کی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے (کان بالمؤمنین رحیما)۔ اوّل الذکر صفت اسمِ ذات کی قائم مقام سمجھی جاتی ہے (قل ادعوا اللّٰہ او ادعوا

الرحمٰن، نیز واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن...)

ایک اور ذوقی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس آیۂ کریمہ کا بار بار اعادہ نماز کی ہر رکعت میں خشیۃ کی تعدیل کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ نماز میں خشیت کا طاری ہونا ایک فطری امر ہے۔ احکم الحاکمین کے سامنے کھڑا ہونا، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا استحضار، اپنی بے بضاعتی کا احساس اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام کی تلاوت یہ سب خشیۃ پیدا کرنے والی باتیں ہیں۔ قرآن شریف میں مومنین کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے قلوب لرزتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اسی طرح مومنین کے بارے میں ہے کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں، ان کے قلوب ہلتے ہیں (وجلت قلوبھم) اور رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی ونفسی و اہلی کے سینۂ مبارک سے نماز کے دوران کھولتے ہوئے پانی کی دیگ کی سی آواز کا نکلنا یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے نماز میں خشیۃ کے طاری ہوجانے کو فطری امر کہنا درست معلوم ہوتا ہے اور اگر کسی پر طبعی خشیۃ طاری نہ ہو تو عقلی خشیۃ ضرور طاری ہونا چاہیے الا یہ کہ غفلت کا پردہ بہت دبیز ہو۔ اس خشیۃ کو حدود کے اندر رکھنے میں اس آیتِ کریمہ کا خاص دخل معلوم ہوتا ہے۔

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؅ (سورۃ الفاتحہ، آیت ۳)

جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔

یوم الدین کا خیال آتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے کہ نہ معلوم اس روز کیا معاملہ ہو۔ معمولی دنیاوی امتحانات میں تو انسان کا دل دھڑکنے لگتا ہے کہ نہ معلوم پاس ہوں یا نہ ہوں حالانکہ پاس ہونے نہ ہونے میں ایک سال کی محنت کا فرق ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان کھڑا ہوتا ہے جو اس بڑے دن کا مالک ہے تو اس کے ایک طرف جنت ہوتی ہے، ایک طرف جہنم اور جنت اور جہنم کا فرق عظیم فرق ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ سال دو سال کی محنت کا فرق نہیں ہے بلکہ ابدالآباد کی راحت اور خوشی اور تکلیف اور غم کا فرق ہے۔ حضرت عارفیؒ نے فرمایا (کہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرو

کہ) آپ مالک ہیں روزِ جزا کے، نہ صرف اس دنیا میں آپ ارحم الراحمین ہیں، روزِ جزا میں بھی آپ ارحم الراحمین ہیں۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ (سورۃ الفاتحہ، آیت ۴)

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواستِ اعانت کی کرتے ہیں۔

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں آپ کی عبادت میں۔ یعنی ہماری مدد فرمایئے تاکہ ہم آپ کی عبادت احسن طریق سے کرسکیں۔ یوں تو جیسا آپ کی عبادت کا حق ہے ویسی عبادت ہم کر ہی نہیں سکتے لیکن آپ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتو ہم کو سرے سے عبادت کی توفیق ہی نہ ہو اور آپ کی نوازش شاملِ حال ہوتو ہم عبادت میں درجۂ احسان کو پہنچ جائیں جو ہماری زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی نور اللہ مرقدہٗ اپنی اکثر مجالس میں اس کی تکرار فرماتے تھے، ایاک نعبد وایاک نستعین۔ ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے، عبدیت بہت اعلیٰ مقام ہے۔عبدیت دوسرے لفظوں میں تفویض ہے یعنی شکر اور صبر۔ جب خوشی حاصل ہوتو خدا کا شکر کرے، جب کسی نعمت پر نظر پڑ گئی تو شکر ادا کرلیا۔ عبادت کی توفیق مل گئی شکر ادا کرلیا، عبادت میں نقص نظر آیا تو توبہ کرلی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگئے جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اس کو بجا لائے اور استقامت کے ساتھ اس پر جمے رہے، جو ناگواری غیر اختیاری طور پر پیش آگئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر برداشت کرلیا۔ اس کو صبر کہتے ہیں۔ اور صبر اور شکر کے مجموعے کو تفویض کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو ناگواری پیش آئے یا سختی پیش آئے یا جو غیراختیاری تنگی یا پریشانی ہو، اس پر صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا اور ان نعمتوں میں بڑی نعمتیں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی توفیق ہے اور چونکہ جس نے نعمت دی ہے، وہ ہر وقت چھین بھی سکتا ہے، خصوصاً اگر ایمان یا عملِ صالح کی نعمت کو انسان اپنی طرف منسوب کرنے لگے اور نفس اور شیطان

کے فریب میں آکر تکبر کرنے لگے تو اس وقت ان نعمتوں کے چھن جانے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے تو آدمی کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اس کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے تاکہ زوالِ نعمت اور تحولِ عافیت سے محفوظ رہے۔ نیز کوئی ایسی سختی بھی پیش آسکتی ہے جس میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اس لیے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کی ضرورت ہے۔ گویا صبر و شکر جن کے مجموعے کو تفویض کہا جاتا ہے اور تعوذ و استغفار جسے استعانت کہہ سکتے ہیں، یہی دو کام بندے کے ہیں۔ تو عبدیت اور استعانت دو کام ہوئے، اسی لیے نعبد اور نستعین ہر نماز میں ہم سے اللہ میاں کہلواتے رہتے ہیں۔ دراصل استعانت یعنی تعوذ و استغفار عبدیت کی تکمیل کے لیے ہیں اور انسان کی خلقت کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ عبدیت میں کمال حاصل کرے۔ الحمد سے لے کر ''نعبد'' تک عبادت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر (آیت نمبر ۱)، اس کی نعمتوں کا استحضار (آیت نمبر ۲)، اس کی عظمت کا استحضار اور اس کے سامنے قیامت کے دن جزا و سزا کے لیے پیش ہونے کا استحضار (آیت نمبر ۳)، اس کے بعد اپنی عبدیت کا اقرار (آیت نمبر ۷) اور اس کے بعد سے آخرِ سورہ تک استعانت ہے۔ اس کی نعمت کی طلب کرنا، ہدایت کا طلب کرنا اور اس کے غضب اور گمراہی سے پناہ مانگنا ہے (آیات نمبر ۵ تا نمبر ۷)۔ حضرت عارفیؒ کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ یہی جملہ عینِ عبادت ہے اور اسی لیے یہی صراطِ مستقیم ہے کیوں کہ عبادت کی روح اقرارِ عبدیت اور رجوع الی اللہ ہے۔ اس بات کی تائید سورۂ یٰس کی آیت ''وان اعبدو انی ھذا... مستقیم'' سے ہوتی ہے۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ O (سورۃ الفاتحہ، آیت ۵)

بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا۔

یہی دعا تمام دعاؤں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عظمت اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ روزانہ ۳۳ مرتبہ ہم یہ دعا نماز میں مانگتے ہیں۔ انسان کے مقبول ہونے اور مردود ہونے کا معیار یہی ہے کہ اس کو صراطِ مستقیم کی

ہدایت ملی ہے یا نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوتی، وہ یہ دیکھیں کہ ہم اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں۔ بار بار یہی مانگ رہے ہیں کہ اھد نا الصراط المستقیم۔ پھر اگر یہی دعا ہماری اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لی تو گویا سب دعائیں قبول فرما لیں۔

ایک اور زاویے سے اس دعا کی اہمیت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ یہ عظیم ترین سورۂ مبارکہ عبد اور معبود کے درمیان صحیح رابطہ قائم کرتی ہے۔ الحمد للہ رب العالمین، رحمت اللہ تعالیٰ کی تہہ بہ تہہ ہے۔ ایک ایک ورق اٹھاتے جایئے اور اس کی تعریف کرتے جایئے اور ربوبیت کا مضبوط فہم سے بالا مرئی اور غیر مرئی مربوط نظام ملاحظہ کرتے جایئے(strong, complex, visible & imperceptible)۔ اس کی رحمتِ واسعہ کے ملاحظے سے نظر نہیں تھکتی اور نہ کچھ اندازہ ہوسکتا ہے اس کی وسعت کا نہ اس کی گہرائی کا، نہ اس کی کیفیت کی مثال ہوسکتی ہے، نہ کمیت کی۔ طلح منضود کی طرح۔ اور ہم اس میں پرورش پا رہے ہیں۔ پھر یوم الدین میں، اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اور یہ بھی اس کی رحمت ہی ہے۔ وہاں حساب اس بات کا ہوگا کہ ہم نے کس حد تک مقصدِ زندگی پورا کیا اور کتنے اس سے غافل رہے۔ اور مقصدِ زندگی اس کی عبادت ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے کہ ہم نے انسان اور جن کی تخلیق ہی اس لیے کی ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ لیکن یہ عبادت ناممکن ہے کہ ہم سے ادا ہو سکے، بغیر اس کی اعانت کے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین، بذاتِ خود ایک دعا ہے اور اس سے آگے اس کی تشریح ہے کیوں کہ عبدیت کا مظہر صراطِ مستقیم پر یعنی انبیا اور صلحا کے راستے پر قائم رہنا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ بندہ اختیار کرے گا، عبدیت کے اظہار کے لیے تو وہ مقبول نہیں ہوگا کیوں کہ عبدیت تو درحقیقت نام ہی اس بات کا ہے کہ جو حکم دیا جائے اس کی بسروچشم تعمیل کی جائے۔

صراطِ مستقیم پلِ صراط کے مثل ہے۔ باریک اور تیز دھار رکھتی ہے۔ اگر اس راہ سے ایک ڈگری بھی ہٹ کر کوئی خط کھینچا جائے تو آگے جا کر ہزاروں میل سے بھی زیادہ کا فرق ہوجائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے پر آدمی چلتا ہے اور دعا کرتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر قائم رکھیں۔ ایسے راستے پر کون چل سکتا ہے، سوائے

اس کے جس پر خدا کی خاص مہربانی ہو۔ جو دنیا میں اس نعمت سے محروم رہا، وہ آخرت میں پلِ صراط پر چل کر جنت میں نہیں پہنچ سکے گا۔ العیاذ باللہ۔

درحقیقت اس معبودِ حقیقی کے جو ایسے رحمٰن اور ایسے رحیم ہیں کہ میرا تمام وجود ان کی عظمت کا مظہر ہے، یہی مانگنے کی دعا ہے کہ وہ ہمیں اس راستے پر قائم رکھیں جو ان کے انعام یافتگان کا راستہ ہے۔ انعام یافتہ لوگ وہ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا سیدھا راستہ دکھایا گیا۔ اس پیرائے میں دعا میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ہماری دعا کو کس قدر مقبول ہوئی ہے کیوں کہ مطلق اگر یہ دعا مانگی جاتی کہ ہم پر انعام کیجیے تو قبولیت کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ مال، اولاد، اسباب وغیرہ وغیرہ مطلق انعام کی نشانی نہیں ہے، یہ صورتاً نعمت اور حقیقتاً قمت یا امہالی بھی ہوتا ہے۔ لیکن صراطِ مستقیم میں اس طرح کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ بر صراطِ مستقیم (اے) دل کسے گمراہ نیست۔ نیز خود بھی خواہش ہوتی ہے انعام یافتہ (جن کو سند مل چکی ہے) لوگوں کی راہ پر چلنے کی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (سورۃ الفاتحہ، آیت ۷)

رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ (رستہ) اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ اُن لوگوں کا جو (رستے سے) گم ہوگئے۔

انعمت علیہم سے وہی لوگ مراد ہیں جن کی تعریف انعم اللہ علیہم من النّبیین... الخ سے کی گئی ہے یعنی وہ لوگ جو صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ انبیا علیہم السلام، صدیقین، شہدا اور صالحین۔ گرچہ دنیاوی اور ظاہری انعامات بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں مثلاً عافیت، دولت، عزت، شہرت اور ان پر بھی شکر واجب ہے جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کا تخت اپنے سامنے پاکر فرمایا تھا... لیبلونی ء اشکر ام اکفر۔ لیکن یہ انعامات حقیقی، ابدی اور سرمدی انعامات نہیں ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم ہونے کی نشانی ہے بلکہ آزمائشی انعامات ہیں جیسا سورۂ فجر میں ایمان سے بے بہرہ انسان کا

ذکر ہے کہ جب اس کو اللہ تعالیٰ نعمت و اکرام سے نواز کر آزماتے ہیں تو وہ کہتا ہے ربی اکرمن اور جب اللہ تعالیٰ ان کو آزماتے ہیں اور ان پر رزق (ایک اندازے کے مطابق یعنی) تنگ کردیتے ہیں تو وہ کہتا ہے، ربی اھانن۔ اصل انعام تو وہی ہے جو نبیّین، صدیقین، شہدا اور صالحین کو عطا ہوا یعنی ایمان کی دولت جس سے تمام بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سبل السلام کی طرف لے جاتے ہیں۔ جو اہلِ ایمان نہیں ہیں، وہ صوری انعامات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سمجھ کر شکر ادا نہیں کرتے (درحقیقت نعمت یہی ہے کہ انسان اس پر شکر ادا کرے) بلکہ یا تو اسے اپنے علم اور ہنرمندی کا اثر سمجھتے ہیں یا اپنے کو ''ابناء اللہ واحباءہ'' سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

صراطِ مستقیم اتنا طویل اور ادق ہے کہ جب تک کسی کا اتباع نہ کیا جائے، جب تک راستے پر چلے ہوئے اور راستہ اچھی طرح پہچانے ہوئے کے ساتھ ساتھ نہ چلا جائے، یہ راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ جیسا کہ فرعون اور اس کی آل میں سے ایک مومن کا مکالمہ سورۂ غافر میں ہے کہ فرعون لوگوں سے اپنی پیروی چاہتا تھا اور اپنے خلوص کو ثابت کرنے کے لیے اس نے کہا، ''ما اریکم الا ما اریٰ''... کہ میں تمھیں وہی راستہ دکھاؤں گا جو میں نے دیکھا ہوا ہے اور میں تمھیں صحیح راستے پر چلاؤں گا اور جو مومن تھا، اس نے کہا، اے میری قوم اتبعونی... الخ کہ میری پیروی کرو، میں تمھیں صحیح راستہ دکھاؤں گا۔ یہاں اھدنا... کا مطلب ہے اوزعنا ان نتبع الذین انعمت علیھم من النّبیین والصدیقین والشھداء والصالحین... یہاں تک کہ ہم آپ کے پاس پہنچ جائیں۔ یہ ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے وحی آتی ہے جس کا اتباع نبی کرتا ہے اور نبی کا اتباع مؤمنین کرتے ہیں۔ اس لیے ہدایت کا انتساب نبی کریم کی طرف بھی کیا گیا۔ ''اور بے شک آپ لتھدی الی صراط مستقیم۔''

انعام یافتہ لوگوں کی تصریح تو ایک آیتِ کریمہ میں ہے جو پہلے لکھی جاچکی ہے۔ مغضوب علیھم سے وہ لوگ مراد ہیں جو عبادت سے بالکل ہی رُوگرداں ہیں اور کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ کئی علما کا خیال ہے کہ اس سے یہودی مراد ہیں اور ضالین سے

نصاریٰ۔ مگر عام طور سے ضالین میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو اپنے خیال میں عبادت کر رہے ہیں، مجاہدہ کر رہے ہیں لیکن چونکہ اللّٰہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق نہیں کر رہے ہیں، اس لیے ان کا سب کیا کرایا اکارت ہو رہا ہے۔ ان کے بارے میں ضلّ سعیھم کی آیتِ کریمہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جو عمل تو کر رہے ہیں لیکن ان کے اعمال اس دنیوی زندگی میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نیک اعمال کر رہے ہیں۔ مغضوب علیھم سے مراد وہ لوگ معلوم ہوتے ہیں جو دن رات سرکشی، تکذیب اور استہزا میں مشغول ہیں اور ضالین سے وہ لوگ مراد ہیں جو عرفِ عام میں تارک الدنیا بھی ہیں، اپنے طور پر خدا کو راضی کرنے کی یا نجاتِ ابدی حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں، مثلاً جوگی یا بدھ مذہب کے پجاری لیکن چونکہ وہ سچے دین میں داخل ہی نہیں ہوئے، اس لیے سب بیکارِ محض ہوگیا اور ساری دوڑ دھوپ اکارت گئی۔ جس طرح ایک آدمی اندھیرے گھر سے کہیں جانے کو نکلے اور سورج نکلے تو معلوم ہو کہ کئی کوس کا چکر لگا کر پھر وہیں کا وہیں پہنچ گیا، جہاں سے چلا تھا۔ تو وہ لوگ جن کا قبلہ (direction) درست نہیں ہے، وہ بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

انعام یافتہ لوگوں کا راستہ یہ ہے کہ انعام کی قدر کی جائے، اس پر شکر ادا کیا جائے کیوں کہ جتنا شکر ادا کیا جائے، اتنا ہی انعام زیادہ ملنے کا وعدہ ہے اور اسی شکر میں یہ بھی شامل ہے کہ اپنے کو اس انعام کا محتاج سمجھا جائے۔ یہی عبدیت ہے۔ اور جس پر جتنا زیادہ انعام ہے وہ اتنا ہی زیادہ انعام عطا کرنے والے کا محتاج ہے۔ اتنا ہی زیادہ اس کی رحمت کا محتاج ہے اور اتنی ہی زیادہ فروتنی اور عبدیت اس میں ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبیِ کریم، فخرِ موجودات ﷺ نے دعا کا اور اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کا اپنے کو سب سے زیادہ محتاج بتایا ہے (او کما قال النبی ﷺ) اور آپ سب سے بلند مقامِ عبدیت پر فائز تھے۔

انعام یافتگان کی راہ پر چلنے کی دعا سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(i) قوانینِ فطرت سے کوئی مفر نہیں ہے۔ ان قوانین میں سے ایک اہم قانون

یہ ہے کہ جو کوئی انعام یافتگان کی راہ پر چلے گا، اسے ضرور انعام ملے گا (اور یہ بات صرف دیکھنے والے نہیں بتا سکتے ہیں بلکہ چونکہ اس راستے کا ایک بڑا جزو اعمالِ قلبی ہے اس لیے وہ شخص خود بتا سکتا ہے، اگر وہ فہمِ سلیم رکھتا ہو۔ یا پھر کوئی مبصر بتا سکتا ہے، اس کے برعکس کا معاملہ ہر وقت نہیں ہوتا یعنی گنہگاروں کو سزا ملنا اتنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان میں فرمایا ہے یعف عن کثیر۔

اس پر ایک آیت کریمہ میں تصریح ہے... وعداً علیہ حقاً فی التوراۃ والانجیل والقرآن...

(ii) اسلام قوانینِ فطرت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ مومن انعام یافتگان کی راہ پر چلنا چاہتا ہے تاکہ اسے بھی انعام ملے۔ وہ بغیر اس راہ پر چلے ہوئے یعنی چلنے کی اپنی حد تک کوشش کیے ہوئے انعام و اکرام کی ہوس نہیں رکھتا جیسے یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ ایمان والے وہی لوگ ہیں جو ایمان کے اقتضا پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح ایمان اور عملِ صالح ایک دوسرے سے لاینفک (inseperable) ہوجاتے ہیں۔

ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیاتِ کریمہ دو گروہوں کے متعلق نہیں ہیں کہ انعمت علیھم کے راستے پر چلایئے اور مغضوبین و ضالین کے راستے پر نہیں چلایئے بلکہ ایک ہی گروہ کے اوصاف ہیں۔

یہ ترجمہ شیخ الحدیث مولانا بدر عالمؒ میرٹھی نے ترجمہ الحزب الاعظم میں اختیار کیا ہے، ''اے پروردگار ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔ راستہ ان کا جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔'' فالحمد للہ حمداً کثیراً۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ. هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ا۔۲)

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو۔

تقویٰ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کو کہتے ہیں اور سب سے کم درجے کا ڈرنا یہ ہے کہ اس کو مان لے کہ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا اور قادرِ مطلق ہے جس طرح کہ اس کے رسول نے بتلایا ہے یعنی ایمان لے آئے، اب اس سے آگے جتنی تبدیلی اعمال اور اخلاق میں آتی جائے گی اور جتنا تعلق اللہ تعالیٰ سے بڑھتا جائے گا اتنی ہی ترقی تقویٰ کے درجات میں ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اس کتاب عظیم کی ہدایت تو اسی وقت سے شروع ہوجاتی ہے جب کہ انسان ایمان لے آئے اور پھر جس جس درجے کا تقویٰ حاصل ہوجاتا ہے اس اس درجے کی ہدایت ملتی رہتی ہے۔ ایک اور جگہ قرآن شریف کو ھدیٰ و رحمۃ بتایا گیا ہے۔ ایک جگہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت فرمایا گیا ہے لیکن وہاں تقویٰ کا لفظ لایا گیا ہے جس سے اس کتاب کا ہدایت اور تقویٰ سے خاص تعلق کی طرف اشارہ ہے اور تقویٰ اور ایمان ایک ہی چیز ہیں اس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں ہے جس میں متقین کی تعریف ہے۔ ایمان بالغیب، اقام الصلوٰۃ، ایتاء الزکوٰۃ، ایمان بالکتب وغیرہ مفسرین نے تقویٰ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی راستے پر چل رہا ہو جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہیں جن میں کپڑا لگنے سے الجھنے اور گر پڑنے کا خطرہ ہو اور وہ شخص اپنے کو بچانے کے لیے کپڑے سنبھال سنبھال کر چلتا ہو، اسی طرح متقی سنبھل سنبھل کر زندگی کا راستہ طے کرتا ہے کہ کہیں کانٹوں میں الجھ نہ جائے۔

ایک لحاظ سے تقویٰ محبتِ الٰہی کا دوسرا رُخ ہے جس طرح ایک سچا چاہنے والا اپنے محبوب کو ہر طرح سے راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر وقت اس کی کوشش رہتی ہے کہ کسی بات سے محبوب ناراض نہ ہوجائے، اسی طرح ایک سچا مومن اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتا رہتا ہے اور ہر وقت اس بات کی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کا کوئی فعل اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔ اس میں ہر طرح کے چھوٹے بڑے گناہ سے بچنا آگیا۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا، تقویٰ کے معنی ''کھٹک'' کے ہیں۔ جس کے دل میں

کھٹک ہے اس کو یہ کتاب سیدھا راستہ بتاتی ہے اور اصل چیز یہی ہے۔ دل میں کھٹک ہونا کہ یہ درست ہے یا نہیں۔ اس بارگاہ کے لائق ہے یا نہیں۔ اور یہ بات قرآن شریف سے بھی ثابت ہے کہ اصل تقویٰ کھٹک ہی ہے اور جو مطمئن ہوگیا اس کا کیا ہے۔ دیکھیے قرآن شریف میں تین الفاظ کے مقابلے میں تین الفاظ لائے گئے ہیں۔ اعطٰی واتقی وصدق بالحسنٰی کے مقابلے میں ہے بخل و استغنا و کذب بالحسنٰی۔ تو جو مستغنی ہوگیا یعنی مطمئن ہو اپنی حالت کی طرف سے اس کو کیا ہدایت ہوگی۔ ہر وقت کھٹک لگی رہنی چاہیے دل میں اور کیسے نہیں ہوگی کھٹک۔ کتنے ہی مدارج پر آپ پہنچ جائیں، آپ سے ہو ہی نہیں سکے گا کہ رب العزت کی شایانِ شان کوئی عبادت کریں۔ کوئی عمل ایسا کریں جو اس کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل ہو۔ ہمیشہ یہی خلش رہے گی کہ نہ معلوم قبول ہو کہ نہیں ہو۔ کہاں اس کی شان اور کہاں ہمارا عمل! تو ہر وقت اسی میں مبتلا رہیے کہیں اس میں ناراضگی نہ ہو۔ کہیں یہ بات ناپسندیدہ نہ ہو۔ معلوم نہیں یہ عمل مقبول ہوا یا نہیں۔ ہر چند کوشش کریں بن نہیں پڑتی عبادت ان کے شایانِ شان، ناز کسی چیز پر کریں؟ کون سا عمل ہے جو ان کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق ہے؟

ایک دن حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے دعا میں یہ کہا کہ جس کتاب کو آپ نے ھدی للمتقین فرمایا ہے اس کے ذریعے ہمارے تقویٰ کو راسخ کردیجیے۔ یہ بھی ایک پہلو اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کا ہے کہ انسان کے اس جذبے کی پرورش جس کا نام تقویٰ ہے، اس کتاب سے ہوتی ہے۔

وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لهم جنت تجری من تحتها الانهر ط کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا قالوا هذا الذی رزقنا من قبل واتوا به متشابها ط ولهم فيها ازواج مطهرة وهم فيها خلدون ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۵)

اور خوش خبری سنا دیجیے آپ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام

کیے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی
ان کے نیچے سے نہریں جب کبھی دیے جاویں گے وہ لوگ ان (بہشتوں)
میں سے کسی پھل کی غذا تو (ہر بار میں) یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم
کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو (دونوں بار کا پھل) ملتا جلتا اور
ان کے واسطے ان (بہشتوں) میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ
لوگ ان (بہشتوں) میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے۔

اصل چیز جس کے لیے جان دے دینا بجا ہے وہ آخرت میں پروردگار کی رضا ہے جو ہمیشہ حاصل رہے گی۔ لیکن ان چیزوں کا ذکر جو جنت کے ذکر میں آتا ہے صرف اس لیے ہے کہ یہ چیزیں بھی جنت میں ملیں گی جن کی تم طبعاً اور خلقی طور پر دنیا میں محبوب رکھتے ہو۔ یعنی تم ان خواہشات و لذات کو صرف عارضی طور پر چھوڑ رہے ہو وہ بھی اس لیے تا کہ تم اپنے مالک کو خوش کر سکو، اور ایک یقینی اور حقیقی خوشی کی خاطر ایک عارضی اور مجازی خوشی چھوڑ رہے ہو کیوں کہ ضروری نہیں ہے کہ ازواج و ذرّیات سے واقعی خوشی بھی حاصل ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا
فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا وَّیَہۡدِیۡ بِہٖ
کَثِیۡرًا ؕ وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ
مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ۪ وَیَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیُفۡسِدُوۡنَ
فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۶، ۲۷)

ہاں واقعی اللہ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ
مچھر کی ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں

(خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال تو بہت موقعے کی ہے ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہوچکے ہیں سو چاہے کچھ بھی ہوجائے وہ یونہی کہتے رہیں گے کہ وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کرچکے تھے اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں پس یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔

کس طرح اللہ تعالیٰ گمراہ کرتے ہیں بہتوں کو اور ہدایت دیتے ہیں بہتوں کو، اس کا مشاہدہ بہت سے مواقع پر ہوتا رہتا ہے، مثلاً ایک افسر نے حق و انصاف کی خاطر ہر طرح کی سفارش اور دباؤ کو رد کردیا تو اس کو ایک بہت اچھے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور پھر کبھی اس طرح کا عہدہ اس کو نہیں دیا گیا۔ اس واقعے سے جو فاسق ہیں، وہ یہ سبق لیں گے کہ ایمان داری کرنا بالکل بے کار ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرمانا چاہیں گے وہ یہ سبق لیں گے کہ ایک افسر اس حد تک دباؤ بھی برداشت کرسکتا ہے اور اس کے باوجود اس کی نوکری بھی برقرار رہتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر کام بالکلیہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ فاسق کی جو تعریف (definition) یہاں کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے خواہشات کی پیروی میں حلال و حرام کچھ نہیں دیکھتے۔ نہ حقوق اللہ کا خیال رکھتے ہیں نہ حقوق العباد کا اور زمین میں فساد پھیلانا بھی اس اتباع ہوائی کی وجہ سے ہے... ما امر اللہ ان یوصل... میں قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک جسے صلۂ رحمی کہتے ہیں، بھی شامل ہے۔ ایک خداناشناس معاشرے میں رشتہ داریاں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اسپتال بنانے کے لیے ایک کروڑ ڈالر دے دے لیکن اس کو یہ خبر نہ ہو کہ اس کے والد کے بھتیجے (second

cousin) بھوکوں مر رہے ہیں۔ قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا مطلب عرفِ عام کی اقربا پروری نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا حق قرابت داروں کا یہ ہے کہ ان کو آگ میں گرنے سے روکا جائے یعنی ان کے دین کو تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش کی جائے جس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی اور اپنے رشتے داروں کی وہ جائیدادیں واپس کرادیں جو ناجائز یا مشتبہ ذرائع سے ان کے پاس آئی تھیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۳۱،۳۲)

اور علم دے دیا (اللہ تعالیٰ نے حضرت) آدم (علیہ السلام) کو (ان کو پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسما کا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کردیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسما ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو۔ (فرشتوں نے) عرض کیا، آپ تو پاک ہیں ہم کو علم ہی نہیں مگر وہی جو کچھ ہم کو آپ نے علم دیا۔ بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لیے مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا)۔

کسی چیز کے نام رکھنے کی استعداد وہ استعداد ہے جس سے آدمی دوسری مخلوقات سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان کے اندر قدرتی استعداد رکھی گئی ہے کہ جو چیزیں اس کے علم میں نہیں تھیں جب وہ اس کے علم میں آتی ہیں تو وہ ان کے خواص اور خصوصیات کو (properties and characteristics) کو دریافت کرلیتا ہے اور اس کا ایک نام رکھتا ہے اور اشیا کے خواص اور ان کی ماہیت دوسرے انسانوں کو بھی بتلاتا ہے۔ نام رکھنا دراصل اس چیز کو پہچان لینے کا نام ہے۔ یہ بات نہ فرشتوں میں پائی جاتی ہے نہ جانوروں میں۔ اور اگر کچھ فرشتوں میں یہ استعداد رکھ دی جاتی تو وہ فرشتوں کی ایک نئی

قسم ہوتی۔ گویا دوسری مخلوق ہوتی۔ انسان اپنی اس استعداد کی وجہ سے دوسری مخلوقات پر یک گونہ فضیلت رکھتا ہے اور چوں کہ سیّدالبشر کا خیر الخلائق کلھم ہونا مسلّم ہے اس لیے انسان کو بھی اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ فالحمد للہ۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۳۶۔ ۳۸)

پھر لغزش دے دی آدم اور حوا کو شیطان نے اسی (درخت) کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان کو اسی (عیش) سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو۔ تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعادِ متعین تک، بعد ازاں حاصل کر لیے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان۔ ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

یہ خیال کہ حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی سزا میں دنیا میں بھیجا گیا، درست نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو معاف فرما دیا اور وہ بڑے توّاب اور بڑے رحیم

ہیں پھر اس معافی کے بعد سزا کیسی؟ اور یہ سمجھنا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ گناہ تو معاف ہوگیا، لیکن اس کا اثر رہ گیا جس طرح زخم تو اچھا ہوجاتا ہے لیکن اس کا داغ رہ جاتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا بھی کامل ہے اور ان کا عفو بھی کامل ہے اور جس کا یقین یہاں توّاب اور رحیم کے صفات کو بیان کرکے دلایا جارہا ہے جو دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اس لیے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ توبہ سے اللہ تعالیٰ گناہوں کے اثرات بھی مٹا دیتے ہیں اور یہ بھی ان کی عطا اور ان کی رحمت ہے۔ ذوقاً ایک بات اور یہاں معلوم ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصور ان کے درجے کے لحاظ سے قصور تھا۔ ہم سے اس طرح کا قصور اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے غلط اجتہاد کے نتیجے میں سرزد ہوجائے تو شاید اس میں بھی ثواب ہے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی ایک درجے سے برأت کا اظہار ''فازلھما الشیطان'' سے ہوتا ہے۔

اب ہبوط الیٰ الدنیا کو اس پس منظر (context) میں دیکھیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانی مخلوقات کو دکھلا دیا کہ آدم علیہ السلام شر اور خیر کے استعمال سے عملی طور پر واقف ہوگئے ہیں اور شیطان کے بہکاوے سے آشنا ہوچکے ہیں اور اس کا کاٹ توبہ و ندامت بھی ان کے ہاتھ میں آگیا ہے تو اب ان کی تربیت مکمل ہوگئی ہے اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کے قابل ہوگئے ہیں تب ان کو دنیا میں بھیجا تاکہ مقصدِ تخلیقِ آدم جو خلافت فی الارض تھی، اس کی تکمیل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کہ تم سب جنت سے نیچے اترو، دراصل رحمت ہی ہے جس نعمت سے فرشتے محروم رہے۔ جو بات ازل سے مقرر ہوچکی تھی، وہی ہوئی (جو بات مقدر کردی جاتی ہے وہ ہوکر رہتی ہے لیکن توبہ سے گناہ یقیناً معاف ہوجاتا ہے اور جو بات پہلے بطورِ سزا کے ہوتی، وہی بات ہوتی ہے۔ لیکن صرف صورتاً سزا ہوتی ہے اور حقیقتاً عنایت ہوتی ہے اور آئندہ کے لیے آزمائش ہوتی ہے) صورتاً تو آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا جارہا ہے لیکن دراصل ان کو زمین کی خلافت مل رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو وہ بات (انی جاعلٌ...) بتائی نہ گئی ہو جو فرشتوں کو بتائی گئی تھی۔

واقعات کی ترتیب (sequence of events) اس طرح سے رکھی گئی کہ بڑاپا بھی ثابت کیا گیا فرشتوں سے سجدہ کراکے، اس بڑاپے کی توثیق بھی کرائی گئی۔ بعد ازاں اس واقعے سے آدم علیہ السلام کا طبعی نسیان اور تذلل بھی ثابت کیا گیا اور پھر توبہ و انابت جیسی نایاب اور اعلیٰ صفت کا بھی مظاہرہ کرایا گیا جس سے غالبًا فرشتے محروم ہوں گے کیوں کہ وہ گناہ تو کسی معاملے میں کرتے ہی نہیں ہیں۔ شاید انھیں اس درد و سوز کی لذت نہ ملی ہو جو آدم علیہ السلام کو ملی۔ غرض ایک بہت بڑا واقعہ (event) ظہور پذیر ہوا اور ایک خاص طریقے سے ظہور پذیر ہوا جس کا علم قبل از ظہور صرف خدا ہی کو تھا۔ ورنہ فرشتوں سے تو سجدہ کراکے جنت میں بھیج دیا تھا۔ وہ بھی تعجب کر رہے ہوں گے کہ بنایا گیا زمین کے لیے خلیفہ یہ جنت میں بیٹھ کر کیسے خلافت کریں گے اور آدم علیہ السلام کو تو شاید اس وقت تک یہ بھی علم نہ ہو کہ ان کو زمین پر اترنا ہے۔

یہ خطا اور نسیان انسان کے خمیر میں ہے اور آدم علیہ السلام کے ذکر میں بارہا یہ بتایا گیا ہے، مثلاً فنسی ولم نجد لہٗ عزما۔ اسی طرح توبہ و ندامت بھی انسان کے خمیر میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات توّاب اور رحیم بار بار کلامِ پاک میں دہرائی گئی ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ نفس اور شیطان دونوں کا فرق یہ ہے کہ جہاں شرع پر عمل کرنے سے کوئی مصلحت مانع ہو یا جہاں کسی خلافِ شرع کام کے جواز میں کسی مصلحت کو سامنے رکھا جائے تو وہ بہکانا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور جہاں لذتِ عاجلہ کے لیے کسی خلافِ شرع کام کو جی چاہے تو وہ بہکانا نفس کی طرف سے ہوتا ہے جس طرح شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ مصلحت بتائی تھی کہ اس درخت کے پھل کھانے سے آپ کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ کہیں آپ فرشتے نہ بن جائیں یا ہمیشہ رہنے والوں میں نہ ہوجائیں۔ اسی طرح ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''الشیطان یعدکم الفقر...'' اور مرغوباتِ نفس کا ذکر ''زین للناس حب الشھوات من...'' میں ہے۔ توبہ اور ندامتِ قلب ہر لغزش کا علاج ہے خواہ اس کی ابتدا شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہو خواہ نفس کی طرف سے ہو۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۴۴)

کیا (غضب ہے کہ) کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (نیک کام سے مراد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ واعظ کو بے عمل ہونا جائز نہیں ہے۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ O وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ O وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ O اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O

(سورۃ البقرہ، آیت ۴۰۔۴۴)

اے بنی اسرائیل یاد کرو تم لوگ میرے ان احسانوں کو جو کیے ہیں میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمھارے عہدوں کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو، اور ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر ایسی حالت میں) کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمھارے پاس ہے (یعنی توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے) اور مت بنو تم (سب میں) پہلے انکار کرنے والے اس (قرآن) کے اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضۂ حقیر کو اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس

حالت میں کہ تم جانتے ہو اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہوکر) اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ، کیا (غضب ہے کہ) کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (نیک کام سے مراد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالاں کہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور ناشکریوں کے باوجود کبھی تو ان کو توبہ کرا کے معاف کیا جارہا ہے اور کبھی معافی کے قبل توبہ کا بھی ذکر نہیں ہے (ویعفوا عن کثیر کے معنی یہی ہیں کہ بہت سے گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف فرماتے ہیں ورنہ توبہ کے بعد تو ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے) لیکن ایک وقت آجاتا ہے کہ فرمان ہوتا ہے کہ بس اب مزید انعامات بند۔ بہت احسان ہوچکا ان ناشکروں کے ساتھ۔ فبآءُ وابغضب من اللہ ، اس لیے ناشکری بہت ڈرنے کی چیز ہے (اور اسی طرح نافرمانی بھی کیوں کہ وہ بھی ایک طرح کی ناشکری ہی ہے) کہ نہ معلوم کب انعامات روک لیے جائیں۔ فاعوذ باللہ عجل کی پرستش کے معاف ہونے کا ذکر پہلے ہے (آیت ۵۳) اس کے بعد فاقتلوا انفسکم کا حکم اور اس کے بعد فتاب علیکم سے (آیت ۵۴) معلوم ہوتا ہے کہ ان کا گناہ تو اسی وقت معاف ہوگیا جس وقت وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے لیکن اس معافی کا اعلانِ عام اس وقت ہوا جب اس گناہ کی تلافی کے لیے ایک سزا مقرر ہوئی اور وہ سزا انھوں نے کاٹ لی۔ یہ دنیا ہی میں سزا دے کر آخرت میں معاف کردینا یا کچھ کو سزا دے کر بقیہ پوری قوم کو معاف کردینا بھی معافی کی ایک فرد ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند کو ڈوبتا ہوا دیکھنے کے بعد اللہ سے ہدایت مانگی تھی تو وہ دعا تو اس وقت قبول ہوگئی لیکن پھر اس کے بعد انھوں نے سورج دیکھ کر فرمایا، ھذا ربی ھذا اکبر پھر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو اصل توحید ان پر واضح ہوگئی تو یہ سورج کو دیکھ کر ھذا ربی کہنا بھی ہدایت ہی کی ایک کڑی تھی۔ اسی طرح ہماری بہت سی دعائیں

اس طرح قبول ہوتی ہیں کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جو دعا مانگی تھی اس کا الٹا اثر ہوا حالانکہ وہ اثر عارضی ہوتا ہے اور اس کے بعد وہی چیز مل جاتی ہے جس کے لیے دعا کی گئی تھی۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۴۵۔۴۶)

اور اگر تم کو حبِ مال و جاہ کے غلبے سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے۔ اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔ وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

صلوٰۃ کی ادائیگی کے مختلف درجات ہیں اسی طرح خشوع کے مختلف درجات ہیں۔ جن لوگوں کو مطلق اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے پیش ہونے والے ہیں (جس کا ذکر آیت نمبر ۴۶ میں ہے) یعنی کفار اور منافقین ان پر مطلق نماز کے لیے کھڑا ہونا بہت گراں ہے۔ برخلاف ان کے مومنین پر بوجہ ان کے آخرت پر یقین ہونے کے نماز کے لیے کھڑا ہونا گراں نہیں ہوتا یعنی اس طرح کی گرانی نہیں ہوتی جو منافقوں کو ہوتی ہے، طبعی کسل کی اور بات ہے۔

نماز کے درجات مختلف ہیں جس طرح تقویٰ اور ہدایت کے درجات مختلف ہیں اور ہر درجے میں اس کی عظمت اور شان کا حق ادا کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں ان کا علاج آیت ۴۶ میں بتایا گیا ہے ایک عامی کے لیے نماز کا پڑھ لینا ہی بہت گراں ہے لیکن جب اس کو آخرت کا تھوڑا بہت خیال آنے لگتا ہے تو یہ آسان ہوجاتا ہے۔ اب

اس کو وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا گراں گزرتا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا خیال زیادہ قوی ہوجاتا ہے تو یہ گرانی آسان ہوجاتی ہے پھر اس کو حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنے میں جو دشواری پیدا ہوتی ہے اس کا علاج بھی یہی ہے۔

جب آخرت پر یقینِ کامل کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے تو پھر نماز میں بھی احسان کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اگر کامل درجے کا خشوع ہوگا تو کامل درجے کی نماز ہوگی اور جب انسان کا ہر عمل اس کے لیے رجوع الی اللہ ہوگا تو اس کا خشوع بھی کامل ہوجائے گا۔ پہلے تو اس راہ میں کوشش کرنی ہوتی ہے اور نماز پڑھتے وقت خصوصاً لقائے رب اور رجوع الیٰ اللہ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بہت دنوں تک مشق کرتے رہنے سے یہ بات عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۵۴)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنی اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے سوتم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کرو، یہ (عمل درآمد) تمھارے لیے بہتر ہوگا تمھارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ تمھارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کرلیتے ہیں۔

یہاں بھی تواب اور رحیم دونوں صفات کا ذکر ہے۔ ایک دوسرے کو قتل کرنا توبہ اور انابت کا طریقہ مقرر کیا گیا تھا تاکہ توبہ میں یہ لوگ کتنے سچے ہیں، یہ معلوم ہوجائے۔ یہ سزا سے بالکل مختلف چیز تھی۔ اگر سزا دی جاتی تو سارے کے سارے بنی اسرائیل

سوائے ان گنے چنے لوگوں کے جنھوں نے گوسالہ پرستی سے منع کیا تھا، ہلاک ہوجاتے۔ علاوہ ازیں دنیا میں قتل ہوجانا ایک دوسرے کے ہاتھ سے آخرت میں جہنم میں جانے کے مقابلے میں بہت ہلکی سزا ہے بلکہ ایک طرح سے تقریباً تقریباً پوری معافی ہی ہے۔ ہوسکتا ہے تھوڑے دنوں کے بعد جب کہ تائبین کا اخلاص واضح ہوگیا ہو، یہ سزا موقوف بھی ہوگئی ہو۔

دو طرح کے معاملات اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نظر نہیں آتے، انھیں ازقسم باطنی انعامات کہہ لیجیے جیسا آیت ۵۲ میں عفو کا ذکر کیا گیا۔ ان انعامات پر بھی شکر واجب ہے۔ دوسرے وہ انعامات جو ظاہری آنکھوں سے نظر آجاتے ہیں، مثلاً زندگی میں آسودگی اور آسائش کا میسر آنا۔ ان پر بھی شکر واجب ہے، بنظرِ غائر دیکھا جائے تو دونوں طرح کے انعامات کا ایک دوسرے کے ساتھ بڑا ربط ہے۔ باطنی انعامات اپنے اندر ظاہری انعامات لیے ہوئے ہیں، مثلاً عفو کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ ان پر عذاب نہیں آیا۔ ان کے چہرے مسخ نہیں ہوئے، باطنی پہلو یہ تھا کہ ان پر نیکی کا دروازہ بند نہیں کیا گیا جیسا کہ لعلکم تشکرون سے ظاہر ہے کیوں کہ شکر بڑی نیکی ہے اور اگر نیکی کی توفیق پوری قوم سے سلب کر لی جاتی تو پھر یہ ارشاد نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعث بعد الموت بہت سے باطنی انعامات لیے ہوئے تھا، جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اتنی بڑی نشانیِ قدرت دیکھنے کے بعد بقیہ زندگی نیکی اور شکر میں گزارنے کا موقع عطا ہوا تھا۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِىۡ هُوَ اَدۡنٰى بِالَّذِىۡ هُوَ خَيۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۶۰۔ ۶۱)

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ! (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنیٰ درجے کی چیزوں کو ایسی چیز(وں) کے مقابلے میں جو اعلیٰ درجے کی ہے۔ کسی شہر میں (جاکر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور جم گئی ان پر ذلت اور پستی (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر اور خود ان میں اولو العزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضبِ الٰہی کے (اور) یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے احکامِ الٰہیہ کے اور قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق، اور (نیز) یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرۂ اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

کبھی کبھی مختلف چیزوں کا ذائقہ چکھنے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر بنی اسرائیل اس رزقِ حسنہ پر قناعت کرتے اور شکر ادا کرتے، تو یہ بات ان کے لیے بہت بہتر ہوتی۔ مختلف چیزوں کے ذائقہ چکھنے کی خواہش ان کو ایک شہر میں لے آئی اور اس کے بعد وہ مصیبتوں میں مبتلا ہوئے غالبًا بہت مصائب ان کے مما تنبت الارض کھانے کی خواہش کے براہِ راست نتیجے میں نہیں تھے بلکہ یہ ان کے قلتِ شکر کا براہِ راست نتیجہ تھا۔ ان کا قلتِ شکر ان کی قلتِ صبر کی شکل میں تھا جو ان کے قولِ باطن ''لن نصبر'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل شکر اور صبر ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ اور بنی اسرائیل کی بے صبری ان کی بار بار حکم عدولی کا نتیجہ تھی۔ ذلک بما کانوا یعتدون... اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا خوش گوار زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

ذوقاً اس آیتِ کریمہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ شہر کی زندگی میں جہاں انواع و اقسام کی غذائیں اور آسائشیں ملتی ہیں، وہیں بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ
وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۶۲)

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صائبین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات اور صفات) پر اور روزِ قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لیے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

بعض نادانوں نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ مسلمان ہو یا یہودی ہو یا عیسائی ہو جو بھی اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے اور نیک کام کرے سب کی نجات ہوجائے گی یعنی نجات کا دار و مدار مسلمان ہونے پر نہیں ہے، یہ انتہائی گمراہ کن بات ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخرۃ دراصل رسول اللہ ﷺ اور ان کے پیش رو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اصل دعوت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دی اور اس کو مدارِ نجات فرمایا اور جو ان پر ایمان لایا اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ مسلمان کہلایا اور تمام کفار اور مشرکین نے کہا کہ اس نے اپنے آبا و اجداد کا دین چھوڑ کر محمد (ﷺ) کا دین اختیار کرلیا تو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لانا دراصل محمد (ﷺ) اور تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا ہے۔ ورنہ مشرکین اور اہلِ کتاب بھی اپنے اپنے زعم میں ایک بڑے خدا کو مانتے تھے، پھر وہ کیوں کلمۂ توحید سے اس قدر بدکے۔

یہ جو ہم لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں یہ محمد (ﷺ) کی رسالت کی تصدیق ہی کر رہے ہیں (اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی رسالت کی تصدیق کر رہے ہیں) جس نے بھی بعثتِ محمدی کے بعد یہ کلمہ کہا انؐ ہی کے کہنے سے تو کہا اور انؐ ہی کو سچا اور واجب الاتباع سمجھ کر کہا۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۷۵)

(اے مسلمانو!) کیا اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہود) تمھارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں کے کچھ لوگ (ایسے گزرے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور جانتے تھے۔

گمراہی کی آخری حالت تحریف فی الکتاب ہے اور جو لوگ جان بوجھ کر کتاب کا غلط مطلب نکالتے ہیں وہ بھی بہت بڑی گمراہی میں ہیں۔

بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۸۱)

کیوں نہیں جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (اور قصور اس طرح) احاطے کر لے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

''گناہ اس کا احاطہ کر لے۔'' احقر کے ذوق میں یہ بات صرف کافروں پر صادق آتی ہے کیوں کہ مسلمان خواہ کتنے ہی گناہ کرے اس کو پوری طرح اس کے گناہ نہیں گھیرتے اور وہ توبہ کرتا رہتا ہے۔ گناہوں سے توبہ نہ بھی کرے تب بھی اس میں ایمان کی وجہ سے روشنی کی کچھ نہ کچھ رمق باقی رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جن سے ایمان چھن جانے کا خطرہ رہتا ہے اور بعض لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود ایمان سے عاری ہوتے ہیں۔ ''خلود فی النار'' صرف کافروں کے لیے ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس کی تفسیر کی ہے، ''گھیر لیا گناہ نے یعنی گناہ کرتا ہے اور

شرمندہ نہیں ہوتا۔" غالباً اس سے بھی ایسے ہی لوگ مراد ہیں جو ایمان سے خالی ہیں کیوں کہ ایمان اور معصیت میں تضاد ہے۔ مومن ہے تو ضرور معصیت پر شرمندہ ہوگا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآئَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۸۴)

اور (وہ زمانہ بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ باہم خون ریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا۔ پھر تم نے اقرار بھی کرلیا اور (اقرار بھی ضمناً نہیں بلکہ ایسا صریح جیسے) تم شہادت دیتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کیوں کہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں ایک فرد کا گھر ویسا ہی محترم ہے جیسا دوسرے کا آیت کریمہ میں دیارھم کا لفظ ہے کیوں کہ جب قوم نے ایک فرد پر ظلم کرکے اس کو گھر سے نکال دیا تو وہ اجتماعی رشتہ منقطع ہوگیا اور مظلوموں کے گھر اور ظالموں کے گھر میں واضح فرق ہوگیا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ O اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۸۵۔ ۸۶)

پھر تم یہ (آنکھوں کے سامنے موجود ہی) ہو (کہ) قتل قتال بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلے میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ اور ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رِہا کرادیتے ہو حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو ان کا ترکِ وطن کرا دینا نیز ممنوع ہے تو کیا (پس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے سو اور کیا سزا ہو ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیے جاویں اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمھارے اعمالِ (زشت) سے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے دنیوی زندگانی (کے حظوظ) کو لے لیا ہے بعوض (نجات) آخرت کے سو نہ تو ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف کی جاوے گی اور نہ کوئی ان کی طرف داری (پیروی) کرنے پاوے گا۔

اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو ماننے اور بعض کا انکار کرنے اور بعض احکام کو ماننے کے بعد عملی طور پر تاویلات سے ان احکام کی خلاف ورزی کرنے کی سزا دنیا کی رسوائی اور آخرت کا دردناک عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو درست فرمادیں اور ہماری شامتِ اعمال کو دور فرمائیں، عملی طور پر ہم بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ گرچہ مقرر سزا یہی ہے لیکن ضروری نہیں کہ دنیا میں رسوائی مل ہی جائے۔ آیت نمبر ۸۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آخرت کے بدلے دنیا خریدے اس کا یہ حال ہوتا ہے یعنی آخرت کے بدلے دنیا خریدنے والے پر سے آخرت میں عذاب کم نہیں کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے اسے تھوڑی بہت دنیا مل جائے، اگر دنیا میں فوری طور پر گرفت ہو جاتی تو شاید ان میں سے بعض ایمان لے آتے۔ لیکن دنیاوی تنعم نے ان کی سرکشی کو اور بڑھا دیا اور توبہ کرنے کی امید کو اور کم کردیا۔ فاعوذ باللہ من خزی الدنیا و عذاب الآخرۃ۔

بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ۚ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ‌ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۹۰)

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندے پر اس کو منظور ہو، نازل فرما دے سو وہ لوگ غضب بلائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت (بھی) ہے۔

یہ حسد کی انتہائی حالت ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے کسی ایسے بندے پر وحی نازل کی جو ان میں سے نہیں تھا یا جس کو وہ اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ نبیِ کریم ﷺ کی نبوت کا ان کو یقین تھا۔ اس کفر اور عناد کی وجہ سے وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے اور حسد ایسی چیز ہے جو نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔ کما قال النبی ﷺ۔

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَـكُمۡ كَمَا سُٮِٕلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۰۸)

ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے (بے جا بے جا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جا چکی ہیں اور جو شخص بجائے ایمان لانے کے کفر (کی باتیں) کرے بلاشک وہ شخص راہِ راست سے دور جا پڑا۔

کبھی کبھی سوال مبنی بر عناد ہوتا ہے اور رسول سے عناد کفر ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس طرح کے سوالات کرنے سے منع فرما دیا گیا ہے جس سے عناد کا پہلو نکلتا ہو اور علما

جو وارثِ رسول اللہ ﷺ سے بھی اس طرح کے سوالات کرنا جس کا منشا علما کی تذلیل کرنا یا ان کو ایک دوسرے کا دشمن یا مدِمقابل ثابت کرنا ہو، ناجائز ہے اور اشارتاً یہ کفر کے کام ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۱۸)

اور (بعضے) جاہل یوں کہتے ہیں کہ (خود) ہم سے کیوں نہیں کلام فرماتے اللہ تعالیٰ یا ہمارے پاس کوئی اور دلیل آجاوے، اسی طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے ہوگزرے ہیں ان کا سا (جاہلانہ) قول، ان سب کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں ہم نے تو بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کردی ہیں۔

اقوال کا تشبہ بسا اوقات دل کے تشبہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے موجودہ زمانے کے نئی روشنی کے لوگ اسلام پر یا داڑھی یا صحابہؓ کے متعلق کافروں کی طرح سے اعتراض کرتے ہیں اور اسے صرف اپنی ذہانت ثابت کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، ان کے قلوب دراصل کفر سے بھرے ہوئے ہیں۔ فاعوذ باللہ من ذٰلک۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۲۹)

اور نہ ان لوگوں کو کوئی بچا سکے گا اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں اور وہ ان کو پورے طور پر بجا لائے (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا مقتدا

بناؤں گا۔ انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجیے)۔

علما نے فرمایا ہے کہ امتحان دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو اس شخص کی استعداد جاننے کے لیے جس کا امتحان لیا جاتا ہے یا دوسروں کو جتانے کے لیے۔ اس رفعت العباد کے ذہن میں ایک توجیہہ اور آتی ہے۔ وہ یہ کہ عادت اللّٰہ ہے کہ بعض مقامات (positions) کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی بہت سے امتحانوں سے گزرتا ہوا کندن بن جائے۔ چھوٹے چھوٹے امتحانات (tirbulations) سے گزر کر آدمی بڑے بڑے معرکوں کے لیے تیار ہوجاتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدین کا چکر دلا کر پھر نوکری کرا کے اور مختلف آزمائشوں سے گزار کر بنی اسرائیل کی امامت کا بار اٹھانے کے قابل بنایا گیا۔ ثم جئت علی قدر یا موسیٰ... اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت سی آزمائشوں سے گزارا گیا اور پھر فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا سردار بنانے والا ہوں۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۲۶)

اور جس وقت ابراہیم (علیہ اسلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس کو ایک (آباد) شہر بنا دیجیے امن (و امان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں سے بھی عنایت کیجیے، ان کو (کہتا ہوں) جو کہ ان میں سے اللّٰہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور اس شخص کو جو کہ کافر رہے سو ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچاؤں گا اور وہ پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی شہر (یا ملک) میں جب رزق کی فراوانی ہوگی تو سب کو رزق

ملے گا چاہے ان میں کوئی مومن ہو کوئی کافر اور اسی طرح جب رزق کی تنگی ہوتی ہے تو سب متاثر ہوتے ہیں، مومن ہوں خواہ کافر۔ الا ماشاء اللّٰہ۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ O

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۲۸)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجیے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت (پیدا) کیجیے جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجیے اور ہمارے حال پر توجہ کیجیے (اور) فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے مہربانی کرنے والے۔

مناسک (rites) انسان کی اندرونی محبت اور انقیاد (love & loyalty) کی منظور شدہ علامات ہیں اور ان کو یہ کہہ کر ناقابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ محض ظاہری چیزیں (formalities) ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مناسک متعلقہ بہ بیت اللّٰہ اور دیگر مناسک کے متعلق تھی۔ یہ مناسک جن کو بعض لوگ رسومات سمجھتے ہیں، اگر وفورِ جذبات کے ساتھ ادا نہ بھی ہوں تب بھی ان کا ایک مقام ہے۔ یعنی یہ مناسک ادا کرنے والا اگر وہ واقعی منافق نہ ہو تو اسے خدا کا کچھ تو خوف ہوتا ہے اور کچھ تو محبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ان کو ادا کرتا ہے۔ گرچہ ہوسکتا ہے اس کی محبت اتنی قوی نہ ہو کہ اس سے دوسرے اچھے اعمال سرزد ہوں۔ اسی طرح اگر بغیر خشوع کے بھی نماز ادا ہوجائے تب بھی اسے صرف اٹھک بیٹھک کہنا درست نہیں ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۳۷)

سو اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہلِ اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ (حق) پر لگ جاویں گے اور اگر وہ رُوگردانی کریں تو وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسرِ مخالفت ہیں ہی تو (سمجھ لو کہ) تمھاری طرف سے عنقریب ہی نبٹ لیں گے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اس طرح کا ہو جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا اور سیاق وسباق سے اس بات کی تصریح ہوتی ہے کہ معتبر ایمان کے لیے تمام رسولوں کی اور آسمانی کتابوں کی تصدیق بھی لازمی ہے۔ اگر ایک نبی کی بھی تکذیب کرے گا تو اس کا ایمان معتبر نہیں رہے گا بلکہ وہ مخالف گروہ یعنی کفار میں شمار کیا جائے گا۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۴۲)

اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور کہیں ہی گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس (بات) نے بدل دیا آپ فرما دیجیے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک ہیں جس کو خدا ہی چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا جس معاملے میں فیصلہ فرما دے پھر اس میں قیل و قال کرنا یا اس کی وجہ پوچھنی پرلے درجے کی حماقت ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۳)

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو۔ بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ)۔

ہر معاملے میں خواہ وہ دنیا کا ہو خواہ دین کا، خواہ کوئی مصیبت دنیوی ہو خواہ نفس اور شیطان کی زبردست کوشش ہلاکت اخروی میں ڈالنے کی ہو، صبر اور نماز دو چیزیں ہیں جن سے فوراً مدد ملتی ہے۔ صبر کی قوت تو غیر مسلموں کو بھی مسلّم ہے اور ان کے ہاں بھی کام میں لگے رہنا (perseverance) کلیدِ کامیابی سمجھا جاتا ہے اور نماز مومنوں کے لیے خاص ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع اور قریب ہیں اور اگلی آیتیں صبر کو قوت بخشنے کے لیے ہیں کہ سچوں نے تو جان تک دے دی اللہ کی راہ میں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۵۔۱۵۷)

اور (دیکھو) ہم تمھارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقے سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجیے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال اولاد حقیقتاً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں۔ ان لوگوں پر (جدا جدا خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہوگئی۔

صبر کا بڑا امتحان تو جہاد (یعنی قتال فی سبیل اللہ) میں ہوتا ہے مگر ایک انسان پر بہت سی مصیبتیں پڑتی رہتی ہیں اور ایک مسلمان کو بہت سی بدنی اور مالی عبادت کرنی ہوتی ہے جو اگر خدانخواستہ ایمان کمزور ہو تو بہت گراں گزرتی ہے۔ اسی طرح کئی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے جنھیں طبعاً انسان چھوڑنا نہیں چاہتا۔ صبر ان تمام حالتوں میں احکامِ الٰہی کے پابند رہنے کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ادنیٰ ترین درجے کی مصیبت کو بھی اس میں شامل رکھا ہے۔ مصیبت خواہ کسی طرح کی بھی ہو ان پانچ طرح کی مصیبتوں میں سے ایک ہوتی ہے جن کا ان آیاتِ کریمہ میں ذکر ہے:

(۱) خوف: خواہ خود کوئی گزند پہنچنے کا یا کسی آفت میں مبتلا ہونے کا خواہ کسی عزیز کو کسی طرح کی گزند پہنچنے کا۔ خواہ مال ضائع ہوجانے کا۔ (psychological)

(۲) جوع: یعنی فوری طور پر جسمانی راحت کا فقدان (physical deprevation)۔

(۳) مال کا ضائع ہوجانا خواہ قلیل ہو خواہ کثیر۔

(۴) اپنی جان کا نقصان یا اپنے عزیزوں میں سے کسی کی جان کا نقصان (physical injury)

(۵) ثمرات کا نقصان خواہ قدرتی ثمرات ہوں، مثلاً کھیت میں غلّہ پیدا ہونا یا باغ میں پھل آنا۔ خواہ اپنی کوشش کے ثمرات۔

یہاں تک کہ چراغ کے گل ہوجانے کی بہت قلیل اور وقتی مصیبت کو بھی حضور ﷺ نے اس میں شامل فرمایا ہے اور انا للّٰہ پڑھ کر اس کے اجر کی امید دلائی ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ۶ رستمبر ۸۵ء کی مجلس میں تفصیلی بیان اس آیتِ کریمہ کے بارے میں فرمایا۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "بشیءٍ" یعنی تھوڑا سا۔ تھوڑا سا آزمائیں گے، ایک چٹکی لیں گے، دیکھو تم گھبرانا نہیں۔ ہمارے پاس پہلے آنا، ہم سے رجوع کرنا اور پھر اتنی بڑی بشارت دے دی ایک قولی عمل پر یعنی زبان سے کہہ لینا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ہوسکتا ہے تمھیں اپنی بدحواسی میں اس وقت یاد نہ رہے۔ لٰہذا ابھی سے بتائے دیتے ہیں۔ جب بھی کوئی مصیبت آئے کہہ لینا، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

قلب پریشان ہے، دماغ ماؤف ہے، کچھ پروا نہیں۔ زبان سے کہہ لو، میرے استفسار پر فرمایا کہ اگر عادتاً بھی پڑھ لیا جائے جب بھی اجر کا باعث ہے، خواہ اس مصیبت کا سبب خود تمھاری کوئی غلطی ہو، خواہ تمھارے کسی گناہ کے سبب سے تم پر نازل ہوئی ہو، خواہ ہم تمھیں کسی اور کی آزمائش کا سبب بنا رہے ہیں کہ جو وہ ظلم تمھارے ساتھ کر رہا ہے اس کا پورا پورا بدلہ لیں۔ کوئی بھی سبب ہو کوئی بھی واسطہ ہو، اس مصیبت کا یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ جب وہ فرما رہے ہیں کہ ہم ضرور تمھیں آزمائیں گے تو ہمیں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مصیبت جو ہم پر پڑی ہے، یہ ہمارے رب کے حکم سے ہے اور وہ ہمیں آزما رہے ہیں۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم فوراً اس کی طرف رجوع ہو جائیں۔ اسباب تلاش کرنا، اس مصیبت کے رفع کے لیے تدابیر سوچنا، اس کا تدارک کرنا، یہ سب بعد کا کام ہے۔ ان میں کوئی کمی بھی رہ گئی تو کچھ پروا نہیں۔ ہمیں تو سندِ رضامندی اسی وقت مل گئی جب ہم نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھ کر اس کی طرف رجوع کر لیا۔

یہ خطاب مومنین سے ہے جن میں بہت برگزیدہ بندے بھی ہیں اور رسول اللہ ﷺ بھی اس میں شامل تھے جو معصوم تھے۔ یہ معلوم کرنا کہ یہ مصیبت ہمارے کسی گناہ کی وجہ سے ہے یا محض ہمارا امتحان ہے جیسے کوئی محبوب اپنے چاہنے والے کا امتحان لیتا ہے، عارفین کا کام ہے۔ ہم جیسوں کو تو یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ ہمارے ہی کسی گناہ پر تنبیہ ہے اور استغفار کرنا چاہیے۔ غم چو بینی زود استغفار کن۔ ویسے تو ہر معاملے جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے، چاہے وہ کوئی مصیبت ہو، چاہے کوئی راحت یا نعمت مل جائے اس میں ہماری آزمائش بھی ہوتی ہے کہ دیکھیں اس بندے پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ مصیبت پر ہماری طرف رجوع کرتا ہے یا نہیں، استغفار کرتا ہے یا نہیں اور نعمت اور راحت پر شکر کرتا ہے یا نہیں۔

دوسرے یہ کہ بہت سے معاملات نقصِ اموال وغیرہ کے ایسے ہوتے ہیں جن کا امتحان اور آزمائش ہونا سبھوں پر ظاہر ہوتا ہے، عارفوں پر بھی اور عام مسلمانوں پر بھی۔ مثلاً اگر کسی کے پاس ایک لاکھ روپے ہوں اور وہ اسے سود پر دے دے تو پندرہ

ہزار روپے سال میں مل جائیں اور اگر جمع رکھے تو اتنے روپے نہیں ملیں گے یعنی اتنے روپوں کا ''نقصان'' ہوگا۔ یہ صریح آزمائش ہے۔

تیسرے یہ کہ بہت سی مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے کسی گناہ کی وجہ سے نہیں پیش آتیں بلکہ نیکی کی وجہ سے پیش آتی ہیں، مثلاً ایمان داری کی تو سب لوگ دشمن ہوگئے۔ یا جیسے اصحاب اخدود جب مومنوں کو آگ میں ڈال رہے تھے تو ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان لے آئے تھے کما قال تعالیٰ: وما نقموا منھم الا ان...الخ۔ تو یہ مصیبت صرف دیکھنے والوں کو نظر آتی ہے، جن پر گزرتی ہے ان کے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن قلب کو ایسی راحت ملتی ہے کہ وہ شہادت کے وقت فزت برب الکعبۃ پکار اٹھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ چھوٹی چھوٹی تکالیف کو اپنی طرف رجوع کا ذریعہ بنایا اور پھر اس رجوع کی وجہ سے اپنی رحمتِ خاصہ اور رحمتِ عامہ کا نزول فرمایا۔ خواہ انسان کوئی بھی دین اختیار کرے، آزمائش اور نبرد آزمائی (ابتلا) سے مفر نہیں۔ البتہ جو کافر ہیں ان کو تو آخرت کا یقین ہی نہیں اور جو مومن ہیں ان کے لیے ان تکالیف میں بھی نعمت پوشیدہ ہے۔

ایک اشارہ اس طرف بھی ملتا ہے کہ ایمان لانے کی وجہ سے اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے کی وجہ سے تکالیف کا اگر سامنا کرنا پڑے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ غیراختیاری امور جو پیش آئیں ان پر ہمارا ردِعمل اختیاری ہے اور اسی ردِعمل کے حساب سے اجر ملتا ہے۔

صبر ایسی چیز ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ صبر کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی مصیبت کوئی ناگواری پیش آجائے تو آدمی کی نظر فوراً اللہ تعالیٰ پر جائے۔ سبب پر نظر جانے سے پہلے مسبّب پر نظر پڑنی چاہیے کیوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسی کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمیں کوئی تکلیف کسی سے پہنچتی ہے تو فوراً اس پر تنقید کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی ناگواری پیش آتی ہے تو اس کے فاعلِ مجازی کی طرف نظر جاتی ہے، مثلاً کسی بہت بدنام شخص کا

پردموشن ہوگیا تو فوراً ذہن اس طرف گیا کہ یہ بہت برا ہوا اور حکومتِ وقت کی خرابیوں کا ذکر ہونے لگا۔ حالانکہ نظر ہماری سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر جانی چاہیے تھی۔ ایک اشکال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان برائی کا سبب تلاش نہ کرے اور فاعلانِ مجازی کو برا بھلا نہ کہے تو اصلاح کیسے ہو؟ کیوں کہ اصلاح کے لیے تنقیدی نظر ہونا ضروری ہے۔ اور اگر انسان ہر واقعے پر مطمئن ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی تو پھر اصلاح کی طرف نظر نہ جائے۔ گویا یہ دونوں زاویہ ہائے نظر ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ دونوں زاویے مختلف تو ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ سبب پر نظر جائے یا مسبّب پر بلکہ جیسا حضرت ڈاکٹر عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ "ہمارے لیے آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ پہلے اللہ پر نظر پڑے۔ سبب پر نظر پڑنے سے پہلے مسبّب پر نظر پڑنی چاہیے۔"

جو سچے مومن ہیں ان کا یہ حال ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ ہی طرف رجوع ہوتے ہیں کیوں کہ ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے مالک ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور چونکہ ان کی اپنی ہستی کچھ نہیں ہوتی ہے وہ اپنی ہستی کو فنا فی اللہ کرچکے ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اس کی فکر زیادہ نہیں ہوتی کہ دوسرے ان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں بلکہ اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں یا وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جس طرح ان کا مالک چاہتا ہے کہ وہ اس طرح کی زندگی گزاریں۔ عین اس مصیبت کے وقت بھی ان کو اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر ہے یا نہیں۔ ان سے اس وقت جس امرِ واجبہ کا مطالبہ ہے اگر وہ اس کو پورا کر رہے ہیں تو پھر ان کو کوئی فکر نہیں ہے اور کسی بات کا غم نہیں ہے۔ ان کا مالک ان سے راضی ہے تو پھر خواہ بڑے سے بڑا جابر بادشاہ ان سے ناراض ہو، خواہ ساری دنیا ان سے ناراض ہوجائے ان کو اس کی کچھ پروا نہیں ہے کیوں کہ بڑے سے بڑا جابر بادشاہ اور ساری دنیا مل کر بھی اس کا کوئی نقصان کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے سوائے اسی صورت کے کہ ان کا مالک یہی چاہتا ہو۔ ان کا مالک

ایسا ہی قدرت والا، ایسا ہی احکم الحاکمین ہے اور اگر ان کا مالک یہی چاہتا ہے کہ ان کو وہ تکلیف پہنچے جو پہنچ رہی ہے یا پہنچنے والی ہے تو پھر کیسی شکایت اور کس سے شکایت؟ انما اشکوا بثی ءحزنی الی اللہ ... ضرور اس کی مصلحت اسی بات کی مقتضی ہوگی۔ وہ علیم و خبیر ہیں۔ غفور و رحیم ہیں۔ ہم پر بہت مہربان ہیں، اس میں ضرور کوئی ہماری ہی بھلائی ہوگی جو اس وقت شاید سمجھ میں نہ آئے لیکن کچھ دنوں کے بعد سمجھ میں آ جائے گی اور چوں کہ مقتضائے بشریت ہے کہ انسان عافیت چاہتا ہے اور پریشانی یا تکلیف اسے گوارا نہیں ہوتی، اس لیے اناللّٰہ کے استحضار کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسے ایک نہ ایک دن اپنے مالک کے پاس لوٹ کر پہنچنا ہی ہے۔ اسی دن ساری تکلیفیں ختم ہوں گی۔ ساری مصیبتیں دور ہوجائیں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ تکلیف عارضی ہے دائمی نہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچیں گے تو وہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ آرام کی زندگی گزاری یا تکلیف کی زندگی گزاری؟ بلکہ یہ سوال ہوگا کہ جو باتیں ہماری طرف سے تم تک پہنچی تھیں ان پر ایمان لائے یا نہیں لائے اور جو احکامات ہمارے تم تک پہنچے تھے ان کو بجا لائے یا نہیں؟ لہٰذا ہم اگر یہاں احکاماتِ الٰہیہ بجا لانے میں ثابت قدم رہے اور اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے رہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں رحمت ہی رحمت ہے اور ہر طرح کی نعمت ہمارا استقبال کرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ فالحمد اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ۔ اور چونکہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہمارے پاس مال ومتاع، عزت و آبرو، ازواج و اولاد، امن وسکون جو کچھ بھی ہے وہ ان ہی کی ملک ہیں۔ اس میں سے وہ جو بھی چاہیں واپس لے لیں تو جزع فزع کیسا۔ ہاں فطرتِ انسان کے تحت رہیں گے تو اس کے سامنے رہیں گے اور پکاریں گے تو اسی کو پکاریں گے۔ البتہ ہمیں اپنے اعمال کی نگرانی کرنی ہے کیوں کہ بلا اور مصیبت امتحانات ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ یہ آیاتِ کریمہ گرچہ خاص طور پر صبر فی المصیبۃ کے بارے میں ہیں لیکن اشارتاً دوسرے دو اقسام یعنی صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ کے لیے بھی ہیں۔ کیوں کہ طاعت پر قائم رہنے اور گناہ سے رکنے میں بھی نفس کو ناگواری ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث

شریف میں ہے کہ حفت الجنۃ بمکارہ... الخ۔ یعنی جنت گھیر دی گئی ہے ناگواریوں سے۔ اور اگر کسی مصیبت پہنچنے کا خدشہ ہو تو یہ سمجھنا کہ ہمیں کوئی تکلیف ہرگز نہیں پہنچ سکتی جب تک اللہ تعالیٰ نے وہ بات ہمارے لیے لکھ نہیں دی ہے (قل لن یصبنا الا...) اور یہ سمجھنا صبر کے مطابق ہوجاتا ہے اور یہی توکل ہے جو صبر ہی کے قسم کی چیز ہے۔ یہ نسخہ تمام مجاہدات کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ کیوں کہ جو چیز بھی نفس پر شاق ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہونے اور اس کے سامنے پیش ہونے کے تصور سے شاق نہیں رہتی، مثلاً نامحرم کو دیکھنے کی یا اس سے کسی شکل میں متمتع ہونے کی خواہش ہو رہی ہے اور اس کے پورا کرنے میں کوئی دقت بھی نہیں ہے اور آدمی اپنے نفس کو اسی سے روک دیتا ہے تو یہ نقص من الانفس کے مشابہ ہے۔ اسی طرح کہیں روپیہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے صدقہ یا صلۂ رحمی کے طور پر جو اگر نہیں خرچ کیا جائے تو کس طرح کا دنیاوی نقصان بھی نہیں ہے تو یہ نقص من الاموال کے مشابہ ہے اور گرچہ یہ آیاتِ کریمہ اضطراری مجاہدات کے بارے میں ہیں اور یہ اختیاری مجاہدات ہیں لیکن ان معاملات میں بھی وہی نسخہ مفید ہے جو صبر علیٰ ما اصاب کے حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

ایک خیال یہاں پر یہ آتا ہے کہ بچہ بڑی محنت سے ایک کھلونے کے پرزوں کو جمع کرکے اور ترتیب دے کر ایک چیز بناتا ہے اور اس کا مربی اس کو توڑ دیتا ہے تاکہ وہ دوبارہ اسے بنائے اور اس طرح اس کے ذہن کی نشوونما ہو تو بچہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ساری محنت کسی نے برباد کردی لیکن سمجھ دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے حق میں اچھا ہوا۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں تو اگر وہ بندہ اس کی طرف نظر کرکے اس مصیبت سے گھبراتا نہیں ہے اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔

''اموال'' کے نقصان میں تمام نقصانات متعلقہ ملکیت (Loss of property) شامل ہیں۔ چاہے وہ کسی غیر متوقع حادثے کی وجہ سے ہوں چاہے وہ چوری یا کسی اور وجہ سے ہوں۔ اسی طرح ''انفس'' میں احقر کے ذوق میں تمام ایسے نقصانات

شامل ہیں جو ذات (person) سے متعلق ہوں، خواہ وہ بیماری ہو، خواہ موت ہو، خواہ کسی مخلوق کی ایذا دہی ہو، خواہ نفس کو کوئی راحت یا لذت حاصل تھی جو جاتی رہی، خواہ کوئی راحت یا لذت مل سکتی تھی جو نہیں ملی، خواہ اپنے کسی عزیز یا دوست کی موت ہو، خواہ اس کی بیماری ہو یہ سب شامل ہیں اور ''ثمرات'' کے نقصان میں تمام ایسے نقصانات شامل ہیں جن میں محنت کا پھل نہ ملے جو اس محنت کا عام طور سے ثمرہ حاصل ہوتا ہے یا حاصل ہوتے ہوتے رہ جائے جیسے باغ کا پھل۔ یہ بھی کسی آفاتِ ارضی یا سماوی کا نتیجہ ہوسکتا ہے یا کسی دشمن کی دشمنی اور ایذا رسانی کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ عمل کا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ سب ایک دوسرے سے مربوط (inter-linked) ہوتے ہیں، مثلاً ہم کسی میز کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور کوئی دوسرا اپنی طرف۔ کبھی اپنے اعمال کے نقص کی وجہ سے متوقع ثمرات مرتب نہیں ہوتے کبھی دوسرے رخنہ ڈال دیتے ہیں۔ غرض ان تمام تکالیف اور مصیبتوں کے داخلی اسباب جو کچھ بھی ہوں اور خواہ ان تک ہماری نظر پہنچ سکتی ہو خواہ نہیں لیکن ان سب کا اصلی سبب خدا کی مرضی ہے۔ لہٰذا ہر ایسے معاملے میں ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع کریں۔ اسی کا نام صبر ہے جس کا سب سے بڑا اجر معیتِ الٰہیہ ہے جس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں ہے اور یہاں صبر کے لیے ایک ایسا مراقبہ بتایا گیا ہے جس سے صبر آسان ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے اس پر ہمارا ردِ عمل کیا ہو رہا ہے ہم اسی کے مکلّف ہیں اور اسی کی نگرانی ہمیں کرنی ہے کیوں کہ اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

اور اس سے اگلی آیت ولنبلونکم... میں آزمائش کی خبر بھی مزید خبردار کرنے کے لیے اور صبر علی الطاعۃ صبر عن المعصیۃ اور صبر علی المصیبۃ ہر طرح کے صبر میں استقامت پیدا کرنے کے لیے ہے کہ اتنی تھوڑی سی تکلیف اتنی تھوڑی سی دیر کے لیے طبعاً مرغوب لیکن شرعاً ممنوع یا مکروہ چیز سے بچنا ہے ابھی تو بڑے امتحانات باقی ہیں، خواہ دنیاوی نقصان کسی کو عمر بھر بفضلہٖ تعالیٰ نہ اٹھانا پڑے (جس طرح فانقلبوا... فضل لم یمسسھم سوء کا واقعہ ہوا) لیکن تیار تو بہرحال رہنا ہے، اور پھر انا للّٰہ سے تجدیدِ عہد کرنا ہے کہ ہماری زندگی اور

موت جب سبھی کچھ اللہ کے لیے ہے تو یہ تھوڑی سی تکلیف بھی سہی اور جب وانا الیہ راجعون کہہ کر موت کو یاد کرلیا جاتا ہے تو اور بھی ارادہ پختہ ہوجاتا ہے اور صبر کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی نقصان مالی یا جانی انسان کو بطور ابتلا کے ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو محسوس نہ ہونے دیں جیسا کہ تجربہ شاہد ہے۔

۱۰سی طرح کسی چیز کی شدید خواہش ہو رہی ہو مگر معاشرہ ایسا ہے کہ وہ چیز جائز طرح سے حاصل نہیں کی جاسکتی تو اس وقت انا للہ... کا استحضار معصیت سے روک دیتا ہے اور وہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

جس طرح نعمت آزمائش ہے، اسی طرح ناگواری بھی آزمائش ہے اور ان دو حالتوں سے کسی کو مفر نہیں۔ تو جو کافر ہیں ان کے پاس نعمت چند روزہ ہے اور جو مومن ہیں ان کے لیے قسمت میں بھی نعمت پوشیدہ ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ غیراختیاری امور پر ردِعمل (reaction) اختیاری ہے اور اسی ردِعمل کی جزا ملتی ہے۔

اسی طرح کے طبعی ناگواری کے واقعات، غیراختیاری حادثات و سانحات، چھوٹے ہوں خواہ بڑے سب کو پیش آتے ہیں، مومن ہو خواہ کافر۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے لیے ان واقعات کو آزمائش بنایا ہے اور کافروں کے لیے سزا۔ اس لحاظ سے مومن کے لیے باعثِ شکر ہیں کہ ان پر صبر کرنے والوں کے لیے بشارت اس وقت بھی ہے جب یہ نقصانات اختیاری افعال کی وجہ سے ہوں کیوں کہ افعال کا اچھا یا برا اثر خدا ہی کے حکم سے ہے۔ لہٰذا اگر کسی گناہ پر ہلکی سی گرفت ہوگئی تو اس وقت استغفار واجب ہے اور یہ گرفت بھی مومن کے لیے آزمائش ہے کہ اس کا کیا ردِعمل ہوتا ہے تو ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی من جانب اللہ سمجھ کر استغفار کرنا اور اس مصیبت پر صبر کرنا ضروری ہے اور اس صبر پر بھی وہی بشارت ہے۔ یہاں استغفار اور صبر اور شکر تینوں جمع ہوگئے۔ اسی طرح صبر عن المعصیۃ میں جو طبعاً ناگواری ہوتی ہے اس پر بھی یہ بشارت ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے من عشق فکتم فمات فھو شہید او کما قال علیہ ﷺ (جو عشق میں مبتلا ہوگیا پھر اس کو چھپایا، پھر وہ مرگیا تو وہ شہید ہے)۔

ذوقاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انا للّٰہ کا مراقبہ ہر معاملے میں رجوع الیٰ اللّٰہ کی تعلیم دیتا ہے۔ طاعت میں اگر سستی ہو تو اس کو رفع کرنے کے لیے بھی رجوع الیٰ اللّٰہ سے کام لیا جائے اور معصیۃ سے بچنے میں اگر نفس کو دشواری ہو تو اس وقت بھی رجوع الیٰ اللّٰہ اکسیر کا کام دیتا ہے۔ گویا ہر طرح کے صبر میں رجوع اِلی اللّٰہ خاص مدد و معاون ہے۔ جتنا رجوع الیٰ اللّٰہ قوی ہوگا اتنا ہی صبر آسان ہوگا اور جتنا رجوع الیٰ اللّٰہ ضعیف ہوگا اتنا ہی صبر کرنے میں دشواری ہوگی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ O (سورة البقرہ، آیت ۱۶۵)

اور بعض لوگ وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللّٰہ سے (رکھنا) ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے اور یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللّٰہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں اور بھی) سخت ہوگا۔

محبت تمام تعلقات کی اصل ہے۔ عبادت بھی محبت کی اَعلیٰ ترین شکل ہے۔ یعنی محبت جب شدت اختیار کرلیتی ہے تو وہ پرستش بن جاتی ہے اور محبّ محبوب کے اشارے پر اپنی جان تک قربان کردینے کو تیار ہوجاتا ہے اور وصالِ محبوب کے لیے پتھروں پر چلنا اس کے لیے قالین پر چلنے سے زیادہ پسندیدہ ہوجاتا ہے اور اس میں اس کو اتنا مزہ آتا ہے کہ قالین پر چلنے والے اس سے محروم رہتے ہیں۔ تو اللّٰہ تعالیٰ فرماتا ہے

کہ اس شدتِ محبت یعنی شدید ترین محبت کے حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور مومنِ حقیقی اور مومنِ صادق وہی لوگ ہیں جن کی صفت یہ ہو کہ وہ اشد حباللّٰہ ہیں اور جن کا ذکر فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر میں ہے۔ اور مومنین بلکہ انسان نے تو ازل ہی سے اس محبت کا مزہ چکھ لیا تھا جس کی طرف اشارہ انا عرضنا الا مانۃ...حملھا الا انسان...الخ۔ میں ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں سب سے ضروری کام دل میں اس محبت کی حفاظت کرنا ہے جو تمام تصوف اور تمام مجاہدہ کا حاصل ہے۔

مومنوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ڈال دی گئی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ ہر مومن کے دل میں یہ محبت موجود ہے اور اگر فی الوقت اس کے شدید ترین ہونے کا اندازہ نہیں ہے تو اس سے اس کے وجود کا انکار نہیں ہوسکتا۔ ہر مومن کے دل میں حبِ خداوندی کا بیج ہے جس طرح ہر انسان کے دل میں توحید کا بیج روزِ ازل میں بویا گیا تھا۔ اب جو شخص اس بیج کی آبیاری کرتا ہے تو وہ پھلتا پھولتا درخت بن جاتا ہے اور جس شخص نے اس کی نگہداشت نہیں کی تو ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بیج کو ضائع کردیتا ہے یعنی اس کا اثر اعمالِ صالحہ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا۔

محبت کے ازدیاد کے لیے دیدار اور گفتار کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کی پرورش اور آبیاری منظور ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نعمتوں کے مشاہدے اور استحضار اور اللہ تعالیٰ سے دعا اور مناجات ضروری ہیں۔ دعا اور مناجات کا حکم کئی عنوانات سے قرآن شریف میں ہے۔ محبت مناجات سے بڑھتی ہے اور اس کا اثر اعمال پر پڑتا ہے کہ اتباعِ سنت نصیب ہوتی ہے۔

محبت کے الوان مختلف ہیں۔ جس طرح دنیاوی اشیا کی محبت بیوی، بیٹے، گھر، مال وغیرہ کی محبتیں مختلف رنگ کی ہیں۔ مناجات، توکل، راضی بہ رضا رہنا اور جہاد فی سبیل للہ سب اللہ تعالیٰ کی محبت کے مختلف الوان ہیں۔ اور تمام طبعی محبتوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عقلی محبت واجب ہے۔ رفتہ رفتہ یہی عقلی محبت طبعی بن جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۶۸)

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں کو کھاؤ (برتو) اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، فی الواقع وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔

جب عام انسانوں کو خطاب ہے تو صرف یہ حکم ہے کہ طیب چیزیں کھاؤ اور شیطان کے بہکانے سے بچو (جو غیر طیب چیزوں کی طرف رغبت دلاتا رہتا ہے) اور جب خاص مسلمانوں کو خطاب ہے تو ان تمام نعمتوں کو اپنی طرف سے عطا ہونے کی حیثیت سے ان پر شکر ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے اور طیب کی قید دونوں جگہ ہے۔ اس لیے کہ پاکی ایمان کا بھی تقاضا ہے اور انسانی فطرت بھی ایسی بنائی گئی ہے کہ ناپاک چیزوں سے نفرت ہو۔ ہر شخص صاف ستھری چیزیں ہی کھانا چاہتا ہے۔ ایمان لانے کے بعد پاک اور ناپاک کا فرق واضح ہوجاتا ہے اور شکر ادا کرنے کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے۔ فالحمد للّٰہ۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۶۹۔۱۷۱)

وہ تم کو ان ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بری اور گندی ہیں اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللّٰہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ کہ جس کی تم سند بھی نہیں رکھتے۔ اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے جو حکم بھیجا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقے) پر چلیں گے

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادا (دین کی) نہ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔ اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور کی) کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلاّ رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا (اسی طرح یہ کفار) بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو سمجھتے کچھ نہیں۔

اس سے پہلی آیتِ کریمہ میں حلال طیّب کھانے کا حکم عامۃ الناس کو تھا اور شیطان کے بہکاوے سے بچنے کا تھا۔ یہاں شیطان جن چیزوں کی طرف آدمی کو لے جانا چاہتا ہے اور جن سے آدمی کو بچنا چاہیے، ان کا بیان فرمایا گیا ہے۔ ترتیب اس طرح ہے کہ جو زیادہ آسانی سے عامۃ الناس کو بری معلوم ہوتی ہو اس کا ذکر پہلے کیا گیا پھر اس سے زیادہ باریک بیں کے نزدیک جو چیز بری معلوم ہوتی ہو اس کا ذکر ہے پھر اس سے زیادہ باریک بیں اور لطیف المزاج انسان کو جو چیز بری معلوم ہوتی ہو اس کا ذکر ہے اور ہر بات پہلی بات سے زیادہ لطیف ہونے کے علاوہ زیادہ بنیادی اہمیت کی ہے۔ یہ بات سب کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بری بات بری بات ہے اس لیے سب سے پہلے ''سوء'' کا ذکر ہے کہ شیطان وہ ہے جو برائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے بچنا ضروری ہے اس لیے شیطان سے ہشیار رہنا ضروری ہے۔ اس کے بعد برائیوں میں سب سے بری بات فحش بات ہے۔ فحاشی، زنا، بے حیائی کی برائی بھی شریف النفس آدمی پر ظاہر ہے۔ پھر اس سے بھی بری بات شرک اور کفر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بات کہنی جو درست نہیں ہے اور جس کا کہنے والے کو کوئی علم نہیں ہے، صرف باپ، دادا سے سنی سنائی باتیں ہیں۔ یہ بات عام لوگوں کو کم ہی بری معلوم ہوتی ہے۔ اس کی برائی واضح ہونے کے لیے قلبِ سلیم ہونا ضروری ہے اور یہ بات سب سے زیادہ بنیادی اہمیت کی ہے۔

ہر گناہ میں خاصیت ہے نقصان کی جو احساسِ لطیف رکھنے والوں کو معلوم ہوتی ہے اور اکثر گناہ کے خیالات خصوصاً نفسانی اور شہوانی خیالات اس وقت آتے ہیں جب

پیٹ بھرا ہوا ہو اسی لیے عام انسانوں کو کہا گیا ہے کہ دنیا میں حلال وحرام دونوں طرح کا رزق ہے تو حلال چیزیں کھاؤ اور شیطان کے بہکانے میں مت آنا کیوں کہ وہ تمھیں ایسی باتوں کی طرف ورغلاتا ہے جو تمھارے لیے نقصان دہ ہیں۔ مومنوں کو خصوصی خطاب ہے تا کہ کھاتے وقت ان کو احساس رہے کہ یہ رزق ان کے رب کی طرف سے عطا کردہ ہے اور اس پر وہ شکر ادا کریں۔ شکر ادا کرنے سے وہ رزق باعثِ خیر و عافیت بن جاتا ہے اور انسان سوء اور فحشا سے رک جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَO اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO (سورۃ البقرہ، آیت ۱۷۲۔۱۷۳)

اے ایمان والو! جو (شرع کی رُو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزا کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصدِ تقرب) غیراللہ کے نامزد کردیا گیا ہو۔ پھر بھی جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہوجاوے بشرطے کہ نہ تو طالبِ لذت ہو اور نہ (قدرِ حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا واقعی اللہ تعالیٰ ہیں، بڑے غفور و رحیم۔

اس رکوع کے شروع میں عام انسانوں کو خطاب تھا کہ زمین میں سے حلال اور طیّب چیزیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو۔ یہاں مومنوں سے خاص خطاب ہے کہ جو طیّبات میں سے دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔ حرام کردہ چیزوں کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں ہے۔ ہمارا ہی عطا کردہ رزق ہے، یعنی مومن دُہرا شکر گزار ہے کہ رزق طیّب ملا اور

اس پاک پروردگار نے دیا۔ لہٰذا فوراً ہی بعد شکر کا حکم ہے۔ اگر اس کا خالص عبادت گزار بندہ ہے (جو مومن کی تعریف ہے) تو طیّبات کئی وجہ سے اس کے لیے باعثِ شکر ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ O (سورۃ البقرہ، آیت ۱۷۴)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضے میں (دنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں، ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) ان کی صفائی کریں گے۔ اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔

بعض چیزوں کی حرمت شدت میں اور کراہیت میں مردار اور سؤر کے گوشت سے زیادہ ہوتی ہیں لیکن قلتِ فہم سے ہلکی نظر آتی ہیں، مثلاً اس سے پہلے حرمت میتۃ وغیرہ کا ذکر تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں کتمانِ حق کا ذکر ہے جس میں بنی اسرائیل کے علما اکثر مبتلا تھے تاکہ دنیاوی مال و جاہ حاصل ہوں یا باقی رہیں تو اس کی شدتِ حرمت بہت زیادہ ہے کیوں کہ ان کے بارے میں ما یاکلون فی بطونھم الا النار فرمایا گیا ہے۔ اکل میتۃ وغیرہ تو اضطرار کی حالت میں جائز بھی ہوجاتا ہے مگر یہ جرم کبھی قابلِ معافی نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں اضطرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ دنیا خریدتے ہیں آخرت کے بدلے میں۔ اسی طرح غیبت کو لوگ ہلکی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ اس کی حرمت اکل میتۃ سے ایک درجہ زیادہ ہے کیوں کہ یہ اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے مثل ہے۔ فاعوذ باللّٰہ۔

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ۙ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۱۷۷)

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے۔ اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اس (اللہ) کی محبت میں رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "بر... تمام طاعاتِ ظاہری و باطنی کو عام ہے۔" اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اصل مدار نیکی تقوی ہے جس کی تھوڑی تفصیل یہاں ایمان باللّٰہ والیوم الآخرہ وغیرہ سے کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنا بذاتِ خود کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نماز کے لیے قبلہ رُخ ہونا نیکی ہے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ "اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔"

تیسری بات یہ ہے کہ ترجیحات (priorities) کو خلط ملط کرنے سے دنیاوی نقصان تو ہوتا ہی ہے، دین کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ تحویلِ قبلہ پر

ہی سارا زور دے رہے تھے کہ ایسا کیوں ہوا۔ پہلی بات جو فیصلہ کرنے کی تھی وہ یہ کہ مومن بن کر رہیں گے یا نہیں۔ جب خدا پر ایمان ہوا تو اس کے خاص جزا و سزا کے دن پر اور اس کے فرشتوں پر اور پھر لازماً اس کے نبیوں پر ایمان لانا ہوگا اور اس بنیادی فیصلے کے بعد دوسری باتوں کا خود بخود فیصلہ ہوجاتا ہے، ایمان نہ ہو تو نماز بے کار اور نماز نہ ہو تو قبلہ بے کار۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۷۹)

اور فہیم لوگو! (اس قانون) قصاص میں تمھاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانونِ امن کی خلاف ورزی کرنے سے) پرہیز رکھو گے۔

ان پورے دو رکوعوں میں تقویٰ ہی کے اوصات و عوارف بتائے گئے ہیں۔ آیت نمبر ۱۷۷ میں نمبر۱ ایمان، نمبر۲ ایتاء مال نمبر۳ اقامتِ صلوٰۃ و نمبر۴ ادائے زکوٰۃ (جس سے نمبر۲ کا بہت زیادہ ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے) اور نمبر۵ صبر پھر اس آیت میں نمبر۶ قصاص اور اس کے بعد کی آیتوں میں نمبر۷ وصیت (جو بعد میں فرض نہیں رہا) نمبر ۸ روزہ اور نمبر۹ اعتکاف کا ذکر ہے اور آیت نمبر۱۸۸ میں ولا تاکلو بینکم ... بھی ان ہی احکام میں ہے۔

قصاص کا تقویٰ سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اور اگر ہم خدا کے اس حکم کو بجا لانے میں کوتاہی کریں (جیسا کہ کر رہے ہیں) تو بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔ حقوق العباد پورے کے پورے ادا کرنا، معاشرے میں یہ شعور ہونا اور حکومت میں یہ صلاحیت ہونا کہ اگر کوئی کسی کی حق تلفی کرے تو اس سے فوراً مظلوم کو اس کا حق دلوایا جائے، معاشرے کی اصلاح اور افراد کی فلاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ ایک اچھا معاشرہ

یا ایک اچھا ملک وہ نہیں ہے جہاں کوئی کسی پر کبھی بھی ظلم نہ کرے کیوں کہ ایک معتد بہ طویل مدت تک ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ایک اچھا معاشرہ یا ایک اچھی مملکت وہ ہے جہاں لوگ عام طور پر ایک دوسرے پر ظلم نہ کرتے ہوں اور اگر کبھی کسی نے کسی پر ظلم کیا تو فوراً مظلوم کو پورا پورا بدلہ دلوا دیا جائے۔ اس میں قوموں کی حیات ہے اور اگر کوئی معاشرہ یہ نہ کرسکے تو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے سے قاصر رہتا ہے۔ اور اس معاشرے میں فسق و فجور عام ہوجاتا ہے۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ ؕ وَمَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۸۵)

(وہ تھوڑے دن) ماہِ رمضان ہے جس میں قرآنِ مجید بھیجا گیا ہے (جس کا ایک وصف) کہ لوگوں کے لیے (ذریعۂ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالۃ ہے من جملہ ان کتب کے جو (ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں اور (حق و باطل) میں فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے)۔ اللہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمھارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ ایام ادا یا قضا کے شمار کی تکمیل کرلیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (و ثنا) بیان کیا کرو، اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و ثمراتِ صیامِ رمضان سے محروم نہ رہو گے) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لیے دے دی) تاکہ تم لوگ اس نعمت کی آسانی پر (اللہ کا) شکر ادا کیا کرو۔

روزے کا گہرا تعلق تقویٰ سے اس لیے بھی ہے کہ بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی۔" جب تشریعی احکام میں بندوں کی آسانی کا اتنا خیال رکھا گیا تو تکوینی احکام میں بھی ضرور بندوں کی آسانی رکھی گئی ہوگی۔ روزے کے احکام میں آسانی کے بہت پہلو ہیں۔ ایک تو آسانی یہ کہ سفر اور مرض میں قضا کر لیا۔ دوسرے یہ کہ فوراً سفر ختم ہونے کے بعد ہی روزہ رکھنا فرض نہیں کیا گیا بلکہ "ایامِ اُخر" فرمایا گیا۔ تیسرے یہ کہ گنتی مقرر کردی گئی۔ اگر یہ ہوتا کہ جتنے چاہو رکھو تو بہت سے تو اس ثواب سے محروم رہتے اور نفس کی طاقت کو توڑنے کے لیے جس معتد بہ مقدارِ مجاہدہ کی ضرورت تھی وہ حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یہ فرض نہیں ہوتا تو ہم میں سے بہتیرے نفس کے سامنے کمزور پڑ جاتے اور اس کے ثمرات سے محروم رہتے اور کئی ایسے بھی ہوتے جو اپنے اوپر بہت زیادہ بار ڈالتے۔ اگر ایسا بھی حکم ہوتا کہ ایسا روزہ رکھو جو ہمارے ہاں قابلِ قبول ہو تب بھی ایک روزہ رکھنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا گنتی مقرر فرما دی کہ گنتی پوری کر دو گے تو ہم قبول کرلیں گے۔ اس لیے اس حکم پر شکر ادا کرنا ضروری ہے کہ ایسا حکم دیا جس سے تقویٰ حاصل ہو اور اس حکم میں بہت سی آسانی بھی رکھ دی تاکہ تقویٰ حاصل ہونا آسان ہوجائے۔ فالحمد للہ۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۸۷۔ ۱۸۸)

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کردیا گیا کیوں کہ وہ تمھارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو۔ خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت (کرکے گناہ میں اپنے کو مبتلا) کر رہے تھے (مگر) خیر اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا۔ سو اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانونِ اجازت) تمھارے لیے تجویز کردیا ہے (بلاتکلف) اس کا سامان کرو اور کھاؤ اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (یعنی نور) صبح (صادق) کی تمیز ہو جاوے سیاہ خط سے، پھر (صبحِ صادق سے) رات تک روزے کو پورا کیا کرو اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں، یہ خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں اس امید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمے) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعے سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم (بھی) ہو۔

حضرت سیّدی و مولائی ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وظیفہ پڑھ لیا، تہجد کی نماز پڑھ لی، تلاوت کرلی، ان سب سے انرجی حاصل ہوگئی۔ اس انرجی کو صرف کہاں کرو گے؟ انھی عالمِ تعلقات میں۔ الحمد للہ ان آیاتِ کریمہ سے بھی اشارتاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلوص کے ساتھ عبادات سے جو تقویٰ پیدا ہوتا ہے، اس کا لازمی اثر معاملات اور اخلاق پر پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے حدود (اور روزہ کے حدود)

کی نگہداشت کرنے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے لوگوں کے اموال ناحق نہ کھاؤ اور حاکموں کو رشوت نہ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو سمجھ لو کہ تمھیں روزے سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛ وَ اَحۡسِنُوۡا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۹۵)

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور (اپنے آپ کو) اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو، اور کام اچھی طرح کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہنا دنیوی لحاظ سے بھی بہت ضروری ہے اور اُخروی لحاظ سے بھی۔ اگر متمول لوگ ناداروں پر خرچ نہیں کریں گے تو معاشرے کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ معاشرے میں جو ایک توازن رہنا چاہیے وہ ختم ہوجائے گا۔ غریبوں کے دلوں میں امیروں سے نفرت اور حسد کے جذبات ابھرنے لگیں گے اور بالآخر معاشرہ تباہ و برباد ہوجائے گا۔ انفاق روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ایک تفسیر تو بڑے بڑے انقلابات کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ روسی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب کی تہہ میں معاشی عدم تعاون (economic inequalities) کام کر رہے تھے۔ جو خرچ کر سکتے تھے انھوں نے ہاتھ روک لیا۔ بڑے لوگوں کو فکر نہیں رہی یہ دیکھنے کی کہ غریب کس حال میں ہیں۔ اگر کوئی خرچ بھی کرتا تھا تو اپنے عیش و عشرت کے لیے یا زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے یا اپنا اثر رسوخ قائم رکھنے کے لیے۔ انسانی ہمدردی میں خرچ کرنا تقریباً مفقود ہوگیا تھا۔ اس ہلاکت کا واضح پتا تو بہت بعد میں چلتا ہے لیکن اس کے آثار جلد ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر انسانی اخوت اور ہمدردی ختم ہوجائے اور لوگ دولت اور سامان جائز و ناجائز طریقے سے جمع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوجائیں تو اس

کا نتیجہ قوم کی بے راہ روی میں آپس کے تشدد میں اور دلوں کا سکون لٹ جانے کی شکل میں جلد ہی نظر آنے لگتا ہے۔ آج بھی جب امریکا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جا رہا ہے۔ اگر وہاں لوگوں سے پوچھیے جن کے اندر کچھ بھی انسانی حس باقی ہے تو وہ یہی کہیں گے کہ ہم سب تباہ ہو رہے ہیں۔ پاکستان اور اس جیسے دوسرے ممالک کی معاشی تباہی کی بھی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انفاق فی سبیل اللّٰہ کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے۔ لیکن مسلمان کا انفاق فی سبیل اللّٰہ اس خوف سے نہیں ہوتا کہ اس سے آنے والا انقلاب رک جائے گا، یا ہمارا نادار طبقہ (have nots) مطمئن رہے گا، بلکہ وہ صرف اللّٰہ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑا محرک (incentive) یہ ہے جس کی بڑائی کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ اللّٰہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ سبحان اللّٰہ، کہاں خالقِ کائنات اور کہاں ایک انتہائی لا شے (insignificant) مخلوق اور اس سے اللّٰہ تعالیٰ کی محبت کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔ سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍO وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِO (سورۃ البقرہ، آیت ۲۰۰۔ ۲۰۱)

سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیجیے اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکارِ آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا۔ اور بعض آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا میں بھی بھلائی مل گئی اور آخرت میں بھی بھلائی مل گئی کہ جنت میں داخل ہوگئے لیکن دوزخ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد (جو گنہگار مومنوں کے ساتھ ہوگا)۔ اس سے بچنے کی دعا بھی ہے کہ

دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے، یعنی تھوڑے دنوں کے لیے بھی دوزخ میں نہ جانے دیجیے، ایک لمحے کے لیے نہ جانے دیجیے۔

جس دعا کی تحسین کی گئی ہے اِس سے یہ مفہوم نہیں ہے کہ دنیا اور دین دونوں مقصود ہیں اور نہ حسنہ سے وہ مراد ہے جیسے عام طور سے اچھی چیز سمجھا جاتا ہے (گرچہ ان کی اچھائی کی بھی نفی نہیں ہے) مراد اور مقصود یہاں حسنہ سے وہ تمام حالتیں ہیں جو سیئہ کا برعکس ہیں جیسا کہ فرمایا ان الحسنٰت یذھبن السئیات۔ یا جیسا حدیث شریف میں ہے الحسند یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب (او کمال قال علیہ السلام) اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آیت نمبر ۲۰۰ میں جو آخرت پر یقین نہ رکھنے والوں کی دعا مذکور ہے اس میں حسنہ کا لفظ سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ صرف ربنا اتنا فی الدنیا ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ جب یہاں پر دنیا اور آخرت دونوں کی خوش حالی مقصود نہیں ہے اور حسنہ کے وہ معانی ہیں جو سیئہ کا برعکس ہیں تو پھر دنیا کے ذکر ہی کی کیا ضرورت تھی (نعوذ باللّٰہ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور تقدیم و تاخیر ذکر میں فطری ہے، natural sequence ہے۔ جیسے کسی نے دعا کی کہ یااللّٰہ تعالیٰ اچھی طرح نماز پڑھوا دیجیے اور قبول فرما لیجیے تو اصل مقصود تو یہی ہے کہ نماز قبول ہوجائے، چاہے کیسی ہی الٹ پلٹ کرکے بے دلی سے کیوں نہ پڑھی جائے لیکن حسنِ طلب یہ ہے کہ نماز پڑھی بھی جائے اچھی طرح اور قبول بھی ہوجائے تو پہلی شق فی الدنیا حسنہ میں سے ہے کیوں کہ اس کا اثر دنیا ہی میں معلوم ہوجاتا ہے اور قلب کو خشوع و اطمینان حاصل ہوتا ہے جو دنیا میں ہی محسوس ہوجاتا ہے اور دوسری شق فی الآخرۃ حسنہ ہے کیوں کہ یہ آخرت ہی میں معلوم ہوگا کہ نماز قبول بھی ہوئی یا نہیں۔ (گرچہ ظنی طور پر بزرگوں نے لکھا ہے کہ ایک وقت کی نماز قبول ہوجانے کی نشانی یہ ہے کہ دوسرے وقت کی نماز پڑھنے کی توفیق ہوگئی لیکن کس درجے کی نماز ہے اور کس درجے کی قبولیت ہے، اس کا پتا تو آخرت ہی میں چلے گا جہاں اعمال کا حقیقی وزن معلوم ہوجائے گا)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، واقعی وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

قال ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ وعن والدہ ''خطوات الشیطان'' تزئین الشیطان فی تحریم السبت ولحم الجمل وغیرہ ذلک و فی آیۃ ۲۰۹...''عزیز''، بالنقمۃ لمن لا الایتابع رسولہ ''حکیم'' فی نسخ شرائع الاول نزلت فی عبداللّٰہ بن سلام واصحابہ لکراھیتھم السبت ولحم الجمل وغیرہ ذلک۔

اردو میں ایک مشہور کہاوت ہے ''ماں سے جو زیادہ چاہے سو ڈائن'' یعنی جو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے یا نقلی چاہت یا خاطر مدارات سے تم پر یہ ثابت کرنا چاہے کہ وہ تمھارے حقیقی اور فطری چاہنے والوں سے زیادہ تمھارا خیرخواہ ہے اس کے مشورے میں ضرور کوئی کید ہے۔ اسی طرح رسول (ﷺ) سے زیادہ پاک رہنے کی یا زاہد عن الدنیا رہنے کی یا عبادت گزار رہنے کا تصور محض شیطان کی پیروی ہے۔ اسی طرح جسے رسول ﷺ نے جائز فرما دیا اور مکروہ نہیں فرمایا، مثلاً نکاحِ بیوگان اس سے دل میں کراہیت کا پایا جانا ہمزات الشیاطین میں سے ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۲)

دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) وہ ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں حالانکہ یہ مسلمان جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجے میں ہوں گے قیامت کے روز، اور روزی تو اللّٰہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ دے دیتے ہیں۔

کفار کا دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرنا ایک قدیم ترین رواج ہے جو ہمارے حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں بھی قائم تھا اور آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کے ذکر میں اس طرح کی بات کا ذکر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ الا یہ کہ خالص اسلامی حکومت میں یا اسلامی معاشرے کے غالب ہونے کی صورت میں یہ بات مفقود ہو جائے۔ اور یہ تمسخر اس لیے ہے کہ صرف حیاتِ دنیا ایسے لوگوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ دنیاوی زندگی ان کے لیے مزین کردی گئی ہے یعنی عیش و عشرت کی زندگی ان کے لیے مرغوب کردی گئی ہے۔ اس کی ظاہری خوب صورتی ان کو نظر آتی ہے اور اس کی خرابیاں ان کی آنکھ سے اوجھل ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے اور ان کی نظر مآل پر بھی جاتی تو وہ اس کی حقیقت سمجھتے:

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اس کے علاوہ یہ بات بھی منکرینِ دین کی نظر سے اوجھل رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں بے حساب رزق دیتے ہیں۔ دنیا میں تو کفار و مومنین دونوں اس عموم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ حکومت و ثروت اپنی مصلحت سے عطا فرماتے رہتے ہیں خواہ سلیمان علیہ السلام جیسا فرماں بردار اور شکر گزار بندہ ہو خواہ فرعون و ہامان جیسے سرکش بندے۔ اور آخرت میں صرف مومنوں کے لیے بے حساب رزق ہے۔ اس میں مومنوں کے لیے بھی تسلی ہے کہ اس تمسخر سے نہ گھبرائیں، جس کے پاس جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ جب ان کے نزدیک مناسب ہوگا، فراخیِ رزق اور غلبہ عطا فرمائیں گے۔ فاجملوا بالطلب وتوکلوا علی اللّٰہ۔ نیز یہ کہ یہ تمسخر ہمیشہ سے رہا ہے چونکہ کفار کا مطمعِ نظر صرف دنیا ہے، اس لیے جب ان کی دنیاوی حالت اچھی ہوتی ہے تو وہ مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ O

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۴)

کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہو گے حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب رہے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانے کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے، بول اٹھے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی، یاد رکھو بے شک اللّٰہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک ہے۔

یہ بات تو ناممکن اور غیر فطری ہے کہ زلزلہ آئے اور مکان نہ ہلے۔ مکان مضبوط سے مضبوط ہو، زور کا زلزلہ آئے گا تو ہلے گا ضرور۔ ہاں اگر مضبوط مکان ہوگا تو ہلنے کے باوجود نہیں گرے گا خواہ کتنے ہی زور کا جھٹکا ہو اور جتنا مضبوط مکان ہوگا اتنے ہی زور کے زلزلے کو باوجود ہلنے کے برداشت کرے گا، بنیاد قائم رہے گی۔ اگر جڑ سے کوئی مکان جنبش کر جائے تو گر جائے گا۔ اسی طرح کا حال ایمان کا ہے کہ خدا محفوظ رکھے شدائد میں ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔ مگر اس کے باوجود برداشت کرلیتا ہے اور قائم رہتا ہے اور شدت گزر جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہیں پر ہے جہاں پر تھا۔ جڑ سے اکھڑ کے دور نہیں جا گرتا۔ جس طرح بعض درختوں کا اور کمزور مکانوں کا حال زلزلے میں ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری کمزوری ہے وخلق الانسان ضعیفا۔ یہ فطری کمزوری کچھ نقصان دہ نہیں ہے، جب ایمان سلامت ہو۔ مومنوں کو ایسے شدائد کے لیے تیار رہنا چاہیے جیسے شدائد اگلے زمانے کے لوگوں پر آچکے ہیں۔ گرچہ اللّٰہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایسے شائد سے محفوظ رکھے اور ربنا ولاتحمل علینا... الذین من قبلنا میں ایسے شدائد سے محفوظ رہنے کی دعا بھی سکھائی گئی ہے۔ اور یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ایسے زبردست شدائد سے تمھیں ضرور واسطہ پڑے گا کیوں کہ جو دور اللّٰہ تعالیٰ کی مصلحت تکوینی کے مطابق اہلِ

ایمان کے غلبے کا دور ہوگا اس میں مومنوں پر من حیث القوم ایسے شدائد نہیں آئیں گے۔ البتہ چھوٹی بڑی آزمائشوں سے سب کو واسطہ پڑے گا جیسا کہ آیت نمبر ۱۰۰، سورۃ البقرہ میں ہے۔ ولنبلونکم بشئی من الخوف... الصابرین میں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحیٔ رحمۃ اللّٰہ علیہ نے فرمایا (بروزِ اتوار ۹ر فروری ۱۹۷۵ء) کہ جو چیز بھی طبیعت کو ناگوار ہو، وہ مصیبت ہے اور ہر مصیبت پر اناللّٰہ ... پڑھنے پر اجر کا وعدہ ہے۔ اب وہ مصیبت کتنے ہی ادنیٰ درجے کی ہو، مثلاً بس کا ایک گھنٹا دیر سے آنا۔ میرے پوچھنے پر تصریح فرمائی کہ اگر عادتاً بھی پڑھ لیا جائے، جب بھی اجر کا وعدہ ہے۔ فالحمدللّٰہ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۸)

حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں گے اور (تم پر) رحمت کریں گے۔

اس سے پہلے ایمان اور کفر کی تفصیل تھی جس میں اہلِ ایمان کو ان کے گھروں سے نکالنا اور فتنہ پردازی کرنا کافروں کے شیوے کے طور پر مذکور تھا۔ اب ایمان والوں کا ذکر ہے جس کی ترتیب ایمان، ہجرت اور جہاد ہے۔ اور اس سے اگلی تین آیات میں احکامات ہیں جو سب جہاد ہی کے فرع ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے المجاہد من جاہد نفسہ، خمر اور میسر کا چھوڑنا، یتیموں کی خیرخواہی اور مشرکات اور مشرکین سے نکاح نہ کرنا، یہ سب جہاد میں شامل ہیں۔

پہلے ذرا غور تو کیجیے کن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کا جو اس وقت ایمان لائے جس وقت ایمان لانا بہتوں کے لیے ہاتھ پر انگارہ رکھنے سے زیادہ سخت تھا

اور بہنوں کے لیے تمام رشتے داری اور ہر طرح کی دوستی سے دست بردار ہوجانے کا نام تھا۔ جنھوں نے اتنی سختیاں سہیں اور ایسے ایسے امتحانوں سے گزرے کہ ان کو فرشتوں سے افضل کہنا بجا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کے سامنے ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے یعنی امید دلائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان پر رحمت نازل فرمائے گا۔ اب کون ہے جو اپنے کو پارسا سمجھ سکے؟ پھر بھی بہت سے ''نیکوکار'' لوگ ایسے ہیں جن کو اپنے گناہ نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر محبت ہی کسی سے نہ ہو تو اس کی خوشی اور ناراضگی کا کیا اندازہ ہو۔ اور جس کو جتنی محبت ہوگی اس کو اتنی ہی تمیز ہوگی یہ پہچاننے کی کہ اس کام میں محبوب کی ناراضگی ہوگی یا اس کام میں ناراضگی کا امکان ہے۔ لہٰذا جو جتنا محبوبِ حقیقی سے قریب ہوگا اتنا ہی استغفار کرتا رہے گا اور اپنے کیے پر نادم ہوتا رہے گا۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۹)

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ ان دونوں (کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں۔ آپ فرما دیجیے کہ جتنا آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں سوچ لیا کرو۔

ایک اصول کی طرف یہاں اشارہ ملتا ہے کہ اگر کسی بات میں نفع بھی ہو اور نقصان بھی تو دیکھنا ہوگا کہ نفع زیادہ ہے یا نقصان۔ اگر نقصان زیادہ ہے نفع سے تو اس کو ترک کردینا ضرور ہے اور یہی عقل کی بات ہے۔ البتہ جن لوگوں نے اللّٰہ تعالیٰ کو فراموش کردیا ہے اور نتیجتاً اللّٰہ تعالیٰ نے بھی ان کو اپنا حقیقی نفع نقصان سمجھنے سے معذور کردیا (فانسٰھم انفسھم) ان کو پتا نہیں چلتا کہ اس کام میں ان کا فائدہ ہے یا نقصان مآل کے اعتبار سے اگر سامنے مٹھائی رکھی ہوئی ہو تو انسان کی خواہش اس کے کھانے کی ضرور ہوگی لیکن اگر معلوم ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو انسان اس سے ضرور بچے گا۔

دوسری بات یہاں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب اور جوئے میں فائدہ کم ہے اور نقصان زیادہ بلکہ فرمایا کہ ان دونوں میں بڑے گناہ ہیں اور لوگوں کے لیے ان میں فائدے بھی ہیں اور ان کے گناہ ان کے فائدوں سے زیادہ ہیں۔ جب ایک طرف خدا کی ناراضگی ہو تو دوسری طرف خواہ کتنا ہی زیادہ دنیوی فائدہ ہو، گناہ کا پلّہ بھاری ہی ہوگا۔ شراب اور جوئے میں جو منافع ہیں اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اسی طرح سود میں بھی بعض اجتماعی فائدے کے لیے مثلاً سوشل سیکورٹی انشورنس وغیرہ کے لیے لابدی سمجھا جاتا ہے لیکن قطعِ نظر ان نقصانات کے جو اب لوگوں پر واضح ہو رہے ہیں صرف یہی بات کہ ان میں گناہ ہے، ان کو چھوڑ دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے کیوں کہ گناہ کی سنگینی منفعتِ عاجلہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا کبھی بحث میں ان دو برائیوں کی relative خرابیوں اور خوبیوں پر نفع نقصان پر بات نہیں کرنی چاہیے ورنہ ہوسکتا ہے کہ کہیں پر جواب نہ بن پڑے، مثلاً بیمے کے فائدے اور نقصانات، بات حکم پر ختم ہے، بلکہ چاہنے والے تو صرف اشاروں کے منتظر رہتے ہیں کہ اشارہ ہو تو آگ میں کود پڑیں اور اشارہ نہ ہو تو آگ سے نکلنے کی کبھی کوشش نہ کریں خواہ جبریلِ امین علیہ السلام ہی مدد کو کیوں نہ آئیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۱)

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجے) بہتر ہے کافر عورت سے گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجاویں اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے، گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو (کیوں کہ) یہ لوگ دوزخ (میں جان) کی تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تا کہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں۔

خوب صورتی، حسن و جمال، لذتِ گفتار، اعلیٰ نسبی، عرفی خوش خلقی یہ سب چیزیں انسان کے دل موہ لینے کو کافی ہوتی ہیں بلکہ ان میں سے صرف بعض چیزیں بھی جس عورت میں پائی جائیں اس پر انسان فریفتہ ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی معمولی عورت جو کسی کی لونڈی ہو اسے کون پوچھتا ہے لیکن انسان ایک بنیادی بات بھول جاتا ہے کہ اچھائیوں اور خوبیوں میں اور برائیوں اور گندگیوں میں تفریق کرنے والی چیز ایمان اور صرف ایمان ہے۔ اوّل الذکر عورت میں اگر ایمان نہیں ہے تو ثانی الذکر عورت اگر وہ ایمان سے بہرہ ور ہے تو اس سے یقیناً بہتر ہے اور فوقیت رکھتی ہے، clearly better & superior ہے۔ یہی معاملہ لڑکیوں کی شادی کا بھی ہے کہ بہترین لڑکا ہو اگر ایمان سے خالی ہے تو بے کار ہے اور ایک حبشی غلام جو مومن ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ بغیر ایمان کے تمام خوبیاں ایسی ہیں جیسے کہ کہا جائے کہ اس بریانی میں چاول

بہترین باسمتی ہے، مرغ ہے، گھی اصلی ہے لیکن تھوڑا سا زہر ملا ہوا ہے جو کھانے کے بعد آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھلائے گا تو کون عقل مند ہوگا جو وہ کھائے گا۔

پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا یہ عقلی معیار ہے یعنی اگر مآل ناپسندیدہ ہے (اولئک یدعون الی النار) تو وہ چیز خواہ دوسرے تمام لحاظ سے اور طبعی پسندیدگی کے لحاظ سے کتنی ہی اچھی ہو ناپسندیدہ ہی رہے گی۔ رفتہ رفتہ یہ عقلی معیار ہی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اسی طرح ایمان میں ایقان پیدا ہوتا ہے۔

یہاں سے اشارہ ملتا ہے کہ مشرکوں سے دوستی اور بے تکلفی جائز نہیں ہے، گرچہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک جائز ہے۔ اسی طرح ان کے ساتھ ملنا جلنا بھی مطلقاً ممنوع نہیں ہے جس طرح کافرہ لونڈی رکھنا جائز ہے کیوں کہ اس سے وہ برتاؤ نہیں ہوتا جو بیوی سے ہوتا ہے۔ یہ بھی اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً بری صحبت بھی ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح برے آدمیوں کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھنی بھی ناپسندیدہ بات ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۳۶)

تم پر (مہر کا) کچھ مؤاخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے، اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہے اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ، صاحبِ وسعت کے ذمے اس کی حیثیت کے موافق ہے اور تنگ دست کے ذمے اس کی حیثیت کے موافق ہے، فائدہ پہنچانا قاعدے کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔

محسنین کا ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''خوش معاملہ لوگوں'' سے کیا ہے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ خوش معاملگی یا لوگوں کے ساتھ احسان کرنے میں اور

درجۂ احسان (ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ) میں کوئی ربط ضرور ہے خصوصاً اگر ہم عبادت کے وسیع معنی مراد لیں۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۳۷)

اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لیے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو، اُس کا نصف (واجب ہے) مگر یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کردیں یا یہ کہ وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے اور تمھارا معاف کردینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو۔ بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ تمھارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ فضیلت کا معیار ایثار ہے یعنی اپنا حق دوسرے کو دے دینا، اسی پر قیاس (analogy) کرکے حسد نہ کرنا یعنی جس کو اللّٰہ تعالیٰ نے مجھ سے زیادہ دے دیا ہے اس کے بارے میں نہ سوچنا کہ فلاں کو مجھ سے زیادہ کیوں مل گیا۔ یہ بات بھی فضیلت کی ہے۔ اسی طرح غیبت نہ کرنا بھی ہے کیوں کہ غیبت کا منشا کسی شخص کی برائی کسی اور کے سامنے لانا ہے تاکہ لوگ تمھیں اچھا سمجھیں اور اس شخص کو تمھارے مقابلے میں برا سمجھیں تو یہ بات تو ایثار کے بالکل برعکس ہوئی۔

آیتِ کریمہ کا آخری ٹکڑا خشوع فی الصلوٰۃ میں بھی ممد ہے کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ ہمارے اعمالِ قلبی کو بھی دیکھ رہے ہیں لہٰذا نماز میں بااختیار خود ہم اگر ایسے خیالات میں مشغول رہیں گے جو خشوع فی الصلوٰۃ کے خلاف ہوں یا بلااختیار اس طرح کا کوئی خیال

آجانے کے بعد اس کو باقی رکھیں گے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ دیکھیں گے اور یہ بھی "بما تعملون" کے زمرے میں آنے کی وجہ سے قابلِ مواخذہ ہے۔ فاعوذ باللّٰہ۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۴۳)

(اے مخاطب) تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لیے۔ سو اللّٰہ تعالیٰ نے ان کے لیے (حکم) فرما دیا کہ مرجاؤ، پھر ان کو جلا دیا۔ بے شک اللّٰہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے (اس قصے میں غور کرو)۔

ان کو موت دینے کے بعد پھر زندہ کردیا یعنی ان پر ثابت کردیا کہ زندگی اور موت صرف اللّٰہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے خوف و ہراس سے بدحواس نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ بات کہ اللّٰہ تعالیٰ نے موت اور حیات کو صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اس کا بہت بڑا فضل ہے لوگوں پر، جس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اور پھر اس بات کا ان کو علم عین الیقین کی حد تک ہوجانا مزید اللّٰہ تعالیٰ کا فضل تھا ان پر اور بعد کے لوگوں پر بھی کہ ان کو اس واقعے کا علم ہوکر انؒ کے عقیدۂ توحید میں مزید پختگی آ گئی۔ فالحمدللہ، لہٰذا کتاب اللّٰہ میں اس واقعے کا ذکر بھی اللّٰہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اور شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ قتال فی سبیل اللّٰہ ہے اور دوسرا طریقہ انفاق فی سبیل اللّٰہ ہے جس میں قرضِ حسنہ بھی شامل ہے۔ ان دونوں باتوں کا حکم آگے کی آیتوں میں ہے۔

وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَكُمۡ طَالُوۡتَ مَلِكًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡكُ عَلَيۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡكِ مِنۡهُ وَلَمۡ يُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰهُ عَلَيۡكُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۴۷)

اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اوّل تو) اللہ تعالیٰ نے تمھارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے اور (دوسرے) علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں جاننے والے ہیں۔

جس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک چنیدہ بندے کو ان کا بادشاہ بنا دیا اسی وقت ان کی فتح یقینی ہوگئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہت کے لیے جسمانی قوت اور علم و فہم دونوں ضروری ہیں۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡۤ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۴۹)

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر (بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو

انھوں نے کہا کہ حق تعالیٰ تمھارا امتحان کریں گے ایک نہر سے۔ سو جو شخص (افراط کے ساتھ) اس سے پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے ساتھیوں میں ہے۔ لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے (تو اتنی اجازت ہے) سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع کر دیا مگر تھوڑے آدمیوں نے ان میں سے، سب ب طالوت اور جو مومنین ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے۔ کہنے لگے آج تو ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات انفرادی سطح پر بھی ہوتی ہے خواہ یہ فرق چھوٹے اور بڑے میں جسمانی ہو خواہ کسی اور طرح کا ہو، مثلاً مچھر جیسی مخلوق جسے ہم بہت ادنیٰ سمجھتے ہیں اس سے نمرود جیسا طاقتور اور جاہ و جلال والا شخص عاجز ہوگیا۔ اسی طرح آدمی کا نفس خواہ کتنا سرکش ہو اور اس کی طبیعت خواہ کتنی ہی کمزور ہو اسے اپنے اور نفس کے مقابلے میں ہرگز ہزیمت کا یقین نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کو یاد کرنا چاہیے جن میں سے ایک کا ذکر اس رکوع میں ہے۔ اسے قوی امید رکھنا چاہیے کہ ان شاء اللہ وہ نفس پر ضرور غالب آئے گا۔

معلوم ہوا کہ کمزور ایمان والے بھی مومنین میں داخل ہیں اور مومنین کا لفظ عام مسلمانوں کی جماعت پر بھی بولا جاتا ہے خواہ ان کا ایمان کتنا ہی کمزور ہو کیوں کہ یہاں والذین امنوا کے بعد ان ہی مومنوں کا قول ہے لاطاقت لنا بجالوت وجنودہ، اس کے آگے جن کا قول ہے وہ پختہ ایمان والے ہیں۔ جب قوم کے لوگ اللہ پر بھروسا کر کے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے لگے تو اس وقت ان کی فتح یقینی ہوگئی اور جب کسی قوم کی قسمت میں شکست لکھی ہوئی ہوتی ہے تو وہ لڑائی سے بھاگنے لگتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O (سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۶)

دین میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں (کیوں کہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے سو جو شخص شیطان سے بداعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو (یعنی اسلام قبول کرلے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں (ہوسکتی) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں۔

کسی نظام (یعنی discipline) میں داخل ہونے پر پابندی یا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔ جس کا جی چاہے آئے جس کا جی چاہے انکار کرے۔ فمن شاء فلیومن... الخ... لیکن discipline میں آجانے کے بعد اس کے قواعد و ضوابط سے انحراف کی آزادی نہیں دی جاسکتی۔ اور نہ ہی اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ اس کے شرائط (norms) اور قواعد (rules) کو کوئی پسِ پشت ڈال دے float) کرے)۔ اس طرح تو انارکی ہوجائے گی اور کسی تنظیم (discipline) میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ خواہ یہ پولیس فورس ہو، خواہ کوئی اجتماعی تنظیم ہو۔ دراصل دین میں ایمان لانے پر جبر اس معنی کو نہیں ہے کہ اس کے اصول وضوابط وفروع سب ایسے ہیں کہ مومن پر ان کی پیروی کرنا کچھ بھی جبر نہیں رہتا اور دل و جان سے احکامِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے جیسا کہ نماز کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ... انھا لکبیرۃ الاعلی الخاشعین۔ لیکن اس کیفیتِ قبول کے لیے قلبِ سلیم درکار ہے۔ اس لیے آخرت میں تمام سوال و جواب اور عذاب وثواب کا مختصر معیار یہ ہے کہ سب پریشانی و مصیبت میں ہوں گے الا من اتی اللّٰہ بقلب سلیم۔ لہٰذا قلب کی حفاظت کی اشد ضرورت ہے۔ اگر قلبِ سلیم ہے تو تمام احکامِ شریعت آسان ہیں اگر قلب میں کجی آگئی تو ہر حکم بھاری ہے۔ یہ تو تفصیلی معیار ہے یہ دیکھنے کا کہ قلبِ سلیم ہے یا نہیں۔ اور مختصر معیار یہ ہے کہ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب۔ اس سے ذکر اللہ کی خاصیت بھی معلوم ہوتی ہے اور قلب کی حالت بھی معلوم

ہوتی ہے۔ ذکر اللہ وہ چیز ہے جس سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے لیکن وہ قلب نہیں جو سیاہ ہو چکا ہو (جس کی فطرت مسخ نہیں ہوئی ہو اس کے لیے اسلام دینِ فطرت ہے) تو قلب وہی قلب کہلانے کا مستحق ہے جسے ذکرِ خداوندی سے اُنس اور لگاؤ ایسا ہو کہ ذکر اللہ سے اسے اطمینان ہوجائے اور یہ بات مشاہدے سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی فمن یکفر ... سے ثابت ہوتی ہے کہ ایمان باللّٰہ کے لیے کذ بالطاغوت ضروری ہے اور جو کفر اور طاغوت سے راضی ہوگیا اس کا ایمان جاتا رہا۔ فاعوذ باللّٰہ۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۵ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۷)

اللہ تعالیٰ ساتھی ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (یا بچا کر) نورِ (اسلام) کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں (اِنسی یا جنی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر (یا بچا کر کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ دُوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے دوست ہیں اس لیے ہم بھی ان کے دوست ہیں۔ ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی محبت اس بنا پر فطری امر ہے اور اس دوستی اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی انھیں ظلمت سے نور کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اگر کسی مسلمان کو گندگیوں میں آلودہ دیکھیں یا اس میں کوئی بھی برائی دیکھیں تو ہماری خواہش اور ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کس طرح اس کو ان گندگیوں سے باہر لایا جائے اور اس کی برائی دور کی جائے۔ اسی معنی کو المومن (یا المسلم) مرآۃ المؤمن (یاالمسلم) فرمایا گیا ہے اور ہماری ادنیٰ کوشش کم از کم یہ تو ہوسکتی ہے کہ ہم اس کے لیے

دعائے خیر کریں اور اس کی تشہیر نہ کرتے پھریں اور اس کی گناہوں میں آلودگی سے ہمیں دلی تکلیف ہو اور ہم اس کی آلودگی یا تکلیف سے ایسے ہی بے چین ہوں جیسے کسی دوست کی آلودگی اور تکلیف سے بے چین ہوتے ہیں۔ مومنوں کے لیے استغفار بھی اسی محبت کی وجہ سے ہے۔

گناہوں سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا ایک بہت اچھا مراقبہ یہ ہے کہ آدمی اس بات کا اکثر استحضار کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی باتوں میں ملوث نہیں دیکھنا چاہتے جو ہمارے لیے دنیا یا آخرت میں تکلیف دہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر بڑے ہی رحیم ہیں۔ فالحمدللہ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ○ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۷-۲۶۹)

اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کیا کرو، عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں، تعریف کے لائق ہیں۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے، اپنی طرف سے گناہ معاف کردینے کا اور زیادہ دینے کا اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں، خوب جاننے والے ہیں، دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جس کو دین کا فہم مل

جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو
عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)۔

گھر میں کوئی چیز رکھی ہوئی ہے جس کے خراب ہونے کا شبہ ہے، وہ نوکر یا کسی اور کو دے دیا جائے تو یہ ''تغمضوا منہ'' میں داخل ہوجائے گا۔

شیطان فقر کا وعدہ کرتا ہے کہ انفاق کرو گے تو فقیر ہوجاؤ گے لیکن ساتھ ہی ساتھ فحشا کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ اس وقت انسان کو ذرّہ برابر بھی خیال نہیں آتا کہ فحش کاموں میں کتنا روپیہ اور وقت برباد ہو رہا ہے۔ نیک کام میں خرچ کرنے کے وقت روپیہ برباد ہونے کا خیال آتا ہے۔ انسان ذرا سا بھی ہشیار ہو تو فوراً سمجھ جائے کہ جو ''دوست'' خدا کی راہ میں اچھی چیز خرچ کرنے کے وقت کہتا ہے کہ ''فقیر ہوجاؤ گے'' اور نفسِ امارہ کی طبعی یا غیرطبعی (natural or perverse) خواہشات کو ہر جائز ناجائز طریقے سے پورا کرنے کا مشورہ دیتا ہے، وہ کیسا دوست ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: (۱) مغفرت کا (جو فحشا کی ضد اس کے اثرات کی ضد ہے) اور (۲) فضل کا (جو فقر کی ضد ہے) اور یہ دونوں وعدے محض حکمت عطا کرنے سے پورے ہوجاتے ہیں۔ ظاہری حکمت یا عقل مندی تمام ظاہری بھلائیوں کا سبب ہوجاتی ہے الا ماشاء اللہ اور باطنی حکمت تمام باطنی بھلائیوں کا سبب ہوجاتی ہے اور خشیۃ اللہ اور استغفار حکمت عطا ہونے کا ابتدائی اثر بھی ہے اور انتہائی اثر بھی اور یہ محض ایک فضل ہے۔ جو وہبی ہے کسبی نہیں۔ فضل ہر طرح کا خدا ہی کے ہاتھ میں ہے گرچہ فضل ڈھونڈنے کا حکم بھی ہے (وابتغوا من فضلہ) اور انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ اس فضل کا وعدہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ
قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ

اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۸)

(اے مخاطب) تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے، کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روز کے روز) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال دے۔ اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

جس طرح ''کفر'' اور ''تکبر'' بعض مواقع پر ایک دوسرے کے مرادف الفاظ بن جاتے ہیں (جیسا سورۂ زمر میں استعمال کیے گئے ہیں) اسی طرح ''ظلم'' اور ''کفر'' بھی بعض حالات میں ہم مرادف الفاظ ہیں۔ جیسا کہ فرمایا یا ہے ان شرک لظلم عظیم۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ○ ب (سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۳)

(ناداری کے وقت) مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا (ہزار درجے) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جاوے اور اللہ تعالیٰ غنی ہیں، حلیم ہیں۔

یہ تعظیم انسانیت (human dignity) کی اعلیٰ ترین سیڑھی ہے۔ لوگ مغربی ممالک میں dignity of labour (مزدور کی عزتِ نفس) کی بات کرتے ہیں، یہاں

معاشرے کے نچلے ترین طبقے کے لوگوں کے ساتھ یعنی بھکاریوں اور ناداروں کے ساتھ بھی احترام کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ان کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھنا یا جھڑکنا ناجائز ہے۔ اور نہ اپنے کو اس سے بڑا سمجھنے کی اجازت ہے کیوں کہ وہ جو کچھ اس (نادار) کو دے رہا ہے درحقیقت اللہ کو دے رہا ہے کیوں کہ وہ اس کی مخلوق ہے اور اپنے فائدے کے لیے دے رہا ہے اور اللہ غنی ہے۔ وہ اگر چاہے تو کسی اور کے ذریعے سے اس کو رزق پہنچائے یا اگر چاہے تو امیر کی ساری امارت اس غریب کو دے دے۔ اور وہ بڑا حلم والا ہے کہ امیروں کی فوراً اس بات پر گرفت نہیں فرماتا ہے کہ وہ کیوں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو مستحقین پر صرف نہیں کرتے اور اگر کوئی اس کی رضا کے لیے اس کے نادار اور مانگنے والے بندے کو کوئی حقیر سی بھی رقم دیتا ہے تو وہ اسے قبول فرماتا ہے، فالحمدللہ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰىۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَا لَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ‌ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا‌ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۴)

اے ایمان والو! تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یومِ قیامت پر سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی (آگئی) ہو پھر اس پر زور کی بارش پڑ جاوے سو اس کو بالکل صاف کردے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (جنت کا) رستہ نہ بتلاویں گے۔

پکتھال نے صدقات کا ترجمہ almsgiving (خیرات دینے) سے کیا ہے لیکن صدقے کا لفظ بہت سے اعمال کو محیط ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، مثلاً راستے سے پتھر ہٹا دینا۔ جس طرح احسان جتلانا اور تکلیف پہنچانا مالی صدقات کو ضائع کرتا ہے، اسی طرح احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے سے ان باتوں کا ثواب بھی ضائع ہوجاتا ہے جو دوسروں کی نفع رسانی کے لیے لوجہ اللّٰہ کیا جاتا ہو۔ اور مومن سے یہ بات بہت بعید ہے کہ کسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اور پھر احسان جتلائے یا تکلیف پہنچائے۔

یہاں کفر کے عموم میں نعمتوں کی ناشکری اور بخل بھی داخل ہے کیوں کہ بخل بھی بہت بڑی ناشکری ہے۔ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا (جس میں ذہنی اذیت بھی شامل ہے) بخل ہی کے آثار ہیں کہ اگر بدلہ نہ ملے تو کم از کم احسان ہی جتایا جائے۔ ورنہ شکر گزار آدمی سے بخل صادر نہیں ہوسکتا (الا نادراً) جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ انھیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ اللّٰہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اس مال میں سے جو اللّٰہ نے ان کو دیا ہے، خرچ نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ بخل کی اصل وجہ (root cause) اللّٰہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہ لانا ہے اور جو مومن ہوکر احسان جتاتا ہے اور جن کو صدقات دیتا ہے ان کو اذیت پہنچاتا ہے تو وہ بھی کافروں کی طرح ہے اور ہدایت سے دور ہے۔

مولانا شاہ ابرار الحق مدظلہٗ نے ایک دفعہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی نور اللّٰہ مرقدہٗ کی جمعے کی مجلس میں یہ آیت تلاوت فرما کر یہ مضمون بیان فرمایا کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسباب کو جمع کرنا اور اضداد کو چھوڑنا۔ اور جو ان دونوں میں سے کوئی بھی کام یا کوئی ایک کام نہیں کرتا ہے اس کو یا پاگل کہا جاتا یا جھوٹا۔ اسی تقریر کے دوران آپ نے یہ اشعار پڑھے:

یہ کیسا انقلاب ہے دیکھ کے دل کباب ہے
کہتے ہیں کہ ثواب ہے شراب اور قمار میں

☆

جو ناکام ہوتا رہے عمر بھر بھی بہرحال کوشش تو عاشق نہ چھوڑے
یہ رشتہ محبت کا ہرگز نہ ٹوٹے جو سو بار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

اَلَّذِیْنَ یُنفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ O
اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ
الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا م
وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۚ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۙ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ O یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی
الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ O اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ O یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ O
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ
فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ O وَاِنْ كَانَ
ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ ۗ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ O وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ O (سورۃ البقرہ، آیت ۲۷۴-۲۸۱)

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلاتخصیصِ اوقات) پوشیدہ اور آشکار (یعنی بلاتخصیصِ حالات) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا ان کے رب کے پاس اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے اور جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر (یعنی حیران و مدہوش)۔ یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا

کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا اور (باطنی) معاملہ اس کا خدا کے حوالے رہا اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جاویں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو، بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لیے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تم پر جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمھارے اصل اموال مل جاویں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔ اور اگر تنگ دست ہو تو مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک اور یہ (بات) کہ معاف ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے تمھارے لیے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

اس رکوع کی تمام آیتوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ''رِبا'' ہر طرح کے سود کو شامل ہے۔ اسے ''انفاق'' کے برعکس لایا گیا ہے گرچہ یہاں انفاق فی سبیل اللہ ہی کا ذکر ہے مگر انفاق خواہ اپنی ضروریات کے لیے ہو، خواہ دوسرے کے لیے خواہ فی الحال مستفید ہونے کے لیے ہو، خواہ تجارت کے لیے، خواہ صنعت (capital expenditure) ہو سب جائز ہے۔ البتہ یہ جائز نہیں ہے کہ مال خرچ بھی نہ کیا جائے یعنی محفوظ بھی رہے اور پھر اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اگر تم اس کو فی الحال

نہیں خرچ کرنا چاہتے تو اپنے کسی بھائی کو دے دو خواہ اللّٰہ کی راہ میں، خواہ قرض کے طور پر۔ وہ اسے خواہ فوراً خرچ کر دے، خواہ تجارت میں لگائے لیکن جب بھی واپس لو گے اصل مال واپس لو گے اور اگر وہ واقعی مجبور ہو اور تنگی میں ہو تو مہلت دینا بھی واجب ہے اور اس پر بھی اصل مال کے علاوہ کچھ لینا جائز نہیں ہے۔

یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ سود وہ ناجائز ہے جو ظلم ہو۔ تو ظلم کیا ہے اور عدل کیا ہے اس کا فیصلہ اللّٰہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اصل سے زیادہ نہ لو ورنہ ظلم ہوگا اور خدا کے حکم کے سامنے کوئی اور فیصلہ نہیں ہوسکتا، بلکہ اگر موجودہ زمانے کے عقلاً بھی غور کریں تو ان پر واضح ہوجائے گا کہ یہ پورا سودی نظام ظلم پر مبنی ہے خواہ بینک میں سود پر روپیہ جمع کروانے (depositor) پر ظلم ہوتا ہے، خواہ بینک سے سود پر قرض لینے والے (borrower) پر ظلم ہوتا ہے۔ عدل اس کو کہتے ہیں کہ کسی پر ظلم نہ ہو، مثلاً اگر روپیہ جمع کروانے والے کو ۱۲ فی صد سود ملے اور قیمتوں میں اضافے کی شرح ۱۶ فی صد ہو تو روپیہ جمع کروانے والا مظلوم ہوگیا اور ہوسکتا ہے کہ قرض لینے والے کو بیس فی صد منافع ہوا ہو تو وہ فائدے میں رہا لیکن بہرحال ایک فریق تو مظلوم ہوگیا تو ایسا نظام ہی کیوں رکھا جائے جس میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی پر ظلم ہوتا رہے۔

ومثلُ الّذِین یُنفقُونَ اَمْوالَھُمُ ابْتِغآءَ مرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتاً مِّنْ انفُسِھِمْ کمثَلِ جنَّةٍ بِربْوَةٍ اَصابھا وابلٌ فاٰتَتْ اُکُلَھا ضِعْفَیْنِ ۚ فانْ لَّمْ یُصِبْھا وابلٌ فطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بما تعْملُوْن بصِیْرٌ ○

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۵)

اور ان لوگوں کے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللّٰہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عملِ شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور

اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

آیت نمبر۲۶۴ میں غیرمومنوں کے خرچ کی مثال تھی... فترک صلدا... کسبوا۔ بارش اس ذرا سی مٹی کو دھو ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ مومنوں کے حق میں بارش کا اثر اس سے اٹھا ہے کہ کئی گنا زیادہ پیداوار ہوتی ہے ورنہ شبنم ہی کافی ہے۔ بعد والی آیت بھی کافروں کی حالت بتاتی ہے اور اس سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہے اور انفاق میں جو pitfalls (غلط راستے پر پڑ جانے کے امکانات) ہیں اور نفس اور شیطان کے جو traps (جال) ہیں ان کو اچھی طرح ظاہر کر دیتی ہے۔ ایود احدکم... الخ، وہ بے چارہ تو سمجھ رہا ہے کہ باغ کام دیتا رہے گا مگر درحقیقت وہ سراب کی مانند ہوتا ہے۔ مومن کے ساتھ یہ ہے کہ چونکہ اس کا انفاق صرف خدا کی رضا کے لیے ہوتا ہے (جس کا اصل اور پورا پورا فیصلہ آخرت میں ہوگا) اور اس لیے کرتا ہے کہ اس کا نفس مطیع ہوجائے اور خدا کی رضا میں ثابت قدم ہوجائے (جس کا پتا ہمیشہ دنیا ہی میں چل جاتا ہے) اس لیے وہ کہیں محروم نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مزید رحمت ہو تو عمل کا کئی گنا اجر ہو بلکہ دنیا میں بھی جو انسان خرچ کرے، اس سے کئی گناہ زیادہ ملنے لگے۔ من حیث لا یحتسب) یہ بارش ہوجانے پر پیداوار کی مثال ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مومنوں کے انفاق کا بدلہ یہ ملا کہ آخرت کے درجات کی تو انتہا نہیں دنیا میں بھی یہ ملا کہ بیس پچیس سال کے اندر کوئی محتاج اور خیرات لینے والا نہیں ملتا تھا۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخلاص میں اور طبعی ناگواری میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات دُہرا ثواب ہوتا ہے کیوں کہ دو باتیں جمع ہوتی ہیں، ایک طلبِ رضائے حق، دوسرے مخالفتِ ہوائے نفس اور دونوں نیتیں باعثِ ثواب ہیں جیسا یہاں صاف ظاہر ہے۔ اور جیسا حضرتؒ کے ترجمے سے ظاہر ہے، ''اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عملِ شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں۔''

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس انفاق فی سبیل اللہ کی وجہ سے اور اس کی برکت سے دوسرے اعمالِ صالحہ پر بھی ثابت قدمی نصیب ہوجائے جیسا مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے فضائلِ صدقات میں کنز سے ایک حدیث شریف نقل کی ہے کہ ''جو شخص اپنے مضطر بھائی کی مدد کرے، حق تعالیٰ شانہٗ اس کو اس دن ثابت قدم رکھے گا جس دن پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔''

اور اس سے یہ لطیفہ اشارتاً اخذ کیا ہے کہ ''فتنوں اور حوادث کے زمانے میں جب لوگوں کے قدم اکھڑ جاتے ہیں، ایسے لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جو لوگوں کی مدد اور اعانت کرتے رہتے ہوں۔'' (جلد اوّل، ص ۱۰۳)

تیسرا نکتہ یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ نفس کو راہِ راست پر رکھنے کی کوشش سے وہ طبعاً بھی راہِ راست پر آجاتا ہے جیسے یہاں انفاق فی سبیل اللہ کی وجہ سے گو وہ تکلیف اور خلافِ طبیعت کیا جائے مگر ہو اخلاص کے ساتھ تو اس سے رفتہ رفتہ طبیعت میں خود سخاوتِ مطلوبہ پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسے عمل کرتے رہنے سے بلاتکلف مداومت ہوتی رہتی ہے، اسی طرح علم میں اضافے سے بھی ہوتی ہے جیسا اس رکوع میں ایود... جنۃ... فاصابھا اعصار...الخ، فرما کر صدقات (لوجہ اللہ) کی ترغیب فرمائی گئی ہے۔ یہی حال دوسرے اخلاق کا ہے کہ رذائلِ نفس کا علاج اس کی مخالفت پر عمل کرنے اور صحیح عمل میں اضافے سے ہوتا ہے، مثلاً جبن (بزدلی) کا علاج بتکلف شجاعت کا کام کرتے رہنے سے ہوتا ہے۔ اور ایک طویل حدیث شریف میں حضرت زبیرؓ سے مروی ہے، ''... اور اللہ تعالیٰ بہادری کو پسند کرتا ہے چاہے سانپ اور بچھو ہی کے مارنے میں کیوں نہ ہو۔'' (فضائلِ صدقات، جلد اوّل، صفحہ ۹۷)

چوتھی بات جو اس سے (بطور corollary) اخذ کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ اچھی چیز کی طبعی ناگواری (مثلاً بخل) مضر نہیں ہے جب عقلی محبت اس چیز کی طبعی ناگواری پر اتنی غالب ہو کہ عمل عقل کے مقتضا پر ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ O اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۷، ۲۶۸)

اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمھارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردّی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں ہاں مگر چشم پوشی کر جاوَ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں، تعریف کے لائق ہیں شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کردینے کا اور زیادہ دینے کا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں خوب جاننے والے ہیں۔

آیت نمبر ۲۶۷ میں انفاق کی ایک اور شرط بتائی گئی ہے کہ ردّی، سڑی گلی چیز نہ ہو اور دوسری آیتِ کریمہ سے پتا چلتا ہے کہ ایسا انفاق فحش بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''فحش'' ان تمام باتوں کے لیے بولا جاتا ہے جن سے آدمی کو حیا آئے، یعنی جو شرم کی بات ہو یہ۔ بات کتنے شرم کی ہے کہ جس اللہ نے سب کچھ دیا اس کی راہ میں جب خرچ کرے تو اس میں گلی سڑی چیزیں ملا دے۔ اور اس طرح کی شرم ناک بات سے بچنے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ شیطان جو فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی سکھاتا ہے اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمانے اور فضل کرنے کا وعدہ فرماتے ہیں تو فضل کے وعدے کے سامنے فقر کا خوف کیا حقیقت رکھتا ہے۔

ذوقاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''فحش'' ہر ایسی بات کو کہتے ہیں جس سے ایک سلیم الفطرت آدمی کو شرم آئے۔ اس معیار پر اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نافرمانی بے

حیائی کی بات ہے۔ اور ''سوء'' بری بات کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کی ایذا دہی کا پہلو بھی شامل ہو۔ مثلاً زنا فحش بات ہے، بے حیائی کے اس مفہوم کی اس حدیث شریف سے تصدیق ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ حیا اور ایمان ایک چیز ہے یعنی لازم وملزوم ہے۔ جب ان میں سے ایک چیز جاتی رہتی ہے تو دوسری چیز بھی چھین لی جاتی ہے۔ ایک پرانی ضرب المثل ہے، بے حیا باشی و ہرچہ خواہی کن۔

یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيۡمٍ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو۔

جب اللہ تعالیٰ خود رِبا کو مٹاتے ہیں تو کون اس کو بڑھا سکتا ہے۔ انفرادی اور معاشرتی فوائد صدقات ہی کے ہیں اور رِبا کے جو فوائد دنیا کے نظر آتے ہیں وہ اوّل تو انسان کی ابدی زندگی کے نقصانات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں دوسرے اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور تحقیق کی جائے تو دنیاوی منافع بھی صرف ظاہری طور پر نظر آتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں باتوں کے تعلق میں احیاناً اور آخرت میں یقیناً کی تفسیر کی ہے۔ ایک ذوقی تعبیر یہ بھی ہے کہ من حیث القوم جو لوگ ایک دوسرے سے سود لیتے رہتے ہیں تو مجموعی طور پر تو دولت میں اضافہ ہوتا نہیں ہے اور انفرادی طور پر جو اضافہ نظر آتا ہے، اس کا بہت بڑا حصہ افراطِ زر کی وجہ سے ختم ہوجاتا ہے اور پھر سود کی شرح افراطِ زر کی شرح سے زیادہ رکھنی پڑتی ہے اور یہ cycle (سلسلہ) چلتا رہتا ہے۔ آج کل کی بہت سی معاشی دشواریاں سود پر مبنی معیشت کی وجہ سے ہیں۔ ایک باطنی سبب سود کے برباد ہونے کا یہ ہوتا ہے کہ اس سے بخل اور حرص پیدا ہوتا ہے جس سے جوع البقر کی طرح آدمی کو جمع کرتے رہنے کا مرض ہوجاتا ہے اور

عافیت برباد ہوجاتی ہے۔ برخلاف اس کے جو معاشرہ ایک دوسرے کی خبرگیری، اور اعانت اورمحتاجوں کو صدقات دینے سے قائم ہوتا ہے وہ بہت جلد خوش حال ہوجاتا ہے۔

یہاں سود کھانے والے کو اشارتاً بہت بڑا کافر اور بہت بڑا گنہگار فرمایا گیا ہے۔ جولوگ سود کو بیع کی مثل قرار دے کر حکمِ خداوندی کا مقابلہ کرتے ہیں (یعنی اس کو challenge کرتے ہیں) وہ تو صریحاً کفر میں مبتلا ہیں ہی، جیسا کہ آیت نمبر۲۷۵ میں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جو سود کھاتا ہے اور اس کی وہ تاویل نہیں کرتا جو کفار کرتے ہیں اور ایمان بھی رکھتا ہے، وہ مومن ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مومن تو ہے لیکن اثیم ہے (واللہ اعلم) زمانۂ نزولِ وحی میں مصلحتِ خداوندی کے مطابق ایسے حالات تھے کہ مسلمانوں کے لیے کسی امرِ خداوندی کو ٹالنا یا اس پر بحث کرنا محال تھا جو بھی ایمان لایا وہ اس کے تمام تقاضے پورا کرتا رہا۔ ایمان اور عمل میں کوئی تضاد (divergence) نہیں تھا۔ اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا تو اس نے ایسی توبہ کی کہ اس سے بالکل پاک ہوگیا۔ شراب حرام ہوئی تو سبھوں نے شراب کے برتن توڑ دیے۔ گرچہ ذہنی طور پر شراب سے دور رہنے کی ترغیب پہلے سے دی جا رہی تھی لیکن جب حرام ہوئی تو ایک دم سے حرام ہوئی۔ یہ نہیں ہوا کہ اتنی مقدار میں حرام ہے اور اس سے کم مقدار میں حلال ہے یا ان حالات میں حرام ہے ان حالات میں حرام نہیں ہے اور ایک دم ہی لوگوں نے چھوڑ دیا کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ جو چیز زمانۂ قدیم سے معاشرے میں رچ بس گئی ہو اس کو ایک دم کیسے چھوڑ دیا جائے۔ نہ social norms (معاشرتی قدریں) نہ igrained habits (گھٹی میں پڑی ہوئی عادات) نہ نقصان کا خوف، کوئی بھی چیز انھیں ایمان کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے سے نہیں روک سکی۔ اسی لیے ہر جگہ ایمان اور عملِ صالح، ایمان اور نماز، ایمان اور زکوٰۃ اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں فرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں نہ ہو ایسی شمع سے وہ شمع ہائے فروزاں روشن ہوئی تھیں جس کا کوئی ثانی اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں فرمایا۔ ان کے ایمان میں ایسی گرمی تھی کہ ان کے سامنے خباثت ہائے نفس آناً فاناً دور ہوجاتے تھے اور شیطان کے وسوسے اور دلائل بے کار ہوجاتے

تھے۔ اب (اتنی dilution آ گئی ہے اور) اتنے ادنیٰ درجے کا ہمارا ایمان ہوگیا ہے کہ فقہا کو سوچنا پڑا ہے کہ فلاں گناہ کفر ہے یا صرف گناہ۔ قرونِ اولیٰ کے بعد یہ بحث شروع ہوئی ہے کہ تارکِ صلوٰۃ کافر ہے یا نہیں۔

اسی ایمان اور عمل کی ہم آہنگی کی طرف اگلی آیت ان الذین امنو...الخ میں اشارہ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۗ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۗ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۗ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ۗ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۗ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۗ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۗ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۗ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ○ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۲)

اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا، ایک میعادِ معین تک (کے لیے) تو اس کو لکھ لیا کرو اور یہ ضروری ہے کہ تمھارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو (لکھنا) سکھلا دیا۔ اس کو چاہیے کہ لکھ دیا کرے اور وہ شخص لکھوا دے جس کے ذمے وہ حق واجب ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو

اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس میں سے ذرّہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمے حق واجب تھا وہ اگر خفیف العقل ہو یا ضعیف البدن ہو یا خود لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کرلیا کرو۔ پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جاویں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جاوے تو ان میں ایک دوسرے کو یاد دلا دے اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لے) بلائے جایا کریں اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملے کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام نہیں اور (اتنا اس میں ضرور کیا کرو کہ) خرید و فروخت کے وقت گواہ کرلیا کرو اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جاوے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

اس طویل آیتِ کریمہ میں آپس کے معاملات کے کئی اصول بتائے گئے ہیں، بعض اوامر ہیں اور بعض بنیادی اصول۔ تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ لیکن ایک بات جو نظروں سے اوجھل رہتی ہے، یہاں سمجھنے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں آخری حکم فرمایا ہے "واتقوا اللّٰہ" اور پھر فرمایا ہے "ویعلمکم اللّٰہ ... الخ"۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ کے لیے معاملات کا درست کرنا نہایت ضروری ہے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھائی ہیں، اپنے نبی ﷺ کے ذریعے اور اس آیت میں وہ معاملات درست رکھنے کے لیے بنیادی باتیں ہیں اور ان معاملات پر عمل کرنا عین تقویٰ اور عین عبادت ہے۔ اور ہوسکتا ہے وقتی طور پر ان باتوں پر عمل نہ کرنے سے کوئی نقصان نہ ہوتا ہو لیکن

اللہ تعالیٰ جو بکل شیء علیم ہیں ان کے یہ احکامات ہیں اور ان پر عمل من جملہ اور باتوں کے ادنیٰ الاتر تابوا کے ضمن میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک سیّدنا محمد ﷺ کے طفیل میں ہمارے تمام معاملات درست اور پسندیدہ فرما دیں۔ (آمین)

لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۶)

اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادے سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادے سے کرے۔ اے ہمارے رب ہم پر دار و گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجیے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت کا) نہ ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجیے ہم سے اور بخش دیجیے ہم کو اور رحم کیجیے ہم پر، آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرف دار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجیے۔

اس آیتِ کریمہ کے پہلے ٹکڑے سے یہ بات واضح ہے کہ جتنے امور کو قرب یا بُعد میں دخل ہے وہ سب امورِ اختیاریہ ہیں۔ ان میں کوئی امر غیراختیاری نہیں (بصائر: ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ۱۴۰۰ھ، ایڈیشن، صفحہ ۱۱۶)

... اصراً کما حملتہ ... کے بارے میں یہ جاننا چاہیے کہ اگلی قوموں پر ایسا بوجھ ان کے فسق و فجور پر اصرار کی وجہ سے ڈالا گیا تھا، مثلاً: فبظلم ... حرمنا علیھم ... یا یوم سبت کی آزائش و اسئلھم ... ماخرۃ البحر ... بما کانوا یفسقون۔ اگر وہ اپنے گناہوں پر نادم ہوتے تو

ایسی سخت آزمائشوں میں نہیں پڑتے۔ تو یہاں دعا مانگتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ یااللہ ہم توبہ کر رہے ہیں آپ کے سامنے، نادم ہیں اپنی حرکتوں پر، تو ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالیے جو آپ نے ہم سے پہلے والوں پر ڈالا تھا رہنا والا... طاقۃ لنا، میں آخرت کے بوجھ سے پناہ مانگنا ہے۔ کما قال مرشدی نور اللہ مرقدہٗ اور اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے دنیاوی بوجھ سے بھی پناہ مانگنا ہے جس کی قوتِ برداشت ہم میں نہیں ہے۔ بہت سے بوجھ ایسے ہیں جو ہماری قوت سے باہر ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں ہوتا، مثلاً ایک شخص حکومت میں اچھے مناصب پر فائز رہا اور بہت ایمان داری سے کام کرتا رہا اللہ تعالیٰ کے فضل سے۔ لیکن اگر اس پر اس کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ استعفیٰ دے دیتا۔ یا اگر وہ صدر یا وزیراعظم کے بہت قریب ہوتا تو اس کی طرف سے انعام یا دھمکی اور ناراضگی کی وجہ سے وہ غلط کام کر بیٹھتا۔ اس دعا میں ہر طرح کی بوجھ سے جو طاقت سے باہر ہو، تعوذ ہے۔

بحمد اللہ یہ دعائیں ہر طرح سے قبول ہوئیں۔ شرعی احکامات ہی انھیں ہلکے بتائے گئے۔ باپ دادا کی شامت اعمالیوں کا اثر نہیں پڑا۔ گناہ، فحاشی، ظلم، سود وغیرہ کی دیرینہ عادتیں چھڑوا دی گئیں۔ یضع عنھم اصرھم، طبیعتوں کے ضعف اور کم زور قویٰ کا خیال رکھا۔ ایک نسل (generation) میں غلامی سے مسلمان آزاد ہوگئے جو مسلمان غلام، مسلمانوں کے پاس رہ گئے، وہ عملاً گھر کے فرد بن گئے۔ بادشاہت مل گئی۔

هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۷۔۹)

وہ ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں
جو کہ اشتباہِ مراد سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں (اس) کتاب کا
اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی
ہے وہ اس کے اسی حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے (دین میں)
شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کا (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض
سے حالانکہ ان کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا جو لوگ علم
(دین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً)
یقین رکھتے ہیں (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی
لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہلِ عقل ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے
دلوں کو کج نہ کیجیے بعد اس کے کہ آپ ہم کو ہدایت کر چکے ہیں اور ہم کو اپنے
پاس سے رحمتِ (خاصّہ) عطا فرمائیے، بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے
ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدانِ محشر میں) جمع
کرنے والے ہیں، اس دن میں جس میں ذرا شک نہیں (اور) بلاشبہ
اللہ تعالیٰ خلاف کرتے ہی نہیں وعدے کو۔

اولو الالباب یعنی اہلِ علم کو بغیر اپنی کم علمی اور اپنے عجز کا اعتراف کیے چارہ نہیں جو اہلِ علم ہیں وہ ایسے مقامات پر جن کے فہم سے ان کا علم عاری ہوتا ہے، اپنے ایمان کی تجدید کرتے ہیں اور خدا سے ایمان پر قائم رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔ اہلِ علم وہ ہیں جو محکمات پر عمل کرتے ہیں اور جو ان کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آتا اس کے پیچھے نہیں پڑتے۔ جو بدبخت ٹیڑھے دل کے ہوتے ہیں وہ ان کی تاویلات کرتے رہتے ہیں اور کبھی بھی اپنی بے علمی کا اعتراف نہیں کرتے، یہی ان کی جہالت کی واضح دلیل ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کتاب کی صداقت سے بھی انکار کرنے لگتے ہیں۔ العیاذ اللہ۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ

وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ
الْمَاٰبِO قُلْ اَؤُنَبِّئُکُمْ بِخَیْرٍ مِّنْ ذٰلِکُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّھِمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ
وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِO اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ O اَلصّٰبِرِیْنَ
وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِO
شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ بِالْقِسْطِ ؕ لَآ
اِلٰہَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۔ ۱۸)

خوش نما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزوں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے، آپ فرما دیجیے کیا میں تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان چیزوں سے (سو سنو) ایسے لوگوں کے لیے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں، ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے پائیں میں نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور (ان کے لیے) ایسی بیبیاں ہیں جو صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لیے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے (بھالتے) ہیں بندوں کو۔ (یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجیے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور (اللہ کے سامنے) فروتنی کرنے والے ہیں اور (مال) خرچ کرنے والے ہیں اور اخیر شب میں (اٹھ اٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں، گواہی دی ہے اللہ نے اس کی کہ بجز اس کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور اہلِ علم نے بھی (اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔

یہاں بھی شہواتِ دنیا کے مقابلے میں آخرت ہی کی نعمتوں کو بتایا گیا ہے اور اللہ کے بندے جو اس کے مستحق ہوں گے جن کو عباد اور الذین اتقوا کے ناموں سے نوازا گیا ہے ان کے لیے جن صفات کا ہونا ضروری ہے وہ صبر، صدق، قنوت، انفاق اور استغفار ہے۔ ان صفات سے نفس اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر ثابت قدم رہتا ہے (یعنی تثبیتِ نفس حاصل ہو جاتی ہے) اس کے بعد ہی لا الٰہ الا ھو... کے صحیح معنی آشکار ہوتے ہیں۔ دنیاوی محبوب و مزین چیزوں سے بچنا، اسی طرح شہوت کے اتباع سے باز رہنا (اسی طرح غصے کو اعتدال میں رکھنا) صبر کے بغیر ناممکن ہے۔ ایک جگہ ذو حظ عظیم کو الذین صبروا کے ہم معنی رکھا گیا ہے لیکن یہ تمام خوبیاں بے کار ہیں اگر ان کے ساتھ ساتھ اپنی جہالت اور ظلم کا ہر وقت خدا کے سامنے اعتراف نہ ہو اور انسان توبہ نہ کرتا رہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صبر، صدق، قنوت، عبادت، تقویٰ، انفاق اور استغفار ان سب کے ساتھ دنیاوی اجر کا ذکر ہے اور ان کا اصل حاصل دنیا میں تثبیتِ نفس یعنی نفس کا اللہ کی رضا پر قائم اور ثابت قدم ہونا ہے۔ جو انسان اس پر کاربند ہوگا اس کو لا الٰہ الا اللہ کے صحیح مفہوم کا پتا چلے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو "عبد" کا لقب زیب دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍO اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۡ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۳۰۔ ۳۱)

بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ایسے شخص کو جو (افعال و اخلاق کے) اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں سو ایسے لوگوں کو خبر سنا دیجیے ایک سزائے دردناک کی (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے سب اعمالِ (صالحہ) غارت ہوگئے دنیا اور آخرت میں اور (سزا کے وقت) ان کا کوئی حامی مددگار نہ ہوگا۔

لوگوں میں سے جو انصاف کا حکم کرتے ہیں وہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرتے ہیں، اس لیے ان کے قتل کرنے والوں اور انبیا علیہم السلام کے قتل کرنے والوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور جو حکام یا دوسرے برسرِ اقتدار لوگ یا دہشت گرد ان کو قتل کرتے ہیں ان کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضبط ہونے اور عذاب کی خوش خبری ہے اور جو قتل سے کم تر ایذا پہنچاتے ہیں، وہ بھی بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ بصیرٌ بالعباد کے الفاظ سے آیت نمبر۱۵ میں اللہ کے خاص بندوں کا ذکر ہے۔ جب کہ آیت نمبر۳۰ میں تمام لوگوں کے لیے عباد کا لفظ لایا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ○ (سورۃ آلِ عمران، آیت ۳۱۔۳۲)

آپ فرما دیجیے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمھارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے عنایت فرمانے والے ہیں (اور) آپ (یہ بھی) فرما دیجیے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی۔ پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ اعراض کریں سو (سن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔

اتباع نبی ﷺ کا ارادہ کرلو بس یہی کافی ہے پھر خواہ تمھارا ارادہ کمزور ہو خواہ تمھارے سامنے ناقابلِ عبور رکاوٹیں ہوں، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں اور تم اپنے مقصد میں محروم نہیں رہو گے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں بھی اطاعت کا یہی مفہوم ہے کہ حکم سے انکار نہ ہو۔ پھر

خواہ کسی درجے کی بھی اطاعت نصیب ہوجائے لیکن اگر حکم سے انکار ہے خواہ اس وجہ سے کہ بعض کو انسان زمانے کی روش اور اپنی ہویٰ کے خلاف پاتا ہے، خواہ اس وجہ سے کہ آخرت پر یقین نہیں ہے، خواہ اس وجہ سے کہ آدمی صرف ''اصولوں'' کی بات کرے اور احکام کو فروعی اور بے وقعت جانتا ہو کسی وجہ سے بھی انکار ہو تو آدمی ایمان کی حد سے نکل کر کفر کی حد میں داخل ہوجاتا ہے۔ فاعوذ باللّٰہ من ذلک۔ اس کے برعکس خواہ آدمی کتنا ہی گنہگار ہو لیکن حکم کا انکار نہ کرتا ہو تو وہ کفر کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا۔

هُنَا لِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ O (سورۂ آلِ عمران، آیت ۳۸)

اس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے۔ عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجیے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بے شک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ رحمۃ اللّٰہ علیہ نے فرمایا (مطب میں ۱۷ر جولائی ۸۳ء) کہ یہاں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب کسی جگہ اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول دیکھے فوراً اپنی حاجت طلب کرے۔ زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جنت کے پھل دیکھ کر یہ دعا نہیں کی کہ مجھے بھی جنت کا پھل دیجیے بلکہ اللّٰہ تعالیٰ سے فوراً اپنی حاجت طلب کی۔

اس طرح جس مجلس میں اللّٰہ تعالیٰ کا ذکر ہو رہا ہو (چونکہ وہاں رحمت کا نزول نص سے ثابت ہے) اپنی حاجت کی دعا کرنے میں قبولیت کی زیادہ امید ہے۔ اس لحاظ سے بزرگوں کے قبور پر بھی اللّٰہ تعالیٰ سے دعا مانگنے میں قبولیت کی زیادہ امید ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ O اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ O

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۵۰۔۵۱)

اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں، اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے تھی یعنی تورات کی اور اس لیے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعضی ایسی چیزیں حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمھارے پاس دلیل (نبوت) لے کر آیا ہوں تمھارے رب کے پاس سے، تم لوگ اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، بے شک اللّٰہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمھارے بھی رب ہیں سو تم لوگ اس کی عبادت کرو، بس یہ ہے راہِ راست۔

اللّٰہ تعالیٰ پر ایمان ہونے کی کسوٹی اطاعتِ رسول ہے جیسا کہ ان آیاتِ کریمہ میں ہے اور آیت نمبر ۵۳ امنا بما انزلت کے ساتھ واتبعنا الرسول ہے۔ صرف زبان سے ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ دل سے بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اگر دل میں ایمان ہو تو اس کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں یعنی اللّٰہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی ہوتی رہتی ہے اور چونکہ یہ احکام رسول ہی کے ذریعے ملے ہیں اس لیے رسول کی ہر معاملے میں اطاعت خود بخود ہونے لگتی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ O اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ O فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ O اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ O (سورۂ آلِ عمران، آیت ۵۹۔۶۱)

بے شک حالت عجیبہ (حضرت) عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالت عجیبہ (حضرت) آدم کے ہے کہ ان (کے قالب) کو مٹی سے بنایا پھر ان کو حکم دیا کہ (جان دار) ہو جا، بس وہ (جان دار) ہوگئے یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جیے، پس جو شخص آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (قطعی) آئے پیچھے تو آپ فرما دیجیے کہ آجاؤ ہم (اور تم) بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمھارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں اس طور سے کہ اللہ کی لعنتیں بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں، بے شک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) وہی ہے سچی بات اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے اور بلاشک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں۔

•

یہ پورا رکوع حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات سے متعلق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور رسول پر الزام اور اس کے متعلق غلط بیانی اللہ تعالیٰ کو کتنی ناگوار ہے۔ ان شر انگیز باتوں کے رد میں تمام دلائل نازل کرنے کے بعد مباہلے کا بھی حکم دے دیا گیا۔ اس کے لیے کوئی کافر تیار نہیں ہوا۔ اس طرح خدا کی پاکی (عن الشرک) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو اُن کے دشمنان نے (جن میں منھ بولے نصاریٰ بھی شامل تھے) مشہور کر رکھا تھا، ان سب باتوں کی بھی تردید ہوگئی۔ اس معاملے میں جتنے مبالغے سے کام لیا گیا اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولؑ کی معصومیت کتنی عزیز ہے اور اس کے متعلق غلط بیانی کس قدر ناپسندیدہ ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ حال ہے تو ہمارے آقا ﷺ کی عزت و توقیر اور معصومیت اور تصدیق کس قدر عزیز ہوگی۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۶۸)

بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (ﷺ) ہیں اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حنیف اور مسلم اور شرک سے بیزار ہونے میں کسی کو شبہ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ انسان درحقیقت اسی کے زیادہ قریب ہوتا ہے جس کا وہ اتباع کرتا ہے۔ اس لیے مشرکینِ مکہ کو اور اہلِ کتاب کو ہمارے نبی ﷺ اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ شرک سے بیزاری اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی میں یہ سب سے آگے تھے لیکن پھر بھی ذاتی عناد یا کبر کی وجہ سے انکار کرتے رہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌO

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۷۷)

یقیناً جو لوگ معاوضۂ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے (انھوں نے) کیا ہے اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ ان سے (لطف کا) کلام فرماویں گے اور نہ ان کی طرف (نظرِ محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

نظر جو بھی ہوگی رحمت کی ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔ نظرِ رحمت سے محرومی انتہائی محرومی ہے۔ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

اب رہی تزکیے کی بات۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عالمِ آخرت میں جب نظر سے پردے اٹھ جائیں گے اور حقیقتِ اشیا نظر آنے لگے گی (۔۔۔۔الیوم حدید) اس وقت اعمالِ صالحہ اپنی رعنائیوں کے ساتھ ظاہر ہوجائیں گے اور اعمال سیہ کی برائی نظر آنے لگے گی۔ اس وقت اللّٰہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کا تزکیہ فرمائیں گے۔ اچھے اعمال کو برے اعمال کا ماحی (مٹانے والا) بنا کر (ان الحسنت یذھبن السیات) یا بالکل معاف فرما کر یا کسی اور طرح سے، مثلاً تھوڑے دنوں تک عذاب دے کر پھر جب وہ بالکل پاک ہوجائیں گے اور گناہوں کا اثر ان سے بالکل ڈھل جائے گا تب ان کو جنت میں داخل فرمائیں گے تاکہ وہ وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکیں لیکن جو اللّٰہ کے وعدے اور اپنی قسمیں بیچتے ہیں ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوگا بلکہ انھیں اپنے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا (جزآء وفاقا) اور کچھ اچھے اعمال کی وجہ سے تھوڑی سی برائی میں کمی (set-off) بھی ہوگئی جب بھی آلودگی اور گندگی باقی رہے گی اور عذاب قائم رہے گا۔ فاستغفر اللّٰہ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ ۚ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۹۰)

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں، ان کی توبہ ہرگز مقبول نہ ہوگی اور ایسے لوگ پکے گمراہ ہیں۔

ایمان کے بعد کفر ممکن نظر آتا ہے اور کئی واقعات ارتداد کے ہمارے سامنے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ایمان صرف ان کے دل کے اوپری حصے (surface) تک رہتا ہے؟ پھر وہ توبہ کس طرح کرتا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف زبانی توبہ

کرتا ہے اور دل سے خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا؟ توجیہہ کچھ بھی ہو خاتمہ بالایمان بھی اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے اور مرتے وقت کی حالت سے کبھی بے توجہ نہیں رہنا چاہیے اور خدا سے ہر وقت توبہ کرتے رہنا چاہیے اور خدا سے خاتمہ بالایمان کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک دن فرمایا کہ ایمان ایک مرتبہ عطا ہوجانے کے بعد چھینا نہیں جاتا۔ اس وقت مجھے ان آیات کا خیال آیا اور میں نے پوچھا کہ قرآن شریف میں جو اس طرح سے ان الذین کفروا... معاً مجھے خیال ہوا کہ یہ منافقوں کے بارے میں ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تصدیق فرما دی۔ فالحمدللہ۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۹۲)

تم خیرِ کامل کو کبھی نہ حاصل کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو بھی خوب جانتے ہیں۔

اور سود چھوڑنا بھی اس میں شامل ہے۔ جب اپنی محبوب چیز کو خدا کی راہ میں دے دینا نیکی (کا مطلوب معیار) حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تو جو چیز محبوب ہو لیکن ابھی تک اپنے پاس آئی نہ ہو اور اس کو چھوڑنے کا حکم بھی ہو تو نیکی حاصل کرنے کے لیے ایسی چیز کا چھوڑنا اور بھی ضروری ہوگا۔

بغیر کسی قربانی کے کچھ حاصل کرنا عادتاً محال ہے اور برّ (نیکی) حاصل کرنا تو اس آیتِ کریمہ کے بیان کردہ اصول کے مطابق بغیر کسی قربانی کے ناممکن ہے۔ ہم سے ایسی قربانیوں کا مطالبہ نہیں ہے جیسے بعض اُممِ سابقہ سے تھا کہ قربانی پیش کرو آگ کھا جائے گی، بلکہ ایسی قربانی کا مطالبہ ہے جس کا براہِ راست فائدہ امت کے کسی دوسرے

فرد یا افراد کو ہو۔ اسی لیے انفاق پر زور دیا گیا ہے۔ سود چھوڑنے سے مقروض کو منافع ہوتا ہے اور قرض دہندہ کو برِّ (نیکی) حاصل ہوتا ہے جو کہ اصل منافع ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۰۱-۱۰۳)

تم کفر کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہِ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے، اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلے کو (اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو) اور باہم نااتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمھارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمھاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو۔

اعتصام باللہ افراد (individuals) کے لیے بھی تمام برائیوں سے بچنے کا ذریعہ (panacea) ہے اور قوم کے لیے بھی۔ فرد کا اتنا خیال رکھا گیا ہے کہ اگر ایک فرد

بھی اعتصام باللہ میں کامل ہوتو فلاح پا جائے گا۔ اس لحاظ سے اس مذہب میں فرد کی بڑی اہمیت ہے (یعنی یہ individualistic مذہب ہے) دوسرے اتنی وسعت ہے کہ جس کا جی چاہے بلالحاظِ رنگ ونسل وزبان اس رسّی کو پکڑ لے وہ ایک ملت کا فرد ہوجائے گا اس لحاظ سے یہ بہت universal مذہب ہے)۔ فرد اور ملت کے مفادات میں کسی طرح کا تضاد نہیں رہتا۔

مسلمانوں کا اتحاد صرف اسی بنیاد پر ہوسکتا ہے اور اس اتحاد کا طریقہ اللّٰہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہے اور اللّٰہ تعالیٰ کی اس خالص نعمت کا جو مسلمانوں پر ہے، بار بار استحضار کرنا ہے کہ انھیں سابقہ دشمنیوں کے باوجود بھائی بھائی بنا دیا۔ اس نعمت پر شکر ادا کرنے سے یہ نعمت (اتفاق اور اتحاد کی) بڑھے گی۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۰۴)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

اس آیتِ کریمہ اور اس سے اگلی آیتِ کریمہ سے اشارتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کرنے والوں کو عوام الناس سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ کہیں اخلاص میں کمی تو نہیں آگئی ہے۔ اپنے نفس کی خاطر دنیا کمانے کے لیے (حبِ جاہ اور حبِ مال دونوں اس میں آگئے) صاف اور معروف باتوں کو توڑ مروڑ کر اور تاویلات کرکے دوسروں کو بتاتے ہیں۔ دوسرا اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ اگر کچھ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے رہیں گے تو تبلیغ کی کمی کی وجہ سے

ہر شخص اپنی اپنی راہ لے لے گا اور آپس میں اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔

تیسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہونے چاہییں (جو دین کا صحیح علم بھی رکھتے ہوں اور تربیت یافتہ بھی ہوں) جن کا کام ہی تبلیغ کرتے رہنا ہو۔ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہے اور نہ ہر شخص سے یہ مطالبہ ہے۔ اور جو لوگ ھذہٖ سبیلی ادعوا... الخ۔ سے تبلیغ کی فرضیت کو ثابت کرتے ہیں سو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر شخص پر تبلیغِ عام فرض ہے، بلکہ اپنے اپنے دائرے میں ہر مسلمان پر تبلیغ واجب ہے جیسے بچوں سے نماز پڑھوانا جب وہ سنِ شعور کو پہنچ جائیں۔ کہیں برائی ہوتے ہوئے دیکھیں تو اس کو روکنے کی کوشش کرنا۔ گھر والوں کو دینی تعلیم دلوانا اور دینی تعلیم دینے والوں کی اعانت کرنا۔ اس طرح کے بہت سے معاملات ہیں۔ تفصیل کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۰۷)

اور جن کے چہرے سفید ہوگئے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ جو چیز وہ اپنے نیک بندوں کو آخرت میں عطا فرمائیں گے اس کی ایک جھلک دنیا میں بھی وہ ان کو روزانہ پانچ بار یا اس سے زیادہ دکھا دیتے ہیں۔ جب بندہ نماز میں ہوتا ہے تو اللہ ہی کی رحمت اس کو ڈھانپے رہتی ہے اور قیام سے لے کر سجود تک خالق سے بندے کے تقرب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے اس کے ہاتھ پاؤں اور عقل و حواس سالم رہتے ہیں۔ اس کا ایمان سلامت رہتا ہے۔ اس کو ایک طرح کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ظاہری اعمال کی حد تک وہ ماسویٰ اللہ سے بالکل کٹ جاتا ہے۔ یہ تو اقل درجہ ہے ورنہ نماز میں

جس قدر حسن عطا ہوجائے اتنی ہی یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ کھڑا ہوتے ہی اس کی رحمت کو یاد کرتا ہے اور پہلی سورۃ جو وہ پڑھتا ہے، وہ الحمدللّٰہ رب العالمین سے شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ احساس انسان کو نماز پڑھتے وقت رہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے تو خشوع میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۰)

تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے، تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللّٰہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے زیادہ اچھا ہوتا ان میں سے بعضے تو مسلمان ہیں اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں مومنوں اور فاسقوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھا گیا ہے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی گناہ کسی سے سرزد ہوتا ہے وہ ایمان کی کمی یا کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر ایمان قوی ہو تو اوّل تو گناہ سرزد ہی نہ ہو، دوسرے اگر کبھی بمقتضائے بشریت سرزد ہو بھی جائے تو بمقتضائے شرفِ انسانیت (جو دوسرے لفظوں میں تقاضائے ایمان ہی سے ہے) فوراً ندامت کی توفیق ہو جاتی ہے اور ایسے شخص کو فاسق نہیں کہتے ہیں، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔

یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگرچہ ایمان اور فسق ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس سے یہ سمجھ لینا جائز نہیں ہوگا کہ مومن سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو ایمان کے درجات ہیں جیسا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے اللّٰہ نزل احسن الحدیث... کی تفسیر میں بتلایا تھا۔ دوسرے گناہ کے فوراً بعد

جب ندامت اور توبہ ہو جائے تو گناہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

یہاں سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ایمان ہے۔ اگر ایمان نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْآ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۞ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۲)

جما دی گئی ان پر بے قدری، جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعے کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعے سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضبِ الٰہی کے اور جما دی گئی ان پر پستی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکامِ الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق، اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرے سے نکل نکل جاتے تھے۔

ذلت تو ان پر ایسی مسلط ہوئی کہ یہودی کا لفظ ہی ذلت کے مرادف ہو گیا نہ صرف مسلمانوں کے ہاں بلکہ سکھوں کے ہاں۔ ہٹلر ہو یا شیکسپیئر یعنی میدانِ حرب کا آدمی ہو یا اہلِ قلم جس کو دیکھیے یہودی کو ذلیل سمجھ رہا ہے کسی کو یہ کہنے کی بجائے کہ تم ذلیل ہو، چھچھورے ہو......

You cling to money like a parasite and stoop to the meanest level for the sake of money, are callous, insist on the pound of flesh, are treacherous, immoral.etc.

اتنا کچھ کہنے کی بجائے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تم یہودی ہو۔ پٹھان کسی کو انتہائی حقارت سے کہے گا تو کہے گا، ''یہودی کا بچہ۔'' مغرب کا کوئی شخص کہے گا تو کہے گا ''تم یہودی ہو۔'' رہ گیا مسکنت کا سوال تو فقیر من لہ حرص کے مقولے کے مطابق یہی تو قوم سب

سے زیادہ مسکین ہے اور یہ اس قوم کا المیہ ہے کہ روپیہ رہنے کے باوجود جذبات اور معاملات ان کے ایسے ہیں جیسے کہ یہ لوگ بہت محتاج ہوں۔

حبل من اللّٰہ سے اس ناچیز کے خیال میں مسلمانوں کی دی ہوئی پناہ ہے اور حبل من الناس سے مراد دوسرے لوگوں کی دی ہوئی پناہ ہے، یعنی وہ اپنے قدموں پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر میں لکھتے آئے ہیں کہ یہودی کہیں اپنی حکومت سے نہیں رہتے۔ اس میں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ اب ان کی حکومت اسرائیل پر ہے۔ لیکن اگر یہ مراد لیا جائے کہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے الا یہ کہ مسلمان یا اور کوئی قوم انھیں پناہ دے دے تو یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کیوں کہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیلی حکومت انگریزوں کی قائم کردہ ہے اور امریکنوں کے بل بوتے پر قائم ہے، یعنی اپنے اس چھوٹے سے خطے میں بھی اگر یہ لوگ ذلیل و خوار نہیں سمجھے جاتے تو وہ حبل من الناس کی وجہ سے ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۴ ۔ ۱۱۸)

اللّٰہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام بتلاتے ہیں اور

بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ شائستہ لوگوں میں سے ہیں اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس سے محروم نہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو خوب جانتے ہیں جو لوگ کافر رہے ہرگز ان کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرا بھی اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں اس کی حالت اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنھوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ اس کو برباد کر ڈالے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔ اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحبِ خصوصیت مت بناؤ، وہ لوگ تمھارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، تمھاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے، ہم علامات تمھارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو۔

آیات نمبر ۱۱۴ اور ۱۱۵ میں صبر علی الطاعۃ کو شکر سے تعبیر کیا گیا ہے اور آیت نمبر ۱۱۶ میں اسی کی ایک شق کو یعنی صبر فی الجہاد کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا صبر اور شکر ایک ہی صفت کے دو پہلو ہیں اور ان دونوں کے اعلیٰ درجے کو احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور احسان کے درجے میں انسان اس وقت داخل ہوتا ہے جب عین نیک عمل میں (مثلاً جہاد میں) اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی انابت قوی ہو جو اس دعا سے ظاہر ہے جو آیت نمبر ۱۱۷ میں ہے کیوں کہ نیک عمل کو تین جہتوں سے خطرہ ہے۔

(۱) کسی سابقہ گناہ کی وجہ سے اس عمل کی تکمیل نہ ہو سکے یا اس میں نقص رہ جائے۔

(۲) نیت یا ہمت کی وجہ سے عمل میں نقص پیدا ہو جائے۔

(۳) آئندہ عجب یا تکبر یا حسد یا غیبت کی وجہ سے وہ عمل ضائع ہو جائے یا اس کا ثواب دوسرے کو پہنچ جائے اور نیک عمل کا کرنے والا فقیر رہ جائے جیسا کہ

قیامت کے دن ایک شخص پیش ہوگا جس کی بہت نیکیاں ہوں گی لیکن سب نیکیاں ایک ایک کر کے دوسروں کو مل جائیں گی جیسا کہ ایک حدیث شریف میں وارد ہے۔
اس لیے عین اس عمل کے وقت بھی استغفار اور استعانت اور انابت ضروری ہے تاکہ اس کے حسن میں کمی نہ آئے اور وہ باحسن وجوہ پورا ہو اور اس کا اجر قائم رہے۔
گویا شکر اور انابت دو عظیم الشان صفات ہیں جن سے نیک کام انجام پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی نصرت ہمیشہ شاملِ حال ہوتے ہیں۔ فالحمدللہ۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۲۰)

اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کے لیے موجبِ رنج ہوتی ہے اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر احاطہ رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دوست دشمن کی پہچان بتلا دی کہ ان سے تمھیں برائی ہی پہنچتی ہے اور ان کی دشمنی ان کی زبان سے بھی ظاہر ہو چکی ہے۔ یہاں ان کے دلوں کا حال بتلایا ہے کہ تمھیں بھلائی پہنچنے سے انھیں رنج ہوتا ہے اور تمھیں نقصان پہنچنے سے ان کو خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ اگر تم ثابت قدم رہے تو ان کا کید تمھارا کچھ نقصان نہیں کر سکتا۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۲۲)

جب تم میں سے دو جماعتوں نے دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں اور
اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا اور مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر
اعتماد کرنا چاہیے۔

ایک توکّل تو وہ ہے جو ظاہر ہے کہ ہمارا فرض فی سبیل اللہ جہاد و قتال کرنا ہے
نتیجے کا مالک اللہ ہے اور امید ہے کہ وہ ہمیں فتح عطا فرمائے گا۔ دوسرے معنی میں توکّل
یہ ہے کہ خلوصِ نیت سے عمل شروع کردو اور ثابت قدم رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکّل
کرو۔ جیسا یہاں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں جماعتوں کو جن کے پاؤں ڈگمگا گئے تھے،
ثابت قدم رکھا تو جس طرح عمل کی توفیق ابتدا میں دینا اس کی رحمت ہے، اسی طرح اس
کی بقا بھی اس کی رحمت ہے۔

ایک اشارہ یہاں یہ بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ہم پر رحم فرمانا چاہیں اور
ہمارا ہاتھ پکڑ لیں تو ہم ارادہ بھی کریں، نافرمانی کرنے کا تو نہیں کرسکتے۔ جیسے صوفیہ علیہم
الرحمۃ کا قول ہے کہ آدمی واصل ہو کر مردود نہیں ہوتا۔ فالحمدللہ۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۲۳)

اور یہ (بات) محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم
بے سروسامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکرگزار رہو۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ
''مسلمانوں کو صرف اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے تاکہ اس کی طرف سے مزید انعام و
احسان ہو اور مزید شکرگزاری کا موقع ملے۔'' اس تقوے اور شکر کے ایک دوسرے سے
ربط (relationship) کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا عملی شکر

تقویٰ اختیار کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا دل میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے احسانات پر کوئی یہ سمجھ لے کہ یہ تو میرا حق تھا یہ چیز تو مجھے ملنی ہی تھی اور اس بات کا خوف نہ ہو کہ وہ جب چاہے مزید انعامات روک دے یا موجودہ انعامات واپس لے لے تو اس کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

مقامِ شکر بہت بڑا مقام ہے بلکہ ایک لحاظ سے عبدیت کا سب سے بڑا مقام ہے کیوں کہ جنتیوں کی آخری گفتگو الحمد للہ رب العالمین ہوگی۔ اور دنیا میں جنتیوں کے سردار نے ہمیں یہی سکھایا کہ رات رات بھر عبادت کی یہاں تک کہ پاؤں سوج گئے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے روتے رہے، گڑگڑاتے رہے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرض کرنے کے جواب میں کہ آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، فرمایا افلا اکون عبداً شکوراً۔

واقعۂ بدر میں اپنے احسان کو یاد دلا کر یہ نہیں فرمایا کہ پس میرا شکر ادا کرو۔ یہ بات تو ویسے ہی فطری بات تھی کہ اتنے عظیم الشان احسان پر بندے شکر ادا کرتے بلکہ فرمایا پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، شاید کہ تم شکر ادا کرو، یعنی ان کو شکر ادا کرنے کا طریقہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور فتح پر اِتراؤ نہیں اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ اگر تم نے فخر کیا تو نہ معلوم کل تمھارے ساتھ کیا معاملہ ہو۔ یہی حال تمام نعمتوں کا ہے۔ کوئی نعمت کسی وقت بھی چھن سکتی ہے یا تو کبر کی وجہ سے یا کسی اور نافرمانی کی وجہ سے یا محض آزمائش کے لیے اور ہر نعمت ایسی ہے کہ وہ خدانخواستہ چلی جائے، تب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور شکر ادا کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ نعمت قائم رہے اور مزید انعامات ملیں۔

یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا ہی دراصل شکر ادا کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ زبان اور دل سے تو ایسے موقعے پر شکر کے کلمات نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن شکر کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اعضا و جوارع سے بھی شکر ادا نہ کیا جائے یعنی ان کو ایسے کاموں سے روکا جائے جن سے روکنے کا حکم ہے۔ اسی لیے آلِ داؤد کو اعملو..

شکرا فرمایا گیا اور سورۂ شوریٰ (آیت نمبر۳۳) میں صبار اور شکور کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ جب جان دینے کا مطالبہ محبوبِ حقیقی کی طرف سے ہو تو خوشی خوشی جان دے دے اور جو تکالیف تبلیغ یا جہاد میں پیش آئیں ان کو خوشی خوشی برداشت کرے۔ جب جا کے آدمی صبار کہلا سکتا ہے اور جب ہی شکور کے زمرے میں داخل ہو سکتا ہے۔

تقویٰ اور شکر ایک دوسرے کے لیے compliments ہیں یعنی ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کا خوف پہلا زینہ ہے۔ اس کے بعد ہی اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی راہ میں خرچ کرنے کا زینہ آئے گا۔ جب تک آدمی تقویٰ اختیار نہ کرے شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ متقی سے ایک درجہ آگے شاکر کا درجہ ہے۔ اس کے برعکس جو شخص قلب اور جوارح سے شکر ادا کرتا رہے، وہ متقی بھی ہوجائے گا۔ یہ تقویٰ، شکر، تقویٰ، شکر کے لامحدود زینے ہیں اور تقویٰ بھی ایک طرح کا شکر ہے۔ گناہ کے گڑھے میں گرنے کے راستے مسدود ہوتے جائیں گے تو قرب کی منزلیں طے ہوتی جائیں گی۔ فالحمدللہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۳۰-۱۳۴)

اے ایمان والو! سود مت کھاؤ (یعنی نہ لو اصل سے) کئی حصے زائد (کرکے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور خوشی سے کہنا مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا امید ہے کہ تم رحم کیے جاؤ اور دوڑو طرف مغفرت کی جو تمھارے پروردگار کی

جانب سے ہے اور (طرف) جنت کی جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایسے لوگ جوکہ خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصے کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

۱

سود خوری کے مقابلے (juxtaposition) میں انفاق کا ذکر ہے جس سے انفاق کا فی ذاتہٖ (perse) محمود ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں بھی جو لوگ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں باللیل والنھار کے بالمقابل جو لوگ یأ کلون الربوٰ کا ذکر ہے (آیات ۲۷۴۔ ۲۷۵) گرچہ دونوں جگہ انفاق سے فی سبیل اللہ مراد ہے لیکن اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سود خور میں بخل کا مادہ بدرجۂ اتم ہوتا ہے جو انفاق اور سخاوت کی ضد ہے۔

آیت نمبر ۱۳۳ میں مغفرت کے لیے دوڑنے کو کہا گیا ہے۔ مغفرت بٹ رہی ہے، دوڑو لینے کے لیے۔ جو دروازے پر پہنچ گیا، اسے مل گیا۔ شاید ہی کوئی محروم رہا ہو۔ جیسے لیلیٰ نے مجنوں کا پیالہ بار بار پھینک دیا تاکہ وہ بار بار اس کے پاس مانگنے آئے، (اسی طرح کبھی محبوبِ حقیقی کو پسند ہوتا ہے کہ بندہ بار بار مانگے تب اس کی حاجت پوری ہو) یا کوئی واقعی بہت بڑا بدقسمت ہو کہ دل میں گستاخی ہو جو چہرے سے عیاں ہو رہی ہو یا باغی ہو بھیس بدل کر آ گیا ہو۔ ورنہ جن کو نہیں ملنا ہوتا ہے، وہ دوڑتے ہی نہیں ہیں، دروازے کی طرف۔ کس کو کتنی کوشش کے بعد دے گا، یہ دینے والا ہی جانتا ہے۔ لیکن کوشش کرنے کا حکم ہے جیسا کہ لفظ سارعوا سے ظاہر ہے اور کوشش کرنے کے بعد بظاہر کچھ بھی نہ ملے تو تعمیلِ حکم تو ہے ہی۔ یہی سب سے بڑی چیز ہے۔

یہاں تعلقات مع الخلق کی استواری (ایمان اور اخلاص کے ساتھ) کو تقویٰ اور احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورۂ بقرہ میں ایمان اور عباداتِ جسمانی و مالی کو تقویٰ بتایا گیا ہے۔ درحقیقت اعلیٰ درجے کا تقویٰ اور احسان ایک ہی چیز ہے اور سب اچھے صفات کلمۂ طیبہ یعنی شجرۂ طیبہ کے ثمرات ہیں۔ لوگوں پر کسی طرح کا بھی احسان ہو خواہ

صلہ رحمی ہو، خواہ مقروض کو مہلت دینی ہو، خواہ لوگوں کے قصور معاف کرنا ہو، خواہ ؛
آزاد کرنا ہو یہ سب باتیں عرفِ عام میں احسان میں داخل ہیں۔

یہ سب صفات بذاتِ خود (perse) اچھی ہیں جس طرح شجاعت، سخاو
اولوالعزمی بذاتِ خود اچھی صفات ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بندے میں یہ سب باتیں پسند
اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب صفات مومنوں کے ہیں اور اگر ان
علاوہ کسی اور میں ہوں تو وہ ایسی ہی ہے جیسے عاریتاً لی ہوئی چیز ہو۔ ان میں وہ پائدار
نہیں ہوتی جو ایمان سے ناشی صفات میں ہوتی ہے اور ان کے اقتضا پر عمل کرنے کا بد
آخرت میں کماحقہٗ مومنوں ہی کو ملے گا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْآ اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا
عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۳۵)

اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جن میں زیادتی ہو یا اپنی
ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی
معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو
اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں۔

جس طرح غلطی کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے، اسی طرح مالک کا یاد
آجانا اور یاد آتے ہی اس غلطی کی معافی مانگنا بھی انسان کی سرشت میں ہے، اگر فطرت
سلیمہ ہو۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے۔ اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام یہ ہے کہ
جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو توبہ کرنے والا ہے وہ گناہوں پر اصرار کرنے
والا نہیں ہے۔ اگرچہ دن بھر میں وہ گناہ ستر دفعہ سرزد ہو اور وہ شخص ستر دفعہ توبہ کرے۔

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ O (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۳۶)

ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے اور باغ ہیں کہ ان کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی یہ ہمیشہ ہمیشہ ان ہی میں رہیں گے اور یہ اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا۔

اپنے گناہوں پر نادم ہوتے رہنا اور توبہ کرتے رہنا بھی کام کرنا ہے اور ایک مثبت کام ہے جس طرح آیاتِ کریمہ ۱۳۰ تا ۱۳۳ میں نیک کاموں کا ذکر ہے یعنی سود چھوڑنا، آسائش اور تنگی میں خرچ کرتے رہنا، جہاد میں صبر کرنا، یہ سب کام کرنے والوں کو محسنین کا خطاب دیا گیا ہے۔ توبہ کرنے والے بھی اسی زمرے میں ہیں۔ اگر کوئی شخص تمام عمر گناہ کرتا رہا اور تمام عمر توبہ کرتا رہا اور دل سے توبہ کرتا رہا تو اس نے بڑا کام کیا۔

اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَیَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ O (سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۴۰)

اگر تم کو زخم پہنچ جاوے تو اس قوم کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور ہم ان ایام کو ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں اور تا کہ اللّٰہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں اور تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا اور اللّٰہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے۔

اس آیتِ کریمہ سے دو اشارے ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جو تم لوگ زخمی ہوئے اور اتنے شہید ہوئے اور اتنی پریشانیاں تم کو ہوئیں تو یہ تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوا۔ کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتے تو معاذ اللّٰہ خود کیوں کر ظلم کریں گے،

بلکہ ان میں بہت سی مصلحتیں رہیں جن میں بعض کا یہاں ذکر کردیا گیا اور بعض کا دوسری آیات میں ذکر ہے۔

دوسرا اشارہ یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتے یعنی کافروں کو دوست نہیں رکھتے۔ ان کے دوست تو مومنین ہیں، یعنی تم ہو۔ تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھتے ہیں۔ اس بات کا جہاں استحضار ہوجائے وہاں سارے غم کافور ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ کہ تم خود بھی تو اللہ کی راہ میں شہادت کے مشتاق تھے تو اس کے لیے تو یہ ہونا ضروری تھا اور بعضے منافق جو صرف زبان سے تمنائے شہادت (یا تمنائے موت فی القتال) کرتے تھے ان کا بھی پتا چل جائے کہ صرف زبانی ہی زبانی تھی، جب سامنے موت نظر آئی تو ساری تمنا رخصت ہوگئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ○ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ (سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۴۴۔ ۱۴۶)

اور محمد ﷺ نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں، سو اگر آپ کا انتقال ہوجائے یا آپ شہید ہی ہوجائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور خدا تعالیٰ جلدی ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو، اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدون حکم خدا کے اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اُس کو اس (دنیا) کا حصہ

دے دیتے ہیں اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس (آخرت) کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلد عوض دیں گے حق شناسوں کو اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہوکر بہت اللہ والے لڑے ہیں، سو نہ تو ہمت ہاری انھوں نے ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئے اور نہ ان کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے۔

یہاں شکر کو کفر کے بالمقابل لایا گیا ہے کیوں کہ ومن ینقلب علی عقبیہ سے کافر ہی مراد ہیں۔ اسی طرح من یرد ثواب الدنیا سے بھی کافر ہی مراد ہیں اور ثوابِ آخرت کا طلب کرنا مومن کی شان ہے کیوں کہ آخرت کی نعمت ملنے کے لیے اللہ کی رضا ضروری ہے، برخلاف دنیوی نعمتوں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور ہمیں ایمان کی توفیق عطا فرمائی، اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر یہ احسان بدرجۂ اتم تھا، لہٰذا ان پر شکر ادا کرنا بدرجۂ اتم واجب تھا۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنے آقا کی اس دنیا سے پردہ پوشی کے بعد بھی وہ رشتہ اللہ تعالیٰ سے قائم رکھو (عبدیت کا) جسے قائم کرانے کے لیے وہ مبعوث ہوئے۔ اگلی آیت میں موت اور آخرت کو یاد دلا کر پھر شکر کا ذکر ہے، جس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اصل شکر آخرت کو طلب کرنا ہے اور جس کو آخرت کی طلب ہوگی وہ زندگی کے آخری لمحے تک اس طلب میں مشغول رہے گا۔ اس سے اگلی آیت میں جہاد کا ذکر ہے اور صبر پر ایک لحاظ سے (indirectly) محبوبیت کا وعدہ ہے۔ معلوم ہوا کہ استقامت شکر ہے اور نیت کا اخلاص یعنی آخرت کی طلب شکر ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ اور صبر اور استغفار اور انابت جن کا ذکر اگلی دو آیتوں میں ہے جن سب کا مجموعہ احسان ہے، یہ بھی شکر میں داخل ہے۔ نیت کا اخلاص اتنا ضروری ہے کہ جنگِ احد میں جو مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے لگے یہ سمجھ کر کہ لڑائی ختم ہو چکی ہے اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے ان کو بطورِ عتاب کے فرمایا گیا کہ منکم من یرید الدنیا۔ حالانکہ وہ اپنے لیے جمع

نہیں کر رہے تھے بلکہ قوم کے لیے جمع کر رہے تھے۔ لہٰذا نیت صرف آخرت کے لیے یعنی اللّٰہ کی رضا کے لیے ہونا ضروری ہے۔

آیت نمبر ۱۴۶ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ ضعف، وہن اور تکان ایک لحاظ سے اکتسابی یعنی اختیاری امور ہیں اور جتنا انسان کو اپنے مقصد سے لگاؤ ہوگا اتنا ہی وہ ان صفاتِ رذیلہ سے دور رہے گا اور اتنا ہی قریب اپنے مقصد سے ہوگا۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَO(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۷)

اور ان کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انھوں نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دیجیے اور ہم کو ثابت قدم رکھیے اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجیے۔

گناہوں میں خاصیت (tendency) ہے نیکیوں کی راہ میں حائل ہونے کی جس طرح نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں اسی طرح بعض برائیاں نیکیوں کو کھا جاتی ہیں اور بعض برائیاں انسان کو نیکیوں سے روک دیتی ہیں جس طرح نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے اسی طرح فحش اور منکر مثلاً شراب اور جوا بھی نماز سے روکتے ہیں (شیطان چاہتا ہے کہ وہ تمھارے درمیان میں عداوت پیدا کردے شراب اور جوئے کے واسطے سے اور تم کو ذکر اور نماز سے روک دے...) تو جب کفار سے مقابلہ ہوتا ہے تو مسلمان ڈرتے ہیں کہ ہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے گناہ کا وبال ہمیں ثابت قدم نہ رہنے دے، اس لیے اس وقت بھی گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور پھر ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔

چونکہ اچھے برے اعمال کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا ہے اس لیے جب نیکیوں

میں دل نہ لگے، مثلاً نماز میں خشوع حاصل نہ ہو تو اس کی وجہ اپنی برائیوں میں تلاش کرو کہ آج مجھ سے کون سا برا کام سرزد ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ حالت ہے اور اگر وجہ سمجھ میں نہ آئے تب بھی استغفار کرو۔ لیکن جب نیکیوں میں دل لگے تو یہ مت سوچو کہ آج مجھ سے کون سا نیک کام ہوا ہے جس کا یہ انعام ملا ہے کیوں کہ اس دربار سے انعام و اکرام بلاسبب ہوا کرتے ہیں۔

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۸)

سو ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی بدلہ دیا اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکوکاروں سے محبت ہے۔

اس رکوع میں دو جگہ شاکرین کا لفظ ہے، ایک جگہ صابرین کا اور ایک جگہ محسنین کا۔ ایک جامع شخصیت کے یہ تین پہلو ہیں۔ ایک ہی عمل شکر، صبر اور احسان تینوں اوصاف کے تحت آسکتا ہے۔

تصور میں ''احسان'' کی جو مثال آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی نوکر کو برتن مانجھنے کا حکم دیا گیا اور وہ اس کو خوب جی لگا کر رگڑ رگڑ کر صاف کر رہا ہے کہ خوب اچھی طرح چمک جائے اور کہیں پر داغ دھبا نہ رہ جائے تاکہ اس کا مالک جو اس کے پاس ہی ہے اور اسے کام کرتا دیکھ رہا ہے، خوش ہوجائے تو ظاہر ہے کہ اس پر جو آقا کا انعام ہوگا، وہ کیسا ہوگا۔ برخلاف اس کے جو نوکر ضابطے کی صفائی کرے گا اور اِدھر اُدھر پونچھ پانچھ کے برتن کو خشک کرکے رکھ دے گا تو معاوضہ تو اس کو بھی مل جائے گا لیکن مالک کی خوشنودی اور اس کی محبت کا جو انعام ہے، وہ اس کو نہیں ملے گا۔ اسی طرح جو ضابطے کی عبادت کرتے ہیں، ان کو ضابطے کے معاوضے کا حق ہے اور جو جی جان لگا کر عبادت کرتے ہیں اور اپنے دل کو خوب اچھی طرح مانجھتے رہتے ہیں کہ معصیت اور غفلت کی

سیاہی یا دھبا نہ رہ جائے اور خدا کی راہ میں جان دینے کو تیار رہتے ہیں، خواہ جان چلی جائے یا رہ جائے ان کو ''محسنین'' کا خطاب ملتا ہے اور دنیا اور آخرت میں بدلہ ملتا ہے۔

اس رکوع میں شکر اور صبر کے بعد احسان کا ذکر ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محسنین ضرور شاکرین بھی ہوتے ہیں اور صابرین بھی۔

عطائے دنیوی (ثواب الدنیا) میں بہت بڑی عطا (غالباً سب سے بڑی عطا) جس کو اکثر لوگ نہیں سمجھتے ہیں جہاد (بالسیف یا بالنفس) میں ثابت قدمی ہے یہاں تک کہ موت آجائے کیوں کہ اصل اعتبار مرتے وقت کا ہے۔ اگر ساری عمر نیکی میں صرف ہوئی اور خدانخواسہ مرتے وقت ایمان کے ساتھ دنیا سے نہیں گیا تو ساری نیکی برباد۔

اللّٰھم احفظنا، اللّٰھم توفنا مسلمین۔ (آمین)

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰھُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ ○

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۱)

ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہول کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انھوں نے اللّٰہ تعالیٰ کا شریک ایسی چیز کو ٹھیرایا ہے جس پر کوئی دلیل اللّٰہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے بے انصافوں کی۔

صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین کا حال تو خیر پوچھنا کیا ہے۔ ان کے غلاموں کے غلاموں کا بھی ایسا رعب ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ چند نفوس جو نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ایک گاؤں کے ایک مکان کی چھت پر تھے جن کے اعمال ننگِ اسلاف تھے، جن کو مومنین صادقین اپنا غلام بنانے کو تیار نہ ہوتے جو طرح طرح کی معصیتوں میں مبتلا تھے اور تقریباً نہتے تھے، جب وہ اللّٰہ کا نام لے کر عیدالاضحیٰ کے موقعے پر کفار کے مقابلے کو تیار ہوگئے تو ان پر کتنا رعب پڑ گیا کہ ان کے

قدم من من بھر سے زیادہ وزنی ہوگئے اور وہ بلا مقابلہ واپس چلے گئے۔ سبحان اللہ، مومن پر اللہ کا فضل بے نہایت ہے خواہ وہ اچھا ہو خواہ برا۔ آیت نمبر۱۵۳ میں اس رحمت کی وسعت کو اور بھی واضح کردیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ○ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۲،۱۵۳)

اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا تھا جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکمِ خداوندی قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ہی کمزور ہوگئے اور باہم حکم میں اختلاف کرنے لگے اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمھاری دل خواہ بات دکھلا دی گئی تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے (اس لیے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے اپنی نصرت کو بند کرلیا اور) پھر تم کو ان (کفار) سے ہٹا دیا تاکہ خدا تعالیٰ تمھاری آزمائش فرماوے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کردیا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں پر، (وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول تمھارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے، سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو اس چیز پر جو تمھارے ہاتھ سے نکل جاوے اور نہ اُس چیز پر جو تم پر مصیبت پڑے۔ اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمھارے سب کاموں کی۔

دنیا چاہنا اور آخرت چاہنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان دونوں چاہے کیوں کہ اصل مقصود ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر الگ الگ مقاصد ہوں تو ان میں ایک مقصد اصلی ہوگا، دوسرے مقاصد اس سے کم تر درجے کے ہوں گے۔ مقصود اور غیرمقصود میں اکثر تضاد بھی ہوجاتا ہے اور مومنوں سے اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں فرماتے کہ آخرت کے علاوہ کچھ اور چاہیں۔ چنانچہ اس واقعے میں بھی جہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم مخاطب ہیں ان کو بھی بتا دیا گیا کہ دنیا ذرا سا بھی چاہو گے تو آخرت چاہنے والوں میں سے نہیں رہو گے۔ حالانکہ وہاں جن بزرگوں سے لغزش ہوئی اور وہ مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ بھی اسلام اور مسلمانوں ہی کی خاطر متوجہ ہوئے، ان کے خلوص کا کیا مقابلہ! ان کی خدا ترسی مسلّم ہے (خیر القرون قرنی...) بلکہ ایک جگہ خود حضور ﷺ کو بھی فدیہ لے کر چھوڑنے کے متعلق فرمایا گیا کہ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے اور اسی آیتِ کریمہ میں فرمایا ہے، تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ... (الانفال آیت ۶۷) ظاہر ہے یہاں بھی فدیہ لے کر چھوڑنا جس کو دنیا چاہنے سے تعبیر فرمایا گیا، خالصتاً اسلام اور مسلمانوں کے لیے تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے لیے آخرت اور صرف آخرت کو پسند فرمایا یعنی ان کو حکم دیا کہ آخرت ہی پسند کرو۔ اور دنیا میں اپنی مصلحت کے مطابق محض اپنے فضل و کرم سے اتنا عطا فرمایا کہ سب کا سب اگر جان توڑ کوشش کرتے اور ساری توجہ دنیا ہی کی طرف مذکورہ کردیتے تب بھی اس کا عشرِ عشیر حاصل نہیں کرسکتے۔ پوری کی پوری قوم پر دنیا جس طرح آ گری اس کی مثال کہیں اور ملتی ہے؟

یہ سارے واقعات جو احد میں ہوئے یہ مسلمانوں کی تربیت کے لیے ہوئے تاکہ آئندہ اگر کبھی کوئی چیز ہاتھ سے نکل جائے یا کوئی مصیبت آ پڑے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی میں تو اس کی قطعی پروا نہ کریں۔ احد میں اگر لوگ مالِ غنیمت کے تلف ہوجانے کی فکر نہیں کرتے اور جہاں حضور نبیِ کریم ﷺ ان کو تعینات کر گئے تھے وہیں رہتے تو یہ مصیبت نہیں آتی اور جب مصیبت آ گئی تھی، تب بھی ان کو گھبرانا نہیں چاہیے تھا اور جو اعلیٰ درجے کے جاں نثار تھے وہ اس وقت بھی نہیں گھبرائے۔ بعض صوفیا نے جو لکھا ہے کہ بعض لوگ دنیا چاہتے ہیں، بعض آخرت چاہتے ہیں اور بعضوں کے

نزدیک ان دونوں کی کوئی وقعت نہیں، وہ کوئی اور ہی چیز چاہتے ہیں تو دراصل ان بزرگوں کے نزدیک یہاں آخرت سے مراد آخرت کی نعمتیں مثل حور وقصور و انھارعسل و لبن سے ہے۔ ورنہ وہ بھی دراصل آخرت ہی چاہتے ہیں کیوں کہ اس آیتِ کریمہ میں دو ہی گروہوں کا ذکر ہوا۔ دنیا چاہنے والے اور آخرت چاہنے والے۔ جن سلاطینِ ہمت کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں، وہ آخرت میں خدا کے دیدار کے طلب گار ہیں اور وہ السابقون الاوّلون میں ہیں۔ مرنے کے بعد ہی وہ آنکھ نصیب ہوگی جو اس شربتِ دیدار سے لطف اندوز ہوسکے اور انھی کو نصیب ہوگی جو جنت میں جائیں گے۔ جنت درحقیقت خدا کی رضا کی جگہ ہے اور اسی کے یہ لوگ طلب گار ہیں۔ **فالحمد للّٰہ ارجوا ان اکون منھم بطفیل نبیه الکریم صلی اللّٰہ علیه وعلیٰ اٰلهٖ و اصحابه اجمعین۔**

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ غیر اختیاری باتوں پر ایک حد سے زیادہ غم جب کوئی چیز فوت ہوجائے یا حد سے زیادہ خوشی جب کوئی چیز حاصل ہوجائے ناپسندیدہ ہے بلکہ ہرحال میں اس پر نظر رکھنی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ کو خبر ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

اس بات کو اور دل میں جمانے کے لیے اللّٰہ تعالیٰ نے ان شرکائے جہاد کو غم پر غم دیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں، ’’یعنی تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے میں تم پر تنگی آئی۔ غم کا بدلہ غم سے ملا تاکہ آگے کو یاد رکھو کہ بہرحال تمھیں رسول ﷺ کے حکم پر چلنا چاہیے، خواہ کوئی نفع کی چیز مثلاً غنیمت وغیرہ ہاتھ سے جائے یا کچھ بلا سامنے آئے... ایک غم تو ابتدائی فتح و کامیابی کے فوت ہونے کا تھا۔ دوسرا اپنے آدمیوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے اور نبیِ کریم ﷺ کی شہادت مشہور ہونے سے پہنچا... غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے اور نقصانِ جانی و بدنی اٹھانے کا جو غم تھا، اس کے عوض میں ایک ایسا بڑا غم دے دیا گیا جس نے پہلے سب غموں کو بھلا دیا یعنی نبیِ کریم ﷺ کے مقتول ہونے کی افواہ...‘‘

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۵)

یقیناً تم میں سے جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں بڑے حلم والے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے اور اس کی قبل والی آیات سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ کبھی کبھی نافرمانیوں کے جو برے اثرات ہوتے ہیں یا ایمان کی کمزوری سے جو قلب پر (اور اس سے عمل پر) جو اثر پڑتا ہے اس کو دور کرنے کے لیے کسی بڑی آزمائش میں مبتلا کردیا جاتا ہے اور جانی اور مالی نقصانات اور مصیبت اور پریشانی سے اس کا ازالہ کردیا جاتا ہے اور یہی ان کی لغزشوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور آئندہ کے لیے ایسی نصیحت ہوجاتی ہے جو عمر بھر کے لیے کافی ہوتی اور ایمان میں قوت آجاتی ہے۔ یہ ابتلا سزا کے طور پر نہیں ہوتا جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا گناہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے معاف کردیا گیا تھا۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۷)

اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔

جمع انسان یا تو اپنے لیے کرتا ہے یا اپنی اولاد (یعنی posterity) کے لیے۔

اوّل الذکر میں تو ظاہر ہے کہ شہادت کا جو نفع ہے وہ مال جمع کرنے سے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا خواہ کتنا ہی خیر خیرات کیا جائے۔ جہاں تک اولاد کے لیے چھوڑنے کا تعلق ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنا فائدہ مقدم ہے۔ خصوصاً آخرت کے معاملے میں اپنا نقصان کرکے دوسروں کا فائدہ کرنا عقل مندی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شہید آگے آنے والوں (posterity) کے لیے وہ چیز چھوڑ جاتا ہے جس کا بدل مادّی اور مرئی لحاظ سے بھی کروڑوں روپوں کے خزانے سے نہیں ہوسکتا، مثلاً آزادی یا اسلام کی سربلندی اور ان کے لیے ایک مثال (tradition) چھوڑ جاتا ہے جو اندھیرے میں روشنی کے مینار کا کام کرتی ہے، ایک مثال چھوڑ جاتا ہے جو کئی پشت کو زندگی کی حرارت بخشتی ہے:

شہید کا جو خون ہے وہ قوم کی حیات ہے

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زندہ کرنے والا اور مارنے والا اور حامی و ناصر صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے جیسا کہ آیت نمبر ۱۶۰ میں ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کافروں کی طرح یہ نہ کہے کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو قتل نہیں ہوتے۔ ایسے آدمی کا یا تو ایمان بہت کمزور ہوگا یا وہ منافق ہوگا اور جس کا قول و فعل اس کے اس عقیدے کے مطابق ہوگا کہ محی و ممیت اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور وہ مرتے دم تک اس پر قائم رہے گا، وہی صادقین کے زمرے میں ہوگا اور انھی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ملے گا جو ہر اُس چیز سے بہتر ہے جو انسان جمع کرسکتا ہے۔

اس سے پہلے آیت نمبر ۱۵۶ کا آخری ٹکڑا تمام اوہام و خطرات کو ڈھا دینے والا ہے کہ جب تم خدا کے لیے لڑ رہے ہو اور خدا ہی سے تمام امیدیں تمھاری وابستہ ہیں اور وہی تمھارے محبوبِ حقیقی ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو تو پھر تمھیں دوسروں سے کیا لینا دینا اور کیسی مصلحت اندیشی:

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ
فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۵۹)

بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہوجاتے سو آپ ان کو معاف کردیجیے اور آپ ان کے لیے استغفار کردیجیے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجیے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

لینتِ قلب (نرمیِ قلب) ایک صفتِ محمودہ ہے۔ سخت گوئی اور سخت دلی لوگوں کی وحشت کا سبب بنتی ہے اوڑ جیسا اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے۔
جنگِ احد کے ذکر کے بعد بھی ان لوگوں پر جن سے لغزش سرزد ہوگئی تھی، رحمت بالائے رحمت نہیں تو اور کیا ہے؟ کمزوروں سے جن کے بارے میں فاعف عنہم فرمایا گیا ان سے بھی مشورہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس میں ایک بڑا پہلوان ان کی دل جوئی کا بھی شامل ہے۔ اور مسلمان خواہ کمزور سے کمزور کیوں نہ ہو، خدا کو محبوب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں پر رؤف اور رحیم ہیں۔ فالحمد للہ۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ
تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۶۱)

اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے حالانکہ جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا۔

یعنی خیانت۔ نبی (ﷺ) کا توغل کرنا ناممکن ہے لیکن اتنی تحذیر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مخاطب جان لے کہ اگر اس نے نعوذ باللہ یہ خیال کیا کہ نبی ﷺ نے معاذاللہ غل کیا ہے تو وہ نبی ﷺ کی نبوت ہی کا منکر ہوگیا اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوکر مرتد ہوگیا۔ فاعوذ باللہ من ذالک ومن کل سوء و صل علیہ نبیہ الکریم سیّدنا و مولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۶۲، ۱۶۳)

سوایسا شخص جو کہ رضائے حق کا تابع ہوگیا وہ اس شخص کے مثل ہوجائے گا جو کہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو اور وہ جانے کی بری جگہ ہے۔ یہ مذکورین درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں ان کے اعمال کو۔

آیت نمبر ۱۶۳ اس سے گزشتہ آیت کی تفصیل ہے کہ نبی تو نبی ہے، ایک امتی بھی اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کا طالب ہوتا ہے اور اس کے اعمال اسی طلب کی عکاسی کرتے ہیں اور جو شخص خیانت کرے یا اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات جھوٹ منسوب کرے، وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ تو ان دونوں میں بُعد المشر قین ہے اور کوئی قدر مشترک نہیں۔

اگلی آیت میں ایک طرح سے مومنوں کی تسلی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے اعمال دیکھ رہے ہیں، لہٰذا دوسرے لوگ جو کہتے ہیں اس کی فکر نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات کی کوئی حد و حساب نہیں ہے اور اگر آدمی یہ بات یاد رکھے تو کبھی بھی عجب میں مبتلا نہ ہو کیوں کہ وہ کسی بھی درجے پر پہنچ جائے تب

بھی اس کے اوپر لامتناہی درجات ہیں۔ اگر کوئی لاکھوں آدمیوں سے اچھا ہے تو کرو
آدمی اس سے بہتر ہوں گے۔ اور اگر انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق کو بھی شامل
جائے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے تو یہ سلسلہ اور بھی لامتناہی ہے۔

اَوَ لَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا ۚ وَقِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوِ ادۡفَعُوۡا ؕ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يَكۡتُمُوۡنَ ۝ اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ وَقَعَدُوۡا لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۶۵۔ ۱۶۸)

اور جب تمھاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو حصے تم جیت چکے تھے، تو کیا ایسے وقت میں تم یوں کہتے ہو کہ یہ کدھر سے ہوئی۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ ہار خاص تمھاری طرف سے ہوئی بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ وہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے سو خدا تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی اور تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنھوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے یوں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمنوں کا دفعیہ بن جانا۔ وہ بولے کہ اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمھارے ساتھ ہو لیتے، یہ (منافقین) اس روز کفر سے نزدیک تر ہوگئے بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ ایمان سے نزدیک تھے۔ یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنے بھائیوں کی نسبت بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا

مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ آپ فرما دیجیے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم سچے ہو۔

ان آیاتِ کریمہ میں ایک بڑی مصیبت کا ذکر ہے جو مسلمانوں کو پہنچی تھی (احد کے دن) اور جو باتیں یہاں بیان فرمائی گئی ہیں وہ تمام مصیبتوں کے لیے واضح روشنی فراہم کرتی ہیں، وہ یہ کہ ہر مصیبت کے دو پہلو ہیں، ایک کا ذکر آیت نمبر ۱۶۵ میں ہے کہ یہ یہ مصیبت خود تمھاری اپنی لائی ہوئی تھی۔ اگر تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرتے تو تم پر یہ مصیبت نہیں آتی کیوں کہ حضور ﷺ کی پوری فرماں برداری کے قید کے ساتھ وعدۂ نصرت ہو چکا تھا (کما فی بیان القرآن) جب تم نے اطاعت کی اپنی قدرت سے تم کو غالب کردیا اور جب خلاف کیا اپنی قدرت سے تم کو مغلوب کردیا (معارف القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۲۷) اسی طرح ہر مصیبت اپنے ہی کیے سے آتی ہے خواہ وہ گناہ ہو، خواہ اپنی بے وقوفی ہو، خواہ اجتہادی غلطی ہو، خواہ یہی بات ہو کہ محبت میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ جب تم نے اللہ اور رسول کی محبت اختیار کی تو اسی وقت سے ہر تکلیف گوارا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب ایک صحابی نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا تو حضور ﷺ نے ان کو فقر کے لیے تیار رہنے کو فرمایا تھا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو بھی مصیبت آتی ہے وہ خدا کے حکم سے آتی ہے اور اس میں چند در چند مصلحتیں ہوتی ہیں جن کا ذکر آیات نمبر ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے (تاکہ مومنین اور منافقین کی پہچان ہوجائے)، جو بھی غیر اختیاری معاملہ ہمارے ساتھ پیش آئے اس پر جو ہمارا ردِعمل (reaction) ہوتا ہے، اس سے ہماری پہچان ہوتی ہے۔ مثلاً صبر کرتے ہیں یا تقدیر اور کاتبِ تقدیر کی شکایت کرتے ہیں، رجوع الی اللہ کرتے ہیں یا جزع فزع کرتے ہیں، عفو کا معاملہ کرتے ہیں یا جائز انتقام لیتے ہیں یا انتقام لینے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں یا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے کینہ پروری کرتے ہیں، غصے میں ہوش و حواس میں رہتے ہیں یا بے قابو ہوجاتے ہیں... وغیرہ وغیرہ۔

اگر وہ مصیبت اختیاری ہے، مثلاً گناہ کرلیا یا آنکھ بند کرکے چلے اور چوٹ لگ گئی تو اس میں دونوں پہلو پائے جاتے ہیں، ایک ہمارا فعل ہونے کی حیثیت سے دوسرے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے کیوں کہ ہمارے افعال کے بھی وہی خالق ہیں اور پھر نتیجتاً جو مصیبت آئی وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آئی۔ اب ہمارا ردِ عمل ہماری اصلیت ظاہر کرے گا کہ ہم اس پر نادم ہوتے ہیں یا نہیں اور توبہ کرتے ہیں یا نہیں، یا اپنی غلطی کا الزام دوسرے پر رکھتے ہیں، یا یہ کہتے ہیں کہ یہی گناہ فلاں فلاں نے بھی کیا تھا اس کو کیوں یہ مصیبت نہیں پیش آئی؟

ان مصلحتوں میں سے ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ مومن اور منافق پہچان لیے جائیں۔ اس اسلوبِ بیان کہ ''تاکہ اللہ جان لے'' کا مطلب یہ ہے کہ تاکہ یہ بات اظہر من الشمس ہوجائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہی تھا۔

آیت نمبر۱۶۷ میں اقرب منھم للایمان ہوا دراصل ایمان سے بالکل خالی ہونا ظاہر کرتا ہے۔ یعنی ظاہر بینوں پر بھی کہ ان کا یہ قول کہ اگر ہم جنگ کرنا جانتے...کفر سے زیادہ قریب تھا۔ یہ ان کے منافق ہونے کی کھلی ہوئی نشانی تھی۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تھوڑے مومن تھے اور تھوڑے تھوڑے کافر۔

ان آیاتِ کریمہ میں تین طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو اس وقت اس اعلیٰ سطح پر نہیں تھے جس سطح پر خاص صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اور ان کا یہ پوچھنا ہی (انّٰی ھٰذا) اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تسلیم و رضا کے جس اعلیٰ درجے پر اللہ تعالیٰ ان کو لے جانا چاہتے تھے، اس پر نہیں پہنچے تھے۔ ان کو بتا دیا گیا کہ یہ ان ہی کی غلطی کی وجہ سے ہوا (جنھوں نے اپنی جگہ احد کے دن چھوڑ دی تھی اور جو خاص الخاص لوگ تھے، ان کی نظر تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر تھی۔ ان کے لیے یہ بات کافی تھی کہ جو کچھ ہوا، اللہ کے حکم سے ہوا اور اس مصیبت کے وقت بھی وہ سراپا تسلیم رہے۔ اور اوّل الذکر اصحابؓ بھی فوراً اپنی غلطی پر متنبہ ہوکر حکم کی پیروی میں لگ گئے۔ اس طرح ان دونوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ یہ سچے مومن ہیں اور اس غزوے میں منافقین بھی پہچانے گئے۔

ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ سابقون تو وہ حضرات تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''تم میں سے وہ ہیں جو آخرت چاہتے ہیں۔'' اور اصحاب الیمین وہ حضرات تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''تم میں سے وہ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں۔'' کیوں کہ یہاں مومنوں ہی کا ذکر ہو رہا ہے اور بعض کا ''دنیا چاہنا'' دنیا کے لیے نہیں تھا، ورنہ ان کا جہاد جہاد ہی کے حکم میں نہ آتا۔ ان کا مالِ غنیمت جمع کرنے لگنا ان کی اجتہادی غلطی تھی جس پر ان کو تنبیہ کی گئی کیوں کہ جہاں نصِ قطعی ہو، وہاں اجتہاد نہیں ہوتا۔ پھر ان کو معافی کا پروانہ بھی وحی کے ذریعے عطا ہوگیا۔ اور اصحابِ شمال منافقین تھے جن کا ذکر آیات نمبر۱۶۷، ۱۶۸ میں ہوا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۷۲۔۱۷۴)

جن لوگوں نے اللہ و رسول کے کہنے کو قبول کرلیا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لیے ثوابِ عظیم ہے، یہ ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ ان لوگوں نے تمھارے لیے (سامان) جمع کیا ہے سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہیے تو اس نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لیے اچھا ہے، پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگواری ذرا پیش نہیں آئی اور وہ لوگ رضائے حق کے تابع رہے اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل والا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں غزوۂ حمراء الاسد کا ذکر ہے جو غزوۂ احد کے فوراً ہی بعد ہوا جس میں حضور نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس میں صرف وہی لوگ جا سکیں گے جو

کل کے معرکے میں ہمارے ساتھ تھے (کذا فی معارف القرآن) جو لوگ اللہ کے احکام پر چلتے ہیں اور پھر انھیں اس کی راہ میں پریشانی ہوتی ہے اور پھر بھی حسب الحکم دل و جان حاضر کیے رہتے ہیں۔ وہی اصلی مردانِ راہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے ''قرح'' کی تفسیر میں فرمایا ہے ''الجرح یوم احد۔'' احد میں زخم لگنے کی ہزاروں مصلحتوں میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ معلوم ہو کہ یہ لوگ ہیں جو زخم کھا کر بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ویسے ہی جاں فروش ہیں۔ اصحابِ بدرؓ کا درجہ بہت بڑا ہے۔ بلاشبہ کیوں کہ وہ پہلا جہاد تھا۔ لیکن احد کے بعد جو لوگ جہاد میں شریک ہوئے ان کا درجہ بھی بہت بڑا ہے، اسی لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں احد کے بعد کے جہاد کو ''بدرِ صغریٰ'' کہا ہے۔

چھوٹے چھوٹے پیمانے (scales) پر ایسے واقعات بکثرت بار بار ہوتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ آزمائش سے اپنی پناہ میں رکھیں۔ (آمین)

اس آیتِ کریمہ میں مومنین صادقین کی صفت بیان فرمائی گئی ہے۔ اصل اونچے درجے کا ایمان وہی ہے کہ زخم کھانے کے بعد بھی قائم رہے۔ جنگِ احد میں جو عارضی شکست ہوئی تھی، اس پر صادقین کا یہ ردِعمل رہا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ انھیں دوبارہ بھی زخم لگ سکتے ہیں جو کچھ بھی ہوا اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر صابر و شاکر رہے اور پھر جہاد میں نکل گئے۔ لوگ ڈراتے رہے۔ ایک دن قبل جان جاتے جاتے بچی تھی پھر بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ہمارا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اس پر نتیجے کا ترتب ہمارے آقا کا کام ہے۔ وہی ہمارے لیے کافی ہے اور جو اس کا حکم ہوگا فتح یا شکست، زندگی یا موت وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اب اس بار اللہ تعالیٰ کے حکم سے بلا گزند واپس آئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل کا مشاہدہ کرتے ہوئے واپس آئے۔ دنیوی بھی اور اُخروی بھی کہ کفار کے دلوں میں ہیبت ڈال دی (نعمۃ) اور حمراء الاسد کے بازار میں تجارت میں نفع ہوا۔ (فضل) (کذا فی معارف القرآن)۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۷۵)
اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے کہ اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے
سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

اب تو شیطان خطرات بعیدہ (long range پریشانیوں) سے ڈراتا ہے کہ اس کا نظام اپناؤ گے تو ترقی رک جائے گی۔ دنیا سے کٹ جاؤ گے اور اس وقت تو فوری تباہی سے ڈراتا تھا کہ لوگ تمھارے لیے جمع ہوگئے ہیں، اب تمھاری جانوں کی خیر نہیں۔ (اب بھی بہت سے مواقع پر اس طرح کا خوف دلاتا ہے) تو جب اس وقت مسلمان نہیں گھبرائے اور اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت پر قائم رہے۔ حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل کہہ کر اور ان نامساعد حالات میں نہ صرف یہ کہ تباہی سے بچ گئے بلکہ مالِ غنیمت لے کر لوٹے تو اب کیا وجہ ہے کہ ہم حسبنا اللّٰہ نعم الوکیل نہ کہیں اور شیطان کے ڈرانے سے ڈر جائیں۔

یہ آیتِ کریمہ ہے تو جہاد سے متعلق لیکن عام نیکیوں میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان ڈراتا ہے کہ ایسا کرو گے تو یہ نقصان ہوجائے گا، وہ نقصان ہوجائے گا لیکن جب انسان اللّٰہ کا نام لے کر وہ کام کر ڈالتا ہے تو ہو ہی جاتا ہے اور کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ جس طرح رمیِ جمار میں معلوم ہوتا ہے کہ قریب گئے تو زخمی ہوجائیں گے یا پس جائیں گے یا خدا معلوم کیا ہوگا لیکن کئی بہت ضعیف لوگوں کو دیکھا ہے کہ ہمت کر کے آگے بڑھے اور آدمیوں کے سیلاب میں جگہ بنتی گئی اور وہ رمی کر کے باہر آگئے۔ لیکن کس حد تک احتیاط ضروری ہے اور کس حد تک غیرضروری، اس کے لیے اللّٰہ تعالیٰ ہی کی ہدایت درکار ہے اور اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وباللّٰہ التوفیق۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا
لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ

مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌO(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۸۰)

اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ ان کے لیے اچھی ہوگی بلکہ یہ بات اُن کے لیے بہت ہی بری ہے۔ وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنا دیے جائیں گے اس کا جس میں انھوں نے بخل کیا تھا اور اخیر میں آسمان و زمین اللہ ہی کا رہ جاوے گا اور اللہ تعالیٰ تمھارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

اصل عذاب جس سے ڈرایا گیا ہے، وہ سیطوقون ما بخلوا ہے جس سے بخل کا بھی قابل تحذیر ہونا معلوم ہوا اور اس مال کی بھی برائی ظاہر ہوگئی جو بخل سے جمع کیا گیا ہو۔ دنیا میں صرف عام اصول بتا دیا گیا کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۸۸)

جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردارِ بد پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو سو ایسے شخصوں کو ہرگز مت خیال کرو کہ وہ خاص طور کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے بلکہ ان کو دردناک سزا ہوگی۔

قال ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فی تفسیر (بما اتوا) بما غیر واصفة محمد ونعته فی الکتاب (ویحبون ان... یفعلوا) یحبون ان یقال فیهم خیر ولا خیر منهم۔ دوسری بات جس کی برائی بیان کی گئی ہے، وہ کثیر تعداد اناث و ذکور کی فطری کمزوری ہے۔ یہاں جن لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، عذاب الیم کا وہ بدرجۂ اتم کتمانِ

حق اور خود رائی کے complex امراض میں مبتلا تھے یعنی یہود۔ عام لوگ جن میں یہ بری بات خود رائی کی تھوڑی بہت حد تک موجود ہو ان کے لیے ہم عذاب الیم کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ ویسے یہ برائی اسی طرف لے جانے والی ہے، خدا محفوظ رکھے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِO الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِO (سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۹۰۔ ۱۹۱)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں، اہلِ عقل کے لیے جن کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا، ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں سو ہم کو عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے۔

زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرنا اللہ تعالیٰ کی یاد میں معین ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنا کہ یہ سب چیزیں ہمارے ہی فائدے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں اللہ تعالیٰ سے محبت میں اضافہ اور اس کے شکر کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عارفیؒ نے ایک بار لاہور میں کہیں تشریف لے جاتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''کتنا اچھا موسم اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ بنایا تو ہوگا اور لوگوں کے لیے بھی لیکن ہم کو تو یہی سمجھنا ہے کہ ہمارے لیے بنایا ہے۔'' اور اس کا ثبوت بہت سی آیتوں سے ملتا ہے، مثلاً وسخّر لکم الشمس والقمر... وبالنجم ھم یھتدون... اور درحقیقت جو کچھ بھی ہمارے گرد و پیش ہے یا تو ہمارے لیے براہِ راست مفید ہے یا اس میں ہماری آزمائش ہے جس میں اللہ تعالیٰ

کی رحمت سے کامیابی کی امید ہے تو یہ ہمارے لیے بالواسطہ مفید ہے۔ فالحمدللہ...اور اگر ہم نے شکر ادا نہیں کیا اور آزمائش میں پورے نہیں اترے تو جہنم میں جانے کا خطرہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے بعد عذابِ نار سے پناہ مانگنا بھی ضروری ہے۔ تفکر تو کفار بھی کرتے ہیں لیکن ان کا تفکر ان کو خالق سے قریب نہیں کرتا ہے بلکہ بسا اوقات دور لے جاتا ہے اور اس طرح ان کا تفکر ان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو جہنم سے پناہ مانگنے کے لیے کہا گیا ہے۔

اس نہج پر جو زندگی گزارے گا، اسے اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوتا جائے گا۔ خواہ وہ ہل چلانے والا ہو، خواہ انسانیت کے لیے مفید سائنسی انکشافات کر رہا ہو یا اور کوئی بڑی خدمت انسانیت کی کر رہا ہو، اس کا درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس بات پر منحصر ہے کہ جو مفید چیز اسے ملی یا اس نے دریافت کی یا اس نے ایجاد کی، اس پر وہ کتنا اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور رحمت کی طرف متوجہ ہوا اور اس کو کس قدر اس کا احساس ہوا کہ یہ نعمت جو اسے ملی ہے اس کو جنت کی طرف بھی لے جاسکتی ہے اور اگر اس نے ناشکری یا کبر کیا، عجب میں مبتلا ہوا تو اسے جہنم کی طرف بھی لے جاسکتی ہے۔ اگر برقی رو (electricity) کے دریافت کنندہ کو اپنی دریافت پر خدا کا شکر اور جہنم سے پناہ مانگنے کا خیال نہیں آیا تو اس کی دریافت ایک پرکاہ کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور اگر ایک اَن پڑھ ہل چلانے والا گندم کا دانہ اپنے کھیت سے حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور جہنم سے پناہ مانگتا ہے تو اس کا یہ عمل بجلی کے دریافت کنندہ کے عمل سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔

اس احقر کے نزدیک اس آیتِ کریمہ سے ایجادات و انکشافات کی ترغیب اور ان کے اعمالِ حسنہ ہونے پر استدلال درست نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ اس آیتِ کریمہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کا شکر، آخرت پر ایمان، اپنی کمزوری کا اعتراف، عجب و کبر سے دوری اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا یعنی مخلوقات میں تفکر کر کے خالق سے رشتہ استوار کرنے کی طرف ترغیب ملتی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ؕ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًاO يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًاO(سورۃ النسا، آیت ۲۵۔ ۲۸)

اور جو شخص تم میں پوری وسعت (اور گنجائش) نہ رکھتا ہو، آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں، (نکاح کرے) اور تمھارے ایمان کی پوری حالت اللّٰہ ہی کو معلوم ہے تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، سو ان سے نکاح کرلیا کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر قاعدے کے موافق دے دیا کرو اس طور پر کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنائی جائیں پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (زنا) کریں تو ان پر اس سزا سے نصف سزا ہوگی کہ آزاد عورتوں پر ہوتی ہے، یہ اُس شخص کے لیے ہے جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو اور تمھارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (بہ نسبت نکاحِ کنیز کے) اور اللّٰہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں بڑے رحمت والے ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم سے بیان کردے اورتم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتا دے اور تم پر توجہ فرما دے اور اللّٰہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں بڑے حکمت والے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ کو تو تمھارے حال پر توجہ فرمانا منظور ہے اور جو لوگ کہ شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ اللّٰہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

نکاح اور طلاق کے احکام جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں، وہ اس لیے ہیں کہ ہم شہوات میں پڑ کر دنیا اور آخرت برباد نہ کر بیٹھیں اور ایسے حدود (limitations) عائد فرمائے ہیں جن کے اندر رہنا انسان کے لیے زیادہ مشقت طلب نہ ہو۔ چنانچہ جن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو، ان کے لیے لونڈیوں سے نکاح کر جائز قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم ان حدود کے اندر رہ کر اپنی ضروریات پوری کرتے رہیں اور ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تمھاری طرف (نظرِ رحمت سے) متوجہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کا نظرِ رحمت سے متوجہ ہونا اور بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف عجز اور ندامت کے ساتھ متوجہ ہونا لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا ہے ثم تاب علیھم لیتوبوا۔ اس کے برعکس شہوات کا اتباع کرنے والے چاہتے ہیں کہ تم ایسے زبردست temptation میں پڑ جاؤ یعنی گناہ کی ایسی شدید خواہش میں مبتلا ہوجاؤ کہ پھر گناہ سے بچنا ناممکن ہوجائے۔ ایسی غیرفطری پابندیاں لگا کر جو ناقابلِ عمل ہوں، مثلاً مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کرنے پر پابندی یا بیوہ کی شادی پر پابندی (جو ہندوؤں کے ہاں قانوناً ہے اور ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں رسماً ہے) یا ایسا آزادانہ اور بے باکانہ ماحول پیدا کرے جس میں جنسی خواہشات کو آدمی جس طرح چاہے پورا کرلے اور معاشرے میں اتنے محرکاتِ فواحش پیدا ہوجائیں کہ گناہ سے بچنا ناممکن ہوجائے۔ (الا ما رحم ربی کا قانون اس گندے، ناپاک اور فحش ماحول میں بھی کام کر رہا ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے ضعف کا پورا علم ہے جو تمھاری خلقت میں شامل ہے۔ اس لیے repression اور temptation دونوں سے دور رکھتے ہوئے تمھارے لیے مناسب احکامات نازل فرمائے ہیں۔ جو لوگ اپنی خواہشات کے اتباع میں لگے ہوئے ہیں، وہ تو یقیناً چاہیں گے کہ تم بھی ان کے ساتھ اپنی خواہشات کے اتباع میں لگ جاؤ اور اس کو یہ لوگ رواداری، ثقافتی آزادی اور اسی طرح کے خوب صورت نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے بہتر کون سا نظام ہوگا کہ ہمارا جو جی

چاہے کرسکتے ہیں۔ لیکن انسان کے خالق کو معلوم ہے (جس نے نہ صرف انسان کو بنایا بلکہ تمام مخلوق کو بنایا) کہ یہ بات انسان کے لیے زہرِ قاتل ہے کہ اپنی ہر خواہش کی تکمیل کے پیچھے پڑ جائے۔ انسان میں یہ فطری کمزوری رکھی گئی ہے کہ اس کے لیے اعمال کے اور خواہشات کی تکمیل کے حدود رکھنے بہت ضروری ہیں۔ ورنہ اگر انسان اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گیا تو تھوڑے ہی دنوں میں ایک دوسرے کا مال کھانے میں لگ جائے گا اور پھر ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائے گا اور اس طرح زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ جیسا آج کل مشاہدہ ہے۔ چنانچہ یہ تفصیل اشارتاً اگلی آیاتِ کریمہ میں بتائی بھی گئی ہے۔ اس طرح کہ مومنوں کو اس سے منع کیا گیا ہے۔ اس رکوع کے آخر تک یہی ذکر ہے... ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ... ایک دوسرے کو قتل مت کرو... ولا تتمنوا... بعضکم علیٰ بعض...

آیت نمبر۲۷ سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ شہوات سے انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہوجاتا ہے اور معاصی سے بعد عن اللہ ہونا سبھوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ اور یہ جو ہماری سوسائٹی ہے یا جس معاشرت کو ہم اپنانا چاہتے ہیں وہ خواہشات کی پیروی پر مبنی ہے، یعنی سب لوگ مل کر جیسا چاہیں قانون بنالیں۔ اور خواہشات کی پیروی میں سب سے زیادہ ہاتھ شہوات للنساء کا موجودہ لادینی معاشرے کی تشکیل میں ہے۔ عورتوں کی ''آزادی'' یعنی عورتوں اور مردوں کا ہر جگہ مل جل کر رہنا اور کام کرنا اور باہمی رضامندی سے جو چاہے کرنا سب اسی شہوت سے مفضی ہیں جس کے نتیجے میں انسان میل عظیم میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے جو باتیں نکاح و طلاق کی بیان فرمائی ہیں، وہ انسان کو اس میل عظیم سے بچاتی ہیں۔

آیت نمبر۲۸ میں ایک بہت بنیادی اہم بات بتائی گئی ہے۔ تھوڑا غور کرنے سے آدمی کو اس کا احساس ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے گناہ کرتے رہیں گے اور بڑے گناہوں سے بچ جائیں گے یا کوئی عورت کہے کہ ہم غیرمردوں کے ساتھ کام کریں گے اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہیں گے اور اس کے باوجود اپنی عصمت کو برقرار رکھیں گے تو یہ صریح نادانی ہے۔

یہاں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں اَن یخفف عنکم اور ایک اور جگہ ارشاد ہے یرید اللہ بکم الیسر۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں روح کی ضرورتوں اور جسمانی ضرورتوں کے درمیان پورا پورا توازن (perfect equilibrium) ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ پابندیوں سے زیادہ پابندیاں عائد کی جائیں تو ان کی پابندی ناممکن ہوجائے اور اگر کم ہوں تو انسان متقی نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ ایک دفعہ جب انسان کسی حکم کو ناممکن سمجھ کر اس کی خلاف ورزی کرلے تو پھر اس کی انتہا نہیں رہتی کہ وہ کہاں پر جا کے رُکے گا۔

شریعت کے احکام تمام تر انسان کی دنیوی اور اُخروی عافیت کے لیے ہیں اور جہاں کسی حکم کی خلاف ورزی کی جاتی ہے وہیں عافیت برباد ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی مرد اور کوئی نامحرم عورت ریل کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے ہوں اور وہاں کوئی تیسرا شخص نہ ہو اور دونوں اپنی اپنی جگہ کتاب پڑھ رہے ہوں، شریعت کہتی ہے کہ اس طرح اکیلے ڈبے میں رہنا ناجائز ہے کیوں کہ وہاں تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔ تو اگر کوئی سمجھے کہ اس کو اپنے نفس پر بڑا قابو ہے اور اس طرح سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے نکل جاتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت مضبوط ہے۔ جب کہ ایک اولوالعزم پیغمبر یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ایسے موقعے پر اپنے کو مضبوط نہیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بعد میں فرماتے ہیں وما ابری نفسی...الخ، دوسرے یہ کہ ہوسکتا ہے صنفِ مخالف کو اپنے نفس پر قابو نہ ہو یا یہ کہ اس وقت قابو نہ رہے۔ تیسرے یہ کہ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کا سفر خیر وخوبی سے بلاکسی واردات کے گزر جائے لیکن دوسروں کو عیب لگانے کا اور غیبت کا موقع تو ضرور ہی مل جائے گا۔ اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا سلامتی اور عافیت اسی میں ہے کہ ایسی حالت (situation) نہ پیدا ہو۔

اسی خلقی کمزوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ دعا مانگنا سکھایا گیا ہے اللّٰھم انی عبدک ضعیف فقوفی رضاک ضعفی رسول اللہ ﷺ فداہ امی و ابی،

بدرجۂ اتم تمام انسانوں میں سب سے زیادہ قوتِ ایمانی اور قوتِ روحانی رکھتے ہوئے یہ دعا مانگتے تھے۔

لیکن اس آیتِ کریمہ میں جس خلقی کمزوری کا ذکر ہے، وہ طبعی کمزوری اور بزدلی سے مختلف ہے جو بعض انسانوں میں ہوتا ہے اور جس کے اقتضا پر قابو پانا ایسے موقع پر بہت ضروری ہے، جہاں اس بزدلی کی وجہ سے شریعت کا کوئی حکم ضائع ہوتا ہو۔ اسی لیے عبدِ قوی کو عبدِ ضعیف سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب فرمایا گیا ہے۔

اس پورے رکوع میں (آیات ۳۱ تا ۳۶) اللہ تعالیٰ نے جو مومنوں پر رحیم، غفور اور ودود ہیں، اپنے مومن بندوں کے ساتھ اپنی بے انتہا محبت اور رحمت کا ذکر بہت ہی مؤثر انداز میں فرمایا ہے۔ تین آیاتِ کریمہ میں یکے بعد دیگرے اپنے ارادے کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ مومنوں پر توجہ فرمانا چاہتے ہیں، ان کو ان کے فائدے کی بات سکھلانا چاہتے ہیں، ان کے لیے آسانی پیدا فرمانا چاہتے ہیں۔ البتہ جو ان کے دشمن ہیں، جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، وہ اس کے برعکس چاہتے ہیں کہ تم میل عظیم میں پڑ جاؤ اور انسان کی خلقت اتنی ضعیف ہے کہ اگر وہ اس میل عظیم میں پڑ گیا تو اس کا سلامت رہنا بہت مشکل ہے۔

اور وہ بنیادی باتیں انسان کے بہت فائدے کی جو اس رکوع میں بتائی گئی ہیں دو ہیں جو دوسری بہت سی باتوں کے لیے اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک جنسی تعلقات میں حلال و حرام کی تمیز اور حلال میں ممکنہ حد تک وسعت اور خلاف ورزی کی صورت میں اس کی سخت سزا۔ دوسرے ایک دوسرے کو مالی اور جانی نقصان نہ پہنچانا۔ ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال ناجائز اور فریقین کی رضامندی کے بغیر کھانے میں ہر طرح کا مالی نقصان شامل ہے اور قتل کرنے میں جانی نقصان ہر طرح کا آجاتا ہے۔ یہ احکامات حسنِ معاشرت کے لیے اصل الاصول ہیں اور نامناسب تعلق سے اجتناب، مسئلۂ میراث اور ایک دوسرے کا حق ادا کرنا ان سب احکامات میں کتنی مصلحتیں ہیں اس کا تھوڑا سا بھی ذکر کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

آیت نمبر۳۱ میں جن سیّئات سے درگزر فرمانے کا ارشاد ہے، ان سے ''لمم'' مراد ہے۔ جیسا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے۔ اور اس طرح کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی تفریق اصل گناہ اور اس کے مقدمات سے کی ہے اور اس آیت کے مفہوم کو سورۂ نجم کی آیت نمبر۳۲ کے ہم معنی قرار دیا ہے۔

آیت نمبر۳۲ میں اختیاری اور غیراختیاری امور کے بارے میں بڑی مفید ہدایت ہے۔ شانِ نزول اس آیت کی یہ ہے کہ غالبًا ازواجِ مطہرات میں سے یا کسی اور صحابیہ نے یہ تمنا کی کہ کاش وہ مرد ہوتیں تو انھیں وہ فضیلتیں حاصل ہوتی جو مردوں کو حاصل تھیں۔ اس آیت میں اللّٰہ تعالیٰ نے جو بعض کو بعض پر خلقی فضیلت دی ہے اس کی تمنا سے منع فرمایا گیا ہے کیوں کہ یہ غیراختیاری فضیلتیں ہیں اور آخرت کی جزا کا تعلق اختیاری اعمال سے ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ مردوں کے لیے ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے ہے جو وہ کمائیں، اس میں دنیوی دولت وغیرہ بھی آ گئی اور اللّٰہ تعالیٰ سے فضل مانگنے کی عام اجازت ہے غیراختیاری ہو یا اختیاری، البتہ قانونِ فطرت کے خلاف دعا کرنے کی ممانعت دوسری جگہ نص میں ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ
وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ
بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ
فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ
سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا○ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا
فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا○ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ
وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی
وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۝ (سورۃ النسا، آیت ۳۴۔۳۸)

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بددماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں اور اگر تم (اوپر والوں) کو ان دونوں (میاں بیوی) میں کشاکش کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، عورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللّٰہ تعالیٰ ان (میاں بی بی) میں اتفاق فرما دیں گے بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں اور تم اللّٰہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہلِ قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غربا کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمھارے مالکانہ قبضے میں ہیں بے شک اللّٰہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں، شیخی کی باتیں کرتے ہوں جو کہ بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللّٰہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لیے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ پر اور

آخری دن پر اعتقاد نہیں رکھتے اور شیطان جس کا مصاحب ہو اس کا وہ
برا مصاحب ہے۔

آیت نمبر ۳۸ میں جو مردوں کو "قوامون" فرمایا گیا ہے یہ اسی قسم کی غیر اختیاری اور خلقی فضیلت ہے جس کا ذکر آیت نمبر ۳۲ میں ہے۔ اس کی دو وجوہات بھی بتا دی گئیں تاکہ اس باب میں جھگڑے کی گنجائش نہ رہے۔ ایک تو یہ کہ گھر میں کسی نہ کسی کو تو دوسرے پر برتری رہے گی ورنہ اگر دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہوں تو پھر وہ گھر کیا ہوا۔ تو یا تو مرد کو فوقیت دی جاتی یا عورت کو اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے اور مرد کو فطری فضیلت دی گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد پر ذمہ داری کما کر لانے کی ہے۔ لہٰذا وہ فطرتاً مال خرچ کرنے والا فرد ہے۔ اگر عورت پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی کہ وہ کما کر لائے اور اپنے شوہر اور بچوں کو کھلائے اور بچوں کی پرورش بھی کرے تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہوتا۔ لیکن مرد کو بھی عورت کے حقوق کے معاملے میں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں اطاعت کرانے کے لیے حد سے آگے نہ بڑھ جائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ بڑے اور برتر ہیں اور ان کے سامنے کسی مخلوق کی دوسری مخلوق پر برتری کالعدم ہے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

انفاق سے رُکنا اور صلۂ رحمی نہ کرنا اور پڑوسیوں اور پاس بیٹھنے والوں کا خیال نہ کرنا، ان سب کی جڑ عجب اور کبر ہے۔ کبھی ایسا براہِ راست تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے جیسے ایک ڈپٹی کمشنر نے اپنے باپ کو نوکروں کے کمروں (servant quarters) میں رکھا تھا اور کبھی بالواسطہ تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے اس کی برابری کریں اور چونکہ یہ برابری پیسوں ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے وہ ان پر خرچ نہیں کرتا یا لحاظاً شرماً دکھاوے کے لیے کچھ خرچ کر دے تو کر دے، لہٰذا وہ سوچتا ہے کہ ہم نے بڑی گاڑھی محنت سے یہ دولت اکٹھی کی ہے یا ہمارے آبا و اجداد ہمارے لیے کما کر چھوڑ گئے ہیں، لہٰذا ہم دوسروں کو کیوں دیں، یعنی وہ مال و دولت کو خدا کی دین نہیں سمجھتا۔ اور کبر کی جڑ کفر سے ملتی ہے، لہٰذا بخل اور فخر کرنا مومن کی شان نہیں ہے، اسی

لیے آیت نمبر ۳۶ کی آخر میں ''اعتدنا للکفرین'' فرمایا گیا ہے اور تکبر اور تفاخر کی سزا ذلت و رسوائی ہے، لہٰذا ''مھینا'' فرمایا گیا ہے۔

اور ایک سزا بخل کی دنیا میں بھی ملتی ہے کہ بخیل اپنے کو پھٹے پرانے حال میں رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے اس کو دیا ہے اسے چھپاتا رہتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے فضل کو ظاہر کرنے کا حکم فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اسے دیا ہے، وہ اس کے چہرے اور لباس، پوشاک سے ظاہر ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے کہ فخر اور احداثِ نعمت میں (اسی طرح بخل اور سخاوت میں) کتنا باریک فرق ہے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے (ازراہِ تفاخر) خرچ کرنا بھی خدا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی بخل (برخلاف سخاوت کے) کی ایک شاخ ہے کیوں کہ ایسا انفاق مقبول نہیں ہے۔

اور آخر میں یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ یہ سب شیطان سے دوستی کا ثمرہ ہے۔ کیوں کہ شیطان جس کا ساتھی ہوگا اس کو یہ سب بتلائے گا اور دنیا میں اور آخرت میں اس کا یہ حشر ہوگا۔ ایک اور جگہ اسی بات کو دوسرے عنوان سے بتلایا گیا ہے کہ شیطان تمھیں بخل کرنے کو کہتا ہے۔ تنگی اور افلاس سے ڈرا کر کہ اللہ کی راہ میں دے دو گے تو خود فقیر ہوجاؤ گے۔ وہاں ''بخل'' کا صراحتاً ذکر نہیں ہے بلکہ ''فحشا'' کا لفظ ہے جس میں بخل اور ہر بری اور نامناسب بات داخل ہے، فالحمدللہ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا O (سورۃ النسا، آیت ۴۸)

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوائے اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔

• اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيۡدًا○(سورۃ النسا، آیت ۱۱۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخشیں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

ایک مضمون دو جگہ دُہرایا گیا ہے، ایک میں شرک کو اثمِ عظیم قرار دیا گیا ہے اور دوسری جگہ اس کو ضلالِ بعید فرمایا گیا ہے۔ پہلی آیت اہلِ کتاب سے متعلق معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس آیت سے پہلے ان کو ایمان لانے کو کہا گیا ہے قبل اس کے کہ ان کے چہرے بگاڑ دیے جائیں۔ اور دوسری آیت مشرکین سے معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس کے بعد ان مشرکین کا بتوں کو اور شیطان کو پکارنے کا ذکر ہے۔ اہلِ کتاب میں سے جو گناہوں میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کے دل سے ایمان کی قدر ہی جاتی رہی اور وہ کافروں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں... **ھٰؤلآء اھدیٰ... سبیلا**۔ مزید تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اور شرک دونوں درحقیقت ایک ہی ہیں اور کفار اور مشرکین دونوں جہنم میں رہیں گے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جو شرک نہیں کرتے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے لیکن دوسری جگہوں پر صریحاً ان کے خلود فی النار کا ذکر ہے۔ تلک الرسل پارہ کی دوسری آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے (والکفرون) باللّٰہ (ھم الظالمون) المشرکون باللّٰہ۔

• اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا○(سورۃ النسا، آیت ۴۹)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ
جس کو چاہیں مقدس بنا دیں اور اُن پر تاگے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

گرچہ یہ آیت مفسدین اہلِ کتاب کے متعلق ہے کہ وہ اپنے آپ کو پاکیزہ بتاتے تھے۔ لیکن عام اشارہ ملتا ہے کہ اپنے آپ کو پاکیزہ بتانا کہ ہم اتنے پاکیزہ ہیں اور اتنے اچھے ہیں، اسی طرح گندگی کی دلیل ہے جس طرح شیطان کا انا خیر منہ کہنا تھا۔ ہرگز اپنی خوبیوں پر نظر نہ رکھو۔ نہ دوسروں پر اپنی خوبیوں اور بڑاپے کا ذکر کر کے رعب جماؤ۔ بلکہ ہمیشہ خدا کی رحمت پر نظر رکھو اور خدا سے ڈرتے رہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (سورۃ النسا، آیت ۵۹)

اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہلِ حکومت ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسولؐ کے حوالے کر دیا کرو، اگر تم اللہ پر اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک طرف تو اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے تو دوسری طرف اولی الامر سے اختلاف کرنے اور اس سے جھگڑا کرنے کا بھی حق معلوم ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر فیصلہ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہوگا اور پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے علما کی طرف رجوع کیا جائے گا جو از روئے حدیث شریف ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' رسول (ﷺ) کے وارث ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جید علما ہی کو قاضی (یا Judge) بنایا جاسکتا ہے جو اللہ اور رسول (ﷺ) کی مرضی معلوم

کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اگر حاکم کے خلاف قاضی کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہو تو حاکم کو عدالت کی حاضری سے مستثنٰی نہیں کیا جاسکتا۔

احکام کا اصل منبع (ultimate authority) اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں جو رسول ﷺ کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کے مقرر کردہ والیوں کے خلاف کوئی شکایت ہوتی تو وہ حضور ﷺ کے دربار میں پیش ہوتی اور حضور ﷺ کے وصال کے بعد خلیفہ حاکم کے مقرر کردہ قاضی کے ہاں پیش ہوتی اور وہاں اس کا فیصلہ ہوتا۔ یہ بات کہ حاکم کا حکم آخری بات نہیں ہے اور اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے اور وہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے اور یہ بات کہ اس کے وضع کردہ کسی قانون کو بھی بلا چون و چرا ماننا ضروری نہیں ہے، سیکڑوں سال تک مسلمانوں کی حکومتوں کا طرۂ امتیاز رہی۔ اور یہ بات کہ گئے گزرے حکمرانوں نے بھی ہمیشہ ایسے علما ہی کو قاضی بنایا جن کے فقیہہ ہونے کو عوام بھی مانتے تھے اور خواص بھی۔ یہ سب باتیں اسلام کا اعجاز ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ صحیح اسلامی حکومت صرف چند برسوں تک رہی حالانکہ وہ دراصل ایک آئیڈیل (ideal) حکومت تھی اور کسی آئیڈیل کا چند دنوں کے لیے بھی حقیقت بن جانا بہت بڑی ہے۔ اسلامی حکومت کی بنیادی قدریں لوگوں کے نزدیک ہمیشہ واضح رہی ہیں۔ فالحمد للہ۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۗ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ (سورۃ النسا، آیت ۶۶)

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کردیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہوجایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجا لاتا اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ثابت قدمی کا، کردار میں پختگی کا اور اعمال میں صبر

(perseverance) کا یہی ایک نسخہ ہے۔ ایک امر پر عمل کرنے سے دوسرے امر پر عمل کرنے میں تقویت ملتی ہے۔ اسی طرح ایک نہی کو ترک کرنے سے دوسری نہی کو ترک کرنے میں آسانی ہوتی ہے، مثلاً اگر نظرِ بد سے تم رک گئے تو یقیناً زنا سے رک جاؤ گے۔ اسی طرح اگر نماز کے لیے تم فجر کے وقت وضو کرکے مسجد چلے گئے تو توقع ہے کہ جہاد کے وقت بھی تمھارے قدم خود بخود اٹھ جائیں گے۔ اسی طرح برائی بھی پھیلنے والی بیماری ہے، مثلاً ایک جھوٹ سے سیکڑوں جھوٹ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن توبہ و استغفار اور ندامت ان پر روک (brake) لگا دیتا ہے۔ اور توبہ قبول ہوجائے تو برائی پھیلنے سے رُک جاتی ہے۔ برخلاف اس کے نیکی سے نیکی پیدا ہونے کی کوئی حد نہیں ہے۔ توبہ کرو گے جب نیکی میں ترقی ہوگی اور شکر کرو گے جب ترقی ہوگی۔ البتہ تکبر سے تمام نیکیاں خاک میں مل جاتی ہیں کیوں کہ تکبر شرک کا ایک شعبہ ہے۔ کیوں کہ ''متکبر'' صرف ایک ہی ہستی کی صفت ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کی زبان سے فرمایا ہے، ''الکبر روائی'' اللہ تعالیٰ مجھے اور مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ (آمین)

وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا○ وَلَئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا○ (سورۃ النسا، آیت ۷۲، ۷۳)

اور تمھارے مجمع میں بعضا بعضا شخص ایسا ہے جو ہٹتا ہے پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا تو کہتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوجاتا ہے تو ایسے طور پر کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں۔ کہتا ہے کہ ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی ان لوگوں کا شریکِ حال ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی۔

یہ حالت منافقین کی ہے۔ ان کی یہ باتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کو مسلمانوں سے دلی محبت بالکل نہیں تھی۔ کان لم تکن... مودۃ۔ کیوں کہ اگر محبت ہوتی تو ان کے کامیاب اور کامران لوٹنے پر خوشی ہوتی اور مالِ غنیمت میں حصہ نہ بٹا سکنے کا افسوس نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ یہ منافقین اتنے بے وقوف ہیں کہ مسلمانوں پر اگر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اس میں ان کے ساتھ نہ رہنے پر خوش ہوتے ہیں اور اگر کوئی غزوہ سر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ نہ رہنے پر افسوس کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی منافقت ظاہر کردیتے ہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

(سورۃ النسا، آیت ۷۴۔ ۷۶)

تو ہاں اس شخص کو چاہیے کہ اللّٰہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور جو شخص اللّٰہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ جان سے مارا جائے یا غالب آجاوے تو ہم اس کو اجرِ عظیم دیں گے اور تمھارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللّٰہ تعالیٰ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے (غیب سے) کسی دوست کو کھڑا کیجیے اور ہمارے لیے غیب سے کسی حامی کو بھیجے جو

لوگ پکے ایمان دار ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو، واقع میں شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔

جہاد کی اوّلین شرائط میں سے اس میں سوائے اللہ تعالیٰ کی رضا کے اپنی کسی اور غرض کا شامل نہ ہونا ہے۔ اسی جذبے کے تحت کہ انھوں نے اپنی دنیا کو آخرت کے عوض بیچ دیا تھا بہت سے صحابہ کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ جہاد میں شہید ہوجائیں۔ ان کے حق میں قضیٰ نحبہ کی خوش خبری ہے۔ فالحمدللہ... اس میں اور ہوسِ ملک گیری کے لیے لڑائی میں فرق صاف ظاہر ہے۔ آیت نمبر۷۵ میں اس کے فرض ہونے کا ذکر ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد صرف اپنے دفاع ہی کے لیے فرض نہیں ہے بلکہ اس صورت میں جب کہ کسی ملک میں ظلم ہو رہا ہو چہ جائے کہ مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو اور وہاں کے لوگ اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہوں (دل سے یا زبان سے بھی یا مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہوں کہ ہمیں ظلم سے نجات دلائیے) تب بھی فوج کشی مظلوموں کو ظلم کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے بشرطِ استطاعت فرض ہے۔

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ حَسَنَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ۝ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ وَاَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ۝ (سورۃ النسا، آیت ۷۸،۷۹)

تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں ہی تم کو موت آدبادے گی اگرچہ تم قلعی چونے کے

قلعوں ہی میں ہو اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ (اتفاقاً) ہوگئی اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کے سبب سے ہے۔ آپ فرما دیجیے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے تو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے۔ اے انسان تجھ کو جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہیں۔

پہلی آیتِ کریمہ میں جو فرمایا گیا ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے یہ تکوینی بات تھی اور دوسری جگہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر اچھائی پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچی اور اگر برائی پہنچی تو یہ خود تمھارے نفس کی طرف سے ہے، یہ تشریعی بات ہے۔ یعنی قانون یہ ہے کہ جب بھی تمھیں کوئی نقصان پہنچے گا تو یہ خود تمھارے کیے کی بدولت ہوگا، خواہ براہِ راست کسی گناہ کا نتیجہ ہوگا، خواہ بالواسطہ کہ ایک گناہ سرزد ہوا پھر اس پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسرا گناہ ہوا پھر اس سے تیسرا گناہ سرزد ہوا، اس طرح ایک سلسلہ ہوگیا جس کے نتیجے میں مصیبت پہنچی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی کج فہم اس آیت سے یہ مطلب نکالے کہ یہ خطاب چوں کہ رسول اللہ ﷺ سے ہے اس لیے نعوذ باللہ حضور ﷺ سے بھی کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو تو اس کا رد اگلی آیت میں ہے کہ جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور اللہ کی اطاعت سے بھلائی ہی پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت سے بھی بھلائی ہی پہنچ سکتی ہے اور اس کو رسول کی طرف منسوب کرنا انتہائی بے وقوفی کی بات ہے جیسا آیت نمبر ۷۸ میں ہے کہ اس قوم کو کیا ہوا ہے کہ یہ بات ہی نہیں سمجھتی۔ تکوینی طور پر جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے اچھائی کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اور برے احوال کو رسول کی طرف منسوب کرنا بڑی بے وقوفی ہے کیوں کہ موٹی سی بات ہے کہ تکوینیات میں رسول ﷺ کو کیا دخل ہے۔ اتنی موٹی سی بات بھی یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں ذمہ داری کا ذکر ہے کہ اچھائی ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا۔ اگر اس کی طرف سے مدد نہیں ہوتی، اگر وہ اپنے اوپر رحمت فرض نہیں کرلیتا (کتب... الرحمۃ) اگر وہ انسان کو صرف عمل اور ردِعمل کے قانون پر چھوڑ دیتا، اگر وہ بہت سی قابلِ مواخذہ باتوں کو معاف نہیں کردیتا (یعفوا عن کثیر) تو یہ اچھائی کبھی نہیں پیش آتی اور یہ نیکی کا کام ہرگز سرزد نہیں ہوتا۔ دراصل نیکی تو وہی ہے جس کے ساتھ انابت اور رجوع الی اللہ شامل ہو ورنہ وہ صرف صورتاً نیکی ہے۔ اس کے برعکس جو برائی پیش آتی ہے، وہ اپنے ہی کیے کی سزا ہوتی ہے یا عمل اور ردِعمل کے قانون کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوتو وہ صرف صورتاً برائی ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ برائی ردِعمل کی وجہ سے پیش آتی ہے کسی گناہ کی سزا نہیں ہوتی، مثلاً ایک بہت جھوٹی سوسائٹی میں کوئی شخص سچ بولے تو اس کو تکلیف تو اٹھانی ہوگی لیکن اس کا اجر بھی ملے گا اور یہ صرف صورتاً برائی ہوگی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم بالائے کرم ہے کہ نیک عمل (مثلاً تہجد کی نماز) کی توفیق بھی دیتے ہیں اور پھر اس پر اجر بھی دیتے ہیں۔ ہر نیک عمل کو اس کی توفیق سمجھو اور اس میں ہر کوتاہی کو اپنی طرف سے سمجھو، اسی میں تمھاری نجات ہے کیوں کہ انسان پیدا ہی ظلوماً جھولا کیا گیا ہے ورنہ اس کی غفورٌ رحیمی کا مورد کون بنتا؟ اگر کوئی گناہ سرزد ہوجائے یا کوئی مصیبت پہنچے تو فوراً ربی انی ظلمت نفسی فاغفرلی... کہو (اور یہ نہ کہو کہ نہ معلوم یہ مصیبت ہم پر ہی کیوں آئی) کیوں کہ یہی ادب ہے جس سے محروم کے بارے میں ہے:

بے ادب محروم گشت از فضل رب

کیوں کہ ادب تمام تر حقوق اور حدود کی حفاظت ہے۔ فالحمدللہ۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝ (سورۃ النساء، آیت ۸۵)

جو شخص اچھی سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

سفارش کی دو قسمیں بیان فرمائی گئی ہیں ایک حسنہ اور ایک سیئہ اور ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل اقلیدس کا سیدھی خط (Geometric straight line) ہے یعنی کوئی ایسی سفارش نہیں ہے جو بین بین ہو جس طرح تمام اعمال کی تقسیم دو طرح پر ہے، اچھے اور برے۔ مباحات میں بھی یا تو انسان کوئی مباح کام خدا کی رضا کے لیے کرکے ثواب کما لیتا ہے یا اس کو ضائع کردیتا ہے۔ جیسا سورۂ والعصر میں ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔ ہر لحہ کم از کم ایک گھاٹا تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ عمر گزرتی جاتی ہے، وقت گزرتا جاتا ہے اور ضائع ہوتا رہتا ہے۔ الا یہ کہ آدمی ایمان لاکر اور اعمالِ صالحہ کرکے اس گھاٹے سے اپنے کو بچالے۔

یہ حدِ فاصل دو طرح کی سفارشوں میں جو بال سے زیادہ باریک ایمان اور فہم کی کمی کے باعث موٹی (blurred) نظر آتی ہے اور اس طرح ایک border علاقہ بن جاتا ہے جو حسنہ اور سیئہ کے بیچ میں سمجھا جاتا ہے۔ اور جتنی نگاہ کمزور ہوگی (یعنی vision جتنا blurred ہوگا) اتنا ہی موٹا یہ علاقہ نظر آئے گا اور جتنی فہم میں ترقی ہوگی اتنی ہی اچھے اور برے میں تمیز بڑھتی جائے گی۔ ایمان کی روشنی جتنی تیز ہوگی، اتنا ہی یہ بات واضح ہوگی کہ یہ سفارش جائز ہے یا ناجائز۔ اسی جائز اور ناجائز کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت کو فرقان کہتے ہیں۔ جملہ اعمال کا یہی حال ہے۔

❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○ (سورۃ النساء، آیت ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کرکے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمھارے سامنے اطاعت ظاہر کرے دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں کیوں کہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا، سو غور کرو بے شک اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

یہاں بھی وہی نیت کے خالص کرنے کی بات ہے۔ جن صحابی نے بھی کہا تھا کہ صرف جان بچانے کے لیے اپنے کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے، ان کے دل میں ہرگز نہیں ہوگا کہ اس کو قتل کردیں تو مالِ غنیمت ملے گا لیکن چونکہ اس فعل میں جو انھوں نے کیا تھا، اس بات کا شائبہ تھا کہ دوسرے لوگ جو ان کی تقلید کرتے ان کی نیت کا خالص ہونا غیر یقینی تھا اس لیے ان کو سختی سے اس پر تنبیہ کی گئی۔ جس طرح ایک اور آیت میں بعض کو بطور تنبیہ خطاب ہوا تھا منکم من یرید الدنیا... صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نیت کو خالص کرنے کی خاص تعلیم دی گئی تاکہ وہ قیامت تک کے لیے آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار رہیں۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک کافر کو قتل کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیا جس نے آپؓ کے منھ پر تھوک دیا تھا۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○ وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ

بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا O (سورۃ النساء، آیت ۹۸۔۱۰۰)

لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں کہ وہ کوئی تدبیر کرسکتے ہیں اور نہ راستے سے واقف ہیں، سو ان کے لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑے مغفرت کرنے والے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور بہت گنجائش اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہوگیا اللہ تعالیٰ کے ذمے، اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں بڑے رحمت والے ہیں۔

یہ سب آیتیں ہجرت سے متعلق ہیں۔ ہجرت اس وقت فرض ہوجاتی ہے جب اپنے وطن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے پر لوگ جان کے دشمن ہوجائیں اور کسی دوسرے ملک میں امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزر سکنے کی امید ہو۔ آیت نمبر۹۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان مجبوری میں فرض کا مکلّف نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی مجبوری واقعی نہ ہو صرف خیالی ہو۔ اللہ تعالیٰ کو صحیح حال کی خبر ہے، لہٰذا ایسے موقعے پر اللہ تعالیٰ کا عفو اور اس کی مغفرت پر نظر رہنی چاہیے۔ اسی طرح جو آیۂ کریمہ سؤر کے گوشت وغیرہ کے حرام ہونے کے بارے میں ہے، وہاں بھی حالتِ اضطرار میں معافی کے اعلان کے ساتھ ساتھ واللہ غفور رحیم بھی ہے۔

آیت نمبر۱۰۰ میں جو وعدہ رزق کی فراوانی کا ہے، وہ اپنی جگہ پر ہے مگر ہجرت بذاتِ خود ثواب کا کام ہے اور جو شخص ہجرت کرتا ہے ثواب کی نیت سے، اپنے دین کو بچانے کے لیے، دنیا حاصل کرنے کے لیے نہیں، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہوگیا۔ فالحمدللہ۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○ (سورۃ النساء، آیت ۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمالِ بددماغی یا بے پروائی کا ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں اور یہ صلح بہتر ہے اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ حق تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

یہاں دو بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ''صلح'' اچھی چیز ہے۔ خصوصاً میاں بیوی کے درمیان، اسی طرح دو بھائیوں کے درمیان یا قریبی رشتے داروں کے درمیان۔ دوسرے یہ کہ ''شح'' نفسِ امارہ کی خاصیت ہے اور اس مادّے کو ضعیف کرنے کے لیے ایک دوسرے پر احسان کرتے رہنا اور (ایک دوسرے کے حقوق کے بارے میں خصوصاً اور تمام معاملات میں عموماً) اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ انسان کے اندر ایک طرف بخل کا مادّہ ہے تو اس کے ساتھ ہی دوسرے کے ساتھ احسان کرنے کا مادّہ بھی ہے جس سے کام لینا چاہیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○ (سورۃ النساء، آیت ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللّٰہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتے داروں

کے مقابلے میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو دونوں کے ساتھ
اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے سو تم خواہشِ نفس کا اتباع مت کرنا، کبھی تم حق سے
ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ
تمھارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے انصاف (جس کو قسط اور عدل سے تعبیر کیا جاتا ہ
صحیح مفہوم متعین ہوتا ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اسلام میں کسی "ism" کی گنجائش
ہے۔ انصاف کے معاملے میں نہ یہ دیکھتا ہے کہ خود مجھ پر یا میرے اقربا پر کیا اثر پ
گا، نہ امیر کا لحاظ کرتا ہے، نہ غریب کا لحاظ کرتا ہے۔ قسط و عدل اور ایلا، اعراض اور ا
ہونے میں جو فرق ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور مومنین پر تو بہت واضح ہے۔ اب ہر
اپنے کو دیکھ لے کہ اس کا یہ عمل خدا کے حکم کی تابع داری میں ہے یا اپنی خواہشاتِ نف
کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ اور عدل و انصاف سے ہٹنے کا یہ جواز پیش کرنا کہ اس
غریبوں کا فائدہ ہوگا (communism) یا مزدوروں کا فائدہ ہوگا وغیرہ وغیرہ یہ سب
اتباعِ ہوا کی شاخیں ہیں۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا O الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا O (سورۃ النساء، آیت ۱۳۸، ۱۳۹)

منافقین کو خوش خبری سنا دیجیے اس (امر) کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا
ہے جن کی یہ حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر،
کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا خدا کے قبضے میں ہے۔

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کو یہ وعید سنانا چاہیے۔

(۲) کتنی مماثلت ہے ان لوگوں سے جنھوں نے کافروں کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کا خون کیا!

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۝ (سورۃ النساء، آیت ۱۴۷)

(اور اے منافقو!) اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم سپاس گزاری کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والے خوب جاننے والے ہیں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ قدس اللہ سرہٗ نے اپنی مجلسِ خاص میں ۲۶/ اگست ۱۹۸۰ء کو فرمایا، ''شکر میں استغفار بھی شامل ہے۔ ما یفعل... علیما۔ تمام قابلِ مؤاخذہ باتوں سے مؤاخذہ اٹھا لیا جائے گا اگر تم شکر کرتے رہو گے۔ ایک گلاس پانی جو ٹھنڈا تم نے پیا اور دو چمچے پانی جو بچا ہوا تھا، وہ پھینک دیا تو کیا یہ ناقدری نہیں ہے نعمت کی؟ کیا اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا؟ کیا اس پر کبھی استغفار کیا ہے تم نے؟ تمام دنیا کے سائنس داں مل کر بھی بنانا چاہیں تو یہ دو گھونٹ ٹھنڈا پانی نہیں بنا سکتے... ہمارے حضرتِ والا... ایک شخص کے چند قطرے دودھ پھینک دینے پر ناراض ہوئے۔ فرماتے تھے، میرا تو دل لرز جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس مقدار کثیر سے ہم متمتع ہوں اور نفع اٹھائیں اس نعمت کی قلیل مقدار کی ہم ناقدری کریں۔''

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۝ (سورۃ النساء، آیت ۱۶۰، ۱۶۱)

سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں، ان پر حرام کردیں اور بسبب اس کے کہ وہ بہت سے آدمیوں کے لیے اللّٰہ تعالیٰ کی راہ سے مانع بن جاتے تھے اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کے لیے جو ان میں سے کافر ہیں، دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے۔

ایک تو تشریعی طور پر حرام کرنا ہوا جس کا ذکر یہاں ہے۔ دوسرے تکوینی طور پر حرام کرنا ہوتا ہے جیسے بنی اسرائیل کے لیے وہ علاقہ جس پر ان کی حکومت مقدر کردی گئی تھی، چالیس سال تک کے لیے حرام کردیا گیا۔ ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے۔ اب وہی قوم توبہ کرلے تو وہی انعامات جو اس قوم پر حرام کردیے گئے تھے، یک لخت لوٹا نہیں دیے جاتے، یعنی ایسا ہونا ضروری نہیں ہے، مثلاً اگر سزاءً وہ انعامات پچاس سال تک کے لیے چھین لیے گئے تھے اور توبہ کے بعد پانچ سال میں لوٹا دیے جائیں تو یہ بھی بڑی معافی ہے اور وہ گناہ جن پر ایسی سخت سزا ہوسکتی ہے جن کا یہاں ذکر ہے وہ ظلم، سود اور لوگوں کا مال ناحق کھانا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًاO اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ط وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًاO
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَاعْتَصَمُوْا بِہٖ فَسَیُدْخِلُھُمْ فِیْ رَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَفَضْلٍ وَّیَھْدِیْھِمْ اِلَیْہِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًاO (سورۃ النساء، آیت ۱۶۸، ۱۶۹ اور ۱۷۵)

بلاشبہ جو لوگ منکر ہیں اور دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں اللّٰہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوائے جہنم کی راہ کے اور کوئی راہ دکھلاویں گے

اس طرح پر کہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کریں گے اور اللّٰہ تعالیٰ کے نزدیک
یہ سزا معمولی بات ہے۔
سو جو لوگ اللّٰہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اللّٰہ کو مضبوط پکڑا سو ایسوں کو
اللّٰہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کریں گے اور اپنے فضل میں اور اپنے تک ان
کو سیدھا رستہ بتلا دیں گے۔

یوں تو بالآخر مقامِ حیرانی و خاموشی آجاتا ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کے لیے ایک عقل مند اور پڑھے لکھے آدمی کو جہنم کے راستے پر چلانا بہت آسان ہے۔ لیکن ایسا راستہ ان ہی کو دکھایا جائے گا جو کافر اور ظالم ہیں۔ اس کے برعکس مومنین کو جو اللّٰہ تعالیٰ کا راستہ مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں، صراطِ مستقیم پر چلائے جانے کی خوش خبری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی درست ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اور بلاسبب بھی ہوسکتی ہے، مثلاً انسان گناہوں کے بعد توبہ کرلے تب بھی اسے سیدھا راستہ دکھا دیا جاتا ہے۔ فالحمد للّٰہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (سورۃ المائدہ، آیت ۲)

اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو کہ بیت الحرام کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں اور جس

وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کیا کرو اور ایسا نہ ہو کہ تم کو کسی قوم سے
(جو اس سبب سے) بغض ہے کہ انھوں نے تم کو مسجدِ حرام سے روک دیا تھا وہ
تمھارے لیے اس کا باعث ہوجاوے کہ تم حد سے نکل جاؤ اور نیکی اور تقویٰ
میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے
کی اعانت مت کرو اور اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرا کرو بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ سخت سزا دینے
والے ہیں۔

''شدید العقاب'' کئی معنوں میں ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بادشاہِ مطلق ہے۔ اس کے سامنے کسی کی زبان نہیں کھل سکتی۔ بڑے سے بڑے گناہ کو چاہے تو بخش دے اور چھوٹے گناہ پر چاہے تو گرفت کرلے۔ دوسرے یہ کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم اپنی کم عقلی کی وجہ سے چھوٹی سمجھتے ہیں اور درحقیقت وہ بڑی باتیں ہوتی ہیں (تحسبونه هينا وهو عند اللّٰه عظيم) تو ایسا نہ ہو کہ تم جسے معمولی نافرمانی سمجھو وہ بہت بڑا گناہ ہو۔ تیسرے یہ کہ چھوٹے گناہ سے غفلت اور اس پر اصرار اسے کبیرہ بنا دیتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو گناہ نہ سمجھنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے شعائر اللّٰہ کے ساتھ تھوڑی سی بھی بے ادبی ہوگی یا نیک لوگوں کی ایذا رسانی میں تھوڑی سی بھی شرکت ہوگی تو اس کی بڑی سزا ہوگی۔ چوتھے یہ کہ آخرت کی سزا چونکہ دائمی ہے اس لیے اگر معمولی سی سوزش بھی ہوجائے تو یہی بہت بڑی سزا ہوجائے اور شدید العقاب اور سریع الحساب مالک یوم الدین کی ضروری صفات ہیں۔ لہٰذا اللّٰہ تعالیٰ سے جتنا بھی ڈرا جائے کم ہے۔ ''اتقوا اللّٰہ'' کے حکم کی تعمیل کے بے انتہا درجات ہیں اور ایمان خواہ کسی بھی درجے کا ہے، آدمی کو کسی نہ کسی درجے کا متقی بنا دیتا ہے، اسی لیے یہاں مومنوں سے خطاب ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ
بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ

السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ لا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O(سورة المائدہ، آیت ۳)

تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیراللہ کے نامزد کردیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرجاوے اور جو کسی ضرب سے مرجاوے اور جو اونچے سے گر کر مرجاوے اور جو کسی ٹکر سے مر جاوے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے لیکن جس کو ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے اور یہ کہ تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ ہیں آج کے دن نا اُمید ہوگئے کافر لوگ تمھارے دین سے، سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔ آج کے دن تمھارے لیے تمھارے دین کو میں نے کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کردیا اور میں نے اسلام کو تمھارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہوجاوے بشرطے کہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں رحمت والے ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ "الیوم اکملت... اور اذا جآء نصر... میں جو ربط ہے، وہ سمجھ میں آیا کہ نعمت اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری کردی، قیامت تک کے لیے اب اس میں اضافہ نہیں ہوگا۔ نہ اس کے پہلے کوئی ایسی آیت نازل ہوئی، نہ اس کے بعد... تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ فسبح... واستغفرہ۔ شکر ادا کیجیے اللہ تعالیٰ کا اور شکر میں جو قصور ہوجائے تو اس کے لیے استغفار کیجیے۔ استغفار سے تکمیل ہوجاتی ہے شکر کی۔ تمام اعمال (صالح) میں جو نقائص رہ جاتے ہیں، جو تقصیر ہوجاتی ہے، وہ پوری ہوجاتی ہے، استغفار سے۔ دین کے پانچوں شعبوں میں یہی کیجیے، اسی کا مطالبہ ہے۔

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ
لَّکُمۡ ۪ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۫ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ
وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ
اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ
اَخۡدَانٍ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ
مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۵)

آج تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کی گئیں اور جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمھارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں جب کہ تم ان کو اُن کا معاوضہ دے دو اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس شخص کا عمل غارت جاوے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔

۱ یعنی اہلِ کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح کرو تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کے لیے کرو۔ شہوت رانی یا چوری چھپے آشنائی کے لیے نہیں۔ جب میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے تو ایک دوسرے سے تعلقات کی بنیاد بھی پاکیزگی اور عزت و احترام پر قائم ہوجاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص نکاح میں اتنی آزادی کا غلط استعمال کرے اور مقصد صرف داشتہ رکھنا ہو، بیوی بنانا نہ ہو تو یہ ایمان ہی کے خلاف بات ہوگی۔ اگر کوئی اللہ کے احکام کو توڑ مروڑ کر اسے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے جواز بنائے یا اللہ تعالیٰ کے قوانین کو حیلہ سازی سے پسِ پشت ڈال دے یا صرف لوگوں کے سامنے اس پر عمل کرے اور تنہائی میں عمل نہ کرے اور سمجھے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے تو ایسے شخص کا ایمان ہی سلامت نہیں ہے۔

اشارتًا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعضے گناہ ایسے ہیں (اور خصوصًا ایسے تاویلات جن

کا یہاں ذکر ہے، ایسے ہیں) جس سے ایمان چھن جاتا ہے اگر وہ پہلے سے موجود ہو اور سارے اعمالِ صالحہ حبط ہوجاتے ہیں۔ فاعوذ باللّٰہ من ذلک۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۶)

اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور (دھوؤ) اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو اور اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو اس زمین پر سے اللّٰہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں لیکن اللّٰہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک صاف رکھے اور یہ کہ تم پر اپنا انعام تام فرما دے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

جس طرح پانی اللّٰہ تعالیٰ کے حکم سے پاک کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح مٹی سے تیمم اللّٰہ تعالیٰ کے حکم سے پاک کرتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے چاہا کہ مسلمانوں پر کسی طرح کی تنگی نہ ہو اور یہ بھی چاہا کہ مسلمان پاک صاف رہیں تو حکم دیا کہ مٹی سے جب مسح کیا جائے گا تو یہ پاک کردے گی۔ لہٰذا تیمم کو وضو یا غسل سے کسی طرح کم سمجھنا اگر پانی نہ

ہو یا اس سے مرض میں نقصان ہوتا ہو اور اس کی وجہ سے کسی حاجتِ بشری کو ملتوی رکھنا جائز نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس پر شکر واجب ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۷۔۱۱)

اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے جب کہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مان لیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ دلوں تک کی باتوں کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے، انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور خاص لوگوں کی عداوت تمھارے لیے اس کا باعث نہ ہوجائے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور انھوں نے اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور ثواب عظیم ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھوٹا بتلایا ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے جب کہ ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی

کریں سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابوتم پر نہ چلنے دیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور
اہلِ ایمان کوحق تعالیٰ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیے۔

گرچہ یہاں میثاق کا ذکرِ نعمت کے علاوہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ میثاق بذاتِ خود بڑی نعمت ہے، بلکہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے کفار و مشرکین محروم ہیں۔

اس رکوع کو یایھا الذین امنوا سے شروع کیا گیا ہے اور آخری آیت میں بھی اسی لقب سے خطاب فرمایا ہے اور مؤمنون پر ختم کیا گیا ہے۔ اس رکوع میں ایک آسانی ہے جو آیت نمبر۶ میں ہے۔ ایک حکم ہے یعنی ''اعدلوا'' چاہے کوئی بھی موقع ہو، چاہے فریق مقابل دشمن ہی قوم کا کیوں نہ ہو اور کئی نعمتوں کو یاد دلایا گیا ہے۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑا یہی میثاق ہے جسے یاد رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تمھارا یہی قول جو تم سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت نے کہلوایا کہ ''سمعنا واطعنا'' یہی تو اصل نعمت ہے جس سے تم اس مالکِ بر و بحر عالم الغیب والشھادۃ اور قادرِ مطلق کے خاص بندے بن گئے۔ جسے تم میثاق والی ملازمت (Government Service) کی مثال سے سمجھ سکتے ہو یہی میثاق یعنی covenant کیا سب کو ملتا ہے؟ نہیں صرف خاص خاص لوگوں کو اس ملازمت میں شامل کیا جاتا ہے۔ دنیا ہی میں دیکھ لو۔ معمولی ملکۂ برطانیہ کی اس اعلیٰ نوکری جس کو covenented service کہا جاتا تھا، اس میں جو داخل ہوجاتا تھا، وہ اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتا تھا اور کتنا وفادار (loyal) ہوتا تھا، تاجِ برطانیہ کا خواہ اس کی تنخواہ پانچ سو ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں کسی برطانوی فرم کا جنرل منیجر بھی اپنے کو کمتر محسوس کرتا تھا۔ اور اب بھی (یعنی ۱۹۷۱ء تک) کسی C.S.P افسر کا مقابلہ کسی بڑی ٹیکسٹائل مل کے ویونگ ماسٹر (weaving master) سے کر کے دیکھ لو۔ سبحان اللہ جس کو اللہ اپنی میثاق والی نوکری (covenent service) کا ممبر بنالے اس پر کتنا شکر واجب ہے! اور وہ بھی ایسی نوکری کہ بڑی سے بڑی غلطی سرزد ہوجائے تو توبہ سے معاف ہوجاتی ہے۔ صرف وفاداری (loyalty) شرط ہے اور اس کے بدلے میں وعدہ کیا

ہے ''مغفرۃ'' کا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے آخرت میں آنے والی باتوں کو تمثیلی طور پر دنیا میں بھی واضح طور پر ظاہر فرماتا رہتا ہے۔

اور جس نعمت کا ذکر آیت نمبر ۱۱ میں ہے، وہ بحمدللہ ہم میں سے کئی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے موقع پر دیکھ چکے ہیں۔ نیز ہمارے نسبی باپ داداؤں پر جو احسان ہوا (یا جو بعد میں مسلمان ہوئے ان کے روحانی باپ دادوں پر جو احسان ہوا) وہ گویا ہم پر بھی احسان ہوا کیوں کہ اگر وہ مٹ جاتے تو ہم کہاں ہوتے۔ جس طرح اگر ایک قوم کے ساتھ میثاق ہوتا ہے تو جو لوگ میثاق کے وقت موجود نہیں تھے وہ بھی اس میثاق سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں، (اگلی آیتوں میں یہودیوں اور نصرانیوں سے میثاق کا ذکر ہے)۔ اسی طرح اگلی نسل کے ساتھ احسان کا بوجھ پچھلی نسل تک پشت ہا پشت تک باقی رہتا ہے لہٰذا ان احسانات کا شکر بھی واجب ہے، مثلاً باپ دادا کی اعلیٰ نسبی ہی سے اولاد کی اعلیٰ نسبی ہے۔ فالحمدللہ۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۱۳، ۱۴)

تو صرف ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا اور ہم نے ان کے قلوب کو سخت کردیا۔ وہ لوگ کلام کو اس کے مواقع سے بدلتے ہیں اور وہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس میں اپنا ایک بڑا حصہ فوت کر بیٹھے اور آپ کو آئے دن کسی نہ کسی (نئی) خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے جو اُن سے صادر ہوتی ہے بجز اُن میں کے معدودے چند شخصوں کے سو

آپ ان کو معاف کردیجیے اور ان سے درگزر کیجیے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوش معاملہ لوگوں سے محبت کرتا ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی ان کا عہد لیا تھا سو وہ بھی جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے اپنا بڑا حصہ فوت کر بیٹھے تو ہم نے ان میں باہم قیامت تک کے لیے بغض و عداوت ڈال دی اور ان کو اللہ تعالیٰ ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے نقضِ میثاق کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے آیت نمبر ۷ میں مومنوں کے میثاق کا ذکر تھا۔ یہاں بھی اسی میثاق کا ذکر ہے یعنی یہودیوں سے اور پھر نصاریٰ سے بھی یہی میثاق تھا کہ جو حکم ہوگا بسر و چشم بجا لائیں گے لیکن انھوں نے اس میثاق کو توڑ دیا۔ ان آیاتِ کریمہ میں ان اثرات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو نقضِ میثاق پر مرتب ہوئے، یعنی اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے قلوب سخت ہوگئے یا یہ دونوں الگ الگ سزائیں ہوئیں۔ اس کے بعد وہ تحریف فی آیات اللہ کرنے لگے۔ اور احکامِ خداوندی کے بیش تر حصے کو بھول گئے جس کا اثر ان کے اعمال سے ظاہر ہونے لگا اور وہ پہچانے جانے لگے کہ یہ مومن نہیں ہیں صرف زبان سے اپنے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیرو کہتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان کا حشر بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی طرح کا نہ ہوجائے اور اس میثاق کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے اور شکر ادا کرتے رہنا چاہیے جس کا ذکر آیت نمبر ۷ میں ہے ورنہ قلب کی تبدیلی میں کیا دیر لگتی ہے اور پھر خدانخواستہ قلب میں اگر سختی آگئی تو بڑے سے بڑا گناہ کرنے میں کوئی باک نہیں ہوگا اور یہی ملعون ہونے کی نشانی ہے۔ نعوذ باللہ۔

آیت نمبر ۱۴ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جس قوم کا رشتۂ اخوت ایمان باللہ ہو، وہ اسی میثاق کے ذریعے جہاں خدا کی مطیع و فرماں بردار بن جاتی ہے وہاں آپس میں بھی متحدہ اور ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھنے والی ہوجاتی ہے اور جہاں یہ میثاق توڑا

گیا (بھلایا گیا) خدا کی نافرمانی اور ناشکری کر کے وہاں وہ رشتۂ اخوت بھی جو ان کے افراد کو باہم منسلک کر رہا تھا، ٹوٹ گیا اور وہ پھر ایک دوسرے سے بغض و عداوت، لوٹ مار، ایذا دہی وغیرہ تمام رذائل میں مبتلا ہوگئے اور یہ خدائی حکم تھا جو ٹل نہیں سکتا تھا۔ اس موقعے پر بار بار ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹوٹنے کا واقعہ یاد آتا ہے۔نعوذ باللّٰہ من سخطہ۔

يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورة المائدہ، آیت ۱۶)

اس کے ذریعے سے اللّٰہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

ہر طرح کی ہدایت کے لیے اپنی کوشش (جو من اتبع رضوانہ سے ظاہر ہے) اور اللّٰہ تعالیٰ کی توفیق (جو باذنہٖ سے ظاہر ہے) دونوں ضروری ہیں۔ اور اگر انسان کا اس بات پر یقین کامل ہو کہ جو بھی ہدایت اور روشنی اسے ملے گی وہ اللّٰہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے ملے گی تو تقویٰ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ کر بھی اس کے دل میں کبھی عجب پیدا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ جب شکر آیا عجب رفو چکر ہوا۔ دراصل ہر نیکی میں اللّٰہ تعالیٰ کا دُہرا احسان ہے، ایک وحی کے ذریعے ہدایت دنیا دوسرے توفیق بخشنا۔

حضرت تھانوی نور اللّٰہ مرقدہٗ نے من اتبع رضوانہ کا ترجمہ فرمایا ہے "جو کہ رضائے حق کے طالب ہوں۔" یہ "طلب" ہی ایک طرح کا عمل ہے بلکہ عمل کی اساس ہے اور ظاہر ہے جب طلب ہوگی تو اس کے لیے اپنی سی کوشش بھی ہوگی۔ پھر اسی کوشش پر اللّٰہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کا یہ ثمرہ مرتب فرماتے ہیں کہ اس کو اندھیرے سے اجالے میں لے آتے ہیں اور صراطِ مستقیم دکھا دیتے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے

راستہ دکھائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص صراطِ مستقیم پر پہنچ گیا۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ فرمایا ہے، ''ان کو راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ اس ہدایت تک پہنچنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ عمل اور اللہ تعالیٰ کا فضل اور یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ○ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ○ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ○ (سورۃ المائدہ، آیت ۲۲۔ ۲۶)

کہنے لگے کہ اے موسیٰ ہم تو ہرگز کبھی بھی وہاں قدم نہ رکھیں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں تو آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے جائیے اور دونوں لڑبھڑ لیجیے ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔ (موسیٰ) دعا کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! میں اپنی جان اور اپنے بھائی پر البتہ اختیار رکھتا ہوں سو آپ ہم دونوں کے اور اس بے حکم قوم کے درمیان فیصلہ فرما دیجیے۔ ارشاد ہوا تو یہ ملک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا یوں ہی زمین میں سر مارتے پھرتے رہیں گے سو آپ اس بے حکم قوم پر غم نہ کیجیے۔

جہاں صاف حکم ہو اور کوئی اختیار (option) نہ ہو، وہاں اس کی تعمیل میں لیت ولعل کرنا یا کسی ''مصلحت'' کی بنا پر اس کی تعمیل کو ملتوی کرنا فسق اور ناجائز ہے۔ اور اس کی سزا آخرت میں ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی خسران اور حرمان کی شکل میں ملتی ہے جیسا فانھا محرمۃ سے ظاہر ہے۔ دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جہاں حکم صاف ہو اور حکم کی تعمیل میں دشمن سے ہار جانے کا واقعی خطرہ بھی ہو وہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ جب کود پڑو گے تو تم ہی غالب رہو گے جیسا فاذا دخلتموہ.... سے ظاہر ہے۔

آیت نمبر۲۳ میں جن لوگوں کو کہا گیا ہے یخافون انعم اللہ علیھما ان پر ایک نعمت یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور نعمت کا تقاضا خشیت بھی ہے کہ ڈر ہو کہ اگر ناشکری کرو گے یا نبی علیہ السلام کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو نعمت چھن جائے گی۔
پکتھال نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے:

"... Who feard (their Lord, men) unto whom Allah had been gracious..."

اس آیتِ کریمہ سے صاف اور واضح ہے کہ توکّل کے لیے عمل اور تعمیلِ حکمِ الٰہی لازم ہے۔ کچھ نہ کرنے (inaction) کو توکّل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو چاہیے تھا کہ داخل ہو جاتے، مقدور بھر کوشش کرتے اور اللہ پر توکّل کرتے۔ انھوں نے نہ تو کوشش کی، نہ حکم کی تعمیل کی اور نہ توکّل کیا تو ذلیل و خوار ہوئے اور چالیس برس تک بھٹکتے رہے۔

آیت نمبر۲۵ میں جو دعا موسیٰ علیہ السلام کی ہے اس کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام بھی وادیِ تیہ میں ان کے ساتھ رہے۔ معلوم ہوا کہ اجابت کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ فاسقوں کو سزا ملی، گرچہ اس شکل میں نہیں ملی جس شکل میں مانگی گئی تھی... دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر پوری کی پوری قوم حکم عدولی کر رہی ہو اور صرف دو چار آدمی حکم مان رہے ہوں تو اس سے حکم کی عظمت اور صداقت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور نہ ان پر حرف آتا ہے جن کے ذریعے یہ حکم دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری قوم کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے اس لیے کہ انھوں نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی۔ پوری قوم کو چھوڑ دینا معمولی ہمت کی بات نہیں ہے۔

لَئِنْ بَسَطْتَ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا

الظّٰلِمِیْنَ O فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ O فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَ ةَ اَخِیْهِؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَ ةَ اَخِیْۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ O مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَۚ كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًاؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًاؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ٘ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ O (سورۃ المائدہ، آیت ۲۸۔۳۲)

اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لیے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لیے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں تو خدا پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں، میں یوں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے پھر تو دوزخیوں میں شامل ہوجاوے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی سو اس کے جی نے اُس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کردیا پھر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہوگیا۔ پھر اللّٰہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا کہ وہ زمین کھودتا تھا تاکہ وہ اس کو تعلیم کردے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طریقے سے چھپا دے۔ کہنے لگا، افسوس میری حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گزرا کہ اس کوے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا سو بڑا شرمندہ ہوا اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی شخص کو بلامعاوضہ دوسرے شخص کے یا بدون کسی فساد کے (جو) زمین میں (اس سے پھیلا ہو) قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جو شخص کسی شخص کو بچا لیوے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا اور ان (بنی اسرائیل) کے پاس ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائلِ واضحہ لے کر آئے پھر اس کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنے والے ہی رہے۔

آدم علیہ السلام کے ان صاحب زادے جنھوں نے اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھایا باوجود یہ کہ وہ جانتے تھے کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا تو یہ مجھے قتل کردے گا، رہتی

دنیا تک اپنا احسان اپنے بھائیوں پر اور جملہ بنی آدم پر کر گئے۔ اسی لحاظ سے ان کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوگا جن کے بارے میں فرمایا ہے کہ جیسے کہ اس نے احیاء الناس جمیعا۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کا امتِ مسلمہ پر رہتی دنیا تک احسان رہے گا کہ انھوں نے باوجود یہ کہ ہاتھ نہ اٹھانے کی صورت میں اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی، مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جزاہ اللّٰہ جزاءً عن امۃ حبیبہ ﷺ۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢبِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ O فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (سورۃ المائدہ، آیت ۳۸، ۳۹)

اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان دونوں کے (داہنے) ہاتھ (گٹے پر سے) کاٹ ڈالو اور ان کے کردار کے عوض میں بطور سزا کے اللّٰہ کی طرف سے اور اللّٰہ تعالیٰ بڑے قوت والے ہیں (جو سزا چاہیں مقرر فرمائیں) بڑے حکمت والے ہیں (کہ مناسب ہی سزا مقرر فرماتے ہیں) پھر جو شخص توبہ کرلے اپنی اس زیادتی کے بعد اور اعمال کی درستی رکھے تو بے شک اللّٰہ تعالیٰ اس پر توجہ فرمائیں گے۔ بے شک خداتعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں بڑی رحمت والے ہیں۔

جو لوگ چور کے ہاتھ کاٹنے کو ظلم کہتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس اللّٰہ نے یہ حکم دیا ہے، وہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ ہزاروں حکمتیں اس حکم میں مضمر ہیں۔ اور وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اصل ظالم تو یہ چور ہی ہیں اور ظلم پر سزا دینے کا ہی نام عدل ہے۔ توبہ پر اپنے ہاں سزا نہ دینے کا قانون اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی غفور رحیمی سے مقرر کیا ہوا ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ O (سورة المائدہ، آیت ۴۳)

اور وہ آپ سے کیسے فیصلہ کراتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے پھر اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ہرگز اعتقاد والے نہیں۔

چونکہ وہ لوگ توریت کے ماننے والے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا ایمان ہے کہ جو کتاب ان کے پاس ہے، وہ اللہ کی نازل کردہ ہے، اس کے باوجود وہ اپنے (کسی یا بعض) معاملے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے اور آپ ﷺ کو حکم بنایا تو اس سے صاف ظاہر ہوگیا ہے کہ ان کا ایمان توریت پر نہیں ہے۔

اس کا ترجمہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے۔ وما اولئک بالمؤمنین بالتورۃ کیوں کہ اگر توریت پر ایمان رکھتے تو حضور ﷺ پر بھی ایمان لاتے جن کی بشارت اس کتابِ مقدس میں تھی۔ لیکن اگر وہ آیتیں توریت کی تحریف شدہ تھیں یا ان کو یہودی علما نے چھپا لیا تھا تب بھی ان کا مومنین بالتورۃ میں سے نہ ہونا، اس بات سے عیاں تھا کہ جو معاملہ وہ حضور ﷺ کے پاس لائے تھے اس کے حکم کو چھپا دیا تھا حالانکہ وہ توریت میں موجود تھا جو بالکل ظاہر بات تھی یہودیوں کے نزدیک بھی کہ کتاب اللہ میں ضرور اس کا حکم ہوگا۔

اگلی آیات میں یہ بات تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ O وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ

بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ O وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O (سورۃ المائدہ، آیت ۴۴۔۴۷)

ہم نے توریت نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا، انبیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور اہل اللہ اور علما بھی بوجہ اس کے کہ ان کو اس کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا تھا اور وہ اس کے اقراری ہوگئے تھے سو تم بھی لوگوں سے اندیشہ مت کرو اور مجھ سے ڈرو اور میرے احکام کے بدلے میں متاعِ قلیل مت لو اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں اور ہم نے ان پر اس (توریت) میں یہ بات فرض کی تھی کہ جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے پھر جو حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھا رہے ہیں اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ ابنِ مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے۔ اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اور انجیل والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں اور جو شخص خداتعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں۔

یہ جو اہلِ توریت اور اہلِ انجیل کو بار بار کہا جا رہا ہے کہ جو اللہ نے نازل

ہے اس کے مطابق حکم کریں اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن شریف کے نازل ہونے کے بعد بھی ان کو اپنی کتاب (مثلاً اہلِ انجیل کو انجیل) کے مطابق حکم دینا چاہیے اور انجیل کے احکامات ان کے لیے باقی رہے کیوں کہ توریت اور انجیل کے صحیح پیروکاروں کو محمد ﷺ کی نبوت کا علم تھا اور ان کے لیے آپ ﷺ پر ایمان لانا اپنی کتاب کی پیروی کی لازمی شرط تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک انجیل کا کچھ حصہ محفوظ رہا ہو۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ اہلِ انجیل اس حکم کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے انجیل میں اتارا ہے۔ اس کے حساب سے نہیں جو ان کے احبار اپنی طرف سے تحریف کرکے بتاتے ہیں۔ اب اگر اہلِ انجیل اپنی کتاب کے مطابق فیصلے کرنے لگیں تو ان کی رہائی نہیں ہوسکتی کیوں کہ انجیلِ مقدس تو ناپید ہوچکی ہے اور جس کو یہ لوگ انجیلِ مقدس کہتے ہیں وہ خود ان کے اور ان کے علما کے مطابق وہ آسمانی کتاب نہیں ہے جو نازل کی گئی تھی۔

آیت نمبر۴۷ اسی طرح کا الزام ان کے فسق اور ان کی گمراہی ثابت کرنے کے لیے ہے جس طرح یہودیوں کو آیت نمبر۴۴ میں کہا گیا تھا۔ یہ بات کہ اس وقت جو توریت اور انجیل تھی، وہ تمام کی تمام تحریف شدہ تھی یا بعض حد تک تحریف شدہ تھی، خارج از بحث ہے کیوں کہ وہ اپنی زبان سے کہتے تو تھے کہ ہم اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتے ہیں۔ پھر اس کی موجودگی میں احکام کسی اور کے ہوں یہ سراسر ظلم اور کفر نہیں تو اور کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر۴۵ میں یہ بھی فرما دیا کہ اس نے توریت میں قصاص کا حکم نازل فرمایا تھا جسے اہلِ علم جانتے تھے لہٰذا اگر بعض نسخوں میں بالفرض تحریف ہو بھی گئی تھی تو وہ ایسے علما سے پوچھ کر معلوم کر سکتے تھے جو دنیا کے لالچ میں مبتلا نہ تھے۔

مسلمانوں میں بھی بہت سے لوگ فیصلے کے لیے غیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس سے ان کا فسق ظاہر ہوتا ہے اور بعض حالات میں نوبت کفر تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ہم میں اور اہلِ انجیل میں بین فرق یہ ہے کہ بحمدہٖ تعالیٰ ہماری کتاب ہر طرح کی تحریف سے محفوظ ہے۔ الفاظ کے لحاظ سے بھی اور معانی کے لحاظ سے بھی۔ احادیثِ نبوی ﷺ کے کثیر ذخیرے سے، صحابہ رضوان اللہ علیہم کے آثار سے، صلحائے امت کے

متفقہ اعمال سے۔ جیسا ہمارے حضور نبیِ کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ یہ میری اُ
(یا میری امت کے علما) کبھی ناحق بات پر متفق نہیں ہوں گے۔ برخلاف یہودیوں
عیسائیوں کے جن کے علما نے متفقہ طور پر دنیائے دنی کے لیے ہر طرح کی تحریف
کتاب میں کردی۔

وَاَنۡزَلۡنَا اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ
وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ
عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ
وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ
فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا
كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۴۸)

اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ (موصوف) ہے اور اس سے پہلے جو کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں کی محافظ ہے تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ کیجیے اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے (دور ہوکر) ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجیے۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت کردیتے لیکن ایسا نہیں کیا تاکہ جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمادیں تو مفید باتوں کی طرف دوڑو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

یہاں بھی وہی بات ہے۔ آیت نمبر ۴۳ کے بعد وہ حکم بھی ظاہر کردیا گیا جے
علمائے یہود چھپا رہے تھے اور وہ غالباً اس وقت تک بما استحفظوا من کتاب اللہ میں

موجود تھا۔ لکل جعلنا منکم... کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خواہ عیسائی رہو، خواہ ہندو، خدا تک پہنچ جاؤ گے کیوں کہ خدا ہی نے یہ تمام راستے بتائے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی نے زمانہ وقریہ وامت کے حساب سے مختلف ادیان نازل فرمائے اور خدا چاہتا تو ایک ہی دین نازل کرتا یا ایک ہی دین پر سب کو قائم کردیتا لیکن اس کی مرضی یہی ہوئی کہ جو دین جس کے مطابق ہو یعنی اس کے حالات کے لحاظ سے وہی دین اس کے لیے چنا، مثلاً بنی اسرائیل کے لیے یہودیت اور پھر عیسائیت۔ اور سب سے آخر میں تمام نبیوں کے سردار اور مصدق کو بھیجا اور universal دین نازل فرمایا۔ اب جو اس کو نہ مانے وہ کافر ہے اور تمام ادیانِ صحیحہ کا منکر ہے۔

اور فاستبقوا الخیرات سے دینِ محمدی اپنانے میں سبقت لے جانا مراد ہے۔

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۴۹)

اور ہم (مکرر) حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجیے اور ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجیے اور ان سے (یعنی ان کی اس بات سے) احتیاط رکھیے کہ وہ آپ کو خداتعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بچلا دیں پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کرلیجیے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعضے جرموں پر ان کو سزا دیں اور زیادہ آدمی تو بے حکم ہی ہوتے ہیں۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شریعت کے احکام سے رُوگردانی کرتے ہیں اور آپس کے معاملات وحی کی روشنی میں اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق نہیں طے کرنا

چاہتے ہیں وہ عنقریب دنیا میں بھی ہلاکت میں پڑنے والے ہیں۔ گویا حکم سے رُوگردانی (جو آج کل عام ہو رہا ہے) ہی اس بات کی نشانی ہے کہ گزشتہ گناہوں کی سزا ملنے والی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصْرَى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّلِمِينَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۵۱)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بے شک وہ ان ہی میں سے ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ نہیں دیتے ان لوگوں کو جو اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

یہ بات عرب اسرائیل لڑائیوں میں صاف ظاہر ہو چکی ہے۔ یہ آیتِ کریمہ ہے تو دراصل منافقین کے بارے میں لیکن مصر اور اردن کے وہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی شراب اور تھوڑا سا سؤر کا گوشت کھا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے یا یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سؤر بہت گندے طریقے سے رہتے تھے اس لیے ان کا گوشت ناجائز تھا، اب وہ بہت صاف ستھرے طریقے سے رکھے جاتے ہیں اس لیے ان کا گوشت کھانا ناجائز نہیں ہے۔ کیا یہ باتیں منافقت کی نہیں ہیں اور کیا ایسے لوگ منافق نہیں ہیں؟

ہر قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں اور اگر ان سے دوستی رکھی جائے تو ان خصوصیات کا سرایت کر جانا بہت آسان ہے اور روزمرہ کا تجربہ ہے، مثلاً یہودیوں (اور عیسائیوں) کی ایک خصوصیت اکالون للسحت کی ہے۔ ان سے دوستی رکھنے والوں میں اور ان کے زیرِ اثر رہنے والوں میں یہ خصوصیت سرایت کر چکی ہے۔ ''سحت'' میں سودی کاروبار کی آمدنی بھی شامل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○ (سورۃ المائدہ، آیت ۵۴)

اے ایمان والو! جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جاوے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو پیدا کردے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر، تیز ہوں گے کافروں پر، جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں بڑے علم والے ہیں۔

یہ صفات اس قوم کی ہیں جو بعد میں لائی جائیں گی اگر خدانخواستہ موجودہ مسلم قوم مرتد ہوجائے۔ یہاں ارتداد کے لیے واحد کا صیغہ ہے (کہ انفرادی طور پر سب ڈرتے رہیں کہ ان کے ارتداد سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ وہ دوسری قوم لے آئے گا) لیکن اس کے نتیجے میں ''قوم'' کے لانے کا ذکر ہے۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اگر قوم کے اتنے افراد مرتد ہوجائیں کہ پوری قوم کو نیست و نابود کرکے دوسری قوم لانا ہوتو ایسا ہی ہوگا ورنہ اِکا دُکا یا معدودے چند افراد کے ارتداد سے جب پوری قوم کی خاصیت اور ان کے صفات اپنی جگہ پر قائم ہوں تو ان چند مرتدین کو سزا دی جائے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم میں یہ صفات نہیں ہیں جن کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر ہے تو وہ حقیقتاً مسلم قوم نہیں ہے اور بدل دیے جانے کے قابل ہے۔ فاعاذنا اللہ من سخطہ یعنی وہ قوم عملی طور پر ارتداد کی مرتکب ہوتی ہے گرچہ اس کے افراد بعض معاملات میں اعتقادی طور پر مسلمان ہی رہیں۔ جن صفات کے زائل ہوجانے سے پوری قوم کے نیست و نابود کردیے جانے کا خدشہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا رشتہ رہنا۔

۲۔ مومنوں کے ساتھ تعلقات میں رافت و رحمت کا برتاؤ رکھنا اور ایک دوسرے سے بدگمانی نہ کرنا، حسد نہ کرنا، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرنا یعنی ایک دوسرے کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آنا اور آپس میں مکمل اتحاد رکھنا۔

۳۔ کافروں پر سخت ہونا۔ جس طرح صفت ناشی ہے الحب فی اللہ اسی طرح یہ صفت ناشی ہے البغض فی اللہ سے۔

۴۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ یہ قوم کی بقا اور سربلندی کے لیے بہت ضروری ہے۔

۵۔ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتا۔

مؤخر الذکر دو صفات حبِ جاہ اور حبِ مال کو فنا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہی لومۃ لائم کا خوف نہ رکھنا بذاتِ خود جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ کے حکم کو قائم کرنا in the face of opposition (یعنی جب اس میں دوسرے لوگوں کی طرف سے مزاحمت ہو) جہاد ہے اور social taboos یعنی معاشرے کے لوگوں کی ملامت بہت سخت مزاحمت ہے۔

لیکن یہ خصوصیت بھی من جانب اللہ عطا ہوتی ہے اور جس کو مل جائے اس پر شکر واجب ہے۔ ملامت کی پروا نہ کرنے کی وجہ اگلی آیتِ کریمہ میں ہے کہ تمھارے دوست اللہ اور رسول اور مسلمان ہیں جو پکے اور سچے مسلمان ہیں (انما ولیکم... ھم راکعون)۔ جب ایسا ہے تو غیروں کی تنقید یا ملامت کی کیا پروا بلکہ اس ملامت سے ڈر کر اللہ کا حکم چھوڑ دینا سخت نادانی اور اپنے نفس پر ظلم ہے کہ دشمنوں کے چڑھانے سے اور حاسدوں کی ملامت سے دوستوں سے بگاڑ کرلیا۔ اور پھر مزید force of convictions add کرنے کے لے فرمایا کہ جو اللہ اور رسول اور مومنوں سے دوستی رکھے تو وہ جان لے کہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہنے والا ہے۔

یہ پورا رکوع اس رشتۂ اخوت کے بارے میں ہے جس میں ہماری ملت جڑی ہوئی ہے۔ اس بات کا پورا یقین ہونا ضروری ہے کہ اہلِ کتاب اور کفار ہمارے واقعی

دوست ہو ہی نہیں سکتے۔ اس شیرازۂ ملت کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں سے محبت اور ان کا اکرام ضروری ہے اور جہاد فی سبیل اللّٰہ اس رشتے کو پختہ کرتا ہے اور دوسروں کی ملامت سے بے فکر رہنا بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر ان کو اہمیت دی گئی تو اپنی قومی صفات وحسنات کے زائل ہوجانے کا بہت خطرہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ○ (سورۃ المائدہ، آیت ۵۷، ۵۸)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے، ان لوگوں میں سے جو ایسے ہیں کہ انھوں نے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور دوسرے کفار کو دوست مت بناؤ اور اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو اور جب تم نماز کے لیے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے۔

کوئی شخص جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اور شعائرِ اسلامی کا مذاق اڑائے اس کو یہود، نصاریٰ، کفار کس زمرے میں شامل کیا جائے۔ مسلمان ہونا اور مثلاً نماز کا مذاق اڑانا محال ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار لوگ ملتے ہیں تو ایسے لوگوں سے دوستی ہرگز جائز نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ تم کو اخلاق کے اور بات چیت کے لحاظ سے بہت ''اچھے'' یا ''یاروں کے یار'' یا ''دل کے اچھے'' معلوم ہوں لیکن ان سے دوستی یقیناً تمھارے لیے تباہی لائے گی جس کا تم کو پتا جلد یا بدیر چل جائے گا جیسا کہ تجربہ بھی ہوچکا ہے۔ ایسے لوگ دوسرے مذاہب میں بھی ہوچکے ہیں، ان میں سے بعض کو اللّٰہ تعالیٰ نے بندر اور خنزیر بنا دیا۔ ان کے لیے یہ بات تو ثابت ہے کہ وہ بہت بے وقوف لوگ

ہیں کیوں کہ اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو ایمان اور شعائرِ ایمان کے ساتھ استہزا دونوں کے ایک ساتھ جمع ہونے کو سوچتے بھی نہیں کیوں کہ ایمان اور کفر کا جمع ہونا محال ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں قوم لایعقلون کا جن کو خطاب دیا گیا ہے وہ تو زبان سے اس کا اقرار بھی نہیں کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہیں۔ صرف دین کے مذاق اڑانے پر ان کو یہ کہا گیا۔ جو شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ دین کا مذاق اڑائے اس پر تو یہ خطاب اور بھی زیادہ صادق آتا ہے۔ لہٰذا ان کی دوستی ویسے بھی خطرناک بات ہے کہ دانا دشمن بہتر از ناداں دوست!

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ
السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ
وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ
وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ
وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ
كُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ
اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ
فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ
اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ٦٣ - ٦٦)

اور آپ ان میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ اور ظلم اور حرام کھانے پر گرتے ہیں، واقعی ان کے یہ کام برے ہیں ان کو مشائخ اور علما گناہ کی بات کہنے سے اور حرام مال کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بری ہے اور یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہوگیا ہے۔ ان ہی

کے ہاتھ بند ہیں اور اپنے اس کہنے سے یہ رحمت سے دور کردیے گئے بلکہ ان کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں اور جو (مضمون) آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہوجاتا ہے اور ہم نے ان میں باہم قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں حق تعالیٰ اس کو فرو کردیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے اور اگر یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی تمام برائیاں معاف کردیتے اور ضرور ان کو چین کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر یہ لوگ توریت اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے، ان میں ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی ہے اور زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں۔

ان پانچ آیاتِ کریمہ میں یہودیوں کی بعض خاص صفات کو بتایا گیا ہے ان میں سے کون کون سی خصوصیات مسلمان اپنا چکے ہیں۔ الامان الحفیظ۔ ان اجتماعی خصلتوں کی سزائیں بھی بتائی گئی ہیں جو مندرجہ ذیل معلوم ہوتی ہیں:

(۱) یہ لوگ برائیوں اور گناہوں میں نہ صرف مبتلا رہتے ہیں بلکہ گناہ میں اور سرکشی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ (یسارعون)

(۲) ان کے روحانی اور مذہبی پیشوا ان کو جھوٹ بولنے سے اور حرام مال کھانے سے نہیں روکتے تھے، یعنی ان کے دینی رہنما ان کے اخلاق اور اعمال کی درستگی سے غافل ہوگئے۔ ہوسکتا ہے عقائد اور عبادات کی تعلیم جاری رہی ہو لیکن جھوٹ، غیبت، بہتان اور اس طرح کی اخلاقی اور معاشرتی برائی سے ان کے رہنما، علما وصلحا نے ان کو نہیں روکا۔ اسی طرح حرام کی کمائی سے ان کو منع نہیں کیا۔ رشوت، دھوکا دہی اور ظلم کی کمائی سے وہ اپنا پیٹ بھرتے رہے۔ لہٰذا لعنت زدہ اور مغضوب ہوگئے۔ دوسری قومیں ان

پر غالب آگئیں اور اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا اثر یہ ہوا کہ ان کا ایمان بھی جاتا رہا اور وہ زمین میں فتنہ وفساد میں مبتلا ہوگئے۔ جیسا ان کے قول ید اللّٰہ مغلولہ سے ان کا کافر ہونا معلوم ہوتا ہے اور ان کے مفسدین ہونے کا ذکر آیت نمبر ۶۴ کے آخر میں ہے۔ یہ گناہ اور حرام مال حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا اور علما اور صلحا کا منع نہیں کرنا، کسی قوم کی گراوٹ کی آخری منزل ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ ایسے نہیں ہیں؟

(۳) اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ گستاخی (مغلولہ) اور اس کی گرفت سے بے پرواہ ہوجانا۔

(۴) آپس میں ایک دوسرے سے نہ ختم ہونے والی دشمنی۔

آخر الذکر خصوصیت آیت نمبر ۶۴ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ اگر یہ بات صرف حضور ﷺ کے زمانے کے یہودیوں کے بارے میں ہو تب بھی ان کی دشمنی کو ابدی دشمنی کہا جاسکتا ہے اور اگر یہ بات آنے والے تمام یہودیوں کے بارے میں ہو تب بھی ان کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کی آپس کی دشمنوں کا پتا چل سکتا ہے۔

آیت نمبر ۶۶ میں جو بات اہلِ کتاب کے لیے کہی گئی تھی وہ ایک لحاظ سے دوسرے کے لیے بھی درست معلوم ہوتی ہے۔ اگر اہلِ کتاب توریت، انجیل اور قرآن شریف پر ایمان لاتے تو وہ دنیا میں بھی اوپر سے اور نیچے سے کھاتے رہتے یعنی دنیا میں بھی وافر اور کثیر رزق کا وعدہ ہے اگر من حیث قوم سب لوگ ایمان لائیں۔ گرچہ کچھ لوگ اہلِ کتاب میں سے ایسے بھی تھے جو ایمان لائے اور جن کا ذکر ''امۃ مقتصدہ'' کیا گیا ہے لیکن ان کی کثیر تعداد فاسقوں کی تھی۔ ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی اگر اس دین کو قائم کریں جو اللّٰہ تعالیٰ نے ہماری طرف نازل فرمایا ہے تو ہم پر بھی رزق فراخ کردیا جائے۔ اگر اکثریت نیکوکاروں کی ہو لیکن اس کے باوجود ایک کثیر تعداد فاسقوں کی ہو تو

(الف) نہ کتاب کے اوامر ونواہی پورے طور پر قائم کیے جاسکیں گے جب تک ان فساق و فجار کا پورے طور سے قلع قمع کرکے ان کو بے اثر (ineffective) نہ بنا دیا جائے۔ اور

(ب) نہ ہی اس قوم پر ایسی امت کا اطلاق کیا جاسکے گا جو کتاب قائم کرتی ہے۔ لٰہذا ان سے بھی اکلوا من فوقھم... کا وعدہ نہیں ہے کیوں کہ جب تک ظالموں کو سزا نہ ہو پوری قوم میں فساد اور ظلم پھیل جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طویل المدت (long term) وعدہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آج قوم توبہ کرلے اور آج ہی سے رزق کی فراوانی ہونے لگے، بلکہ توبہ کے بعد عملِ صالح کرتے رہنے سے اس کے ثمرات دنیا میں بھی اس شکل میں ظاہر ہونے لگیں گے کہ ان کو دنیا میں بھی غلبہ حاصل ہوگا اور آخرت تو ہے ہی مومنوں کے لیے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ٦٧)

اے رسول! جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (سب) پہنچا دیجیے اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا یقیناً اللہ تعالیٰ ان کافر لوگوں کو راہ نہ دیں گے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی حضورﷺ کے لائے ہوئے دین کی تبلیغ میں مشغول ہوگا، اسے خدا لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا جب تک وہ اپنا کام پورا نہ کرلے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ٦٨)

آپ کہیے کہ اے اہلِ کتاب! تم کسی راہ پر بھی نہیں جب تک کہ توریت کی
اور انجیل کی اور جو (کتاب) تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بھیجی
گئی ہے اس کی بھی پوری پابندی نہ کرو گے اور ضرور جو (مضمون) آپ کے
پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی
اور کفر کی ترقی کا سبب بن جاتا ہے تو آپ ان کافر لوگوں پر غم نہ کیا کیجیے۔

معلوم ہوا کہ اقامتِ کتاب شرط ہے، اہلِ کتاب ہونے کی اور جو دین پر قائم نہیں ہیں وہ گم راہ محض ہیں۔

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا
اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ
السَّبِیْلِ ○ (سورۃ المائدہ، آیت ۷۷)

آپ فرمائیے کہ اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں ناحق کا غلو مت کرو اور ان
لوگوں کے خیالات پر مت چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور بہتوں
کو غلطی میں ڈال چکے ہیں اور وہ لوگ راہِ راست سے دور ہو گئے تھے۔

معلوم ہوا کہ دین میں غلو گمراہ قوموں کی پیروی کا نتیجہ ہے۔ دین میں غیرحق کی آمیزش غلو ہے اور اس کا منبع یا تو اتباعِ ہوئ ہوتا ہے یا دوسری قوموں کا اتباع جو ہوئ پر مبنی تھا۔ مسلمانوں میں غلو اور بدعت اکثر یا تو اہلِ کتاب کی پیروی کا نتیجہ ہوتا ہے یا مشرکوں کی پیروی کا۔

لتجدنَ اشدَ النَاسِ عداوۃً لِلَّذِیْنَ اٰمنُوا الْیَھُوْدَ وَالَّذِیْنَ
اَشْرَکُوْا ۚ و لتجدنَ اَقْرَبَھُمْ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا

نصریٰ ط ذٰلِک بانَ مَنھُمُ قسّیسِیۡن ورُھبانا وَانّھمْ لا یَستَکبِرُوۡنَO (سورۃ المائدہ، آیت ۸۲)

تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پاویں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیے گا جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارکِ دنیا درویش ہیں اور اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔

یہودیوں اور نصاریٰ میں یہ بہت بڑا فرق ہے جو یہاں بتایا گیا ہے۔ یہودی اپنے کو سب سے برتر نسل سمجھتے ہیں کہ ہم جیسا کوئی نہیں۔ ان کے برخلاف نصاریٰ میں وہ نسلی برتری (racial prejudice) نہیں ہے۔ اسی لیے ان کے اندر ایسے لوگ بھی ہیں جو متکبر نہیں ہیں۔

یآیُّھا الّذِیۡنَ اٰمنُوۡا اِنّما الۡخمرُ والۡمیۡسرُ والۡاَنۡصابُ والۡاَزۡلامُ رجۡسٌ مِّنۡ عَملِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡہُ لعلّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَO انّما یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَداوۃَ والۡبغۡضآءَ فی الۡخمرِ والۡمیۡسرِ ویَصُدَّکُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ و عنِ الصَّلٰوۃِ ج فھلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتھُوۡنَO (سورۃ المائدہ، آیت ۹۰، ۹۱)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یوں ہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے سو اب بھی باز آؤ گے۔

اس تصریح کے بعد اور اس کے بعد کی آیتوں کے پڑھنے کے بعد بھی اگر کوئی

کہے قرآن شریف میں شراب کے ساتھ ''حرام'' کا لفظ لکھا ہوا نہیں ہے اس لیے شراب حرام نہیں ہے تو وہ ظالم بھی ہے، جاہل بھی ہے اور کافر بھی جیسا لیبلوکم فی ما اتکم سے ظاہر ہے۔ انصاب یعنی عبادت الاوثان کا ذکر بھی اسی آیت میں ہے تو نعوذ باللہ اس طرح عبادت الاوثان بھی حرام نہیں رہا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث شریف میں (معافی کے اعلان کے بارے میں) ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو صحابہ میں سے ایسے لوگ تھے جو حرمتِ خمر سے پہلے انتقال فرما گئے تھے۔

- ان آیاتِ کریمہ سے آگے تحریم صید البر کے بارے میں فرمایا لیبلونکم بشیٔ من الصید ... میں تو حالتِ احرام میں شکار کے منع ہونے کی صرف یہ مصلحت بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو آزمانا چاہتے ہیں کہ کون ان کے احکام مانتا ہے۔ یہ مصلحت ہر حکم کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مصلحت نہیں بتائی گئی۔ جب کہ شراب اور جوئے کے حرام ہونے کی مصلحت بتائی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حلت و حرمت محض خدا کے حکم سے ہے اور اس کی مصلحت بتانا خدا اور رسول کے ذمے نہیں ہے۔ جو مصلحتیں آیت نمبر۹۱ میں بتائی گئی ہیں کہ شیطان ان کے ذریعے تمھیں آپس میں عداوت میں مبتلا کردینا چاہتا ہے اور تمھیں نماز اور اللہ کے ذکر سے روکنا چاہتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے تحت ہے اور اس کی مزید رحمت ہے۔

شراب کا ذکر اللہ اور نماز سے روکنا تو صاف ظاہر ہے لیکن جوئے کی یہ خرابی نظر نہیں آتی۔ درحقیقت جوا بھی اسی طرح نماز سے روکتا ہے جس طرح شراب۔ کیوں کہ جوئے کی حقیقت ہے کہ جس طرح بھی ہو روپیہ کماؤ۔ جوا کھیلنے والا ہمیشہ اسی دھن میں رہتا ہے۔ لہٰذا آخرت کی طرف سے غفلت اور اللہ کے ذکر سے اور نماز سے محرومی رہتی ہے۔ ایک روپے کے بدلے شاید ایک لاکھ روپیہ مل جائے۔ یہ بھی سود خوری کی ایک قسم ہے اور سود خور بھی دنیا ہی کا کتا ہوتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ کی یاد سے روکے اور نماز سے روکے اس سے رُک جانا چاہیے۔ نماز ذکر اللہ کی اعلیٰ ترین فرد ہے۔ کیوں کہ اس میں تمام اعضاء

جوارح دوسرے کاموں سے رُکے رہتے ہیں۔ البتہ یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری سے مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری ہو، ذکر ہے۔ جس وقت جس کام کا حکم ہے جس کام کا اشارہ ہے اس وقت وہی کام کرنا ذکر ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ایک نمازی کے سامنے سے اندھا گزر رہا ہے اور خطرہ ہے کہ اگر اس کو روکا نہ گیا تو وہ کنویں میں یا گڑھے میں گر پڑے گا تو نماز توڑ کر اس اندھے کو بتانا واجب ہے۔ اسی طرح کسی وقت اگر کسی مخلوق کا حق ادا کرنا ہے، بیوی کا حق ہو یا سائل کا حق ہو یا پڑوسی کا، اس وقت اس حق کو ضائع کر کے وظیفہ پڑھتے رہنا جائز نہیں ہے۔ یہی راز حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول میں ہے کہ اپنے دل کو فارغ رکھتا ہوں کہ شاید کسی وقت ذکر کی توفیق ہوجائے۔

لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۹۳)

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جب کہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں۔

مومنین کو مباحات کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں خواہ وہ روز پلاؤ زردہ ہی کھائیں بشرطے کہ ان کا تقویٰ بڑھتا رہے اور وہ ایمان کو تازہ کرنے اور تقویٰ کے اعلیٰ تر معیار پر پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ درجۂ احسان اور درجۂ محبوبیت پر پہنچ جائیں۔ ایسے لوگوں کا کھانا بھی ان میں نور پیدا کرتا ہے اور غافلین کا کھانا ظلمت پیدا

کرتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کا مباحات میں مبتلا رہنا مضر ہوتا ہے جیسا کہ اشارتاً معلوم ہے کیوں کہ وہ ان میں منہمک ہوجاتا ہے اور یادِ خدا سے غافل ہوجاتا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ م اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۃ المائدہ، آیت ۱۱۰)

جب کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسٰی ابنِ مریم میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمھاری والدہ پر ہوا ہے جب کہ میں نے تم کو روح القدس سے تائید دی تم آدمیوں سے کلام کرتے تھے، گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی اور جب کہ میں نے تم کو کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور توریت اور انجیل تعلیم کیں اور جب کہ تم گارے سے ایک شکل بناتے تھے جیسے پرندے کی شکل ہوتی ہے میرے حکم سے پھر تم اس کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے اور تم اچھا کردیتے تھے مادر زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو میرے حکم سے اور جب کہ تم مردوں کو نکال کر کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے (یعنی تمھارے قتل و اہلاک سے) باز رکھا جب تم ان کے پاس دلیلیں لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انھوں نے کہا تھا کہ یہ بجز کھلے جادو کے اور کچھ بھی نہیں۔

جس طرح چڑیا کو زندہ کردینا اللہ کے حکم سے تھا، بالکل اسی طرح مٹی سے اس کی ہیئت کا بنانا بھی اللہ کے حکم سے تھا اور دونوں باتوں کا خدا کے نزدیک یکساں

سہل ہوتا مسلّم ہے۔ گرچہ عادتاً ہیئتِ طیر کا بنانا آسان نظر آتا ہے یعنی انسان کے لیے عادتاً ایسا کرنا آسان ہے اور اس کو زندہ کرنا محال ہے لیکن اللہ کے حکم کے نزدیک انسان کو دونوں پر قدرت حاصل ہو جانا یکساں آسان ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۱)

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں کو اور نور کو بنایا پھر بھی کافر لوگ (دوسروں کو) اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی ظلمات کے بھی خالق ہیں اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جب کچھ نہیں تھا، خلا تھا اور تمام اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ کچھ نہیں ہوتا۔ state of nothingness ہمارے تصور میں نہیں آ سکتی۔ فسبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۱۱)

آپ فرما دیجیے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو پھر دیکھ لو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

کتبِ سیر اور تاریخ کا مطالعہ بھی ایک درجے میں سیر فی الارض ہے جس سے اہلِ بصیرت کو ہدایت اور روشنی ملتی ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیت ۱۲)

آپ کہیے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی مِلک ہے آپ کہہ دیجیے کہ سب اللہ ہی کی مِلک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرما لیا ہے تم کو خدا تعالیٰ قیامت کے روز جمع کریں گے اس میں کوئی شک نہیں جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کر دیا ہے سو وہ ایمان نہ لاویں گے۔

ایک تو مستقلاً اس کا مشاہدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے۔ دوسرے قیامت کا دن مقرر کر دینا اور اسے بتا دینا بھی ایک بڑی رحمت ہے۔ اگر گناہ پر فوراً سزا ہو جائے اور توبہ کا موقع نہ ملے تو انسان کہاں کا رہے؟ یہ بھی خدا کی بڑی رحمت ہے کہ دنیا میں عذاب نہیں ہوتا۔ گناہ بڑے سے بڑا کیوں نہ ہو اس کے بعد جو مصیبت آتی ہے اس گناہ کے سبب سے وہ ابتلا اور تنبیہ ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی موت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور جس نے موت تک بھی توبہ نہیں کی، تب بھی شرک سے کم تر درجے کے گناہوں کے معاف کر دیے جانے سے ناامیدی نہیں ہے۔ جن کی گرفت دنیا میں ہوتی ہے ان کو بھی اتنی سزا نہیں دی جاتی جتنی ان گناہوں کی واقعی سزا ہے۔

دوسرا ظہور رحمت کا قیامت کے دن ہوگا جب کہ مومنوں کو انعام دیا جائے گا اور کافروں کو سزا دی جائے گی۔ اگر کافروں کو سزا نہیں ملتی اور مومن اور کافر برابر ہوتے تو یہ مومنوں کے ساتھ رحمت کا اظہار نہیں ہوتا۔ لہٰذا کافروں پر عتاب درپردہ مومنوں پر انعام ہے۔ فالحمد للہ۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ م اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیت ۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ لوگ اس (رسول) کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کرلیا ہے سو وہ ایمان نہ لاویں گے۔

جس طرح اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالنے والے خدا پر ایمان نہیں لاتے، اسی طرح وہ اس کے رسول پر بھی ایمان نہیں لاتے۔ کیوں کہ خدا پر ایمان، اس کی رحمت پر ایمان، یومِ قیامت پر ایمان، رسول پر ایمان اور کتابِ عظیم پر ایمان سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۲۵)

اور ان میں بعضے ایسے ہیں کہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر حجاب ڈال رکھے ہیں اس سے کہ وہ اس کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور اگر وہ لوگ تمام دلائل کو دیکھ لیں ان پر بھی ایمان نہ لاویں یہاں تک کہ جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں، یہ لوگ جو کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے چلی آرہی ہیں۔

یہ مثال ان لوگوں پر بھی صادق آتی ہے جو ''اسکالرز'' سمجھے جاتے ہیں، قرآن شریف اور اسلام کے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے اور وہ قرآن شریف کے صحیح فہم سے قاصر ہیں جیسا کہ مستشرقین اور بعض دوسرے لوگ ہیں جنھوں نے

قرآن شریف کا ترجمہ کیا، تفسیر لکھی لیکن وہ دولتِ ایمان سے محروم ہیں۔ ایسے لوگوں واسطے سے یعنی ان کی تحریروں کے ذریعے سے قرآن شریف اور اسلام کو سمجھنا کیسی بے ا کی بات ہے۔

بل بدالھم ما کانوا یخفون من قبل ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ وانھم لکذبون O (سورۃ الانعام، آیت ۲۸)

بلکہ جس چیز کو اُس کے قبل دبایا کرتے تھے وہ ان کے سامنے آگئی ہے اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھی بھیج دیے جاویں تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

یہ شخصی فطرت ہے جو ان کی زندگی پر محیط ہے۔ اور اگر وہ ساری عمر خدا کی نافرمانی کرتے رہے تو آئندہ بھی اگر ان کو مہلت دی جاتی تو یہی کرتے۔

There are characteristics ingrained in life.

اس سے کم تر درجے میں جن عادتوں کو ہم اپنا لیتے ہیں وہ بھی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہیں اور ان سے بھی زندگی بھر جان چھڑانی مشکل ہوجاتی ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو چھڑا دیں۔ اس لیے تضرع اور دعا ضروری ہے۔

قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتی اذا جآءتھم الساعۃ بغتۃ قالوا یحسرتنا علی ما فرطنا فیھا وھم یحملون اوزارھم علی ظھورھم الا سآء ما یزرون O وما الحیوۃ الدنیآ الا لعب و لھو وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون افلا تعقلون O (سورۃ الانعام، آیت ۳۲،۳۱)

بے شک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللّٰہ سے ملنے کی تکذیب کی یہاں تک کہ جب وہ معین وقت ان پر دفعتاً آ پہنچے گا کہنے لگیں گے کہ ہائے افسوس ہماری کوتاہی پر جو اس کے بارے میں ہوئی اور (حالت ان کی یہ ہوگی کہ) وہ اپنے بار اپنی کمر پر لادے ہوں گے خوب سن لو کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو لادیں گے اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز لہو و لعب کے اور پچھلا گھر متقیوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سوچتے سمجھتے نہیں ہو۔

جو لوگ آخرت کے قائل نہیں ہیں ان میں سے بعض یہ بہانہ بناتے ہیں کہ جب جنت اور جہنم مقدر ہوچکی ہے تو پھر ہم دنیاوی عیش و عشرت کیوں چھوڑیں؟ وہ درحقیقت اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں اور تقدیر کے بھی قائل نہیں ہیں کیوں کہ اگر ان کو ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ کہیں وہ جہنمی نہ ہوں وہ لاکھ لاکھ جتن کرتے کہ ان کی تقدیر بدل جائے اور خدا کے آگے خوب آہ و زاری کرتے اور اگر تقدیر کے قائل ہوتے تو کاتبِ تقدیر کا اور اس کے وعدوں کا انکار نہیں کرتے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیت ۳۴، ۳۵)

اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جاچکی ہے سو انھوں نے اس پر صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی اور اللّٰہ تعالیٰ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ کے پاس بعض پیغمبروں کے بعض قصص پہنچ چکے ہیں

اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ
زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ
تو کرو اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کردیتا سو آپ
نادانوں میں سے نہ ہوجیے۔

پہلے رسول بھی یعنی بہت سے جو نبیِ کریم ﷺ سے پہلے مبعوث ہوئے وہ جھٹلائے گئے اور ایذا پہنچائے گئے یہاں تک کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی۔ ہر رسول کا جھٹلایا جانا ضروری نہیں ہے، لیکن ہر رسول کی مدد ہونا یقینی بات ہے۔ یہ نصرت کبھی اس طرح بھی آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کے بعد دوسرے پیغمبران کے جانشین ہوئے اور بالآخر دین غالب ہوا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہوگا کہ ان کے جانے کے بعد اس قوم پر جس نے انھیں جھٹلایا، عذاب آیا اور وہ قوم فنا کردی گئی ہو۔ اور دراصل آخری فتح ہی اصل فتح ہوتی ہے۔ چونکہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے اس لیے جھٹلائے جانے اور ایذا پہنچائے جانے کے بعد ان کی مدد ہونا اور دین کا غالب ہونا ضروری تھا۔

دوسری آیتِ کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول ﷺ سے خطاب فرما رہے ہیں لیکن کفار اہلِ کتاب اور مشرکین نے اس کتابِ عظیم کو رسول ﷺ کا قول قرار دے دیا۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کا یہ الزام ایک شخص میں split اور irreconcilable personalities جمع کردینے کے مرادف ہے یعنی خالق کی personality بھی اور مخلوق کی بھی (چونکہ حضور ﷺ کو وہ بھی مخلوق مانتے ہیں)۔ اس طرح کی حرکت ان کی پرانی ہے انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی اسی طرح کی split and irreconcilable personalities یعنی متعدد اور متضاد شخصیتیں اپنے جی سے گڑھی کہ خدا بھی ہے اور خدا کا بیٹا بھی۔ بابِ ہدایت میں ان کو اتنی موٹی سی بات بھی نظر نہیں آئی۔ ایسی شخصیت کا وجود محال ہے لہٰذا قرآن شریف کا بھی رسول ﷺ کا

قول ہونا محال ہے۔ یہی لوگ یتھون عنہ وینئون عنہ کی تعریف میں آتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان جوان کو بڑا قابل اور عقل مند اور اسکالر سمجھتے ہیں۔ فنعوذ باللّٰہ۔

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۳۶)

وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللّٰہ تعالیٰ زندہ کرکے اٹھاویں گے پھر سب اللّٰہ ہی کی طرف لائے جاویں گے۔

غور سے سننا صحیح طور پر سمجھنے اور بات کو پرکھنے کے لیے بہت ضروری ہے اور اگر جو کچھ کہا گیا ہے وہ سچ ہے تو صحیح فہم کے ساتھ اس کو سمجھنے والا فوراً اس کو قبول کرلیتا ہے۔ لیکن اگر سننے والے کے ذہن پر کوئی اور چیز مسلط ہے اور وہ صرف سرسری طور پر سنتا ہے تو اس کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ اسی طرح جو لوگ اس کلام پر توجہ نہیں دیتے جو اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر اتارا ہے، وہ قیامت تک نہیں سمجھیں گے کہ یہ خدا کی طرف سے ہدایت ہے یا اس کی طرف سے کیا ہدایت مل رہی ہے۔

ولقد ارسلنآ الیٰ اُمم مّن قبلک فاخذنٰهم بالبأسآء والضّرّآء لعلّهم یتضرّعون۝ فلولآ اذ جآءَهم بأسنا تضرّعوا ولٰکن قست قلوبهم وزیّن لهم الشّیطٰن ما کانوا یعملون۝ فلمّا نسوا ما ذکّروا به فتحنا علیهم ابواب کلّ شیءٍ ؕ حتّیٰ اذا فرحوا بمآ اوتوآ اخذنٰهم بغتة فاذا هم مّبلسون۝ فقطع دابر القوم الّذین ظلموا ؕ والحمد للّٰه ربّ العٰلمین۝ (سورۃ الانعام، آیت ۴۳۔۴۵)

اورہم نے اُور امتوں کی طرف بھی جو کہ آپ سے پہلے ہوچکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے سو ہم نے ان کو تنگ دستی اور بیماری سے پکڑا تا کہ وہ ڈھیلے پڑ جاویں، سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے لیکن ان کے قلوب تو سخت رہے اور شیطان ان کے اعمال کو (ان کے خیال میں) آراستہ کر کے دکھلاتا رہا، پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کونصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کردیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں وہ خوب اِترا گئے ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے، پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

قساوتِ قلب کی پہچان یہی ہے کہ جو برائی رائج الوقت ہو، ان کو شیطان نظروں میں اچھا بنا دے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر بھی اس کے سامنے گریہ وزاری نہ کریں۔

یہ جیسا آج کل ہو رہا ہے اور ہم جن مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہی ہے۔ پھر ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے تضرع کیوں نہیں کرتے اور ہماری آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں نکلتے؟ کہیں ہمارے قلوب کی سختی ہمیں بالکل ہی ڈبو نہ دے۔ گریہ وزاری کا نہ ہونا قلب کی سختی کی علامت ہے اور یہ بڑے ڈر کی چیز ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب پر اختیار ہی نہیں ہوتا اور کسی کا قلب طبعاً ایسا ہوتا ہے کہ رونا نہیں آتا۔ تو اس آیت کے اگلے ٹکڑے سے ایسے لوگوں کی مایوسی دور ہوتی ہے کیوں کہ قلب کی جو قساوت یہاں مذکور ہے اس کا لازم ملزوم حصہ یہ ہے کہ شیطان ان لوگوں کے اعمال کو ان کے سامنے خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ تو اگر یہ بات نہیں ہے اور کوئی شخص اپنے اعمال کی برائیوں کا احساس رکھتا ہے اور توبہ استغفار کرتا رہتا ہے اور عقلی طور پر تضرع میں مصروف ہے، تو وہ اس قساوت میں مبتلا نہیں ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ قساوتِ قلبی کی نشانی یہ ہے کہ انسان کو اپنے برے اعمال اچھے معلوم ہوں۔ یہاں سے یہ بھی بطور corollary معلوم ہوا کہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا

نظر نہ آنا بہت بڑی بدقسمتی ہے اور یہ بھی اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ تکبر تمام مصیبتوں کی جڑ ہے اور تکبر ہی انسان کو ایمان لانے سے روکتا ہے۔

مصیبت اور تنگی کے وقت میں بھی دل کا سخت ہو جانا (اگر پوری قوم اس میں مبتلا ہو یا اس کے بیشتر افراد اس میں مبتلا ہوں) قوم کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے بعد دوم stages اور ہیں۔ تباہی کی اگلی سیڑھی یہ ہے جس کا ذکر فتحنا علیھم... الخ میں فرمایا گیا ہے۔ صرف پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہلاک ہونے والی ہے لیکن دوسری آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شاء اللّٰہ یہ قوم ہلاک نہیں ہوگی یعنی وہ حالت ابھی نہیں پہنچی ہے جس کے بعد گزشتہ قومیں ہلاک ہوتی رہی ہیں۔ ارادۃ اللّٰہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم پر سے افلاس ونکبت اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک یہ خدا کی طرف رجوع نہیں ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ اللّٰہ تعالیٰ کا خاص فضل نبی رحمت ﷺ فداہ ابی وامی ونفسی کی امت پر ہے۔ لہٰذا یہ فرحوا بما اوتوا کے درجے پر ان شاء اللّٰہ تعالیٰ کبھی نہیں پہنچے گی جس کے بعد تیسرا قدم اخذنھم بغتۃ...الخ کا ہوتا ہے جس سے قوم کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

اس سے ان لوگوں کا بھی جواب ہوگیا جو کہتے ہیں کہ مسلمانوں ہی پر کیوں برق گرتی ہے اور دوسری قومیں بھی جو خدا کو بھول گئی ہیں اور جن کے قلوب ہمارے قلوب سے زیادہ سخت ہیں، وہ کیوں عیش میں ہیں؟ جواب یہ نہیں ہے کہ ان کے اعمال اچھے ہیں بلکہ جواب یہ ہے کہ یہ خدا کا احسان اس قوم پر ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ قوم عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے گی الا وہ جو تیسری قسم کا عذاب ہے یذیق بعضم بأس بعض (جس میں ہم لوگ اکثر جگہ مبتلا ہیں) او کمال قال رسول اللّٰہ ﷺ۔ فالحمدللّٰہ۔

قُلۡ لَّاۤ اَقُوۡلُ لَكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَكُمۡ اِنِّىۡ مَلَكٌ‌ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ‌ ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى

الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۵۰)
آپ کہہ دیجیے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کا اتباع کرلیتا ہوں آپ کہیے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہوسکتا ہے سو کیا تم غور نہیں کرتے۔

معلوم ہوا کہ جو اتباعِ وحی کرے وہ بصیر ہے اور جو وحی کا اتباع نہ کرے وہ اندھا ہے۔ اور یہی بات مومن اور کافر میں فرق کرنے والی ہے۔ اس کا تعلق نہ دولت سے ہے نہ supernatural power (مافوق الفطری قوت) سے ہے، نہ spiritual power (روحانی قوت) سے ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ O وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۵۱،۵۲)
اور ایسے لوگوں کو ڈرائیے جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس (ایسی حالت سے) جمع کیے جائیں گے کہ جتنے غیر اللّٰہ ہیں نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع ہوگا، اس امید پر کہ وہ ڈر جاویں اور ان لوگوں کو نہ نکالیے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضامندی کا قصد رکھتے ہیں۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور آپ کا حساب ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں ورنہ آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہوجاویں گے۔

انذار کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تمام عالم کو بداعمالیوں کے خوف ناک انجام

سے ڈرایا جائے تاکہ کافروں پر اتمامِ حجت ہوجائے۔ دوسرے مسلمانوں کو متقی بنانا ہے کیوں کہ گناہوں کی سزا مومن کے لیے بھی ہے۔ اور متقی وہ ہے جو اطاعتِ رسول میں پکا ہو۔ یہ آیات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناز کی تلوار ہے جو صرف عاشقوں کے لیے ہے اور اس کے بعد دلدہی بھی کتنی عجیب اور زبردست ہے! مومنین کے حق میں یہ بڑی ہی دلدہی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ کی شانِ محبوبیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ پاک اپنے حبیب ﷺ کو ہر نقصان اور پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں۔

یہ خطاب حضور سرورِ کونین سیّد الاوّلین والآخرین کو ہو رہا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ آیت نمبر ۵۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو اپنے رب کے پاس جمع ہونے کا اور اس کے سوا کوئی ولی یا شفیع نہیں ہونے کا یقین ہے ان کے لیے بھی انذار بالوحی کی ضرورت ہے۔ اور ان کے لیے بھی ایک درجہ تقویٰ ہے اور اس کے اوپر ایک اور یہاں تک کہ بے حساب درجات ایک کے اوپر ایک ہیں لاتقف عندھم۔ اور ہر درجے کے متقی کے لیے یہ کتاب اس سے اعلیٰ درجے پر پہنچنے کا ذریعہ ہے اور ہدایت ہے اور واحد ذریعہ ہے، یعنی اس سے ہٹ کر کوئی اور ذریعہ ہدایت کا نہیں ہے۔

آیت نمبر ۵۲ تو مومنین کے لیے بڑی ہی بشارت ہے۔ مومنین کی دلدہی اور اکرام کے لیے کتنی عظیم الشان آیت ہے! خطاب دنیا کی عظیم ترین اور اکرم ترین شخصیت سے ہے اور نہ صرف یہ کہا جارہا ہے کہ آپ ﷺ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے، یعنی آپ سے ان کی اچھائی برائی کی پرسش نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی فرمایا جارہا ہے کہ ان پر آپ ﷺ کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے، یعنی ان سے آپ کے نامۂ اعمال کے متعلق پرسش نہیں ہوگی۔ دونوں کا حساب کتاب الگ الگ ہے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ آپ کے رب ہیں اسی طرح ان کے بھی رب ہیں۔ معبودیت اور ربوبیت میں اور ہر صفت میں اللہ تعالیٰ منزہ عن الشرک ہیں۔ بات صرف ما علیک...شئی تک ہی پوری ہوجاتی تھی مگر مقصود تو دراصل مومنین کے اکرام کا اظہار ہے۔ حضور ﷺ فداہ ابی و امی و نفسی کی رفعت شان کا اظہار مقصود نہیں ہے۔ یہ فرما کر ''اور نہ ان پر آپ (ﷺ) کے حساب میں سے کچھ ہے'' ان کی عظمت و شان کو آسمان پر پہنچا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی

برابری کا درجہ! نعوذ باللہ، ہم ان کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مگر اندازِ بیان دیکھیے اور پھر بات بھی بالکل سچی ہے:

بے چارگی میں برابر ہیں ہم اور تم

یہ آیت قرآن شریف کے من اللہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ یہ خطاب صرف خدا ہی کی طرف سے صرف رسول کو ہوسکتا تھا۔ کسی اور کے ذہن میں نعوذ باللہ یہ خطاب آ ہی نہیں سکتا تھا۔ مومنین کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کیوں کہ وہ تو ہر وقت حلقہ بگوش تھے آپ ﷺ کے ادنیٰ اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کردینے کو تیار تھے، آپ ﷺ ہی کو اپنا دین ایمان بنائے ہوئے تھے۔ اور کافرین کے وہم و گمان میں تو اور بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کیوں کہ وہ تو مومنوں کو نعوذ باللہ ذلیل سمجھتے ہی تھے اور ان کو تو اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ وہ کیسے اس بات کو سوچ سکتے تھے۔ پھر یہ خطاب جو جلال اور جمال اور محبوبیت interwoven (ایک دوسرے کے ساتھ مربوط) ہے وہ کسی بشر یا جن یا فرشتے یا کسی مخلوق کے اندازِ بیان میں ممکن نہیں ہے۔

دوسری آیت سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ اپنوں کے اوپر نظر رکھنا، ان کی خبرگیری کرنا، ان کی اصلاح اور نگہداشت دوسروں پر تبلیغ کرنے سے کسی طرح کم درجہ نہیں رکھتا۔

ہاں مگر اتنی زیادہ خوش خبری سن لینے کے بعد یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ تم اس گروہ میں اسی وقت شامل ہونے کی امید رکھ سکتے ہو جب تم بھی اپنے رب کو صبح و شام پکارو اور اس کی مرضی تلاش کرتے رہو۔ یہ خطاب ہی ان لوگوں کے متعلق ہے یدعون... یریدون وجهه۔

کیا رؤف الرحیمی ہے اور کس رؤف الرحیم کو یہ تنبیہ کی جارہی ہے۔ سجدے سے زمین کو بھر دیا جائے جب بھی اس آیت کے نازل کرنے کا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

فسبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَO وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ
وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَO (سورۃ الانعام، آیت ۵۳۔۵۵)

اور اسی طور پر ہم نے ایک کو دوسرے کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے تاکہ یہ لوگ کہا کریں، کیا یہ لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے اللہ تعالیٰ نے ان پر زیادہ فضل کیا ہے؟ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آویں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو یوں کہہ دیجیے کہ تم پر سلامتی ہے تمھارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمے مقرر کرلیا ہے کہ جو شخص تم میں سے کوئی برا کام کر بیٹھے جہالت سے پھر وہ اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح رکھے تو (اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ) وہ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں بڑی رحمت والے ہیں اور اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے رہتے ہیں اور تاکہ مجرمین کا طریقہ ظاہر ہوجاوے۔

یہ پورا رکوع مومنین کے لیے بڑی ہی تسلی اور خوش خبری کا ہے۔ مومنوں پر جو انعامات اللہ تعالیٰ کے ہیں جن میں سب سے بڑا انعام خود کلام اللہ کا نازل فرمانا ہے اس کو دیکھ کر کافرین متکبرین یہ کہتے تھے کہ کیا یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہے؟ (یہ کتاب قریش کے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں ہوئی؟) ان کے استہزا کا ذکر اور اس کا مسکت جواب ہے۔ آیت نمبر ۵۳ میں شاکرین کا لفظ ظالمین کا antonym (الٹا) ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نعمت اسی کو دی جاتی ہے جو اس کا شکر ادا کرے۔ پھر مومنوں کو غیر مبرا عن المعاصی رکھتے ہوئے توبہ پر عام معافی کا اعلان ہے۔ ان کے لیے خوش خبری ہے جو گناہ کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں۔ اور آخر میں یہ ہے کہ اتنی چھوٹ، اتنی دلدہی اور اتنی شفقت کے بعد بھی جو مومنوں کے گروہ میں شامل نہ ہو اور

تقویٰ اختیار نہ کرے تو وہ جانے اور اس کا کام۔ اور اس طرح کے طور پر مجرمین کی ڈگر بھی واضح ہوگئی کہ جو گناہ کرے اور نادم بھی نہ ہو اور اپنے کفر پر ڈٹا رہے وہ دراصل مجرم ہے۔ اسی سے منافقین کی بھی پہچان ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی رحمت اپنے اوپر واجب کرلی پھر بھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ جس طرح ایمان سے عملِ صالح کا رشتہ الگ نہیں ہوسکتا (دونوں inseperable ہیں) اسی طرح توبہ سے اصلاح کا رشتہ الگ نہیں ہوسکتا اور ایک کے بغیر دوسرا معتبر نہیں ہے۔

عمل منکم سوء بجھالۃ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو نادانی کی وجہ سے نہیں بلکہ جان کر گناہ کرے گا اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہاں شرط بجھالۃ کی حصر کے لیے ہے تبعیض کے لیے نہیں جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مواعظ میں فرمایا ہے۔ جس طرح وعداللہ ... عنھم سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے بعض مراد نہیں ہیں بلکہ تمام کے تمام اصحاب مراد ہیں۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ سب کے سب جہالت ہی کی وجہ سے ہیں۔ کما قال مولانا شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ فی حاشیۃ ''اگر گناہ کے تباہ کن نتائج کا پوری طرح اندازہ اور استحضار ہو تو کون شخص ہے جو اس پر اقدام کی جرأت کرے گا۔'' کیوں کہ انسان کی خلقت ہی میں ضعف ہے اور ظلم اور جہل اس کے خمیر میں ہے۔ ورنہ وہ ہرگز ''امانت'' قبول نہیں کرتا)۔ اس لیے اس سے گناہ کا سرزد نہ ہونا جو دراصل اپنے نفس پر ظلم ہے، بہت ہی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اپنے اوپر توبہ قبول کرنا واجب کرلیا تو اگر احکام پورے ادا نہیں ہوسکتے تو کم از کم ندامت تو اس تقصیر پر ہونی چاہیے۔ جس طرح گناہ کا کبھی کبھار صادر ہوجانا فطرتِ بشری ہے، اسی طرح گناہ پر ندامت ہونا بھی فطرتِ بشری ہے اور جو یہ بھی نہ کرے کہ گناہ ہوجانے پر صدقِ دل سے توبہ کرلے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے کو احکام کا پابند نہیں سمجھتا۔ گویا اپنے کو خدا کا محکوم ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اصل مجرم ہے۔ فاعوذ اللہ۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ O وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ O وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ O (سورۃ الانعام، آیت ۸۰-۸۳)

اور اُن سے ان کی قوم نے حجت کرنا شروع کی۔ آپ نے فرمایا، کیا تم اللّٰہ کے معاملے میں مجھ سے حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھ کو طریقہ بتلا دیا ہے اور میں ان چیزوں سے جن کو تم اللّٰہ کے ساتھ شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا۔ ہاں لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے۔ میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے کیا تم پھر خیال نہیں کرتے اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے شریک بنایا ہے حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھیرایا ہے جن پر اللّٰہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی سو ان دو جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اگر تم خبر رکھتے ہو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے ایسوں ہی کے لیے امن ہے اور وہی راہ پر چل رہے ہیں اور یہ ہماری حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں دی تھی، ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر حجت قائم کر کے اپنا بلند مرتبت ہونا ثابت کر دیا۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ شرافت اور بڑائی کا معیار حکمت اور علم ہے اور اگر ایک شخص ان دونوں باتوں میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہے تو وہ شرافت کے اعلیٰ معیار پر ہے اور اگر کوئی شخص شرافت کے بہت بلند معیار پر ہو تو اس کی وجہ سے اس کی آل

اولاد سب دوسروں سے نسبی طور پر ممتاز ہوجاتی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امۃً قانتہ کا خطاب ملا اور ان کی آل کو فضیلت تمام دنیا پر عطا کی گئی۔ آیت نمبر ۸۳ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ علم اور حکمت ہی رفعِ درجات کا ذریعہ ہیں۔ ایک بے وقوف جاہل اگر بادشاہ بن جائے تب بھی لوگوں کی نظروں میں اس کی وہ وقعت نہیں ہوتی جو ایک دانش مند کی ہوتی ہے۔ واقعی جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیرِ کثیر عطا کی گئی۔

اور حکمت میں اللّٰہ تعالیٰ پر ایمانِ کامل اور تقویٰ کا اعلیٰ معیار جو تمام حکمتوں کی جڑ ہے اور جس کی وجہ سے تہذیبِ نفس ہوتی ہے یہ سب شامل ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے نفس کو مہذب کرلیتا ہے وہ شریف کہلاتا ہے اور جو جانوروں کی طرح بے لگام خواہشات (uncontrolled instincts) پر عمل کرتا ہے وہ گنوار کہلاتا ہے اور تقویٰ علم اور حکمت دونوں میں common ہے۔ چنانچہ حدیثِ پاک میں تقویٰ کو رأس الحکمۃ فرمایا گیا ہے اور قرآن شریف میں علما ہی کو اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرنے والا بتایا گیا ہے۔ اسی طرح پڑھا لکھا آدمی شریف کہلاتا ہے اور جاہل شخص گنوار کہلاتا ہے۔

تہذیبِ نفس و شرافت کا اثر اولاد پر بھی ضرور پڑتا ہے۔ یہ بات جینیات (genetic) کا علم رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں اور عام مشاہدہ بھی ہے۔ البتہ اس اثر کو ماحول کا اثر یا خود اختیار کردہ عادات ملیا میٹ بھی کرسکتی ہیں۔ یہ خلاصہ ہے نسبی شرافت کا۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۙ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۸۵۔ ۸۸)

اور (نیز) زکریاؑ اور یحییٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور الیاسؑ کو (اور یہ) سب (حضرات پورے شائستہ لوگوں میں تھے اور نیز (ہم نے طریقِ حق کی ہدایت کی) اسماعیلؑ کو اور یسعؑ اور یونسؑ کو اور لوطؑ کو اور (ان میں سے) ہر ایک کو (ان زمانوں کے) تمام جہان والوں پر (نبوت سے) ہم نے فضیلت دی اور نیز ان کے کچھ باپ دادوں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو (طریقِ حق کی ہم نے ہدایت کی) اور ہم نے ان (سب) کو مقبول بنایا اور ہم نے ان کو راہِ راست کی ہدایت کی، اللہ کی ہدایت وہ یہی (دین) ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت کرتا ہے اور اگر (فرضاً) یہ حضرات بھی شرک کرتے تو جو کچھ یہ اعمال کیا کرتے تھے ان سے سب اکارت ہوجاتے۔

اتنے بڑے بڑے سترہ اٹھارہ اولوالعزم پیغمبروں کا ذکر فرمانے کے بعد فرمانا کہ اگر وہ شرک کرتے تو ان کے اعمال حبط ہوجاتے۔ ایک تو اس سے اللہ تعالیٰ کے قوانین کے اٹل ہونے کا پتا چلتا ہے کہ اگر یہ بھی شرک کرتے تو ان کے تمام اعمال جن میں سے کئی ایسے وزنی ہیں کہ پہاڑوں کے وزن ان کے سامنے ہیچ ہیں، وہ سب اعمال حبط ہوجاتے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا پتا چلتا ہے کہ سب کے سب اس کے سامنے دم سادھے ہوئے ہیں۔ عبدیت میں پورے ہیں۔ تیسرے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آدمی کا اختیار کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا دونوں طرف ہر وقت قائم رہتا ہے چنانچہ ان معصومین کو بھی اختیار نہ تھا کہ شقِ اوّل یا شقِ ثانی اختیار کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی خالقیت کمال کی خالقیت ہے جس کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی کہ تکوینی طور پر کسی وقت کوئی بھی ان کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا اور اس کے باوجود ایک ایسی مخلوق پیدا فرما دی جسے مرتے دم تک اختیار دیا گیا ہے فمن شاء فالیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ کوئی درجہ (stage) ہمارے لیے ایسا آئے گا جس پر پہنچ کر ہم سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوسکے گا، غلط ہے۔ اور مامون عن سوء الخاتمہ ہوجانا کفر ہے۔ اسی لیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت عن الشر والمعاصی مانگنی چاہیے اور اسی لیے ہمارے سردار کو بھی کہا گیا ہے فاستعذ باللہ. فاعوذباللہ من جمیع الشرور والفتن۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ
شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی
لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ
مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ
یَلْعَبُوْنَ O وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ
وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ O (سورۃ الانعام،
آیت ۹۱،۹۲)

اوران لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی جب کہ یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز بھی نازل نہیں کی۔ آپ کہیے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لیے وہ ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن کو ظاہر کردیتے ہو اور بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو اورتم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے بڑے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے (نازل فرمایا ہے) پھران کو ان کے مشغلے میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجیے اور یہ (بھی ایسی ہی) کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور تاکہ آپ مکے والوں کو اور آس پاس والوں کو ڈراویں اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں۔

جو اندازِ بیان آیت نمبر۹۱ میں اختیار فرمایا گیا ہے اس سے اشارہ ملتا ہے کہ کافروں اور منکروں کے اعتراضات بالکل قابلِ التفات نہیں ان کے انکارِ رسالت کے جواب میں صرف ایک سوال کیا گیا کہ پوچھیے کہ کس نے کتاب اتاری موسیٰ پر تجعلونہ... یعنی تم اس کو واقعی کتاب منزل من اللہ سمجھتے ہو اس لیے اس کی تعظیم بھی کرتے ہو اور چونکہ تم اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی میں مبتلا ہو اس لیے اس کے بہت سے حصے

چھپاتے ہو۔ اب اس سوال کا جواب، وہ ہزار فکر میں غلطاں رہیں نہیں دے سکتے۔ دراصل رسالت کا انکار اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کا انکار کرنا ہے۔ لہٰذا جو شخص وحدانیت کا اقرار کرتا ہے لیکن رسالت کا انکار کرتا ہے، وہ جانتا ہی نہیں کہ خدا ہے کیا۔ بھلا ایسے رحیم و کریم سے یہ گمان رکھنا کہ وہ انسانوں کو یوں ہی زمین میں چرنے پھرنے کے لیے چھوڑ دے گا اور ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول نہیں بھیجے گا درحقیقت خدا تعالیٰ ہی کا انکار کرنا ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ سے یہ واضح ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کتابِ مبارک پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور عملی طور پر اپنے ایمان بالآخرۃ کا مظاہرہ بھی نماز پر محافظت کر کے کرتے ہیں کیوں کہ جس کے پاس لوٹ کر جانے کا یقین ہے اس کے آگے سربسجود ہوجانا بھی لازمی ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں بھی قرآن شریف میں امن باللّٰہِ والیوم الآخر ہے، وہاں وہاں امن برسل اللّٰہ جمیعا وھذا الرسول مراد لیا جائے گا ورنہ قرآن کے خبر کی تکذیب نعوذ باللّٰہ لازم آتی ہے اور logically ہم اسی کتاب کی ایک آیت کو اپنے نظریے کے ثبوت میں پیش کر کے اسی کتاب کی تکذیب نہیں کر سکتے۔

ایک اشارہ اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی ملتا ہے کہ جس درجے کا ایمان ہوگا اسی درجے کی نماز ہوگی (اور اسی درجے کی اس میں خاصیت برائیوں اور فواحش سے روکنے کی ہوگی) اور اعلیٰ درجہ ایمان کا وہ ہے جسے احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اگر نماز میں درجۂ احسان حاصل ہوگا تو دوسرے اعمال بھی اسی درجے کے ہوں گے۔ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کی جڑیں خشک ہوگئی ہیں یا ایمان ہے ہی نہیں صرف زبانی اقرار ہے اور یہ دونوں حالتیں خطرناک ہیں۔ ایمانِ کامل ہوتے ہوئے گناہ کا سرزد ہوجانا تو انسانی کمزوری کی وجہ سے ممکن ہے لیکن پھر گناہ کے فوراً بعد ندامت ہونا ایمان کی علامت ہے اور ندامت ہی توبہ ہے۔ اس کے برعکس گناہ میں ہر وقت مبتلا رہنا اور ہمہ وقت دنیا کی فکر میں رہنا، حلال و حرام کی تمیز نہ ہونا یہ سب باتیں ایمان کے منافی ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَاؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۹۲)

اور یہ (بھی ایسی ہی) کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور تا کہ آپ مکے والوں کو اور آس پاس والوں کو ڈراویں اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں۔

اہلِ کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر واقعی یقین رکھتے تھے اور غیر اہلِ کتاب میں سے بھی جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے تھے اپنے قلبِ سلیم کی وجہ سے کسی دینِ حق کی تلاش میں تھے جو ان کو نہ یہودیوں کے دین میں ملتا تھا نہ نصرانیوں کے دین میں، وہ اس مبارک کتاب پر ایمان لے آئے۔ یہ ان لوگوں کے ایمان بالآخرۃ اور قلبِ سلیم کی کسوٹی بھی ہوگئی یعنی اس کتاب پر ایمان لانا اور اس کتاب کی صداقت کی ایک روشن دلیل بھی ہوگئی کہ علمائے بنی اسرائیل اور صالح مردانِ حق مثل سیّدنا ابی بکرؓ اس کتاب پر ایمان لے آئے۔ آخرت پر ایمان لانا کتاب پر ایمان لانے سے اس قدر مربوط (interlinked) ہے کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے بلکہ ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے زینا لھم اعمالھم ...الخ

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ O وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ O وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًاۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ O

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ O وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۹۷۔۹۹ اور ۱۵۱۔۱۵۳)

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمھارے (فائدے کے) لیے ستاروں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کے ذریعے سے اندھیروں میں خشکی میں بھی اور دریا میں بھی رستہ معلوم کرسکو، بے شک ہم نے (یہ) دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں ان لوگوں کے لیے جو خبر رکھتے ہیں۔ اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (اصل میں) ایک شخص سے پیدا کیا پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی، بے شک ہم نے یہ دلائل (بھی توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے آسمان (کی طرف) سے پانی برسایا پھر ہم نے اس کے ذریعے سے ہر قسم کے نباتات کو نکالا پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ اس سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گپھے میں سے خوشے ہیں جو (مارے بوجھ کے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور (اسی پانی سے ہم نے) انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار (کے درخت پیدا کیے) جو کہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے (ذرا) ہر ایک کے

پھل کو تو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور (پھر) اس کے پکنے کو دیکھو ان میں (بھی) دلائل (توحید کے موجود) ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان (لانے کی فکر) رکھتے ہیں۔

آپ (ان سے) کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمھارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ یہ کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھیراؤ (۲) اور ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (۳) اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو، ہم اُن کو اور تم کو رزق (مقدر) دیں گے (۴) اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں اور خواہ پوشیدہ ہوں (۵) اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو (۶) اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (۷) اور ناپ تول پورا کیا کرو انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے (۸) اور جب تم بات کیا کرو تو انصاف رکھا کرو گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو (۹) اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو اس کو پورا کیا کرو ان (سب) کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو۔

ستاروں کی جس افادیت کا آیتِ کریمہ نمبر۹۸ میں ذکر ہے وہ آج بھی موجود ہے۔ باوجود تمام سائنسی ترقیوں کے ستارے اب بھی اندھیری راتوں میں خشکی اور سمندر میں سفر کرنے والوں کے لیے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ سے اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم، فقہ اور ایمان جن کا ایسی باتوں سے ہے جو عمل کے دائرے میں نہیں آتی ہیں۔ ایک طرح کی چیزیں، مثلاً علم اور سمجھ بوجھ اعمال کے محرکات تو ہیں لیکن خود ان کو عمل نہیں کہا جاسکتا ہے۔ جتنا علم میں

اضافہ ہوگا اور فہم جتنا صحیح ہوگا اتنا ہی ایمان قوی ہوگا۔

اسی طرح عقل، ذکر اور تقویٰ جن کا تعلق اعمالِ ظاہری سے بھی ہے ایک طرح کی باتیں ہیں۔ عقل کی کمی سے اعمال میں بھی نقص آ جاتا ہے اور جو شخص بالکل فاتر العقل ہے وہ اعمال کا بھی مکلّف نہیں ہے۔ اسی طرح ذکرِ قلب یا لسان کا فعل ہے صرف کیفیت نہیں ہے جیسے فہم ہے اور تقویٰ کا تعلق بھی اعمال ہی سے ہے خواہ ظاہری ہوں خواہ باطنی۔

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ۝

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوۡہُ فَذَرۡہُمۡ وَ مَا یَفۡتَرُوۡنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیات ۱۰۶، ۱۰۷ اور ۱۱۲)

آپ خود اس طریق پر چلتے رہیے جس کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور مشرکین کی طرف خیال نہ کیجیے اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ کرتے اور ہم نے آپ کو ان کا نگراں نہیں بنایا اور نہ آپ ان پر مختار ہیں۔

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کیے کچھ آدمی اور کچھ جن، جن میں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکے میں ڈال دیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ ایسے کام نہ کر سکتے سو ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ افترا پردازی کر رہے ہیں اس کو آپ رہنے دیجیے۔

آیت نمبر ۱۰۶ کا اندازِ بیان صرف امیدِ موہوم کو ختم کرنے کے لیے اختیار فرمایا

گیا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم کوئی معجزہ دیکھ لیں تو ایمان لے آئیں گے۔ تو شاید کسی کو یہ امید ہوتی کہ اگر معجزہ نازل ہوجاتا تو یہ ایمان لے ہی آتے۔ یہ تمام دلیلوں اور تمام امیدوں کو قطع کرنے والی بات ہے کہ ہم ان کے قلوب اور ان کی آنکھیں پھیر دیتے۔ جب عالمِ تکوینی کی بات بتا دی گئی تو یہ فیصلہ کن بات ہے۔ کیوں کہ ہر واقعے کی (جس میں انسان کے اختیار کو کچھ دخل ہوتا ہے) دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک بندے کے فعل ہونے کی دوسری اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی اور اس دوسری حیثیت کا ذکر ایسے ہی موقعوں پر کیا جاتا ہے جہاں کوئی اٹل اور فیصلہ کن بات بتانی ہو۔

ان آیاتِ کریمہ میں تفویض کی تعلیم ہے۔ اپنی قوم کا شرک میں مبتلا رہنا نبیِ کریم ﷺ کو بہت ناگوار تھا۔ ان کی تسلی فرمائی گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تبلیغ چھوڑ دو یا کوشش چھوڑ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حد سے زیادہ نہ کُڑھو۔

آیت نمبر۱۱۲ میں تو اس سے ایک درجے اور آگے کی بات ہے کہ یہ شیاطین جو تمھاری دشمنی پر کمر بستہ ہیں یہ بھی ہماری ہی مشیت ہے۔ تو مقابلہ بھی کرتے رہو، جہاد بھی کرتے رہو لیکن ہر پریشانی کے وقت نظر ہمارے ہی اوپر رہے۔ ان کو اور ان کی افترا پردازی کو رہنے دو۔ یہ عالمِ تکوینیات کی بات ہے تاکہ تمھیں کسی کے ہدایت نہ پانے سے زیادہ ملال نہ ہو۔

یہاں عقل اور استدلال کی سرحد ختم ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر کی بات آجاتی ہے۔ اگر تقدیر کے بارے میں ہمیں وحیِ الٰہی کے ذریعے نہیں بتا دیا جاتا تو ہم تمام عمر اس طرح کے سوالات کے جواب کی تلاش میں سرگرداں رہتے کہ ایسے ایسے پڑھے لکھے لوگ، اتنے ذہین لوگ یا اتنے "اچھے" لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ یا یہ کہ سرظفر اللہ جیسے ذہین لوگ جو عالمی شہرت کے مالک ہیں، مرزا غلام احمد پر کس طرح ایمان لے آئے؟

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۱۱۶)

اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا میں اکثریت ہمیشہ کافروں اور گمراہوں کی رہے گی۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وحی نازل ہونے کے بعد اکثریت کی اتباع جائز نہیں ہے، اگر وہ فیصلہ وحی کے احکام کے خلاف ہو۔ چاہے فیصلہ کرنے والے کتنی ہی بڑی اکثریت میں کیوں نہ ہوں۔

اس آیتِ کریمہ کی رُو سے موجودہ جمہوریت کی نفی ہوتی ہے جس میں اکثریت کی رائے سے جو بھی قانون چاہو بنالو۔ جو بھی قانون یا فیصلہ وحی کی روشنی میں درست نہ ہو، وہ جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ جو بھی بات وحی کے مطابق یا وحی کی روشنی میں (جعلنا لہ نوراً...) جائز نہیں ہے، اس کی حیثیت محض رائے اور ظن کی ہے۔ اسی لیے فقہا نے فقہی معاملات میں رائے کو رد کردیا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ۭ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓي اَوْلِيٰۗـِٕـهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۱۲۱)

اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یہ امر بے حکمی ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں تاکہ یہ تم سے (بے کار) جدال کریں اور اگر (خدانخواستہ) تم ان لوگوں کی اطاعت (عقائد وافعال میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہوجاؤ۔

ان شیطانوں کی اطاعت ہی شرک ہے خصوصاً اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کردیا ہے اس کو حرام کردیں یا جس کو حرام کردیا ہے اس کو حلال کردیں۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O (سورۃ الانعام، آیت ۱۲۲)

ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے کیا ایسا شخص اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے اُن سے نکلنے ہی نہیں پاتا، اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح تمام بدقسمت گمراہوں کا حال ہے کہ انھیں اپنی تمام باتیں اچھی لگتی ہیں اور اسی لیے وہ اپنی قعرِ گمراہی میں سے نکل نہیں سکتے۔ اگر کوئی حکم ہوتا (یعنی وحی یا رسول کا حکم) جیسا مسلمانوں کے پاس ہے تو وہ دیکھ لیتے کہ کون سی بات درست ہے، کون سی نہیں اور اپنے اعمال کی اصلاح کرلیتے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَاۗىِٕهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ O وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا

كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَO وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَO (سورۃ الانعام، آیت ۱۱۹۔ ۱۲۱)

اور تم کو کون امر اس کا باعث ہوسکتا ہے کہ تم ایسے جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتلا دی ہے جن کو تم پر حرام کیا ہے مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جاوے تو حلال ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ بہت سے آدمی اپنے غلط خیالات پر بلا کسی سند کے گمراہ کرتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو خوب جانتا ہے اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کیے کی عنقریب سزا ملے گی اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یہ امر بے حکمی ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں تا کہ یہ تم سے (بے کار) جدال کریں اور اگر (خدانخواستہ) تم ان لوگوں کی اطاعت (عقائد و افعال میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ۔

امام شافعیؒ کے نزدیک خدا کا نام نہ لیے جانے سے یہ مراد ہے کہ جو جانور غیراللہ کے لیے ذبح کیا جائے اور دلیل اسی سورت کی آیت نمبر۱۴۵ اور فسقاً... ہے۔ غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک حدیث پر یہ فتویٰ ہے کہ چند اشخاص آئے اور انھوں نے حضورﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بعض لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ آپﷺ نے فرمایا تم اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھا لیا کرو۔

یہ آسانی حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مشکوک حالات کے متعلق ہے لیکن جہاں یہ یقین غالب ہو کہ خدا کا نام نہیں لیا گیا ہوگا، وہاں پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور موجودہ روشن خیال ''علما'' کا مقصد دین سے آزادی ہے اس لیے کہ وہ ڈبے ہی کے گوشت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس ملک سے بھی جہاں مشینوں کے ذریعے جانوروں کو

مارا جاتا ہے اور گوشت تیار کیا جاتا ہے یعنی جدید مذبح خانوں کے ذریعے ذبح کرنے کی روش ہے پر معترض نہیں جو سنتِ ابراہیمی کو بالکل ختم کر دینے پر مصر ہیں۔

وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ○(سورۃ الانعام، آیت ۱۳۳)

اور آپ کا رب بالکل غنی ہے، رحمت والا ہے اگر وہ چاہے تو تم سب کو اٹھا لیوے اور تمھارے بعد جس کو چاہے تمھاری جگہ آباد کرے جیسا تم کو ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سب سے غنی ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ تم کو تمھارے کفر و عناد کے باوجود باقی رکھے ہوئے ہے اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے، تمھارے لیے ورنہ وہ چاہے تو تمھیں نیست و نابود کر کے تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ یہاں اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بندے کی قابلیت کی محتاج نہیں ہے اور جو اللہ کو اپنا رب سمجھتے ہیں ان کو ان کی رحمت ہی کا امیدوار ہونا چاہیے گرچہ اس بات سے بھی ڈرتے رہنا چاہیے جس کا ذکر آیت کے دوسرے ٹکڑے میں ہے یعنی رجا اور خوف دونوں ہونا چاہئیں اور دونوں کا جمع ہونا محبت میں عام معاہدہ ہے۔

ایک شخص دنیا میں بہت تنعّم کے ساتھ رہتا ہے، زہد و تقویٰ سے دور ہے، ہر وقت جھوٹ سچ بول کر دنیا میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ دوسری طرف ایسا شخص ہے جو دنیا کے عیش وعشرت سے دور ہے، آخرت کے لیے دنیا کی بڑی بڑی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے، اپنی ایمان داری کی وجہ سے دنیاوی ترقی میں بہتوں سے پیچھے رہ جاتا ہے اور دفعتاً ایسا ہوجائے کہ اوّل الذکر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثانی الذکر کے درجے سے اونچا

ہوجائے اور یہ بات ثانی الذکر کو معلوم ہوجائے تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا یا نہیں کہ اس کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے؟ یا اوّل الذکر کے خلاف حسد کے جذبات ابھریں گے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ سراسر عجب اور کبر ہے اور یہی بات اسے اسفل السافلین میں گرانے کے لیے کافی ہے۔ فاعوذ باللّٰہ ان اکون منھم۔

عجب اور کبر ایمان کے سراسر منافی ہے۔ ایمان تو یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی جتنی نعمتیں اسے ملی ہیں خواہ ایمان و تقویٰ ہو، خواہ زر و مال ہو، ان سب کو اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے بلااستحقاق سمجھے۔ اللّٰہ تعالیٰ ایسے غنی ہیں کہ ان کو کسی کے تقویٰ اور عبادت کی کوئی حاجت نہیں۔ وہ ایسے بے پروا ہیں کہ ان کی رحمت کسی بات کی محتاج نہیں۔ وہ ایسے ذوالرحمۃ ہیں کہ آن کی آن میں فاسق سے فاسق شخص کو ولایت کا اعلیٰ درجہ عطا فرما دیں۔ وہ اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ زاہد و عابد ہی پر اپنی رحمت نازل فرمائیں۔ اچھا برا، بڑا چھوٹا، عابد و زاہد اور فاسق و فاجر یہ سب بندوں کی (یعنی ایک سے دوسرے کو ممتاز کرنے والی) باتیں ہیں۔ جب عبد اور معبود، خالق اور مخلوق کا رشتہ دیکھا جائے گا تو وہ سب سے غنی ہیں، ذوالرحمۃ ہیں اور ہم سب فقیر کے فقیر ہیں۔ جو بھی ملتا جائے گا ٹھیک، اس طرح ملتا جائے گا جس طرح ایک آقا اپنے محتاج بندوں کو دیتا ہے اور جس کو ملے گا وہ ہزار کچھ پانے کے بعد فقیر کا فقیر رہے گا اور آقا کے عطا کی احتیاج اس کو باقی رہے گی۔ وہ جب چاہیں، جس کو چاہیں جتنا چاہیں دے دیں اور کسی کو یہ سوچنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں کو اتنا کیوں ملا؟ سب کے سب اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں، زبانِ قال سے نہ سہی زبانِ حال سے ضرور ایسا ہے۔ اور وہ ایسے غنی ہیں، ایسے عطا کرنے والے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ایک بھنگی کی دعا سے ساری دنیا کے گناہوں کو بخش دیں۔ بڑے بڑے عابد و زاہد لاکھ دعا کرتے رہیں اور وہ نہ چاہیں تو ان کی ایک بھی دعا قبول نہ کریں۔ وہ قادرِ مطلق ہیں، فعال لما یرید ہیں۔ کسی کا ان پر کچھ حق نہیں (الا یہ کہ وہ خود ہی محض اپنی رحمت سے فرما دیں کہ فلاں فلاں کے لیے میرا یہ یہ وعدہ ہے جیسا کہ فرمایا کان حقا علینا، المؤمنین یا کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ) اور وہ چاہیں تو ایک فاسق و فاجر کی

ایک مرتبہ کی پکار سن کر اس کو قطب الاقطاب بنا دیں۔

غرض جب تک ان کی غنا اور ان کی رحمت کا ایسا استحضار نہ ہو کہ تمام نعمتوں کو ان کی طرف سے سمجھا جائے اور تمام نعمتوں کو بالکل بلا استحقاق سمجھا جائے، اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوگا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۱۳۶۔۱۳۷)

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مواشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعمِ خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے پھر جو چیز ان کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ انھوں نے کیا بری تجویز نکال رکھی ہے اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے خیال میں اُن کے معبودوں نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے تاکہ وہ اُن کو برباد کریں اور تاکہ ان کے طریقے کو مخبوط کردیں اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ ایسا کام نہ کرتے اور آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں، یوں ہی رہنے دیجیے۔

آیت نمبر ۱۲۱ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر تم نے ان کی باتوں میں آکر یہ صحیح سمجھ لیا کہ اگر اللہ کا نام جانور کو ذبح کرتے وقت نہیں لیا گیا تو اس سے کیا فرق

پڑتا ہے تو تم مشرک ہوجاؤ گے۔ ویسے بھی یہ اصول مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کو فضول سمجھنے سے انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے لیکن اس آیتِ کریمہ کو مؤخرالذکر دو آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حلال وحرام کی ساری تفصیل جو ان آیات میں ہے وہ اس مشرکانہ نظام کا حصہ تھا۔ نہ صرف یہ کہ بیٹی کو قتل کرنا غیرتِ مزعومہ کی وجہ سے تھا بلکہ اس خیال سے بھی تھا کہ اتنے سارے لوگ ہوجائیں گے تو کہاں سے کھائیں گے جس کا ذکر آیت نمبر۱۵۱ میں ہے (ولا تقتلوا... املاق) تو اگر اس نظام کے کسی ایک حصے کو بھی آدمی اپنا لے تو جلد ہی وہ اس پورے مشرکانہ نظام کا ایک حصہ بن جائے گا اور اسی لیے حلال وحرام میں اللہ کا نام لینے سے اور نہ لینے سے جو فرق ہوتا ہے، اس کا حکم بہت واضح کردیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر اتنی سختی سے تنبیہ کی گئی کہ اگر تم نے اُن کی اطاعت کی تو تم مشرک ہوجاؤ گے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیت ۱۴۷)

پھر اگر یہ آپ کو کاذب کہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے نہ ٹلے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتِ واسعۃ کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ اپنے رسول کی تکذیب کے باوجود فوراً سزا نہیں دیتا۔ لیکن بالآخر مجرموں سے سزا ٹل نہیں سکتی۔ اور یہ مجرموں کو سزا دینا بھی مومنوں پر رحمت کا ایک انداز ہے۔ کیوں کہ اگر آخرت میں بھی ماننے والے اور نہ ماننے والے سب بخش دیے جاتے تو ماننے والوں کا تخصص کیا ہوتا۔ فالحمدللہ رب العالمین۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ؕ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ○ (سورۃ الانعام، آیت ۱۴۸۔ ۱۴۹)

یہ مشرک لوگ یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے، اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ آپ کہیے کہ کیا تمھارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو، تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں بناتے ہو۔ آپ کہیے کہ پس پوری حجت اللہ ہی کی رہی، پھر اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ پر لے آتا۔

غیر اختیاری باتوں کے پیچھے پڑنے کی ممانعت ان آیاتِ کریمہ سے ظاہر ہے۔ شرک اور قتلِ اولاد سے زیادہ قبیح چیزیں کیا ہو سکتی ہیں لیکن یہ حرکات جو اُن سے سرزد ہو رہی ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم اور اختیار سے ہو رہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ ایسا نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے برے افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا تقدیر کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے اور اس کا واقعے کے خلاف ہونا، کفار اور مشرکین پر بھی یہ بات عذاب (یا موت) آنے پر ایسی واضح ہو جاتی ہے کہ انکار کی مجال نہیں رہتی۔

یہ دلیلیں جو مشرکین دیتے ہیں، اسی لیے ہیں کہ انھوں نے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔ اگر عذاب کا مزہ چکھ لیں تو فوراً یہ بحثیں بھول جائیں اور کہنے لگیں: یاویلنا انا کنا ظالمین اور اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگیں۔ معمولی معمولی تکلیف پر انسان اس کے اسباب کو تلاش کرنے لگتا ہے اور اس کے دفعیہ کی تدبیر کرنے لگتا ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی یہ نہیں سوچتا کہ کیوں کوشش کی جائے اگر اللہ چاہتا تو یہ تکلیف نہیں پہنچتی۔ گرچہ یہ بات

اپنی جگہ سو فی صد درست ہے لیکن اس کی وجہ سے عالمِ اسباب میں جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اس سے ہم عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

آیت نمبر ۱۴۸ میں ان سے ان کے اس قول کا ثبوت مل گیا ہے کہ کیا تمھارے پاس حقیقی علم ہے یا یوں ہی بات بنا رہے ہو تم سے قبل بھی لوگوں نے اسی طرح کہا تھا (کذلک کذب الذین من قبلھم) جب تک ان پر عذاب نہیں آگیا۔ عذاب آنے کے بعد انھوں نے سمجھا کہ یہ دلیل کتنی غلط تھی۔ آیت نمبر ۱۴۹ میں جو اللّٰہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولو شاء اللّٰہ اس میں اور مشرکین کے ولو شاء اللّٰہ کہنے میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ایک چاہنا تکوینی ہے جس سے کوئی مفر نہیں، دوسرا چاہنا تشریعی ہے جو اس بنا پر ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایمان لائے یا انکار کرے۔ دونوں باتوں کا رات دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے گرچہ یہ کیسے ہوتا ہے (یعنی اس کی صورت کیا ہے) اس کا کسی کو علم نہیں۔

مشرکین کو شرک سے روک دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ گو وہ ان افعال کے فاعل ہیں جس کی سزا انھیں ضرور ملے گی لیکن ان افعال کے خالق اللّٰہ تعالیٰ ہی ہیں اور یہ ان کی مصلحت ہے کہ وہ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ہدایت سے محروم رکھتے ہیں۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۱۵۰)

آپ کہیے کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر (باقاعدہ) شہادت دیں کہ اللّٰہ تعالیٰ نے ان (مذکورہ) چیزوں کو حرام کردیا ہے پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو آپ اس شہادت کی سماعت نہ فرمایئے اور (اے مخاطب) ایسے لوگوں کے

باطل خیالات کا اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے برابر دوسروں کو ٹھیراتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ایمان کی تینوں بنیادی باتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے یعنی رسالت، معاد اور توحید۔ اگر ان میں سے ایک بات کا بھی انکار کیا جاتا ہے تو بقیہ دو باتوں کا بھی انکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اہلِ کتاب میں بھی جو لوگ ایمان نہیں لائے ان کو بھی کافر کہا گیا ہے البتہ بعض باتوں میں کفار مشرکین اور کفار اہلِ کتاب سے معاملے میں فرق رکھا گیا ہے، مثلاً اہلِ کتاب عورتوں سے شادی کرنا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O

سورۃ الانعام، آیت ۱۶۲)

آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔

اس سے پہلی آیتِ شریفہ میں ملتِ ابراہیم حنیفا کا ذکر تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی ہدایت کی نعمت کی تفصیل ہے۔ اس میں پہلی چیز نماز ہے۔ اس کا خشوع کے ساتھ اور پوری توجہ کے ساتھ پڑھنا پوری زندگی اخلاص کے ساتھ گزارنے کا ایک زینہ ہے۔ جو قربانی حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی، اس کی تیاری کا ذریعہ نماز ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یعنی جتنی دیر تم نماز پڑھتے ہو اتنی دیر کے لیے تم ماسویٰ اللہ سے بالکل قطع تعلق کر لیتے ہو اور اپنے اللہ کے سامنے حاضری دے کر، اس سے اپنا تعلق استوار کرتے ہو۔ یہ اس قربانی کے لیے مشق (practice) کی حیثیت رکھتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے تم وقت کی قربانی دے رہے ہو۔ اتنی دیر تو کھیل تفریح میں گزار سکتے تھے۔ اتنی دیر تم اپنی تجارت یا اپنے کاروبار کو فروغ دینے میں صرف کر سکتے تھے لیکن تم

اپنے اللہ کی رضا کے لیے ان سب سے کچھ دیر کے لیے فارغ ہوگئے ہو۔ قل ما عنداللّٰہ خیر من اللھو ومن التجارۃ...

اب یہ مت سوچو کہ نماز پڑھنے کے بعد کیا کرو گے۔ کیا پتا یہ تمھاری آخری ہی نماز ہو۔ اور اس طرح تم نماز کا حق ادا نہیں کرسکو گے۔ خیالات (imagination) کی دنیا سے حقیقت (reality) کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ دیکھو کس کے سامنے کھڑے ہو اور تمھارا رُخ کعبے کی طرف ہے جو منبعِ انوار وتجلیات ہے۔ کتنی بڑی خوش قسمتی کی بات ہے پھر تم وحیِ متلو کی تلاوت کر رہے ہو۔ جو مسلمانوں کے علاوہ کسی اور قوم کو نصیب نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم تلاوت سن رہے ہو یا زبان سے تلاوت کر رہے اور اس کی طرف تمھاری توجہ نہ ہو۔ خدانخواستہ تمھاری مشابہت ان لوگوں سے نہ ہوجائے جو سمعنا کہتے ہیں لیکن سنتے نہیں ہیں۔ جب تلاوت ختم کرلو تو سوچو کہ اب کیا حکم ہے اور اس کو ہمارے آقائے نامدار ﷺ کس طرح بجا لائے۔ اسی طرح پوری نماز ختم کرو۔ یہ جو تم نے وقت کی قربانی دی اور تھوڑی دیر تک یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حکم براری کرتے رہے یہ تمھیں اس قربانی کے لیے تیار کرے گی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی تھی جس کو ''نسکی'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہ قربانی چھوٹی ہو یا بڑی یہ پوری زندگی پر پھیلی ہوئی ہے۔ زندہ رہنا بھی اللہ ہی کے لیے ہے اور جان دینا بھی اسی کے لیے ہے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (سورۃ الانعام، آیت ۱۶۴۔ ۱۶۵)

آپ فرما دیجیے کہ کیا میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لیے

تلاش کروں حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا۔ اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھاوے گا۔ پھر تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔ اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحبِ اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ (ظاہراً) تم کو آزماوے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں، بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

تمام علائقِ دنیوی میں گھرے رہنے کے باوجود اگر یہ یاد رہ جائے کہ کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے اور سب کو فرداً فرداً اپنے رب کی طرف واپس جانا ہے تو دنیا میں مشغولیت کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اسی کو غالباً خلوتے در انجمن کہتے ہیں۔

زمین کی خلافت، سوسائٹی کی اونچ نیچ سب اسی لیے ہے کہ تم کو جو ملا ہے اس میں آزمائے جاؤ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ط قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۱،۱۲)

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمھاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے جب کہ میں تجھ کو حکم دے چکا، کہنے لگا، میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔

اس پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے ازلی دشمن شیطان کے بنیادی فضائل کا ذکر ہے اور دونوں کے respectives (متبعین) میں یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شیطان کہتا ہے انا خیرمنہ اور اسے نکال دیا جاتا ہے فما لک ان تتکبر فیھا۔ اس سزا پر بھی وہ متنبہ نہیں ہوتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ اچھا تو ہمیں بھی مہلت دی جائے، ہم بھی دیکھ لیں گے کہ جن لوگوں کو آپ نے یوں (نعوذ باللہ) بلاوجہ ہم پر فوقیت دی ہے ان میں کتنے آپ کے شکرگزار رہتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ جاؤ تمھارے پیروؤں کو بھی جہنم میں بھیج دیں گے۔ ہم تو غنی ہیں، ان کی اطاعت یا ناشکری کی ہمیں کیا پروا ہے یعنی ان کی ناشکری سے یا جہنم رسید ہونے سے ہمارا کچھ نقصان نہیں۔ اس کے بالکل برعکس آدم و حوا علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام سے جب نافرمانی ہوتی ہے تو کہتے ہیں ربنا ظلمنا انفسنا... ہماری تو عمر گزر جاتی ہے ربنا ظلمنا فاغفر لنا کہتے کہتے اور کبھی بھی ہم نہیں کہتے انا خیرمنہ۔

ایک اور بات یہاں غور کرنے کی یہ ہے کہ شیطان نے جب آدم و حوا علیہما السلام کو بہکایا تو دلیل دے کر بہکایا، ایسی بات نہیں کی جو absurd (لایعنی) کہہ کر ٹال دی جاتی بلکہ ہمدردی اور نصیحت کے طور پر کہی۔ یہی حال شیاطین کا اب بھی ہے کہ اسی طرح انسان کو گمراہ کرتے ہیں جس طرح وہ گمراہ ہوسکے۔ ایسے مواقع پر آدم کی اولاد کے لیے یہ ایک دفاع ہے کہ خواہ تمھارا مشورہ ماننے میں کتنا ہی فائدہ ہو مگر چونکہ یہ میرے رب کے حکم کے خلاف ہے، اس لیے میں اس پر عمل نہیں کرسکتا۔

تیسری بات یہ غور کرنے کی ہے کہ اس فریب کی ابتدا خدا کے احکام کی مصلحت بتانے سے ہوتی ہے۔ ما نھٰکم... الا ان... لہٰذا جب کوئی خدا کے حکم کی مصلحت بتا کر تمھیں اس حکم سے ذرّہ برابر بھی انحراف کی ترغیب دے، وہ تمھارا ازلی دشمن ہے۔

امریکی معاشرے اور اس کی نقالی میں دوسرے معاشرے میں لوگ اسی شیطانی قول کو دُہرانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہر شخص اپنے کو دوسروں سے بہتر کہتا ہے اور بڑے زور شور سے کہتا ہے۔ اور اپنے کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے بہتر بننے کی کوشش اور بات ہے (فاستبقوا الخیرات) اور اپنے کو

بہتر کہنا اور ثابت کرنے کی کوشش اور بات ہے (فلا تزکوا...) اور جو وجہ شیطان نے اپنی بڑائی کی بیان کی وہ علاوہ لغو ہونے کے مضحکہ خیز ہے، اوّل تو اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آگ مٹی سے بہتر ہے اور اگر بہتر ہو بھی تب بھی بہتر چیز سے صرف بنا ہونا باعثِ فضیلت نہیں ہے جیسے سنگِ مرمر کے بنے ہوئے بیت الخلا کو چینی کی پلیٹ (جس پر کھانا کھاتے ہوں اس) پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض فضیلت ہو بھی تو یہ غیر اختیاری بات ہے اور غیر اختیاری بات میں اس کا کیا کمال۔ اب پوری دنیا کا ایسا معاشرہ ہوگیا ہے کہ بغیر اس کے نوکری نہیں ملتی، کاروبار نہیں چلتا اور زندہ رہنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھیں۔ (آمین)

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا، تو اس (آسمان) سے اُتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تکبر کرے اس (آسمان) میں (رہ کر) سو نکل بے شک تو ذلیلوں میں (شمار) ہونے لگا۔

معلوم ہوا کہ تکبر اور جنت ایک جگہ نہیں ہوسکتے۔ دونوں میں ازلی بیر ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا او کمال قال۔ (اور اگر مومن ہوا تو جہنم میں تھوڑی دیر رہنا اس تکبر کو زائل کردے گا۔)

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۶)

وہ کہنے لگا بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے (میں قسم کھاتا ہوں کہ) میں ان کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔

ایک ہی جملے میں شیطان اپنی نافرمانی کا ذمہ دار نعوذ باللّٰہ اللّٰہ تعالیٰ کو ٹھہرا رہا ہے (کہ سب کام آپ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے اور آپ ہی نے تقدیر میں لکھ دیا تھا کہ میں نافرمانی کروں گا تو پھر میں کیسے آپ کا حکم مانتا) اور پھر اس جملے میں اپنے اختیار کا اتنے جرم کے ساتھ اظہار کر رہا ہے کہ کہتا ہے لاقعدن لھم... بالکل اسی طرح اس کے پیرو کہتے ہیں کہ جہاں عملِ صالح اور آخرت کی بات آئی تو کہہ دیا کہ قسمت ذمے دار ہے اور جہاں دنیا حاصل کرنے کی بات ہوئی تو پوری کوشش اس پر صرف کردی اور قسمت کو بھول گئے۔

اس کے برخلاف حضرت آدم علیہ السلام کو بھی یہ معلوم تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللّٰہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہو رہا ہے (کیوں کہ غالباً اُس عالم میں غیب کے وہ پردے نہیں تھے جو اِس عالم میں ہیں) لیکن اس کے باوجود جب ان کی غلطی پر گرفت ہوئی تو فوراً اپنے قصور کا اعتراف کرلیا اور کوئی تاویل نہیں کی۔ اتنا بھی نہیں کہا کہ میں شیطان کے بہکائے میں آ گیا۔ نہ یہ کہا کہ غلطی تو تھی لیکن نیت نیک تھی۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کی خلقی کمزوری کا اندازہ لگا کر ایسی گستاخانہ بات کہہ دی لیکن اللّٰہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا مردود (مجھے کسی کی پروا نہیں) دور ہو، میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیرووں سے بھر دوں گا۔ اور پھر وقت آنے پر آدم علیہ السلام کو توبہ کا ہتھیار عطا فرمایا جس سے شیطان بے بس ہوگیا۔ ایک توبہ سے شیطان کا سارا بنا بنایا جال ٹوٹ جاتا ہے۔ آیت نمبر ۱۷ سے اشارہ ملتا ہے کہ ''شکر'' مکمل اطاعت کا نام ہے۔ اور غلطی سرزد ہوجانے کے بعد ''استغفار'' مکمل اطاعت میں کمی کو پورا کردیتا ہے خواہ وہ چھوٹی ہو خواہ بڑی، توبہ اور ندامت سے معاف ہوجاتی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ''شکر'' اور ''استغفار'' بس یہی دو چیزیں مومن کے لیے کافی ہیں۔

۞

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ

تَکُوۡنَا مَلَکَیۡنِ اَوۡ تَکُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِیۡنَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۲۰)
پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کا پردہ کا بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کردے اور کہنے لگا کہ تمھارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہوجاؤ یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

اس واقعے میں ایک گونہ اثر (آدم علیہ السلام) انسان کے طبعی تجسس کا بھی ہوسکتا ہے۔ اگر انسان کو کسی بات سے منع کردیا جائے تو وہ اس کا پتا لگانے کا متلاشی ہوتا ہے کہ اسے کیوں منع کیا گیا ہے اور جب شیطان نے ان کو سمجھایا کہ اس ممانعت کی یہ وجہ ہے کہ اگر اس درخت کا پھل کھا لو گے تو تم فرشتوں میں سے ہوجاؤ گے یا ہمیشہ رہنے والوں میں ہوجاؤ گے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ انسان کا فطری تجسس ہی اس کے لیے ایک بڑی نعمت بھی ہے اور اس کی وجہ سے وہ کسی بڑی مصیبت میں بھی پھنس جاتا ہے لیکن اگر غلطی کے فوراً بعد اس کا احساس ہوجائے اور توبہ کرلے تو وہ ابدی خسران سے بچ جاتا ہے۔

شیطان نے جو وجہ بتائی تھی وہ یقیناً غلط تھی اور اس کی نیت اس بہکانے میں یہ تھی کہ آدم و حوا علیہما السلام کی بے پردگی ہو لیکن اس نے آدم علیہ السلام کو ایسی بات کہی جس میں ان کو کوئی خرابی نظر نہیں آئی (کہ مالک کا تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور اپنا بھی کوئی خاص نقصان معلوم نہیں ہوتا) لیکن یہ بات ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی کہ شیطان ان کا دشمن ہے اور کبھی ان کو صحیح مشورہ نہیں دے سکتا۔ تقریباً یہی حال کلمۃ الحق ارید بھا الباطل کا ہے۔ غرضِ فاسد سے کتنی ہی اچھی بات کہی جائے اس کو ماننے میں گھاٹا ہے کیوں کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی چال پوشیدہ ہوگی جو اس وقت معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ اور شیطان کی یہ دشمنی ہمیشہ رہے گی کہ خواہ وہ کچھ بھی مشورہ دے اس میں اس کی چال ہوگی جس سے بنی آدم کو آیت نمبر ۲۷ میں اس واقعے کو یاد دلا کر متنبہ کیا

گیا ہے اور ایک جگہ فرمایا گیا ہے، ان الشیطان لکم عدو مبین... پس اس کو اپنا دشمن ہی سمجھتے رہو۔

دونوں باتیں جو شیطان نے کہیں، وہ غلط تھیں، نہ اس درخت کے پھل کھانے سے ہیشگی ملی کیوں کہ خلود تو جنت کی صفت ہے اور نہ اس کے کھانے سے وہ فرشتے ہوجاتے کیوں کہ فرشتے نافرمانی سے پاک ہیں۔ ایک بڑا سبق اس میں یہ تھا کہ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو، نافرمانی تو نافرمانی ہے اور سب سے بڑھ کر جھوٹ اس کا قسم کھا کر یقین دلانا تھا کہ وہ ان کا خیرخواہ ہے۔

فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۲۲،۲۳)

پس ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا پس ان دونوں نے جب درخت کو چکھا دونوں کا پردہ کا بدن ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہوگیا اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ رکھنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے ممانعت نہ کرچکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمھارا صریح دشمن ہے۔ دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہوجائے گا۔

سورۂ بقرہ میں جن ''کلمات'' کا ذکر تھا جن سے آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصور معاف ہوا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی کلمات تھے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصل توبہ ندامت ہے۔ اور اس کا اظہار اللّٰہ تعالیٰ کے سامنے کرنا خواہ

کسی بھی عنوان سے ہو، یہی توبہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض جملے گو بعینہٖ وہی بات نہیں کہتے جو مقصود ہوتے ہیں لیکن اس جملے کی روح وہی ہوتی ہے گرچہ الفاظ مختلف ہوں۔ چنانچہ یہاں اتوب الیک یا استغفرک کے الفاظ نہیں ہیں لیکن معنًا یہی بات کہی جا رہی ہے۔ جب کوئی خاص الفاظ کس بات کے لیے مخصوص نہ ہوں تو الفاظ پر اصرار کرنا نادانی ہے بلکہ اگر زبان سے وہ بات نہیں بھی کہی جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک لڑکے کی شدید بیماری کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ ''ارے بے وقوف! کیا زبان ہی دعا مانگنے کے لیے ہے؟''

شیطان مردود اپنے خیال میں لاقعدن لھم... کہہ کر اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کر رہا تھا اور اسی خیالِ باطل کی پیروی میں ایرانی کافروں نے اہرمن اور یزداں کو مقابل گردانا تھا۔ سبحان اللہ عن مایقول الظالمون۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو شیطان پیدا کیا اور دوسری طرف اس کے مقابلے کے لیے ایک ایسی چیز پیدا کی جو بظاہر چھوٹی ہے مگر دراصل بہت بڑی ہے۔ وہ چیز ہے ندامت اور توبہ۔ تمام شیطانی وساوس و خطرات یہاں تک کہ شیطانی حرکات و معاصی ایک طرف اور توبہ ایک طرف۔ صرف ایک توبہ ان تمام باتوں کے مٹا دینے کو کافی ہے۔ چنانچہ دراصل مقابلہ شیطان اور انسان میں ہے لہٰذا شیطان کا antonym انسان ہے۔ اور شرفِ انسانیت یہ ہے کہ انسان شیطان کی چال کو سمجھے اور اس کا مقابلہ کرے اور کبھی غلطی سرزد ہوجائے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوکر استغفار کرے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۲۷)

اے اولاد آدمؑ کی! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا اس نے تمھارے دادا دادی کو جنت سے باہر کرا دیا ایسی حالت سے ان کا لباس بھی ان سے اتروا دیا تا کہ ان کو ان کا پردہ کا بدن دکھلائی دینے لگے وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔ ہم شیطانوں کو انھیں لوگوں کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔

ایسا نہ ہو کہ شیطان تم سے لباسِ شرافت چھین لے، لباسِ تقویٰ چھین لے۔ ایک لغزش میں پڑ کر تم اپنا لباس گنوا بیٹھو گے۔ تم اپنی ذات اور کردار کو محفوظ سمجھ رہے ہو مگر شیطان تمھیں غیر متوجہ دیکھ کر تمھارا لباس چھین کر تمھیں ننگا نہ کردے۔ کیوں کہ وہ تمھیں ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں سے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس میں صرف شیطان کی قید نہیں۔ وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں دیکھ رہا ہے (کہ کب تمھیں غافل پا کر تمھیں دھوکا دے دے) اس خطرے سے صرف اس بات کا استحضار ہی بچا سکتا ہے کہ تم اس کو اپنا دشمن سمجھتے رہو۔ کیوں کہ جو غیر مومن ہیں ان کے لیے تو ہم نے شیاطین کو ان کا دوست ہی بنا دیا ہے۔ وہ ننگے رہنے ہی میں خوش ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی فکر ہے نہ آخرت کی۔ ان کے لیے شرم ناک باتیں معیوب ہی نہیں اس لیے لباس چھننے کا کیا خوف؟

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۲۸)

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی بتلایا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کی تعلیم نہیں دیتا، کیا خدا کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کی تم سند نہیں رکھتے۔

یہ مومنوں کے بالمقابل گروہ کا ذکر ہے۔ مومن جب کسی فحش کام یا کسی اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو استغفار کرتا ہے اور اپنے رب کے سامنے نادم ہوتا ہے۔ اور کافر یا منافق سے جب کوئی فحش کام سرزد ہوتا ہے تو نہ صرف اپنے اس کام کا جواز اپنے لیے بڑوں کی تقلید کو پیش کرتا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے بالکل صحیح اور نیک کام بنا کر پیش کرتا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔

یہ تاویل اور اپنی برائی کو اچھائی ثابت کرتے رہنا اگر اس سے بہت ہی کم درجے کا ہو تب بھی بہت بچنے اور پناہ مانگنے کی چیز ہے اور انسان کو طاغوت کا دوست بنا دیتا ہے جو اسے روشنی سے اندھیرے کی طرف لے جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۳۳)

آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھیراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمے ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

اس سے قبل کی آیتوں میں لباس کے اُتروائے جانے کا ذکر تھا اور لباس جو عریانیت کو چھپائے اور لباسِ تقویٰ کا ذکر تھا اور شیطان کی چال... لیر پھا سوا تھا... سے خبردار کیا گیا تھا۔ پھر آیت نمبر ۳۱ میں خذوا زینتکم (ای البِسو ثیابکم) کا ذکر تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جو شرافت کا لباس (قول حضرت ابنِ عباسؓ لباس التقویٰ والعفۃ) اُتروانے والی ہیں۔ ان میں فواحش ما ظھر تو ظاہر ہی ہے کہ شرافت

جیسا کہ ایامِ جاہلیت میں مرد اور عورتیں ننگی طواف کیا کرتی تھیں اور جیسا کہ آج کل کی تہذیب میں عورتیں نیم عریاں لباس عام طور سے پہنتی ہیں۔ اور فواحشِ باطنی سے شرافت کا اترنا ظاہر ہے۔ کیوں کہ by definition بے حیائی اور عفت ایک دوسرے کی ضد ہیں، یعنی بے حیائی کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عفت اور شرم و حیا کے خلاف ہو۔ فواحش کے علاوہ جن باتوں کا یہاں ذکر ہے۔ اثم، یعنی، شرک اور اللّٰہ تعالیٰ کے بارے میں کوئی ایسی بات جو درست نہ ہو ان سب سے بھی لباسِ تقویٰ اتر جاتا ہے بلکہ فحش کے وسیع تر مفہوم میں ہر طرح کے گناہ شامل ہیں۔ ''فحش'' کا الٹ ''حیا'' ہے جس کا وسیع مفہوم حضرت عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث شریف میں ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو اور پیٹ اور جو کچھ اس میں بھرا ہے، اس سب کی نگرانی کرو اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے، اس کو یاد کرو... الخ (اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ)

قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَاؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًاۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۳۸، ۳۹)

اللّٰہ تعالیٰ فرما دے گا کہ جو فرقے تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی، ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ جس وقت بھی کوئی (کفار کی) جماعت داخل (دوزخ) ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب اس میں سب جمع ہو جائیں گے تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں نے گمراہ

کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دوگنا دیجیے۔ اللہ تعالیٰ فرماویں گے کہ سب ہی کا دوگنا ہے لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں۔ اور پہلے لوگ پچھلے لوگوں سے کہیں گے کہ پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہیں سو تم بھی اپنے کردار کے مقابلے میں عذاب کا مزہ چکھتے رہو۔

جب جہنم میں سب کفار و مشرکین جمع ہو جائیں گے تو اس میں بعد میں جانے والے کہیں گے کہ یااللہ یہ لوگ (یعنی پہلے جانے والے لوگ) ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اس لیے ان کو دوگونا عذاب دیجیے۔ جواب ملے گا کہ سب کے لیے دوگونا عذاب ہے۔ ہر نسل (generation) اپنے سے قبل والی نسل کے بعد ہے تو اپنے سے بعد میں آنے والی نسل سے پہلے ہے اس جواب پر پہلے داخل ہونے والے لوگ کہیں گے کہ چلو تم کو تو ہم پر کوئی فضیلت نہیں ملی یعنی تم پر سے تو عذاب کم نہیں ہوا۔ اس سے ان لوگوں کی طبعی دنائیت (چھوٹا پن) ظاہر ہے کہ یہ خصلت ایک مومن کی خصلت کے بالکل برعکس ہے۔ گرچہ بہت سے ضعیف الایمان فاسقوں، فاجروں کی بھی یہی خصلت ہوتی ہے کہ چلو ہم تو گرفتارِ عذاب ہیں ہی، اچھا ہے کہ تم بھی عذاب میں گرفتار ہو۔ مومن اپنے بھائی مومن کو پریشانی اور تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونا تو درکنار خود بھی ایسا پریشان ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ تکلیف اسی کو پہنچی ہو۔ احادیثِ مبارکہ میں مومنوں کی آپس کی شفقت اور محبت کی بہت سی مثالیں ہیں۔

یہ ان لوگوں کی خاصیت ہے جنھیں جہنم میں جانا ہے۔ وہ اس بات سے اپنی تسلی کرتے ہیں کہ فلاں ہم سے زیادہ برے ہیں... یا یہ کہ وہ ہم سے بہتر نہیں ہیں۔ اشارتاً یہ بات تنزل پذیر اقوام پر بھی صادق آتی ہے کہ انھیں اس بات سے اطمینان ہوتا ہے کہ فلاں قوم بھی پستی میں ہے یا یہ کہ فلاں قوم ہم سے زیادہ برائیوں میں مبتلا ہے، اس کا حال کیوں اچھا ہے۔ جو ترقی پذیر لوگ ہیں وہ دوسروں کی اچھی بات تلاش کرتے ہیں اور انھیں اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ بھی ترقی کریں۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۴۳)

اور جو کچھ ان کے دلوں میں غبار تھا ہم اس کو دور کردیں گے اُن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ لوگ کہیں گے کہ اللّٰہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس (مقام) تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللّٰہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے اور اُن سے پکار کر کہا جاوے گا کہ یہ جنت تم کو دی گئی ہے تمھارے اعمال کے بدلے۔

بندے کی طرف سے شکر گزاری اور مالک کی طرف سے قدر شناسی اس طرح ظاہر ہوگی۔ دنیا میں بھی بندے کو یہی چاہیے کہ وہ اپنے ہر نیک عمل کو اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت سمجھ کر شکر ادا کرتا رہے، تھوڑا سا غور کرنے سے اس پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ اس نیک عمل کا صدور اس سے ہو ہی نہیں سکتا تھا لولا ھدانا... اللّٰہ اور اگر اس کے رسول ﷺ اچھے برے اعمال کی پوری پوری تفصیل نہ بتا دیتے۔

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۴۹)

کیا یہ وہی ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللّٰہ تعالیٰ اُن پر رحمت نہ کرے گا (ان کو یہ حکم ہوگیا) کہ جاؤ جنت میں تم پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ تم مغموم ہو گے۔

یہ بات اہلِ اعراف جہنم میں جانے والوں سے کہیں گے کہ تم تو (مسلمانوں) کے بارے میں کہتے تھے کہ اللّٰہ کی رحمت ہرگز ان پر نہیں ہوگی۔ اب دیکھو یہ لوگ جنت

میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ بہت سے کفار بھی اللہ اور جنت اور دوزخ یا ثواب اور عقاب کے قائل ہیں لیکن ان کو اس کا صرف مبہم سا خیال ہے (hazy idea) لیکن بایں ہمہ وہ کافر ہی ہیں کیوں کہ ایمان باللہ (اور ایمان بالآخر) اسی کا معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ کو اس طرح ان صفات و کمالات کے ساتھ مانے جن صفات و کمالات کے ساتھ ماننا اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو اور اس طرح ثواب و عقاب کا یقین رکھے جو حقیقت میں ہونے والا ہے اور یہ بات سوائے اللہ کے رسول کے کوئی نہیں بتا سکتا۔ غیب کی باتوں کے جاننے کا واحد ذریعہ یہی ہے، لہٰذا یہاں ایمان باللہ میں ایمان بالرسول شامل ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۵۵، ۵۶)

اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں، تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات) واقعی (ہے کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو (دعا میں) حدِ (ادب) سے نکل جائیں اور دنیا میں بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اُس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

دعا کرنے کے آداب اور دعا کی قبولیت کے آثار یہاں بتائے گئے ہیں۔ معتدین اور مفسدین کے زمرے میں رہتے ہوئے دعا قبول ہونے کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسا محال کے موجود ہوجانے کی تمنا کرنا اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے لوگوں کو نہ دعا کی توفیق ہوتی ہے (مگر سرسری طریقے سے جیسے خدا حافظ کہہ دیا) اور نہ اس کے قبول ہونے کی امید ہوتی ہے۔ (الا ماشاء اللہ)

آیت نمبر۶ میں محسنین کو خوش خبری بھی سنائی گئی ہے اور ایک مزید ادب سکھایا گیا ہے کہ جس چیز کے لیے ہم نے حدود کی پابندی کرتے ہوئے اور ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی) دعا کی ہے اس پر ہمارا حق ہوگیا، بلکہ بھروسا اس وقت بھی اللہ کی رحمت پر ہونا چاہیے اور اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝

(سورۃ الاعراف، آیت ۵۸)

اور جو سرزمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار تو خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی) تو بہت کم نکلتی ہے اسی طرح ہم (ہمیشہ) دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں۔

شکر ادا کرنے کا یہ بھی ثمرہ ہے کہ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ شکر ادا کرنے والے ہی دراصل عالم ہیں کیوں کہ جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے وہ درحقیقت اس کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے اور یہی ایمان ہے اور ایمان ہی کی فروع تمام اچھی باتیں ہیں جن میں علم بھی شامل ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لقوم یشکرون کا ترجمہ فرمایا ہے:

''ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں۔''

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا

جَهُوْلًا ۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا O (سورۃ الاحزاب، آیت ۷۲،۷۳)

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سو انھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا، وہ ظالم ہے جاہل ہے۔ انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات کو سزا دے گا اور مومنین اور مومنات پر توجہ (و رحمت) فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

آیت نمبر۷۳ ایک بار اس آیتِ کریمہ کی یہ تفسیر ذہن میں آئی تھی کہ انسان نے یہ جانتے ہوئے کہ امانت کا بوجھ کتنا بڑا ہے، محبت کی وجہ سے اٹھا لیا کیوں کہ محبوبِ حقیقی کوئی چیز دے رہا ہے اور کوئی اس کا لینے والا نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آگے بڑھ کر اس نے وہ چیز لے لی۔ اسی محبت نے اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا کیوں کہ محبت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ بہت سی چیزیں عاشق کی نظر سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ امانت کا بوجھ اٹھا کر ہو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا بن گیا۔ محبت اور اس کی وجہ سے ظلم اور جہل اس کی خمیر میں تھا۔ الحمدللہ اس کی تائید حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بدیعہ ''روح در جمادات'' سے ہوگئی۔ (صفحہ ۲۸۳، البدائع، کتب خانہ جمیلی) فالحمدللہ۔

اٹھانے کو تو بوجھ اٹھا لیا لیکن جب خیال آیا کہ اس کا حق کیسے ادا ہوگا اور یہ خطرۂ عظیم ہم نے کیسے اپنے سر لے لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عذاب تو صرف منافقین کے لیے اور مشرکین کے لیے مقرر کیا گیا ہے جو زبان سے تو دعوائے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں رائی برابر بھی محبت نہیں ہے۔ یا جو علی الاعلان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یا اس کے وجود کا یا اس کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں۔ نفاق فی العمل والوں کو بھی متنبہ ہونا چاہیے کہ صرف زبانی ایمان کافی نہیں ہے۔ محبت اور عشق تو ایسی چیز ہے جو

صورت سے جھلکتی ہے اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتی ہے اور عبادت یا پرستش تو محبت کا آخری درجہ ہے (اشد حباً للہ اور اور سیماھم فی وجوھھم... میں ان کی طرف اشارہ ہے) اسی طرح شرک فی العمل بھی بہت بچنے کی چیز ہے۔ رہے مومن تو اگر نفس اور شیطان کی وجہ سے ان سے لغزش صادر ہوجاتی ہے تو وہ توبہ کرلیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تو بڑے بخشنے والے مہربان ہیں۔

ظلم اور جہل خواہ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو جب ان کی نسبت تخلیقی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے گی تو اس میں حسن و خوبی ہی نظر آئے گی۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔ ظلم اور جہل کی خلقت میں ہزاروں مصلحتیں ہوں گی جن میں سے ایک عظیم مصلحت کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو حیاتِ دنیوی کا راز ان ہی دولفظوں، ظلم اور جہل میں پوشیدہ ہے اور اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں کہ جب فرشتوں نے ادب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ایسی مخلوق کی خلافت پر تعجب کا اظہار کیا جو زمین میں فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی تو ان کو حاکمانہ جواب دیا گیا کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی برتری ثابت کی گئی ان کو اس کا علم عطا فرما کر۔ ان آیاتِ کریمہ میں اس سوال کا حکیمانہ جواب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی خلقت میں ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ (مثلاً علمِ اسما) اگر ظلم اور جہل شامل نہیں کیے جاتے تو وہ کبھی بھی اس امانت کو نہ اٹھا لیتا جس کو اٹھانے سے آسمان اور زمین سب کانپ اٹھے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ان کے صفاتِ جلالی و جمالی اور انسان کے درمیان جہل کے بے شمار پردے نہ ہوتے اور وہ اپنے نفع ونقصان کو اور اس امانت کے تقاضوں کو واقعی پہچانتا تو ہرگز ایسی ذمہ داری نہ اٹھاتا جسے نباہنا اس کی قدرت سے باہر تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی غفور رحیمی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ حقیقت پر سے تھوڑا پردہ ہٹا دیا جائے اور انسان کو اس کے ظلم اور جہل کا مشاہدہ کرا دیا جائے تاکہ وہ جان جائے کہ وعدے کو یاد رکھنا اور نفس وشیطان کے ہوتے ہوئے خلافت کا حق ادا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ چنانچہ جب شجرِ ممنوعہ والا واقعہ پیش آیا تو

حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پکار اٹھے: رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور قیامت تک کے لیے یہ قانون اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اور انسان کے خلقی ضعف کا واضح ہوگیا... کتب ربکم علی نفسہ الرحمۃ انہ من عمل منکم... خطا اور نسیان اور راہِ عدل سے لغزش (یعنی ظلم) تقاضائے بشریت لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا تریاق استعمال کرنا یعنی ندامت اور توبہ بھی تقاضائے بشریت ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی غفور رحیمی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ توبہ قبول فرمائیں گے البتہ جو صرف جھوٹ موٹ کا ایمان لائے یا مشرک ہی رہے، ان کو ضرور سزا ملے گی۔ کیوں کہ نہ انھوں نے امانت کا حق ادا کیا اور نہ اپنی تقصیر کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۷۵، ۷۶)

ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انھوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے، پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

یہ قول ان کا استکبار کی وجہ سے تھا کہ ایسے ایسے ذلیل لوگ جب اس شخص پر ایمان لائے ہیں تو ہم کیسے اس پر ایمان لاکر ان لوگوں کے برابر ہوجائیں۔ اور درپردہ استدلال یہ تھا کہ جب اس شخص پر ایسے چھوٹے چھوٹے لوگ ایمان لائے ہیں تو یہ ان

ہی چھوٹوں کا سردار ہوگا اور خود بڑا شخص تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اگر واقعی یہ بڑا شخص ہوتا تو ہم جیسے بڑے لوگ اس پر ایمان لاتے۔ حالانکہ دونوں باتیں بہت ہی غیر منطقی اور غیر معقول ہیں اور سب سے زیادہ بنیادی غیر معقولیت اس بات کی یہ ہے کہ وہ کمزور اور نادار لوگوں کو ذلیل سمجھتے رہے حالانکہ ناداری اور کمزوری اور ذلت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں میں کوئی co-relationship (قدرِ مشترک) بھی نہیں ہے۔

اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ O (سورۃ الاعراف، آیت ۸۱)

(یعنی) تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم حد (انسانیت) ہی سے گزر گئے ہو۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوت کا غیر محل میں صرف کرنا بھی اسراف ہے۔ یعنی اتباعِ شہوات میں حد سے گزر جانا۔ اور حلال حرام فطری اور غیر فطری کے حدود کو خیرباد کہہ دینا ہے۔ مولاناؒ نے اس کا ترجمہ ''حد (انسانیت) سے گزر جانا'' کیا ہے۔

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لَنُخۡرِجَنَّکَ یٰشُعَیۡبُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَکَ مِنۡ قَرۡیَتِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوۡ کُنَّا کٰرِہِیۡنَ O قَدِ افۡتَرَیۡنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِیۡ مِلَّتِکُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنۡہَا ؕ وَمَا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ فِیۡہَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡنَا ؕ رَبَّنَا افۡتَحۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ قَوۡمِنَا بِالۡحَقِّ وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡفٰتِحِیۡنَ O

(سورۃ الاعراف، آیت ۸۸، ۸۹)

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا کہ اے شعیب ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ۔ شعیبؑ نے جواب دیا (کہ کیا ہم تمھارے مذہب میں آجاویں گے) گو ہم اس کو (بدلیل وبصیرت) مکروہ ہی سمجھتے ہوں۔ ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہوجاویں گے اگر (خدا نہ کرے) ہم تمھارے مذہب میں آجاویں (خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو اور ہم سے ممکن نہیں کہ (تمھارے مذہب) میں پھر آجاویں لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے، ہمارے مقدر (میں) کیا ہو ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم اللہ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری (اس) قوم کے درمیان میں فیصلہ کردیجیے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار ہے کہ تم ہمیں اپنے دین میں کس طرح واپس لے جاسکتے ہو، اگرہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں سے کہلوا دیا کہ اگر تم نے زبردستی ہمیں اپنے دین میں داخل کرا بھی لیا تو چونکہ ہم اسے جبراً وکرھاً قبول کریں گے تو دراصل تمھارے دین میں داخل ہی نہیں ہوں گے کیوں کہ ایمان اور کفر کا تعلق دل سے ہے اور جبراً کوئی دل کو نہیں بدل سکتا۔ اسی لیے لا اکراہ فی الدین فرمایا گیا ہے۔ گو ظاہری اعمال کسی کے کسی ملت کے اعمال کے مطابق ہوجائیں مگر جب تک اس کے دل میں اس ملت اور اس کے دین سے نفرت ہے وہ اس ملت کا فرد نہیں کہلاسکتا۔ یہ بات بہت obvious، ظاہر وباہر ہے۔ اور یہی اس الزام کا مسکت جواب ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا کیوں کہ تلوار کے زور سے منافقوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوسکتا تھا، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔

دوسری آیت میں ایک اور حقیقت کا اظہار ہے کہ اگر خدانخواستہ اللہ ہی کی مرضی ہوئی کہ ہم تمھاری ملت میں دوبارہ پہنچ جائیں تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ ان کا علم ہر

چیز پر وسیع ہے۔ لہٰذا ان کی حکمت اگر اسی کو مقتضی ہو تو کون کچھ کر سکتا ہے۔ اس کا علم تو ان ہی کو ہے کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہوگا یا نہیں لیکن (وہ ہمارے رب ہیں) اور ہم نے ان پر پورا بھروسا کرلیا ہے۔ یعنی ان کی رحمت اور ان کی ربوبیت سے ہمیں قوی امید ہے کہ ہمیں وہ دوبارہ تمھاری ملت میں نہیں داخل کریں گے۔ یہ عجز و افتقار ہی ایمان کا محافظ ہے۔ اور پھر دعا ہے جو دراصل خاتمہ بالخیر کی دعا ہے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ توکل کے معنی اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ہے۔ اور مضبوطی کے ساتھ ایمان پر جم جانے کے بعد ان کی رحمت پر بھروسا رکھنا اور اِترانا نہیں کہ ہم بڑے بہادر ہیں۔ ثابت قدمی ان ہی کی طرف سے ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ يَضَّرَّعُوۡنَ○ ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ○ وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰـكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۹۴۔ ۹۶)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہو تا کہ وہ ڈھیلے پڑ جاویں۔ پھر ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور (اس وقت براہِ کج فہمی) کہنے لگے کہ ہمارے آبا و اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھیں تو ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انھوں نے تو (پیغمبروں کی) تکذیب کی تو ہم نے (بھی) ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔

ان آیاتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان اور تقویٰ کے برکات دنیا میں بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح تکذیب اور فسق کا وبال دنیا میں بھی آتا ہے۔ آیت نمبر۹۶ میں برکات نازل کرنے اور ایمان وتقویٰ کا رشتہ صاف ظاہر ہے۔لیکن یہ بات بھی آیت نمبر ۹۵ سے معلوم ہوتی ہے کہ فسق و فجور وتکذیب کے باوجود ان اقوام پر دنیاوی نعمتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن یہ ان کی ultimate بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور قدمس اباء نا...الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ cycle کئی پشتوں تک چلتا ہے اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر آج ہم توبہ کرلیں اور تقویٰ اختیار کرلیں تو اس کا فائدہ برکات من السماء کی شکل میں ہماری آئندہ نسلوں کو پہنچے۔

اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَO اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَO اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَO تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَO(سورۃ الاعراف، آیت ۹۸، ۱۰۱)

اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہوگئے ہیں کہ ان پر (بھی) ہمارا عذاب دن دوپہر ہی آپڑے جس وقت کہ وہ اپنے لایعنی قصوں میں مشغول ہوں۔ ہاں تو کیا اللہ تعالیٰ کی اس (ناگہانی) پکڑ سے بے فکر ہوگئے سو (سمجھ رکھو) خدا تعالیٰ کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا اور ان (گزشتہ) زمین پر رہنے والوں کے بعد جو لوگ (اب) زمین پر بجائے ان کے رہتے ہیں، کیا ان واقعاتِ مذکورہ نے ان کو یہ بات ہنوز نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو ان

کے جرائم کے سبب ہلاک کر ڈالتے اور ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اس سے وہ سنتے نہیں۔ ان (مذکورہ) بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے پھر جس چیز کو انھوں نے اوّل (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے، اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

دل پر مہر لگنے کا ذکر یہاں دو آیتوں میں ہے (آیت نمبر ۱۰۰ اور ۱۰۱) اس سے پہلے جو بستی والے اطمینان سے سوتے تھے اور کھیلتے کودتے تھے اور اپنی نافرمانیوں کے باوجود عذاب کی طرف سے مطمئن تھے، ان کا ذکر ہے اور فرمایا کہ کیا یہ لوگ اللہ کے plan سے اپنے کو مامون سمجھے ہوئے ہیں؟ اگر ہم نافرمانی کر رہے ہیں تو ڈرتے رہنا چاہیے کہ نہ معلوم کس وقت گرفت ہوجائے اور نہ جانے اللہ تعالیٰ کے (Time frame میں) اس کا کون سا وقت مقرر ہے۔ اگلا اور آخری اسٹیج اس روش کا دل پر مہر لگ جانا ہے۔ دل پر مہر لگ جانا بڑے ڈرنے کی چیز ہے اور بار بار تنبیہہ ہونے پر اور بار بار کی تنگی اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار دیکھتے ہوئے جو ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں چھوڑتے تو بہت ڈرنے کی بات ہے کہ کہیں خدانخواستہ ہمارے دلوں پر مہر تو نہیں لگ گئی ہے اور اگر اب تک نہیں لگی ہے تو خدانخواستہ عنقریب نہ لگ جائے۔ اعاذنا اللہ منھا۔ گرچہ آیت نمبر ۱۰۱ میں کافروں کا ذکر ہے لیکن فسق و کفر میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ فسق بڑھتے بڑھتے کفر ہوجاتا ہے۔ جب گناہ کے سیاہ نقطے پورے دل پر چھا جائیں تو ایمان بھی چھن جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کہیں خدانخواستہ ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے آپ کو مومن سمجھ رہے ہیں اور درحقیقت ایمان ہم سے رخصت ہوچکا ہے۔ بقول حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کہ ایمان پر خاتمے کی دعا مانگتے ہو۔ ارے ایمان ہے کہاں جس پر خاتمہ ہو۔ اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ توبہ کرو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

آدمی کا ایمان کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اس کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اور خاتمے کی طرف سے مامون نہیں رہنا چاہیے۔ جس طرح ایک

بہت مضبوط دماغ کا آدمی ایک بہت باریک رگ میں کچھ ہوجانے کی وجہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے، اسی طرح ایک بہت ہی صحت مند آدمی ایک چھوٹے سے خلیاتی مرض (کینسر) میں مبتلا ہو کر لبِ گور پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے اور استغفار کرتے رہنا چاہیے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہونا اس کی رحمت کا انکار کرنا ہے اور اس کی قدرت کا انکار کرنا ہے۔ اگرچہ اس کی رحمتِ واسعہ ہر چیز کو محیط ہے لیکن وہ جس کو چاہے اپنی رحمت سے محروم کردے۔ فاعوذ باللّٰہ، تمام نیکیوں کو اور تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت بلااستحقاق سمجھنا ہی دراصل ایمان ہے اور کفر بانعم اللّٰہ دراصل کفر باللّٰہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ایسی ہے کہ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء۔ یہی علیٰ کل شئی قدیر کی تفسیر ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبیِ کریم ﷺ جب زور کی ہوا دیکھتے تو حضور ﷺ کے چہرے کا رنگ گھبراہٹ سے فق ہوجاتا۔ اسی طرح کسوف اور خسوف کے وقت لمبی نمازیں پڑھتے اور اللہ تعالیٰ سے مناجات میں مشغول ہوجاتے۔

ایک سوال بعض ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ اچھا دین ہے کہ آدمی عمر بھر گناہوں سے بچتا رہے، بہت سے لذائذ کو خیرباد کہتا رہے اور بہت سی پریشانیاں اٹھائے پھر بھی تمام عمر عذابِ آخرت سے ڈر میں مبتلا رہے اور معمولی سی لغزشوں پر استغفار کرتا رہے جب کہ دوسرے بڑے سے بڑا جرم کرکے بھی مطمئن رہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ استغفار ہی آدم علیہ السلام اور ابلیسِ لعین میں فارق ہے۔ اور اپنی کمزوری اور عجز کا ہر وقت اعتراف ہو، لہٰذا نعوذ باللّٰہ ہی اصل شرفِ آدمیت ہے۔

قال فرعون اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم ۚ اِنّ ھٰذا لمکرٌ مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھآ اھلھا ۚ فسوف تعلمون ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۲۳)

فرعون کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ پر ایمان لائے ہو بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں بے شک یہ ایک کارروائی تھی جس پر تمھارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں تا کہ تم سب اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو سو (بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

سچائی کی تصدیق اور اس کا اظہار spontaneous (فی الفور) ہونا چاہیے اور اس میں کسی مشورے اور اجازت کی ضرورت نہیں اور یہی بات ''بڑے آدمیوں'' کو بری لگتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اگر ان سے پوچھا جاتا تو وہ اجازت دے دیتے۔ نہیں بلکہ اس وقت بھی کہتے کہ خبردار اگر ایمان لائے تو خیر نہیں۔ لاقطعن ایدیکم... یہ صرف ایک بہانہ ہے کہ ہم بڑے تھے ہم سے کم از کم پوچھ تو لیا ہوتا۔ اگر پوچھتے تو زیادہ برا ہوتا۔ برملا ایمان کا اظہار بھی نہیں ہوتا اور تکلیف اتنی ہی پہنچتی جتنی وہ لوگ پہنچانا چاہتے۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَO قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَO وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَO (سورۃ الاعراف، آیت ۱۲۴۔۱۲۶)

میں تمھارے (ایک طرف کے) ہاتھ اور (دوسری طرف کے) پاؤں کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ (کچھ پروا نہیں ہم مر کر اپنے مالک کے پاس ہی جاویں گے اور تو نے ہم میں کون سا عیب دیکھا بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے جب وہ احکام ہمارے پاس آئے، اے ہمارے رب ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما اور ہماری جان حالتِ اسلام پر نکالیے۔

قرآن شریف میں جو قصے بیان ہوئے ہیں اور بعض قصے کئی بار بیان ہوئے

ہیں، ان کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر جگہ ایک خاص پہلو پر زور ڈالنا مقصود ہوتا ہے اور جس جگہ وہ واقعہ بیان ہوتا ہے، وہاں بس اتنا ہی ضروری ہوتا ہے اس مقصد کے لیے جتنا بیان فرمایا گیا، مثلاً یہیں پر جادوگروں کے ایمان کا جو واقعہ بیان فرمایا گیا اس میں فرعون کا اوراس کا فوراً ایک بہانہ تراشنا اور پھر دھمکی دینا اور ان سب پر ان مومنوں کا ردِعمل، ان کی بے خوفی، ان کا صبر اور ان کا صرف اللّٰہ تعالیٰ پر توکّل یہ سب خوب واضح ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا، یہ بات یہاں پر بالکل غیرضروری ہے۔ اور اگر بتا دیا جاتا کہ پھر ان کو فرعون نے یہ سزا دی اور اس سے وہ معجزانہ طور پر بچ گئے یا عام فطری قانون کے تحت پُراذیت موت کا شکار ہوگئے تو اس سے ان باتوں کی طرف توجہ کم ہوجاتی جن کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا۔ یہ بھی ایک وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سے قصے اپنی پوری تفصیل کے ساتھ بیان نہیں فرمائے گئے۔ یا تو یہ قصے اس زمانے اور اس علاقے کے مشہور واقعات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں یا اس واقعے کا صرف اتنا حصہ بتلانا مقصود ہوتا ہے جو بتلا دیا گیا۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَ هُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَ هُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ واصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۲۷، ۱۲۸)

اور قومِ فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو ترک کیے رہیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کردیں گے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہم کو ہر طرح کا ان

پر زور ہے، موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ (گھبراؤ مت) یہ زمین اللّٰہ تعالیٰ کی ہے جس کو چاہیں مالک (و حاکم) بنا دیں اپنے بندوں میں سے اور اخیر کامیابی انھیں کو ہوتی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔

جادوگرانِ تائبین کا ردِعمل بالکل فطری تھا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ان کو اپنے رب پر جو اعتماد تھا وہ ظاہر کیا اور اسلام پر خاتمے کی دعا کی یعنی تم جو کرسکتے ہو کرلو لیکن یاد رکھو کہ یہ سراسر ظلم ہے کیوں کہ یہ تم صرف اس لیے کر رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لائے لیکن ہماری منزل تو بس ایمان پر خاتمہ ہے جس کے لیے ہم خدا ہی سے صبر واستقامت مانگتے ہیں اور اس منزل سے تم ان شاء اللہ ہمیں ہرگز نہیں ہٹا سکو گے۔

پھر فرعون نے جولڑکوں کو قتل کرنے اور عورتوں کو زندہ رکھنے کا عہد کیا، اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے صرف صبر کے لیے کہا اور کہا کہ زمین (میں حکومت) اللّٰہ تعالیٰ جس کو چاہیں دیں لیکن عاقبت ان متقیوں کے لیے ہے۔ ایمان پر استقامت اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ آخرت اور صرف آخرت کے انعامات پر نظر ہو۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۲۹)

قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی۔ موسیٰ نے فرمایا بہت جلد اللّٰہ تعالیٰ تمھارے دشمن کو ہلاک کردیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیں گے پھر تمھارا طرزِ عمل دیکھیں گے۔

اور ایک دوسری آیتِ کریمہ میں ذکر ہے کہ زبور میں بھی ''ارض'' کا صالحین کے لیے موعود ہونا لکھا ہوا تھا۔ اور قرآن شریف میں کہیں اور بھی تمکین فی الارض کا مسلمانوں کے لیے وعدہ ہے۔ لیکن اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ وہی خطۂ زمین جس میں یہ رہتے ہیں اس کے یہ وارث ہوجائیں گے کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو جو ''ارض'' ملی جو ان کے لیے لکھ دی گئی تھی وہ ارضِ مقدسہ تھی جو ان کو اپنا آبائی وطن چھوڑنے کے بعد ملی۔ وہ بھی چالیس سال یا اس سے زیادہ مدت کے بعد ملی۔ لہٰذا یہ بھی وعدہ نہیں ہے کہ کل مل جائے گی یا دو سال کے بعد مل جائے گی، یعنی وعدہ تو سچا ہے لیکن زمان و مکاں کے تعین کے بغیر ہے گرچہ اللہ تعالیٰ کے پاس دونوں لکھے ہوئے ہیں اور بندوں کو تعین نہ بتانے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ''ارض'' اس دنیا میں نہ ہو بلکہ قیامت کے بعد جو ''ارض'' اس ''ارض'' کو تبدیل کرکے بنے گی وہ ہو اور کتبنا فی الزبور کی تفسیر میں یہی بات آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس زمین کا وعدہ نیک لوگوں کے لیے فرمایا ہے، وہ آخرت سے متعلق ہے۔

❁

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۫ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ○ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ○

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۴۴، ۱۴۵)

ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ (یہ بہت ہے کہ) میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو (اب) جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے اس کو لو اور شکر کرو اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکامِ ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی تو ان کو کوشش کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو بھی حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے پر عمل کریں۔ میں اب بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکموں کا مقام دکھلاتا ہوں۔

ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ جو میں نے تم کو عطا کیا ہے وہ لے لو اور شکر کرو۔ دوسرے یہ کہ ان احکام کو قبول کرنا ہی شکر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ایسے لازم وملزوم ہیں کہ ایک کا ہونا دوسرے کے ہونے کے مرادف ہے۔

جس طرح اللّٰہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا احسان اور فضل ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کہ انھیں رسالت اور ہم کلامی سے نوازا گیا اور اسی احسان کے تقاضے میں ان سے کہا گیا کہ شکر ادا کرنے والوں میں ہوجاؤ۔ اسی طرح ہم پر بھی اللّٰہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے کہ ہمیں اس نے اپنے نبیِ برحق ﷺ کے واسطے سے اپنی کتاب عطا فرمائی لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اسے مضبوطی سے پکڑ لیں، یعنی اس کے اوامر ونواہی اور احکامِ ظاہرہ و باطنہ کی پابندی کریں۔ اسی طرح ہم اس نعمت کا شکر ادا کرسکیں گے۔ اور اگر نعوذ باللّٰہ شاکرین میں سے نہیں ہوئے تو فاسقین میں سے ہوجائیں گے جیسا کہ اگلی آیت میں واضح اشارہ ملتا ہے۔

''یاخذوا باحسنھا'' کے معنی ''یاخذوا بکلھا'' ہے کیوں کہ تمام کا تمام احسن ہے، یہ صرف ترغیب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ بات اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ آیت نمبر۱۴۴ میں ''خذ ما اتیتک'' ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ ○ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَۃِ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ ؕ ھَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۴۶، ۱۴۷)

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان

پر ایمان نہ لاویں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو (اپنا) طریقہ نہ بناویں اور اگر گمراہی کا رستہ دیکھ لیں تو اس کو (اپنا) طریقہ بنالیں اور یہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اور ان سے غافل رہے۔ اور یہ لوگ جنھوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام غارت گئے اور ان کو وہی سزا دی جاوے گی جو کچھ یہ کرتے تھے۔

اکثر جو ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں کہ سر ظفر اللہ جیسا شخص کیسے گمراہ ہوگیا تو اس کا جواب یہاں موجود ہے اور جب ان کی یہ حالت ہے کہ ان یروا کل آیت لا یومنوا بھا...تو پھر ساری دنیا کا علم بھی انھی فائدہ نہیں دے سکتا اور اس بات کا جواب کہ اتنے ''اچھے اچھے'' لوگ کس طرح جہنم میں چلے جائیں گے اس کا جواب بھی یہاں موجود ہے کہ ان لوگوں کے اعمال غارت ہوجائیں گے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آخرت کا انکار کیا اور ظاہر ہے کہ جب آخرت کا انکار ہی ہے تو پھر وہاں کی نعمتوں کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''شکر'' کا antonym (یعنی اس کی متضاد صفت) ''کبر'' ہے۔ جس نے شکر اختیار کیا وہ خود بخود کبر سے بچ گیا and via-versa اور کبر ایک طرح کی perversity (یعنی فطرت کا بگاڑ ہے) ایسا شخص جس کی فطرت ہی بگڑ گئی ہو اچھی چیز کو بری اور بری چیز کو اچھی سمجھتا ہے یعنی اگر بھلائی کا راستہ دیکھتا ہے تو اس کو اختیار نہیں کرتا اور برائی کا راستہ دیکھتا ہے تو اس کو اختیار کرتا ہے۔

ہر تکبر بغیر حق ہے کیوں کہ مخلوق کو تکبر کرنے کا حق نہیں ہے۔

''غافلین'' کا ترجمہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے ''جاحدین'' کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ الفاظ کی حقیقت اور اس کے معانی (shades of meaning) سمجھنے کی بہت ضرورت ہے۔ غفلت کے کئی درجے ہیں اور یہاں پر آخری درجہ مراد ہے۔

آخرت کے انکار سے حبطِ اعمال مسلم ہے۔ ''بما کانوا یعملون'' کے ساتھ جزا کو مشروط کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اعمال میں عقائد اور اقوال سب شامل ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے ''ویقولون من الشرک۔''

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۴۱ اور ۱۶۸)

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں (کے ظلم و ایذا) سے بچا لیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے، تمھارے بیٹوں کو بکثرت مار ڈالتے تھے اور تمھارئی عورتوں کو (اپنی بیگار اور خدمت کے لیے) زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس (واقعہ) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے بڑی (بھاری) آزمائش تھی۔ اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کردیں بعضے ان میں نیک تھے اور بعضے ان میں اور طرح کے بھی تھے (یعنی بد) اور ہم ان کو خوش حالیوں (صحت وغنا) اور بدحالیوں (بیماری وفقر) سے آزماتے رہے کہ شاید اسی سے باز آجاویں۔

آیت نمبر ۱۴۱ سے ایک لحظہ کے لیے نعوذ باللہ یہ خیال آسکتا ہے کہ خود ہی تو اس عذاب میں مبتلا فرمایا تھا پھر اس سے نجات دے دی تو کیا احسان ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر کسی کو اس بات کا پورا اختیار ہو کہ چاہے تو عذاب میں مبتلا رکھے چاہے آسائش و عافیت میں رکھے، اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور وہ اگر اپنے غلام کو کچھ دن عذاب میں مبتلا رکھ کر عافیت عطا فرمائے تو کیا اس کا احسان نہیں ہوگا؟ ضرور

ہوگا، بلکہ کچھ دن مبتلائے مصیبت رہنے کے بعد اس عافیت کی زیادہ قدر ہوگی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور تمرد ہی کی وجہ سے ان پر آلِ فرعون کا عذاب مسلط کیا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے بلا سبب ان پر رحم فرما کر انھیں اس عذاب سے نجات دی۔ اس تسلسل (sequence) کا اشارہ ان واقعات سے ملتا ہے جن کا ذکر آیت نمبر ۱۴۱ اور آیت نمبر ۱۶۸ کے درمیان کی آیات میں ہے۔ دوسرے اس سے اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو بما کسبت ایدیکم کے ساتھ سبب اور مسبب کے رشتے میں (causal relationship) میں منسلک فرمایا ہے۔ اگر یہ خیال آئے کہ بڑے بڑے بزرگوں پر اور انبیائے معصومین پر بھی مصیبتیں آئی ہیں تو ایک لحاظ سے یہ بھی اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے سارے عالم کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور محبت میں تو آزمائشیں ہوتی ہی ہیں اور تکالیف آتی ہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ گرچہ ظاہری مصیبت ہوتی ہے مگر ان کے لیے وہ مصیبت ہزاروں خوشیوں کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تیسرا جواب آیت نمبر ۱۶۸ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اچھی حالت میں رکھ کر آزمایا اور بری حالت میں رکھ کر آزمایا تاکہ ان کو رجوع الی اللہ کا موقع ملے۔ اچھی حالت میں شکر کے ساتھ اور بری حالت میں صبر اور توبہ کے ساتھ۔ لہٰذا فرعون سے سزا دلوانا بھی اسی لیے تھا کہ وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور نجات دینا بھی اسی لیے تھا کہ وہ شکر کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

❁

وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِىْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۶)

اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجیے اور آخرت میں بھی ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (اللّٰہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ میں اپنا عذاب تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیا کو محیط ہو رہی ہے تو وہ (رحمت) ان لوگوں کے نام تو ضرور ہی لکھوں گا جو کہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

نماز میں تو اللّٰہ کی رحمتِ خاصہ ہے ہی۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ اسلام سے وعدے کا ذکر ہے کہ متقیوں کے لیے خاص طور پر رحمت لکھ دوں گا لیکن اللّٰہ تعالیٰ کی عام رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر وقت اللّٰہ تعالیٰ کے انعامات ہم پر ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر یہ انعامات اسباب اور واسطوں کے ذریعے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اسباب کا سلسلہ بہت دور تک چلا جاتا ہے اور انسان کی نظر منعمِ حقیقی سے ہٹ جاتی ہے، مثلاً نعمت السبب سبب السبب سبب السبب السبب اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت۔ لہٰذا کبھی کبھی یہ بات یاد کرتے رہنے کی ہے کہ تمام اسباب کو منقطع تصور کیا جائے اور ہر نعمت کا سبب صرف اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کو سمجھا جائے۔ جیسا کہ دعائے مسنونہ صبح و شام پڑھنے کی ہے اللھم ما اصبح بی من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک وحدک لاشریک لک، لک الحمد ولک الشکر۔ اور ارشادِ ربانی ہے وما بکم من نعمۃ فمن اللّٰہ ...الخ (النمل، آیت ۵۲) سورۂ نمل ہی میں اللّٰہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ نعمت کا ہر واسطہ اور اسباب کے chain (زنجیر) کی ہر کڑی کا اللّٰہ تعالیٰ کی نعمت ہونا سمجھ میں آجاتا ہے، یعنی نہ صرف یہ کہ (ultimate analysis میں) ہر نعمت اللّٰہ تعالیٰ کی طرف ہے بلکہ (immidiate context میں بھی) ہر واسطہ اللّٰہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ یہیں سے اندازہ لگاؤ کہ اللّٰہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا نہ صرف انسانی دماغ کے لیے بلکہ اس سے بے حد و حساب (infinitely) زیادہ صلاحیت رکھنے والے ذہن کے لیے بھی ناممکن ہے۔ وان تعدوا...الخ (النمل، آیت ۱۸) یہ نعمت کی فراوانی اور یہ رحمت کی ارزانی ایک ایک چیز میں غور کرنے سے نظر آجاتی ہے، مثلاً فلینظر الانسان الی...الخ۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے کہ گنہگار بندے بھی عافیت اور آرام سے چل پھر رہے ہیں اور اگر کسی کو کوئی تکلیف ہے بھی تو وہ اس گناہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جس میں وہ مبتلا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت روک لیں اور لوگوں کو عمل اور ردِعمل کے قانون کے مطابق سزا فوراً ملنے لگے تو زندگی کا سفر رک جائے کیوں کہ کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکے اور چونکہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہیں اس لیے وہ جب چاہیں اپنی رحمت روک لیں اور چاہیں تو بڑے سے بڑے عابد و زاہد کو اپنی رحمت سے دور کردیں اور اس سے ان کے عدل پر ذرّہ برابر بھی حرف نہ آئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے لیکن امید رکھنی بھی ضروری ہے اور اسی امید بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے محسنین سے اپنی رحمت قریب ہونے کا اعلان فرمایا (سورۂ اعراف) ولاتفسدوا (... المحسنین)) اور ان کے لیے اپنی خصوصی رحمت مقدر کردینے کا وعدہ بھی فرمایا۔ فالحمدللہ۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۷)

جو لوگ کہ ایسے رسول نبیِ اُمی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے) وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں سو جو لوگ اس نبی (موصوف) پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اُن کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک مجلس میں ایک صاحب نے ایک بے وقوفی کا سوال کیا کہ پہلے اللہ پر ایمان لائے یا پہلے رسول پر ایمان لائے۔ میں نے ان کو بتایا کہ اللہ اور رسول میں تفریق کرنے والے کو کافر کہا گیا ہے۔ مگر وہ نہ مانے۔ اس آیتِ کریمہ میں واضح طور پر رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی ونفسی و مالی پر ایمان لانے اور ان کی اتباع کرنے کا ذکر ہے، بلکہ صریحاً رسولِ پاک ﷺ کو حلال کرنے والا اور حرام کرنے والا فرمایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول پر ایمان لانے میں اللہ پر ایمان لانا شامل ہے۔ رسول کو صرف سچا، امین، بہادر، بہترین انسان سمجھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو خدا کا رسول سمجھنا ضروری ہے ورنہ کارلائل اور گاندھی کا بھی ایمان تھا کہ محمد ﷺ بے انتہا صفاتِ حمیدہ کے مالک تھے اور بہترین انسان تھے لیکن اس سے وہ ''الذین امنوا'' کے زمرے میں ہرگز شامل نہیں ہوسکتے۔

اسی طرح بعض جہلا ان الذین امنو... والنصاریٰ... الخ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جنتی ہونے کے لیے رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے حالانکہ وہاں بھی ایمان باللہ میں ایمان بالرسول شامل ہے کیوں کہ کسی نہ کسی طرح سے یہود و نصاریٰ بھی خدا کو مانتے تھے اور آخرت کے قائل تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو جن صفات کے ساتھ ماننا ضروری ہے اور آخرت کا جو تصور ضروری ہے وہ وہی ہے جو حضور ﷺ نے بتایا۔ حدیث شریف میں من قال... دخل الجنۃ میں یہی ایمان مراد ہے۔ آپ کی یہ صفات آسمانی کتابوں میں مذکور تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا واکتب لنا فی... الخ کے جواب میں آنے والے عظیم الشان رسول ﷺ کی یہ خصوصیات بتائی گئیں، جن میں سے ایک خصوصیت ''امی'' ہونا بھی ہے حضور ﷺ کے علم وفضل وفہم کے سامنے بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ کچھ چیز نہیں تھے اور اس کا اعتراف دشمنوں کو بھی تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کا ''اَن پڑھ'' ہونا یقیناً ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں ہے وما کنت تتلوا... المبطلون۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ ۚ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ O

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۶۳)

اور آپ ان (اپنے ہم عصر یہودی) لوگوں سے (بطور تنبیہہ) اُس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے، اس وقت کا حال پوچھیے جب کہ وہ ہفتے کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتے کے روز (دریا کی) مچھلیاں ظاہر ہو ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے اس سبب سے کہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے۔

بلا یعنی آزمائش کی دو قسمیں ہیں۔ بلائے حسنہ اور بلائے سیئہ۔ پھر بلائے سیئہ کی جو عرفِ عام میں بھی بلا اور مصیبت کے نام سے پکاری جاتی ہے، دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک عام قاعدہ آزمائش کے تحت کے... نبلوھم... فتنۃ... دوسرے بطور سرزنش اور تنبیہ کے لیکن اس میں بھی آزمائش ہوتی ہے۔ اس آزمائش میں کامیاب ہونے کے لیے گزشتہ گناہوں پر ندامت اور توبۃ النصوح کی ضرورت ہے۔ لیکن عام طور سے ایسی آزمائش میں لوگ کامیاب نہیں ہوتے اور یہ ان ہی لوگوں سے امتحان لیا جاتا ہے جو مبتلائے فسق و فجور ہوتے ہیں اور پھر اس میں ناکامیاب ہونے کے بعد ایسی سزا ہوتی ہے جو irreversible (جس سے لوٹنا ناممکن ہوتا ہے) ہوتی ہے جیسے یہاں ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو بندر اور سوّر بنا دیے گئے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ O

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۶۵)

(سو آخر) جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے اُن لوگوں کو بچالیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کو جو (حکم مذکور میں) زیادتی کرتے تھے ایک سخت عذاب میں پکڑلیا۔

جب قوموں کے فیصلے کا وقت آتا ہے، اس وقت دو ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو عام روش میں بہہ جاتے ہیں جو روش گناہ، ظلم اور خودغرضی کی ہوتی ہے دوسرے وہ جو اس روش میں نہیں بہتے اور برائیوں سے منع کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ گناہ میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن دوسروں کو برائی سے نہیں روکتے کہ وہ جانے ان کا کام (یعنی unconcerned رہتے ہیں) یہ بھی اوّل الذکر catagorey (زمرے) میں آتے ہیں۔ صرف ثانی الذکر ہی دنیاوی سخت عذاب کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں اور بچائے جاتے ہیں۔

البتہ یہ منع کرنا کیفاً اور کماً (یعنی سختی سے روکا جائے یا نرمی سے یا کسی حیلے سے روکا جائے) ہر آدمی کے اپنے circumstances (ماحول) اور صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے من رامنکم منکرا فلیُغیرہ بیدہ... الخ یعنی جو برائی ہوتا ہوا دیکھے اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے یعنی طاقت کے استعمال سے روکے، اگر اس میں اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''جب نفع کی امید نہ ہو تو نہی عن المنکر کا وجوب ساقط ہوجاتا ہے۔ تو قائلینِ اوّل نے اس سے پہلی آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے (واذ قالت... تعظون...) انھوں نے) یاس کی وجہ سے وعظ چھوڑ دیا اور قائلینِ ثانی کو امید تھی اس لیے وہ کرتے رہے اور تحقیق یہ ہے کہ ساکتین کو بھی نجات رہی۔'' یہ بھی فرمایا کہ '' قائلین لِمَ تعظون نے بوجہ یاس کے عدم وجوب پر عمل کیا اور قائلینِ معذرت الٰی ربکم کو یا تو یاس نہیں ہوا یا عالی ہمتی کی شق کو اختیار کیا، غرض دونوں مصیب تھے۔''

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۶۹، ۱۷۰)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب (توریت) کو ان سے حاصل کیا اس دنیائے دنی کا مال و متاع لے لیتے ہیں اور (اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہوجاوے گی حالانکہ اگر ان کے پاس (پھر) ویسا ہی مال و متاع (دین فروشی کے عوض) آنے لگے تو اس کو لے لیتے ہیں کیا اُن سے کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ خدا کی طرف بجز حق بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں اور انھوں نے اس کتاب میں جو کچھ تھا اس کو پڑھ (بھی) لیا اور آخرت والا گھر ان لوگوں کے لیے (اس دنیا سے) بہتر ہے جو (ان عقائد و اعمالِ قبیحہ سے) پرہیز رکھتے ہیں پھر کیا (اے یہود) تم نہیں سمجھتے اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی اصلاح کریں، ثواب ضائع نہ کریں گے۔

گرچہ یہ باتیں اہلِ کتاب کے بارے میں ہیں لیکن غور سے دیکھیں تو ہم میں بھی بہت سے ہیں جو اسی پر عمل پیرا ہیں کہ جو کچھ مل جائے اس میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اللہ معاف کرے گا اور اگر مزید دنیا مل جائے آخرت بیچ کر تو وہ بھی لے لیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی غفور رحیمی پر بھروسا ان ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو توبہ کرتے ہیں اور واقعی اس کی سزا سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ زبانی کہنے والوں کو اللہ کی غفور رحیمی سے کیا حصہ مل سکتا ہے۔ البتہ جو لوگ مضبوطی سے کتاب کو پکڑے رہیں اور نماز قائم کریں (یعنی احکام کی پیروی کرتے رہیں) تو البتہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے وافر حصہ ملنے کی امید ہے اور گناہ کی آلودگیوں کی وجہ سے ان کے نیک اعمال ضائع

نہیں ہوں گے۔

آیت نمبر ۱۷۰ ایک وعدہ بھی ہے تا کہ لوگ صبر و استقامت سے کام کرتے رہیں، ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا بھی بیان ہے کہ اتنے بڑے الٹ پلٹ (upheavels) کے بعد جب انسان تو کیا بڑی عظیم الجثہ مخلوقات کا پتا بھی نہیں چلے گا اس کے بعد بھی انسان کے اعمال کا باقی رہنا اور نیک اعمال کا بدلہ ملنا اسی کی قدرت میں ہے اور ایک لحاظ سے یہ آیت آخرت کا ثبوت بھی ہے کہ جب محسنین کو بدلہ ملنا ضروری ہے اور دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر کو بدلہ نہیں ملتا تو آخرت کا ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ فالحمدللہ

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۷۲، ۱۷۳)

اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انھیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں۔ ہم (سب اس واقعے کے) گواہ بنتے ہیں تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے سو کیا ان غلط راہ (نکالنے) والوں کے فعل پر آپ ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی صلاحیت ہے جو جینی (genetic) اور ماحولیاتی (environmental) اثرات سے متاثر نہیں ہوتی اور انسان کو وقتاً فوقتاً یہ

سوچنے پر مجبور کردیتی ہے کہ وہ ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کا بندہ ہے اور کم از کم دیکھی ہوئی چیزوں کو یا محسوس کی ہوئی چیزوں کو (مثلاً ہوا کو) اپنا معبود ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ مخلوق کو خدا ماننا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

واتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۗ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۷۵، ۱۷۶)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہوگیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کردیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے، یہی حالت (عام طور پر) ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا سو آپ اس حال کو بیان کردیجیے شاید وہ لوگ کچھ سوچیں۔

قال ابن عباسؓ... وهو بلعم باعوراء... اکرمه الله بالاسم الاعظم فدعا به علی موسیٰ فاخذ الله منه حفظ ذلک ويقال اميه بن ابی الصلت اکرمه الله تعالیٰ بحسن وکلام حسن ولمالم يومن اخذ الله منه ذلک... (الذين كذبوا بايتنا) بحمد عليه السلام والقرآن وهم اليهود۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسلمان اس کے مصداق نہیں ہیں یہ آیت کافروں یعنی مکذبین کے بارے میں ہے اور مسلمان مکذبین نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ علم چاہے روحانی (spiritual) ہو جیسے اسمِ اعظم کا جاننا ہے، چاہے مادی (material) چیزوں کا علم ہو وہ کتنے ہی پائے کا علم کیوں نہ ہو وہ ارفع مقامات پر پہنچانے کی صلاحیت (potentiality) تو رکھتا ہے مگر جب تک ایمان نہ ہو، وہ ہرگز ایسی رفعت یا ایسی عزت کا موجب نہیں ہوسکتا جو مستقل (permanent) ہو اور جو خدا کے نزدیک بھی عزت اور رفعت ہو۔ چنانچہ اتینہ من ایاتنا علم کی اعلیٰ سطح (highest type of knowledge) کو ظاہر کرتا ہے اور ولو شئنا سے ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو اس کا رفعت دینا منظور ہوتا تو رفعت دیتا اور اخلدہ الی الارض اس مردود کے ایمان سے کورا ہونے کو ظاہر کرتا ہے کیوں کہ یہ بات کفر کی خاص characteristic میں سے ہے جسے ابنِ عباسؓ نے فرمایا ہے، ''ان وعظ لم یلعظ وان سکت عنہ لم یعقل...'' اور اسی آیتِ کریمہ میں اخلد الی الارض کے بعد واتبع ھواہ اور پھر کذبوا بایٰتنا اس بات کو بالکل واضح کردیتا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ علم ہدایت سے محرومی کو نہیں روک سکتا، جب انسان کفر اور تکذیب کی ظلمت میں گھرا ہوا ہو۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۷۹)

اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں، یہ لوگ غافل ہیں۔

نہ صرف یہ کہ ان کے ظاہری طور پر آنکھ کان وغیرہ ہیں اور وہ گائے بیل کی

طرح سمجھ بوجھ سے کورے اور بے وقوف ہیں بلکہ بے شمار لوگ بہت ہی سوجھ بوجھ والے ہیں اور بظاہر ہوش، گوش والے اعلیٰ پڑھے لکھے، ذہین اور اونچے طبقے کے لوگ ہیں۔ بات کیجیے تو مرعوب ہوجائیے۔ ظاہری اور باطنی حسن (مثلاً نرم گفتگو، خوش خلقی، مدارات وغیرہ) سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ بس صرف ''فہمِ حق'' کے معاملے میں گونگے بہرے اور اندھے ہوجاتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی آنکھ کام نہیں کرتی۔ آخرت کے بارے میں اگر سوچیں اور غرور سے باہر نکل کر دیکھیں تو شاید ان کی سمجھ میں بات آجائے لیکن جو قلوبنا غلف کہہ دے اس سے کیا توقع؟ لہٰذا ویسے تو ذہین بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی لیکن حق بات سمجھنے کے معاملے میں گدھے اور بیل سے بھی بدتر ہیں۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ آخر چودھری ظفر اللہ خاں کیوں قادیانی تھے؟ اور آئن اسٹائن مسلمان کیوں نہیں ہوا؟ ان کی تخلیق ہی اسی طرز پر ہے۔ وہ سوچتے ہی دوسرے خطوط پر ہیں۔ ان کی سمجھ میں اتنی واضح اور موٹی بات نہیں آسکتی کہ رسول پر ایمان لانے کے بعد پوری پیروی بلاشرکتِ غیرے کرنی لازمی ہے، یا یہ کہ جو نظام اتنا مربوط اور unified ہے وہ عقیدۂ تثلیث (trinity) یا دہریت (atheism) کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ○ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۸۹)

اور اللہ ایسا (قادر ومنعم) ہے جس نے تم کو ایک تنِ واحد (آدمؑ) سے پیدا کیا اور اُسی سے اس کا جوڑا (حوا) بنایا تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا ہلکا سا سو وہ اس کو لیے ہوئے چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں میاں بی بی

اللہ سے جو کہ ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح و سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے۔"

اصل سکون حلال ہی چیز میں ہے اور اگر ایک عورت کسی ایک مرد کی ہو کر نہ رہے بلکہ دو تین مردوں سے بیک وقت اس کے تعلقات ہوں تو کسی کا سکون باقی نہ رہے۔ اور سوسائٹی کا معیار اتنا گر جائے جتنا جانوروں کا ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر اور بچوں سے مستقل تعلق کسی کا نہیں رہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ۝ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۹۴، ۱۹۵)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں تم ان کو پکارو پھر اُن کو چاہیے کہ تمھارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا اُن کے ہاتھ ہیں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں آپ (یہ بھی) کہہ دیجیے کہ تم اپنے سب شریکوں کو بلا لو پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر مجھ کو ذرا مہلت مت دو۔

چاہے وہ پتھر کی پرستش ہو، چاہے سانپ کی، چاہے جابر بادشاہ یا حکمران کی۔ بندے ہونے میں سانپ، پتھر، بادشاہ سب برابر ہیں اور جتنے ہم مجبور ہیں خدا کے سامنے اتنے ہی یہ بھی مجبور ہیں۔ ایک جابر حکمران ذرّہ برابر بھی کم مجبور نہیں ہے۔ پھر خدا کے بندوں کا اعلان ہوتا ہے کہ تم سب مل کر جمع ہو جاؤ اور ہمارے خلاف جو کچھ بھی کرنا

چاہتے ہو کر ڈالو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو، انھیں یقین ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی نہیں ہوگی، یہ سب مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ اکیلے ہوں اور یہ سب ایک طرف ہوں اور اگر خدا ہی ان کو اس طرح آزمانا چاہے کہ وہ ان کے ظلم کا شکار ہو جائیں تو یہ مردانِ خدا سر بسجود ہو کر کہتے ہیں: ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔

غیر اللّٰہ کے خوف سے بے نیاز ہو جاؤ
غیر اللّٰہ سے نفع کی امید اٹھا رکھو

بس یہی دو باتیں توحیدِ خالص کا خاصہ ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ O وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ O (سورۃ الانفال، آیت ۴۵۔۴۷)

اے ایمان والو! جب تم کو کسی جماعت سے (جہاد میں) مقابلے کا اتفاق ہوا کرے تو (ان آداب کا لحاظ رکھو ایک یہ کہ) ثابت قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (کا لحاظ) کیا کرو اور نزاع مت کرو (نہ اپنے امام سے نہ آپس میں) ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

جس طرح ایمان پر قائم رہنا اپنے اختیار سے بلا توفیقِ ایزدی ممکن نہیں ہے کیوں کہ نہ معلوم اللہ تعالیٰ کے علم میں کس طرح بات ہوئی ہو۔ اسی طرح اعمالِ صالح کا بھی ہمیں یقینی علم نہیں ہے کہ ہم سے ہو سکے گا یا نہیں۔ اور جہادِ اعظم عملِ صالح ہے لہٰذا

جہاد میں بھی توکل اور اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرتے رہنا اور اس کو بہت یاد کرنا ضروری ہے اور اسی کی یہاں تعلیم ہے۔ فاثبتوا کے بعد واذکروا اللّٰہ کثیرا کا حکم ہے۔ برخلاف کفار کے جن کو اپنی قوت اور اپنی بہادری پر زعم ہوتا ہے اور وہ گھر سے اِتراتے ہوئے نکلتے ہیں (جس کا ذکر آیتِ کریمہ نمبر۴۷ میں ہے) حالانکہ ان کو خدا کے غضب سے ڈرنا چاہیے تھا اور مومنوں سے تعرض نہیں کرنا چاہیے تھا۔

یہی حال ہر معاملے میں ہے کہ مومن نیکی پر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر قائم رہتا ہے اور نیکی ہوجانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔ برخلاف کافر یا منافق کے کہ وہ اپنے زعم میں مبتلا رہتا ہے۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیات ۳۔۴)

اور اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے پھر اگر تم (کفر سے) توبہ کرلو تو تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے (اسلام سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کرسکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے ہاں مگر وہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی سو ان کے معاہدے کو ان کی مدتِ (مقررہ) تک پورا کردو واقعی اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

کبھی نرمی تقویٰ کے اثر سے ہے اور کبھی سختی تقویٰ کے اثر سے ہے اور دونوں طرح کے معاملے میں مدِمقابل کفار ہی ہیں۔ اوّل الذکر حالت پاسِ عہد کی وجہ سے ہے جب کہ کفار نے بھی عہد کا پاس رکھا ہو۔ ثانی الذکر کا حکم جہاد کے موقع پر ہے جیسا کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آیت نمبر۱۲۳ میں ہے ولیجدوا فیکم غلظۃ۔

گویا جیسا آقا نے حکم دیا ویسے ہی بن گئے۔ اگر کہا کہ اس وقت ریشم بن جاؤ تو ریشم کی طرح نرم ہوگئے اور کہا کہ اس وقت فولاد بن جاؤ تو فولاد کی طرح سخت ہوگئے۔ پھر بھی انسانی فطرت ایسی ہے کہ غلطی کا احتمال رہ جاتا ہے۔ لہٰذا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے معافی کا بھی اعلان کیا جارہا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فضلِ عظیم والے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ O وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ O (سورۃ الاعراف، آیت ۱۹۹۔ ۲۰۱)

سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجیے اور نیک کام کی تعلیم کردیا کیجیے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجایا کیجیے اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اگر ان تین باتوں میں جن کا ذکر آیت نمبر۱۹۹ میں ہے، شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آئے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لیا کیجیے۔ شیطان اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اللہ کے متقی بندوں کو اگر معاصی میں مبتلا نہ کرسکے تو کم از کم بڑے درجے کی نیکی کو چھوڑ کر کم تر درجے کی نیکی میں لگا دے۔ شیطان کے ایسے تمام مکائد اللہ تعالیٰ کی طرف

رجوع کرنے سے (تذکروا) صاف نظر آنے لگتے ہیں۔
اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ معاف کر دینا، نیکیوں کا حکم دینا اور جاہلوں سے نہ الجھنا بڑے درجے کی نیکیاں ہیں۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَO اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَO

(سورۃ الاعراف، آیت ۲۰۵۔ ۲۰۶)

اور (آپ ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ) اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام (یعنی علی الدوام) اور اہلِ غفلت میں شمار مت ہونا یقیناً جو (ملائکہ) تیرے رب کے نزدیک (مقرب) ہیں وہ اس کی عبادت سے (جس میں اصل عقائد ہیں) تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (جو کہ طاعتِ لسانی ہے) اور اس کو سجدہ کرتے ہیں (جو کہ اعمالِ جوارح سے ہے)۔

اپنے دل میں خدا کو یاد کرنا تضروع کے ساتھ بلا جہر کے تزکیۂ نفس کے لیے بہت اچھا مراقبہ ہے۔ ایسا کرنے سے خود بخود غفلت دور ہوجاتی ہے۔ خدا کو یاد کرنے میں خدا کی نعمتوں کا استحضار کرتے رہنا بھی ہے جو ہر وقت ہمیں عطا ہوتی رہتی ہیں۔ عام نعمتیں بھی جس سے چند معذورین کے علاوہ سب بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں اور خاص نعمتیں بھی جن کا ذرا سے تامل سے پتا چل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری طرف سے جو تقصیر ہوتی رہتی ہے یا کفرانِ نعمت ہوتا رہتا ہے، اس کا استحضار بھی اللّٰہ تعالیٰ ہی کو یاد کرنا ہے۔ روزانہ صبح جاگنے پر اور رات کو سونے سے قبل یا کوئی اور وقت مقرر کرکے ان باتوں کا استحضار کرتے رہنے سے آدمی کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں دعا کرنے کے آداب اور دعا کی قبولیت کے آثار بھی بتلائے گئے ہیں۔ معتدین اور مفسدین میں سے رہنا اور دعا قبول ہونے کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسا محال کے موجود ہونے کی تمنا کرنا اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے لوگوں کو نہ دعا کی توفیق ہوتی ہے (مگر سرسری طریقے سے جیسے خدا حافظ کہہ دیا) اور نہ اس کے قبول ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں محسنین کو خوش خبری بھی ہے اور ایک مزید ادب سکھایا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ جس چیز کے لیے ہم نے (حدود کی پابندی کرتے ہوئے اور ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے) دعا مانگی ہے اس پر ہمارا حق ہوگیا بلکہ اللہ کی رحمت پر بھروسا رکھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے (یہ باتیں آیات نمبر۵۵ اور ۵۶ میں ہیں)۔ ان آیاتِ کریمہ میں ذکر کے آداب بتائے گئے ہیں جو وہی ہیں جو دعا کے آداب ہیں۔ دراصل دعا عبادت کی ایک شکل ہے الدعا مخ العبادۃ اور ذکر بھی عبادت ہے اور عاجزی اور اس کا اظہار بندے کا امتیاز ہے۔ لہٰذا جو لوگ خدا کے نزدیک ہیں یعنی جن کو خدا نے اپنے ہاں اعلیٰ مراتب عطا کیے ہیں وہ زیادہ عاجزی کرتے ہیں اور زیادہ تسبیح کرتے ہیں اور زیادہ سجدہ کرتے ہیں جو عبادت اور تسبیح کی اعلیٰ ترین ہیئت ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (سورۃ الانفال، آیت ۱)

یہ لوگ آپ سے (خاص) غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں اور رسول کی ہیں سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا (واصلحوا...) مابینکم فی .... فلیؤد الغنی الی الفقیر والقوی الی الضعیف والشاب الی الشیخ۔

اصلاحِ معاملات اتنی اہم ہے کہ اسے دو بنیادی اور اہم اصولوں کے درمیان بیان فرمایا یعنی ''اللہ سے ڈرو'' اور ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' کے درمیان، جس طرح رشوت کی ممانعت کو روزہ کے احکام کے درمیان بیان فرمایا گیا۔

بلکہ اصلاحِ معاملات جامع ہے اور رشوت سے بچنا فرع ہے اس لیے یہاں زیادہ بنیادی باتوں کے درمیان ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۝ (سورۃ الانفال، آیت ۲)

(کیوں کہ) بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کردیتی ہیں۔

جب مومنوں کی یہ شان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر ان کے سامنے کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں تو بڑے ہی شرم کی اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ اگر انسان کے قلب میں اس وقت بھی کوئی حرکت نہ ہو جب وہ خود اللہ تعالیٰ کا ذکر نماز میں کر رہا ہو۔ یا نماز کے علاوہ ذکر کر رہا ہو۔ اسی طرح جب تلاوت کی جا رہی ہو نماز میں خواہ غیر نماز میں تو ایمان میں اضافہ محسوس ہونا چاہیے خصوصاً جب آدمی خود تلاوت کر رہا ہو اور اگر ایسا محسوس نہیں ہوتا تو ذکر اور تلاوت کا کچھ حق ادا نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حق ادا ہوا نہ محبت کا۔ فاستغفروا اللہ واعوذ بہ من ذلک۔

اور یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جب آدمی توکل کے اس معیار پر پہنچ جائے

کہ جو کچھ ہو رہا ہو اسے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھے اور اپنے نفع نقصان کو کاملاً بلاشرکتِ غیرے اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں سمجھے۔

كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ○ (سورۃ الانفال، آیات نمبر ۵، ۶)

جیسا آپ کے رب نے آپ کے گھر (اور بستی) سے مصلحت کے ساتھ آپ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھتی تھی (اور) وہ اس مصلحت (کے کام) میں بعد اس کے کہ اس کا ظہور ہوگیا تھا (اپنے بچاؤ کے لیے) آپ سے (بطور مشورہ) اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکے لیا جاتا ہے۔

غالباً یہ منافقوں کے حق میں ہے کیوں کہ وہ بھی بظاہر مومنین ہی کے زمرے میں تھے یا بہت کمزور ایمان والوں کے بارے میں ہے ورنہ رسول ﷺ سے مجادلہ کرنا اس معاملے میں کمالِ کم فہمی اور بے ادبی ہے۔ معلوم ہوا کہ مومنین کا لفظ بھی کبھی بالکل عام معنی میں پوری مسلمان قوم کے لیے بولا جاتا ہے۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ○ (سورۃ الانفال، آیت ۱۲)

(اُس وقت کو یاد کرو) جب کہ آپ کا رب (اُن) فرشتوں کو حکم دیتا تھا کہ میں تمھارا ساتھی (مددگار) ہوں سو (مجھ کو مددگار سمجھ کر) تم ایمان والوں کی

ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رعب ڈالے دیتا ہوں سو تم (کفار کی) گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور کو مارو۔

ثابت ہوا کہ ملائکہ کی قوت بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ارادے کی محتاج ہے یعنی قوت اصل ان میں بھی ویسی ہی مفقود ہے جیسی انسان میں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ○

(سورۃ الانفال، آیت ۲۲)

بے شک بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں گونگے ہیں جو کہ ذرا نہیں سمجھتے۔

اس سے پہلے آیت نمبر۲۱ اور نمبر۲۲ میں ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے منھ مت پھیرو جب اس کی بات سن رہے ہو یعنی گوش وقلب کو حاضر رکھو تا کہ حکم سمجھ سکو اور اس پر عمل کرسکو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور درحقیقت وہ سن نہیں رہے ہوتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں ان کی مثال بیان فرمائی گئی ہے، یعنی غور سے نہ سننا یا سنی اَن سنی کردینا، بہرے اور گونگے ہوجانے کی ہے کہ اسے کچھ بھی کہتے رہو، وہ سمجھتا ہی نہیں۔
گرچہ یہ مثال کافروں اور منافقوں کے لیے ہے لیکن مسلمان اگر قرآن شریف سنتے وقت یا تلاوت کرتے وقت اس کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ اس کی انتہائی بدنصیبی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ○ (سورۃ الانفال، آیت ۲۴)

اے ایمان والو تم اللہ اور رسول(ﷺ) کے کہنے کو بجا لایا کرو جب کہ رسول(ﷺ) تم کو تمھاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب کے درمیان میں اور بلاشبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

جس کام کے لیے بھی اللہ اور اس کے رسولﷺ کا حکم ہو اس پر دل و جان سے لبیک کہنا دل کی زندگی اور تازگی کا سبب ہوتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو بخوبی معلوم ہے کہ کس نے دل و جان سے لبیک کہا ہے اور اطاعت کا ارادہ کیا ہے۔ کیوں کہ وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان کا احاطہ رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم بیان ہو رہا ہو تو اس کو سننا اور قبول کرنا بھی دل کی زندگی کا سبب ہوتا ہے۔ خواہ بعد میں اس پر عمل کر سکے یا نہ عمل کر سکے صرف سن لینا اور اطاعت کا ارادہ کر لینا ہی قلب کی صلاحیت کو درست کرنے کی خاصیت رکھتا ہے۔ یہاں مخاطب مومنین ہیں کیوں کہ ان کے قلوب میں تھوڑی یا بہت جان موجود ہے اور ہر مومن کے قلب میں ایمان ہے خواہ کمزور ہی سہی۔ ورنہ جن کے قلوب پر مہر لگ چکی ہے ان کو استجابت کی توفیق ہی نہیں ہوتی جیسا اگلی آیتِ کریمہ میں ہے کہ ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جو کہتے ہیں، سمعنا لیکن وہ سنتے نہیں ہیں۔ ہر مومن کے قلب میں کچھ نہ کچھ صلاحیت موجود رہتی ہے۔ اگر اس نے اس سے کام لیا تو وہ صلاحیت بڑھتی ہے اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی بات سن کر اس کی طرف دل متوجہ نہیں ہوا یا اس نے ان باتوں کی تاویلات شروع کردی تو وہ اس حیات بخش دعوت سے محروم رہتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(سورۃ الانفال، آیت ۲۸، ۲۹)

اور تم اس بات کو جان رکھو کہ تمھارے اموال اور تمھاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے اور اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا بھاری اجر (موجود) ہے۔ اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلے کی چیز دے گا اور تم سے تمھارے گناہ دور کرے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

فتنہ بمعنی امتحان کے ہیں اور ہر امتحان میں پاس ہونے پر اجر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا اجر ہے۔ اپنی ملکیت میں اور اپنے زیرِ اثر جو کچھ بھی ہے اس کو آزمائش سمجھتے رہنا چاہیے۔

اموال اور اولاد کا فتنہ دو طرح پر ہے ایک تو یہ کہ ان کا اثر تمھارے اوپر کیا ہوتا ہے اور اپنی اقدار (values) اور زندگی میں تم کس چیز کو کتنی اہمیت دیتے ہو (یعنی attitude of life) اس پر ہے، مثلاً ان کے ساتھ اتنا انہماک تو نہیں ہے کہ تم اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتے ہو (لاتلھکم ...عن ذکر اللہ ...) یا ان کی وجہ سے تم میں عجب اور کبر تو نہیں آجاتا یا اپنی اولاد کی اصلاح سے (واصلح... ذریتی) غافل تو نہیں ہوجاتے۔ دوسرے یہ کہ تمھارا معاملہ ان کے ساتھ کیسا رہتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہو یا انفاق لیصدوا عن سبیل اللہ کرتے ہو اور چونکہ یہ معاملات سخت ہیں اور حقوق مال و اولاد کا ادا ہونا بغیر فضلِ خداوندی کے محال ہے، اس لیے آگے نسخہ بھی بیان فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمھیں فرقان یعنی نیکی و بدی کی تمیز عطا کریں گے جس سے حقوق شناسی اور حقوق کے حدود کا علم ہوگا کہ کس طرح اگر ان میں تضاد پیدا ہوجائے تو اس کو دور کرو، یعنی وہ تمھیں اس کی صلاحیت عطا فرمائیں گے کہ متضاد حقوق کو ان کے حدود کے اندر کس طرح ادا کرو، power of resolving conflicting demands عطا فرمائیں گے اور سیئات کو دور فرمائیں گے جس سے تم اپنی شامتِ اعمال میں نہیں پڑو گے نیز گناہ سے blurred vision کا مرض پیدا ہوجانا لازمی ہے یعنی نگاہ دھندلی ہوجاتی

ہے اور جب شامتِ اعمال دور ہوجاتی ہے تو نگاہ بھی تیز ہوجاتی ہے اور تمھارے گناہوں کو معاف فرمائیں گے اور وہ فضلِ عظیم والے ہیں۔ فالحمد اللہ۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (سورۃ الانفال، آیت ۵۲-۵۳)

ان کی حالت ایسی ہے جیسے فرعون والوں کی اور ان سے پہلے کے (کافر) لوگوں کی حالت تھی کہ انھوں نے آیاتِ الٰہیہ کا انکار کیا سو خدا تعالیٰ نے ان کے (ان) گناہوں پر ان کو پکڑ لیا بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے سخت سزا دینے والے ہیں یہ بات اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کی تفسیر میں فرمایا ہے ''بترک الشکر'' شروع شروع میں جو نعمت ملتی ہے تو ایک سلیم الفطرت آدمی اس کا شکر ادا کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد آدمی اس کا عادی ہوجاتا ہے اور بہت سے لوگ شکر ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہ نعمت سلب ہوجاتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ جب تک ایک قوم نعمتیں کا شکر ادا کرتی رہی ان کو منجانب اللہ سمجھ کر اور ان کا صحیح استعمال کرتی رہی اس وقت تک وہ ترقی کرتی رہی پھر جب وہ عیش وعشرت اور فسق و فجور میں پڑ گئی تو وہ نعتیں چھن گئیں۔ نعمتوں کا سلب ہونا اور عذاب میں مبتلا ہونا بہت لمبے عرصے میں بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ فراعنۂ مصر کی کئی پشتیں حکومت کرتی رہیں اور کفر وفسق میں مبتلا رہیں لیکن

جب بالآخر نعمتیں سلب ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک آنِ واحد میں ہوگیا۔ جو قوم خدا کی نافرمانی میں مبتلا رہتی ہے اس کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ نہ معلوم کب اللّٰہ تعالیٰ اپنی نعمتیں چھین لیں اور کب عذاب آجائے اور فوراً توبہ کرنا چاہیے۔

سورۂ رعد کی آیت نمبر ۱۱ میں کچھ مختلف الفاظ ہیں یعنی لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیر وا...

بادی النظر میں اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جب تک قوم اپنی حالت کو سدھارنے کا کام نہیں کرے گی، اس کی حالت اللّٰہ تعالیٰ نہیں سدھارے گا۔ بقول شاعر:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لیکن حضرت تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے... واقعی اللّٰہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور معارف میں اس شعر کے بارے میں ہے کہ اگرچہ یہ بات ایک حد تک درست ہے مگر اس آیت سے یہ بات نہیں نکلتی۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الانفال، آیت ۶۰)

اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہوسکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعے سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللّٰہ کے دشمن ہیں اور تمھارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے ان کو اللّٰہ ہی جانتا ہے اور اللّٰہ کی راہ میں جو چیز بھی خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا دے دیا جاوے گا اور تمھارے لیے کچھ کمی نہ ہوگی۔

قوۃ گرچہ یہاں پر وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اپنی جسمانی قوت کوحتی الوسع بڑھانا اور ہمت، شجاعت، قوتِ بطش اور قوتِ مدافعت کو بڑھانا بھی اس میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ ۭ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○ (سورۃ الانفال، آیت ۶۲، ۶۳)

اور اگر وہ لوگ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہیں اور وہی ہے جس نے آپ کو اپنی (غیبی) امداد (ملائکہ) سے اور (ظاہری امداد) مسلمانوں سے قوت دی اور ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کردیا اور اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کرسکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں باہم اتفاق پیدا کردیا بے شک وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

اس حکمت اور قدرتِ خداوندی کا اعجاز ہے کہ آج بھی جب ہماری قوتِ ایمانی اتنی کمزور ہوگئی ہے ہم میں اس حد تک دلی یگانگی اور اتحاد ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں پر ظلم ہو ہم ان کی مدد کے لیے تڑپنے لگتے ہیں۔ اور اسلام ہی کا نام لے کر ہم نے پاکستان بنا لیا۔ یہاں سے یہ بات بھی اشارتاً معلوم ہوتی ہے کہ جب تک پختہ طور پر مومن نہیں ہوجاتے ہمیں وہ اتحاد میسر نہیں آسکتا جو ایک ابھرتی ہوئی قوم کے لیے ضروری ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ ۭ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا ڰ وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ

حَكِيْمٌO لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌO (سورۃ الانفال، آیت ۶۷، ۶۸)

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خوں ریزی نہ کرلیں، تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑے حکمت والے ہیں اگر خدائے تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔

یہ دنیا کا چاہنا اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی بے سرو سامانی دور ہو اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا۔ اس کی وجہ بھی بتا دی گئی کہ واللّٰہ یرید الآخرۃ یعنی تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کو آخرت کی بھلائی پسند ہے۔ جن صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فدیہ لے کر چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا ان کے نزدیک بھی صرف مسلمانوں کی فلاح ملحوظ تھی۔ ہماری طرح کا دنیا چاہنا نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں تھی کہ ایسے بے نفس اصحاب الرائے اس معاملے میں مسلمانوں کی فلاحِ آخرت کی فکر کرتے اور ان کی فلاحِ دنیوی کو ثانوی حیثیت دیتے۔ اور اس وقت کافروں کو قتل کر دینے میں دین کا غلبہ زیادہ یقینی تھا اگرچہ مسلمانوں کی خوش حالی شاید کچھ اور عرصے کے لیے متاخر ہوجاتی۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اگر دنیا کا کوئی فائدہ چھوڑنا پڑے، آخرت کے فائدے کے لیے تب بھی دنیا کا فائدہ چھوڑنا ضروری ہے کیوں کہ آخرت کا تھوڑا فائدہ بھی دنیا کے بہت فائدے سے زیادہ ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی سفاہت بھی معلوم ہوئی جو مسلمانوں کے دنیوی فائدے کے لیے ان کے دین کے فائدے کو نظر انداز کردیتے ہیں اور شریعت کے حکم کو مصلحتِ وقت کا بہانہ کرکے ٹال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین سے محفوظ رکھے۔ جب قوم کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے تو اپنی مصلحت کے لیے قوم کو گمراہ کرنا تو اور بھی بہت بڑا جرم ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی متوقع فائدہ نہ پہنچے تو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں آخرت میں اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ یثخن فی الارض اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے جو موجودہ دور کے دانش مندوں اور ترقی پسندوں (liberal thinkers اور rational) کے نزدیک مکروہ ہے۔ جیسے بہت سے لوگ سزائے موت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کی غرض وابستہ ہو تو بے دریغ بمباری اور دہشت گردی سے نہیں چوکتے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (سورۃ الانفال، آیت ۷۵)

اور جو لوگ (ہجرتِ نبویہ کے) بعد کے زمانے میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ جہاد کیا سو یہ لوگ (گو فضیلت میں تمھارے برابر نہیں لیکن تاہم) تمھارے ہی شمار میں ہیں اور جو لوگ رشتے دار ہیں کتاب اللہ میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

یہاں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بعد میں قیامت تک جو لوگ ہجرت کریں گے وہ بھی ایک لحاظ سے مہاجرینِ اوّلین کے ساتھ ہوں گے جیسا ارشادِ نبوی ہے، انت مع من احببت۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (سورۃ الانفال، آیت ٦٧)

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیے
جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کر لیں
تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو
چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران آیت ۱۵۳ بھی دیکھیں۔ وہاں منکم من یرید الدنیا ہے اور یہاں تریدون عرض الدنیا ہے۔ غالباً یہاں اکثر صحابہؓ کی یہی رائے ہوگی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے اور اسی پر فیصلہ ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ یہ قوم آخرت اور صرف آخرت کو پسند کرے اور اس کا حکم دیا کہ آخرت ہی پسند کرو اور دنیا ان کو اپنی مصلحت کے مطابق محض اپنے فضل سے اتنا عطا فرمائی کہ اگر سب جان توڑ کر بھی کوشش کرتے تو اس کا عشرِ عشیر حاصل نہیں کر سکتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال، آیت ۲۷)
اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور اپنی قابلِ
حفاظت چیزوں میں خلل مت ڈالو اور تم تو اس کا (مضر ہونا) جانتے ہو۔

حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی کی اعلیٰ اور احسن ترین تعلیم دی جا رہی ہے۔
حق دار کا حق اس تک نہ پہنچانا خیانت ہے اور حق دار کا حق اس تک پہنچا دینا امانت کا ادا کرنا ہے۔ (... یامرکم ان تؤدوا)
اللہ اور رسول کا حق پہچانو اور ان میں خیانت نہ کرو اور آپس میں ایک دوسرے کا حق پہچانو اور ان کی ادائیگی میں خیانت نہ کرو۔ ان حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر وقت ہم سے کسی نہ کسی حقِ واجبہ کی ادائیگی کا مطالبہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ

مال اور اولاد بھی ہمارے لیے آزمائشیں ہیں اور مال کو ہم بالکلیہ اپنا مال نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ اس میں بھی دوسروں کے حقوق ہیں اور اولاد کو بھی ہم اپنی ملکیت کلی نہیں سمجھ سکتے، اس لیے کہ اولاد کے بھی ہم پر حقوق ہیں۔ اس لیے دونوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ نیز اس لیے بھی ذکر فرمایا (منجملہ اور بے شمار مصلحتوں کے جن کا احاطہ نہیں ہوسکتا) کہ مال اور اولاد میں پھنس کر انسان اللہ اور اس کے رسول کے حق کو اکثر بھول جاتا ہے۔ لہٰذا جو صاحبِ مال اور صاحبِ اولاد ہے اور اس کے باوجود تمام حقوق کو ادا کرتا ہے اور ان کی ادائیگی میں خیانت نہیں کرتا، اس کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا گیا۔

ان حقوق میں کبھی ایک دوسرے میں تضاد بھی نظر آتا ہے۔ کبھی حقوق کے حدود صاف طور پر واضح نظر نہیں آتے، لہٰذا اگر کسی کو حقوق کی ادائیگی کا احساس بھی ہو تو اس کے لیے مشکل پیش آجاتی ہے کہ کس طرح توازن برقرار رکھا جائے۔ لہٰذا فرقان عطا فرمانے کا وعدہ بھی کیا گیا جس سے حق و باطل میں باریک سے باریک فرق بھی نظر آنے لگتا ہے اور حدود واضح ہوجاتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۶)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہر طور پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے (ایسے موقع پر) جہاد کیا اور اللہ اور رسول (ﷺ) اور مومنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمھارے سب کاموں کی۔

یعنی عمل سے ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس کی راہ میں جان و مال لگانے کو تیار ہو اور اس کے مقابلے میں کسی کو دوست نہیں بنا سکتے اور عمل بھی ایسا ہو جو ریا سے پاک ہو

کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے پورے پورے واقف ہیں۔ ان کو سب خبر ہے کہ کون سا عمل تم نے کس نیت سے کیا۔

اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۸)

ہاں اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں اور نماز کی پابندیں کریں اور زکوٰۃ دیں اور بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں سو ایسے لوگوں کی نسبت توقع (یعنی وعدہ) ہے کہ اپنے مقصود تک پہنچ جاویں گے۔

مومن کی محبت تو ساری مخلوق اور سارے جہان کے لیے ہے اگر سب کا منبع محبت خالق ہے تو سبحان اللہ۔ اگر ساری محبتوں سے زیادہ شدت کے ساتھ خدا کی محبت دل میں ہے تب بھی نجات کی توقع ہے لیکن خشیّت کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ صرف خدا کا خوف ہو۔ کسی دوسرے کی خشیّت کی ذرّہ برابر بھی دل میں گنجائش نہ ہو۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''وہی آباد کرے مسجدیں اللہ کی جو یقین لایا اللہ پر... اور نہ ڈرا سوا اللہ کے کسی سے...''

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۹)

کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجدِ حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو

اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک اور جو لوگ بے انصاف ہیں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ نہیں دیتا۔

معلوم ہوا کہ عادتاً اور رسماً کی جانے والی نیکیاں ایمان اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل چیز تو ایمان باللہ والیوم الآخرۃ ہے۔ اگر ایمان ہی نہیں تو حاجیوں کو پانی پلانا یا اللہ کا گھر بنانا کس کام کا۔ مشرکین بھی سمجھتے تھے کہ یہ مسجدِ حرام ہے اور سب سے بڑے معبود کا گھر ہے لیکن جب تک اور معبودوں کا انکار نہ کیا جائے اور ان کی پرستش نہ چھوڑی جائے اس وقت تک سب سے بڑے معبود کا اقرار بالکل بے معنی ہے۔ شرک اور توحید میں کہیں پر بھی جمع ناممکن اور محال ہے اور ایمان اگر ہو تو جہاد فی سبیل اللہ لازمی ہے۔ ناممکن ہے کہ انسان ایمان رکھتا ہو اور ادنیٰ درجے میں بھی جہاد نہ کرتا ہو۔ اللہ کے لیے، ورنہ روٹی کے لیے تو سب ہی جدوجہد کرتے ہیں۔

اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے یعنی مشرکوں کو ہدایت نہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ بہت سے مشرکین بعد میں ایمان لائے بلکہ میرے ناقص فہم میں یہ ہدایت سے محرومی، فہم و فراست سے محرومی ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور شرک اور فہمِ سلیم میں by defenition (یعنی دونوں الفاظ کی لغوی تعریف میں) بُعدِ عظیم ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ (ن) اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۲۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور

تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترکِ ہجرت) کا بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

اس رکوع کو شروع کیا گیا تھا مسجد کی تعمیر یا آبادی کے ذکر سے کہ مشرکوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ مسجدیں بنائیں۔ دوسری آیت میں ذکر تھا کہ مساجد کی تعمیر مومنوں ہی کو زیب دیتی ہے جن کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس آیتِ کریمہ میں محبت کی معراج کا ذکر کرکے رکوع ختم کردیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیتِ کریمہ میں ان لوگوں سے (اور اپنے ان اعزا و اقارب سے) دوستی کو منع فرمایا گیا تھا جو کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ یہاں تفصیلاً تمام محبتوں کو اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے کم تر درجے پر رکھنے کا حکم ہے اور یہ محبت عقلی محبت ہے جو تھوڑے تامل سے معلوم ہوسکتی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے تھوڑے تامل کے بعد حضور ﷺ سے فرمایا تھا کہ ہاں اب میں آپ ﷺ کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب پاتا ہوں۔ خوف اور خشیۃ کا بھی یہی معاملہ ہے کہ عقلی خشیۃ مقصود ہے ورنہ طبعی ڈر تو آدمی کو شیر سے بھی لگتا ہے، سانپ سے بھی لگتا ہے اور ظالم حاکم سے بھی لگتا ہے لیکن جب خدا کی نافرمانی کا سوال آتا ہے اور اس کی ناراضگی کا خوف ایسا ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی کی ناراضگی یا ایذا رسانی کا خوف ختم ہوجاتا ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کتنا عقلی مذہب ہے اور عقل کا کیا مقام اسلام میں ہے۔ جب تک اس کی طبعی خواہشات عقل کے تقاضوں پر غالب رہتی ہیں، اس وقت تک انسان مومن کے زمرے میں شامل نہیں ہوتا۔ کچھ اور طبعی تقاضوں کا ذکر قرآن شریف میں ''... حب الشھوات من...'' میں ہے۔ یہ تقاضے ایمان کے سامنے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اعتقاداً آدمی یہ

سمجھ لے کہ یہ سب چیزیں چند روزہ ہیں واللّٰہ عندہ حسن ماب۔ لیکن ایمان کی کمزوری کی وجہ سے وہ اکثر نفس کے تقاضوں سے مغلوب ہوکر اس طرح کے فیصلے معاملات میں کرتا ہے جیسے اس کی طبیعت چاہتی ہے۔ یہ درجہ بہت خطرناک ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے کہ آدمی عقل کے تقاضوں کو طبیعت کے تقاضوں پر غالب کر کے ایسے اعمال کرتا ہے جیسے اللّٰہ اور رسول کا حکم ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ وہ ہے کہ ایسی محبت اللّٰہ اور اس کے رسول کی دل میں پیوست ہوجاتی ہے اور اس کی راہ میں جان دینے کا ایسا شوق پیدا ہوجاتا ہے کہ طبیعت کے تقاضے بدل جاتے ہیں، کوئی قربانی بڑی نہیں معلوم ہوتی ہے اور کوئی تکلیف اللّٰہ کی راہ میں نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس میں لذت آتی ہو۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے درجہ نمبر۲ پر بہت مشق کی ضرورت ہے۔ لیکن کوشش کے بعد آدمی کو خدا کے فضل کا منتظر رہنا چاہیے۔ اللّٰہ تعالیٰ کوشش کرنے والے بندے کے دل میں اپنی محبت جلد یا بدیر ڈال ہی دیتے ہیں۔ یہ درجہ محض وہبی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۳۸، ۳۹)

اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللّٰہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کرلی سو دنیاوی زندگی کا تمتع تو آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللّٰہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا (یعنی تم کو ہلاک کردے گا) اور تمھارے بدلے دوسری قوم پیدا کردے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اللّٰہ (کے دین) کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے اور اللّٰہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

معلوم ہوا کہ تنگی و محتاجی کے ڈر سے خدا و رسول کے احکام پر عمل نہ کرنا بہت ہی بیوقوفی کی بات ہے اور ایمان کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے اور جو خطرہ مکہ والوں کو مشرکین پر حج کے دروازے کو بند کرنے سے لاحق تھا کہ ان کی معیشت کا تقریباً تمام تر دارو مدار ان ہی لوگوں سے حاصل شدہ آمدنی پر تھا وہ خطرہ آج بحمد اللہ کسی بھی مسلمان ملک کی معیشت کو نہیں ہے۔

''ان شآء'' یا تو حاکمیت کی یاد دہانی کے لیے ہے کہ ان پر کوئی بات بھی واجب نہیں اور ان سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں امر فرمایا خواہ وہ امر تکوینی ہو خواہ تشریعی یا اس لیے کہ اگر دنیا میں غنیٰ حاصل نہ بھی ہوا اور فقیر کے فقیر ہی رہیں اور رزق کا ایک دروازہ بند ہو اور دوسرے دروازے نہ کھلیں تو یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہوگا کیوں کہ ان کو ہماری مصلحتیں ہم سے زیادہ معلوم ہیں اور ان کی طرف سے وہی حکم ہوگا جس میں ہماری بھلائی ہوگی۔

دوسری آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ ''قوم'' لوگوں کے مختلف گروہوں یعنی مجموعوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل قوم الفاسقین کا ذکر آیت نمبر۲۴ میں تھا۔ کبھی ایسے لوگوں کے مجموعے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اعمال و افکار و اقدار کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کبھی ملک یا قریہ کی بنا پر ہوتا ہے جیسے قومِ نوحؑ سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو ان پر ایمان لائے بلکہ وہ ہیں جو ان کے مخاطب تھے۔ اسی طرح قومِ لوطؑ اور مدین کے لوگوں کا ذکر ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا

يُشْرِكُوْنَ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۳۰-۳۳)

اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کے عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کا قول ہے، ان کے منہ سے کہنے کا۔ یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔ خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر الٹے جارہے ہیں انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود (برحق) کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔ وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللّٰہ کے نور (یعنی دینِ اسلام) کو اپنے منھ سے بجھا دیں حالانکہ اللّٰہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں (چنانچہ) وہ اللّٰہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کردے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں کہ اصل تعلیماتِ الٰہی پر پردہ پڑ جائے اور لوگ مغالطہ اور بھول بھلیوں (confusions) میں مبتلا ہو جائیں۔ گرچہ یہود اور نصاریٰ دونوں خدا کے الگ الگ بندوں کو اس کا بیٹا کہہ رہے تھے مگر جو بات ان دونوں میں قدرِ مشترک تھی وہ جھوٹ کو پھیلانا تھا تاکہ سچ دب جائے۔ اسی لیے دو جگہ قالت کا لفظ استعمال فرمایا گیا اور ''بافواھھم'' کا لفظ لایا گیا۔ اس زمانے میں منھ کی پھونک سے چراغ بجھایا جاتا تھا۔ لیکن اللّٰہ تعالیٰ کا ارادہ تھا کہ حقیقت پر سے شکوک اور ابہام اور ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا پردہ اٹھ جائے اور انسانوں کو واضح روشنی اور مکمل ہدایت مل جائے۔ جو قرآن شریف کے نزول سے حاصل ہوئی۔ اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ جلد ہی اسلام کا

غلبہ تمام ادیان پر ہوگیا۔ مسلمان دوسرے تمام مذاہب کے ماننے والوں پر غالب آگئے اور دوسرے ادیان کے پیروکار اسلام کی سچائی کے معترف ہوکر جوق در جوق اس دینِ حنیف میں داخل ہونے لگے، بلکہ اس طرح بھی یہ بات پوری ہوئی کہ قیامت تک کے لیے اس دین کی فوقیت دوسرے تمام دینوں پر مسلّم ہوگئی۔ اور آج جب کہ اکثر مسلمان اپنے دین کو عملی طور پر چھوڑ چکے ہیں (اور اسی لیے ہم انھیں دوسرے لوگوں سے مغلوب دیکھتے ہیں اور دوسرے دین کے لوگوں کو اس میں جوق در جوق داخل ہوتے ہی نہیں دیکھتے ہیں) تب بھی تمام ادیان میں اسلام ہی کو دینِ کامل سمجھا جاتا ہے، مثلاً عیسائیت میں گرجا اور سلطنت کی حکومتیں الگ الگ سمجھی جاتی ہیں اور گرجا کی حکومت کا مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جس مفہوم میں ہم خدا کی حکومت یا اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے عیسائی عوام گرجا کی حکومت (یعنی theocracy) سے ڈرتے ہیں اور اس سے متنفر ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کے مذہب میں جو داخل کرو سب ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ وہ محض ایک سماجی تنظیم (social order) ہے اور اب تو یہ سماجی تنظیم بھی نہیں ہے۔ اسی طرح عبادت کا مفہوم اور خدا سے صحیح تعلق اور اس کے مقتضیات کا تصور (concept) اگر کسی بھی دین میں پایا جاتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور اس بات کے معترف دشمنانِ اسلام بھی ہیں۔ اس معنی میں آج بھی یہ دین تمام دینوں پر غالب ہے۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۴۶)

اور اگر وہ لوگ (غزوہ میں) چلنے کا ارادہ کرتے تو اس کا کچھ سامان تو درست کرتے لیکن (خیر ہوئی) اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لیے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکمِ تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو۔

ویسے تو مخلوقات کا ارادہ بھی خالقِ کائنات کے ارادے کے تابع ہے لیکن

یہاں قوانینِ فطرت میں سے ایک اہم قانون بیان ہوا ہے کہ اگر وہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو نکلنے کی تیاری کرتے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا کام ارادہ کرنا ہے اور پھر اس کے لیے حتی المقدور کوشش کرنا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ارادہ کسی substantial form میں ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس کا یہ ارادہ ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل (مثلاً جہاد یا قتال کے لیے جانا) کا ارادہ نہ کرے اور کسی طرح کی کوشش نہ کرے تو وہاں خدا کی طرف سے حکم ہو جاتا ہے کہ اب بیٹھ گئے ہو تو بیٹھے رہو۔ پھر اٹھنے کی سبیلیں خود بخود مسدود ہوتی جاتی ہیں۔

اس واقعے میں جس کا یہاں ذکر ہے ایسا کیوں ہوا اور کیوں انھیں کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہو بیٹھنے رہنے والوں کے ساتھ؟ رسول کی دشمنی کی وجہ سے جو ان لوگوں میں تھی۔ چونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے، اس لیے اللہ کو اچھا نہ لگا کہ وہ بھی مجاہدین کے گروہ میں ظاہرہ طور سے بھی شامل رہیں۔ یہی ان کے بیٹھے رہنے کا سبب بنا۔ اسی بات نے انھیں ارادہ کرنے سے بھی مجبور کر دیا۔ منافق ہونے کے باوجود وہ ارادہ کر سکتے تھے کہ نفاق چھپانے کے علاوہ کم از کم پھوٹ ہی ڈالیں گے۔ لیکن ارادہ پر بھی اللہ تعالیٰ کو پوری قدرت ہے اور جب بیٹھے رہنے کا حکم ہو گیا تو وہ پھر ارادہ کہاں کر سکتے تھے۔ ان کا عذر کہ مجبوریاں تھیں، ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ انھوں نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ اگر ارادہ کرتے تو کچھ تو جانے کی تیاری کرتے۔

رہی یہ بات کہ انھوں نے رسول ﷺ سے دشمنی ہی کیوں کی اور یہی بات ان کے مقدر میں کیوں لکھی گئی تو یہ تکوینی امور ہیں۔ ہر نبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے عدوا شیطین الجن والانس پیدا فرمایا اور شاید اب صدیقین اور مجددین کے لیے بھی ایسا ہوتا ہو۔ اسی طرح ایسے لوگوں کا نام بھی مقدر ہو جاتا ہے جو اس کے ساتھی ہوں گے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی قدرت، علم، جبروت و وحدانیت کی معرفت ہوگی وہ ہر وقت اس سے ڈرتا رہے گا اور اس کے سامنے گڑگڑاتا رہے گا اور جاہلوں کی طرح اپنی خرابیوں کو قسمت پر نہیں ٹالے گا۔ کوئی بھی آگ میں گرنے کے بعد قسمت کا حوالہ دے کر اس میں بیٹھا

نہیں رہتا بلکہ فطری حکم سے مجبور ہوکر اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو ''بخشی'' کے گروہ میں شامل ہوگیا وہ ''اشقیٰ'' کے گروہ سے الگ ہوگیا۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْ اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ O(سورۃ التوبہ، آیت ۴۷)

اگر یہ لوگ تمھارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوائے اس کے کہ اور دونا فساد کرتے اور کیا ہوتا اور تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں اور ان ظالموں کو اللہ خوب سمجھے گا۔

منافقین کے نہیں جانے میں جو تکوینی مصلحت تھی اس کا یہاں ذکر ہے کہ اگر وہ تمھارے ساتھ جاتے تو تمھارا نقصان ہی تھا کیوں کہ ان کے اندر کافروں اور مشرکوں کے جاسوس ہیں۔ ان کا جہاد میں نہ جانا، ان کے لیے خسرانِ دنیا اور آخرت کا سبب بنا اور مسلمانوں کے لیے ان کی چالوں سے محفوظ رہنا مفید رہا۔ اسی طرح ظاہری سبب اور مسبب (cause and effect) کا سلسلہ اور تکوینی احکامات کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O(سورۃ التوبہ، آیت ۵۱)

آپ فرما دیجیے ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہییں۔

اللہ تعالیٰ کے لیے ماضی، حال، مستقبل سب ایک ہے لہٰذا یہ کہنا کہ جو اللہ نے لکھ دیا ہے وہی ہوگا یا یہ کہنا کہ جو اللہ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے یا یہ کہنا کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا بغیر اس کی مرضی کے کچھ نہیں ہوگا، سب ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ زمان و مکاں کے خالق ہیں۔ جب انھوں نے اپنی قدرت کا کرشمہ ایسا دکھا دیا کہ اپنے ایک بندے کو کچھ دیر کے لیے زمان و مکاں کی قید سے آزاد کردیا تو پھر اس نکتے کے سمجھنے میں کوئی دقّت نہیں رہ جاتی۔

اس ایک رکوع میں اور اس ایک واقعے کے ضمن میں اسباب کا بھی ذکر آ گیا اور تقدیر کا بھی پھر ظاہری اسباب کا بھی ذکر ہے ''لاعدوا لہ عُدّۃً'' اور توکّل کا بھی اور ظاہری اسباب کا بھی ذکر ہے اور باطنی اسباب کا بھی۔ پورے رکوع میں کہیں کوئی اشکال یا نعوذ باللہ شک یا ریب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور ویسے یہ باتیں ایسی ہیں کہ تمام عمران کے متعلق گفتگو ہوتی رہے جب بھی معاملہ سلجھانا مشکل ہے۔ کتنی آسانی سے اتنے دقیق مسائل کو ذہن نشین کروا دیا گیا۔ فسبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

فلا تُعجِبکَ اَموَالُهُم وَلَآ اَولَادُهُم ؕ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُم بِها فِی الْحَيٰوةِ الدُّنيَا وتَزهَقَ اَنفُسُهُم وهُم كٰفِرُونَ ○

(سورۃ التوبہ، آیت ۵۵)

سو ان کے اموال اور اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان (مذکورہ) چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں (بھی) ان کو گرفتارِ عذاب رکھے اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جاوے۔

اس عذاب کو ان ہی لوگوں سے پوچھو جو حکومت وسلطنت اور مال و متاع کے باوجود ہر وقت پریشانی اور سراسیمگی اور خوف سے گھرے رہتے ہیں۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۵۶)

اور یہ (منافق) لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں کے ہیں حالانکہ (واقع میں) وہ تم میں کے نہیں لیکن (بات یہ ہے کہ) وہ ڈرپوک لوگ ہیں۔

یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر جھوٹ بات کہہ دے تو اس کو مان لینا چاہیے، یہ بات درست نہیں ہے۔ یہاں منافقوں کے جھوٹے حلف لینے کو رد کردیا گیا اور گرچہ عام طور سے ان سے معاملہ[1] مسلمانوں جیسا کیا گیا لیکن لاتقم علی قبرہ... اور قل لن تخرجوا... سے صاف ظاہر ہے کہ ہمیشہ اور ہر معاملے میں ان سے اغماض نہیں کیا گیا بلکہ جب ضرورت ہوئی فرق بھی برتا گیا۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ''یفرقون'' کا ترجمہ ''ڈرتے ہیں'' کیا ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے تفسیر میں فرمایا ''یخافون من سیوفکم۔'' دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ منافقین رفتہ رفتہ سب کے سب بے نقاب ہوگئے اپنے اعمال کی وجہ سے۔ اسلام کی یہ رحمت تھی کہ ایسوں پر بھی حکمِ ظاہر ہی پر لگایا گیا۔ تمام عمر کی دشمنی کے باوجود عین حالتِ جنگ میں بھی جو ڈر کی وجہ سے بھی تلوار کے نیچے آکر اسلام لے آیا، اس سے باز پرس نہیں کی گئی۔ اس سے دشمنانِ اسلام کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ پوری قدرت کے باوجود اپنے دشمنوں اور اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو صرف کلمہ پڑھ لینے سے معاف کردینا آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر چونکہ خدا کا حکم تھا، اس لیے ایسے لوگ بھی عام رحمتِ خداوندی سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝
(سورۃ التوبہ، آیت ۵۹)

اور ان کے لیے بہتر ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی رہتے جو کچھ ان کو اللہ نے
اور اس کے رسول (ﷺ) نے دیا تھا اور یوں کہتے کہ ہم کو اللہ کافی ہے
آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا اور اس کے رسول (ﷺ)
دیں گے ہم (اوّل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں۔

یہاں چونکہ انفال اور صدقات کا ذکر ہے، اس لیے جو ظاہری دینے والے ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ ان کا کا بھی ذکر ہے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں پر جو بھی اللہ کا فضل ہوا وہ رسول کے واسطے سے ہوا اور رسول کے اتباع سے ہوا۔ اور آئندہ بھی جو ملے گا وہ رسول ہی کی جوتیوں کے طفیل ملے گا۔ جو بھی مالِ غنیمت ہاتھ لگا وہ بھی رسول ﷺ ہی کے طفیل لگا۔ اللہ تعالیٰ دین کو ظاہری شان و شوکت بھی دینا چاہتے تھے اس لیے فتوحات عطا فرمائیں۔ اگر دنیاوی مال و متاع رسول کے طفیل میں اور ان کی اتباع کی بدولت نہیں ملتا تو اس کا خیر ہونا مشکوک ہوتا۔ دنیاوی مال و متاع اور ثروت وعروج بھی واقعی خیر ہوتا ہے اور کبھی ظاہراً خیر ہوتا ہے اور حقیقتاً خیر نہیں ہوتا جیسا آیت نمبر ۵۵ سے واضح ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ
يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۶۲)
یہ لوگ تمھارے سامنے (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کرلیں
(جس میں مال و جان محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ
حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مومنین کی رضا اور اللہ اور رسول ﷺ کی رضا دو چیزیں ہیں، بلکہ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے کہ جن کو خدا اور رسول ﷺ کے رضا کی فکر نہیں

ہے وہ تمھارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں اور یہ جو چکنی چپڑی باتوں سے اور قسمیں کھا کھا کر تمھیں خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ صرف ظاہر داری کی باتیں ہیں اور فریب ہیں۔

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَیَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَO (سورۃ التوبہ، آیت ٦٧)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بری بات (یعنی کفر و مخالفتِ اسلام) کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات (یعنی ایمان و اتباعِ نبوی) سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں انھوں نے خدا کا خیال نہ کیا پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں۔

منافقوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جو لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود برائی کا حکم کریں مثلاً زنا کرنے کی ترغیب دیں اور سچ بولنے سے اور ایمان داری سے منع کریں، وہ منافق ہیں۔ بنیادی طور پر منافق فاسق ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر فاسق منافق ہو۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌO وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُO

(سورۃ التوبہ، آیت ۷۱، ۷۲)

> اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا کہنا مانتے ہیں، ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادرِ (مطلق) ہے، حکمت والا ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور (ان سب نعمتوں کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سب (نعمتوں) سے بڑی چیز ہے یہ (جزائے مذکور) بڑی کامیابی ہے۔

آیت نمبر ۶۷ میں منافقوں کے ایک دوسرے کے دوست ہونے کے بارے میں ہے۔ یہاں مومنوں کو ایک دوسرے کا دوست بتایا گیا ہے۔ منافقوں کو بعضھم من بعض فرمایا گیا ہے اور مومنوں کو بعضھم اولیآء بعض فرمایا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ گرچہ ایک سے دوسرے کی برائی اس طرح مربوط ہوتی ہے جس طرح ایک اچھائی دوسری اچھائی سے مربوط ہوتی ہے لیکن مومنین ہی حقیقتاً ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ منافقین گرچہ ظاہرہ طور پر آپس میں بہت دوست ہیں لیکن دراصل وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں جیسا کہ جہنم میں رہنے والے ایک دوسرے کو کہیں گے بل انتم قدمتموہ لنا۔
نسوا اللہ کا الٹا یطیعون اللہ ورسولہ ہے اور فنسیھم کا الٹا سیرحمھم ا للہ ہے۔ لیکن جہاں منافقوں کی ذاتی خباثت کا ذکر ہے یعنی ھم الفاسقون کہا گیا ہے، اس کے مقابلے میں مومنوں کی ذاتی خوبی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے کہ بے شک وہی عزیز و حکیم ہے جس نے اپنی رحمت سے مومنوں کو فائز المرام کیا۔ ایمان بخش کر اور مستقبل کے ہر step پر رحم کا امیدوار رکھا اور بالآخر جنت میں داخل فرمایا۔ رحم تو اب بھی اللہ تعالیٰ کا ان پر ہے کہ امر بالمعروف اور دیگر نیکیوں کی توفیق دی مگر جس رحم کا یہاں ذکر ہے وہ ظاہر و باہر رحم ہے۔ ساری دنیا پر واضح ہوجائے گا کہ ہاں واقعی یہ امتِ مرحومہ ہے۔ جس طرح اصحابِ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر ہی معلوم ہوجاتا تھا کہ دنیا اور آخرت

کی فلاح اور بھلائی واقعی ان ہی کے حصے میں ہے۔ گرچہ یہاں خالدین فیھا آخرت کے متعلق ہے۔

یہ بات کہ اللہ کی رضا سب سے بڑی بات ہے، دنیا میں بھی ہے کہ ہمارے اعمال کی غایت اگر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنی ہے تو یہی بڑی کامیابی ہے لیکن چوں کہ دنیا میں اس بات کا قطعی فیصلہ عام طور سے اس طرح نہیں ہوتا کہ سب کو پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا فلاں کو حاصل ہوگئی ہے بلکہ جن لوگوں کو حاصل بھی ہوجاتی ہے وہ بھی اپنے کو ''خطرِ عظیم'' پر محسوس کرتے ہیں اور ہر وقت خشیۃ اور عجز اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو کم ترین مخلوق سمجھتے رہتے ہیں اور ان کے دل لرزتے رہتے ہیں (قلوبھم وجلۃ...) اس لیے جنت کو مقامِ رضا قرار دیا گیا جہاں پہنچ کر مومنین کی تمام تشویشات ختم ہوجائیں گی اور وہ خدا کا شکر ادا کریں گے جس نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا۔ فالحمدللہ

جب تک کہ ایمان پر خاتمہ نہ ہو جائے اس وقت تک یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص مرحومین میں سے ہے یا محرومین میں سے، بلکہ موت ایمان پر ہوئی یا نہیں اس کا بھی یقینی علم مرنے والے ہی کو ہوسکتا ہے۔ اسی لیے عارفین مرتے دم تک ڈرتے رہتے ہیں۔ جو جنت کا وعدہ اگلی آیت میں ہے وہ مشروط ہے ایمان لانے پر اور باقی ماندہ زندگی ایمان کے ساتھ گزارنے پر۔ سیرحمھم اللہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پُرامید ہونا چاہیے کہ ان شاء اللہ عنقریب یعنی موت کے وقت رحم ہی ہوگا۔ وہ اس پر قادر ہیں (عزیز) اور خاتمہ کس طرح ہونا چاہیے یہ بھی وہی جانتے ہیں۔ (حکیم)

اسمائے الٰہی میں جہاں ''ال'' نہیں لگا ہوا ہو وہ بھی اسمِ معرفہ ہی ہے کیوں کہ ان کی قدرت اور حکمت ماسوائے اللہ کی قدرت اور حکمت سے بہت مختلف ہے۔

دوسرا اشارہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابھی بھی مومنوں پر رحمت ہے اور مستقبل قریب میں پھر مزید رحمت ہوگی اور یہ اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُO (سورۃ التوبہ، آیت ۷۳)

اے نبی (ﷺ) کفار (سے بالسنان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

حالاں کہ حضور ﷺ کی لینتِ قلب کی ایک جگہ مدح کی گئی ہے لیکن یہاں سختی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ لینتِ قلب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے تھا۔ ولو کنت غلیظ القلب... اور یہاں کفار کے ساتھ معاملے میں واغلظ علیہم کا حکم ہے۔ جہاں نرمی کرنی چاہیے وہاں نرمی کی جائے اور جہاں سختی کرنی چاہیے وہاں سختی کی جائے۔ یہی بہترین اخلاق اور بہترین سیاست ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ O فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَO فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَO (سورۃ التوبہ، آیت ۸۱۔۸۳)

پیچھے رہ جانے والے خوش ہوگئے رسول اللہ (ﷺ) کے (جانے کے) بعد اپنے بیٹھے رہنے پر اور ان کو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ہوا اور (دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو۔ آپ کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے۔ سو تھوڑے دنوں (دنیا میں) ہنس لیں اور بہت دنوں (آخرت میں)

روتے رہیں ان کاموں کے بدلے میں جو کچھ (کفر و نفاق و خلاف) کیا کرتے تھے۔ تو اگر خدا تعالیٰ آپ کو (اس سفر سے مدینے کو صحیح سالم) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے پھر یہ لوگ (کسی جہاد میں) چلنے کی اجازت مانگیں تو آپ یوں کہہ دیجیے کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ نہ چلو گے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمنِ (دین) سے لڑو گے، تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو جو پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں۔

بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی سزا مستقل ہوتی ہے یا وہ مستقل بدبختی کا سبب بن جاتے ہیں۔ گرچہ یہ آیات منافقوں کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ اس امید پر گناہ کرنا کہ پھر توبہ کریں گے یا نیک کام کریں گے، بہت خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس گناہ کی وجہ سے وہ تکوینی طور پر توبہ سے یا نیک اعمال سے محروم کردیے جائیں۔ فاستغفر اللّٰہ۔

لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۹۱)

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں جب کہ یہ لوگ اللّٰہ اور رسول (ﷺ) کے ساتھ (اور احکام میں) خلوص رکھیں، ان نیکوکاروں پر کسی قسم کا الزام (عائد) نہیں اور اللّٰہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

ایک تو یہ لوگ ہیں جو کسی واقعی اور طبعی مجبوری کی بنا پر جہاد میں شریک نہ ہو سکے، ان کے لیے معافی کا اعلان ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے اور چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ نہ کہا جائے۔ وہ اللّٰہ کی قسم کھا کر اپنا عذر بیان

کریں گے تاکہ تم ان کو کچھ نہ کہو تو یوں ہی سہی تم بھی انھیں چھوڑ دو اور ان سے مواخذہ نہ کرو۔ فاعرضوا عنھم ۔ کیوں کہ وہ تو ہیں ہی گندے ناپاک انھم رجس۔ اس ایک واقعہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہاں محسنین کا لفظ ان مومنوں کے لیے استعمال ہوا ہے جن کو واقعی کوئی عذر تھا لیکن یہ ایک عام قاعدہ بتلایا جارہا ہے۔ یہاں اللہ اور رسول ﷺ اور مسلمانوں کی خیرخواہی کو احسان کہا گیا ہے۔ یہ خیرخواہی بھی دراصل ایک اعلیٰ عبادت ہے۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۹۲)

اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ ان کو کوئی سواری دے دیں اور آپ اُن سے کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کروں تو وہ (ناکام) اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اس غم میں کہ (افسوس) ان کو خرچ کرنے کو کچھ بھی میسر نہیں۔

عبداللہ من مغفل بن یسار المزنی وسالم بن عمیر الانصاری و اصحابھما۔ یہ ان کی مالی مجبوری تھی کہ جانے سے رہ گئے لیکن ان کو جہاد میں جانے کا شوق تھا اور اس سے محرومی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ناکردہ عمل کو منظور کرلیا۔ جہاد کی طرح سے دوسرے اعمالِ صالحہ کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے، مثلاً حج وغیرہ۔ دل کی اصل قدر ہے دولت کی نہیں اور اس طرح امیر غریب کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ وَھُمْ اَغْنِیَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۹۳)

پس الزام (اور مؤاخذہ) تو صرف ان لوگوں پر ہے جو باوجود اہلِ سامان (و قوت) ہونے کے گھر رہنے کی اجازت چاہتے ہیں، وہ لوگ (غایت بے حمیتی سے) خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی جس سے وہ (گناہ و ثواب کو) جانتے بھی نہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے قلب کا علم سے گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں تک اصلی علم کا تعلق ہے یعنی اس علم کا جس سے اللہ تعالیٰ کا دل میں ڈر پیدا ہو اور اس کا قرب حاصل ہو اس کا تعلق تو قلب کے ساتھ بہت ظاہر ہے کہ قلبِ سلیم جس کو حاصل ہوتا ہے اسی کو فہمِ سلیم حاصل ہوتا ہے اور جتنا تقویٰ بڑھتا ہے اتنی ہی خشیت بڑھتی ہے اور اتنا ہی علم بڑھتا ہے (انما...من عبادہ العلماء) لیکن ان علوم کا بھی تعلق قلب سے معلوم ہوتا ہے جن کو مجازاً علم کہا جاتا ہے جس طرح فسق و فجور سے دل سیاہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح عقل بھی مسخ ہوجاتی ہے اور دنیاوی معاملات میں بھی عقل کام نہیں کرتی۔ جیسا کہ مجازی لیڈروں اور حکام کے بہت سے کاموں کے بارے میں یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کی عقلیں مسخ ہوگئی ہیں۔ ایسا بھی بہت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت سے گدھے کو مالا مال کردیتے ہیں۔

دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مہر لگنا بدعملی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کم ہمتی بھی اس میں شامل ہے کہ استطاعت رکھتے ہوئے جہاد میں شریک نہ ہو۔ اور دراصل یہ کم ہمتی کفر اور نفاق کی وجہ سے تھی ورنہ طبعی بزدلی کے ساتھ جہاد جمع ہوسکتا ہے جیسا اس مضمون کی ایک حدیث شریف سے واضح ہے۔ ایمان کی قوت طبعی کمزوری اور کم ہمتی پر غالب آجاتی ہے جس کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ز وَّمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۹۵)

ہاں وہ اب تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جائیں گے (کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ سو تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو، وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور (اخیر میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کے بدلے میں جو کچھ وہ (نفاق و خلاف وغیرہ) کیا کرتے تھے۔

منافقین قسم کھا کھا کر (اپنا عذر) بیان کرتے تھے تاکہ ان سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کو اور مسلمانوں کو بھی ان سے اعراض کرنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے تو سمجھا ہوگا کہ اچھا بے وقوف بنایا حالانکہ وہ خود بے وقوف بنے کہ انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ مسلمانوں کے اعراض کی وجہ کچھ اور تھی، یہ بات نہیں تھی کہ وہ ان کی اصلیت نہیں سمجھے اور ان کی قسم کا انھوں نے اعتبار کرلیا۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ وہ قسم کھاتے ہیں تاکہ وہ تم کو راضی کرلیں حالانکہ اللہ اور رسول ﷺ اس کے زیادہ مستحق کہ ان کو راضی کیا جاتا۔ اپنے اس مقصد میں بھی وہ ناکام ہی رہے کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ تو اسی وقت راضی ہوتے جب وہ اپنے دل سے نفاق کو دھو ڈالتے اور سچے مسلمان ہوجاتے۔ اپنے قسم کھانے کی غرض وہ اللہ تعالٰی سے کیسے پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔ اگر ایک دو مسلمان ان کی باتوں میں آ بھی جاتے جب بھی مسلمانوں کے سب کام چونکہ وحیِ الٰہی کے تابع ہوتے تھے اس لیے ان کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۹۹)

اور بعض اہلِ دیہات ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو عنداللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول (ﷺ) کی دعا کا ذریعہ بناتے ہیں، یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بے شک ان کے لیے موجبِ قربت ہے، ضرور ان کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کرلیں گے اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

اس سے بھی اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ رحمت کے درجات ہیں اور جو لوگ باہر کے درجے میں ہیں بلحاظ intensity کے وہ اندر کے درجے میں جانا چاہتے ہیں اور اسی طرح لامتناہی درجات ہیں۔ اعراب میں سے جو ایمان لائے ان میں سے جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم اسلام لے آئے ہو مگر ابھی تک ایمان تمھارے قلوب میں داخل نہیں ہوا۔ وہ ایمان پر قائم ہیں اور اعمالِ صالحہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان لوگوں میں شامل ہوجاتے ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے "اولئک کتب فی قلوبھم الایمان..."

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۰۲، ۱۰۴)

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہوگئے جنھوں نے ملے جلے عمل کیے

تھے کچھ بھلے اور کچھ برے (سو) اللہ سے امید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرما دیں (یعنی توبہ قبول کرلیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔ آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجیے جس کے (لینے کے) ذریعے سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کردیں گے اور ان کے لیے دعا کیجیے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجبِ اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب جانتے ہیں۔ کیا ان کو خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور (کیا ان کو) یہ (خبر نہیں) کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے کی صفت اور رحمت کرنے (کی صفت میں) کامل ہے۔

توبہ ہی کا ذکر یہاں بھی ہے کیوں کہ اچھے برے اعمال مخلوط ہیں اور گناہوں کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف و ندامت ہی توبہ ہے۔ سب سے پہلے خوش خبری ہے عسی اللّٰہ ان یتوب علیھم اور حق تعالیٰ کی طرف سے جب یہ بات ہو تو یہ وعدہ خسروانہ ہوتا ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کرنے کے بعد تزکیہ و تطہیرِ نفس کے لیے صدقات دینا بہت اچھا ہے۔ اور توبہ قبول ہونے کی نشانی یہ بھی ہے کہ آدمی کا دل نیک کاموں کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ یہ بھی اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ سکونِ قلب کے لیے درود شریف پڑھنا چاہیے کیوں کہ حضور ﷺ کے مستقل احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ جب ہم آپ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں تو آپ ﷺ کی طرف سے بھی جواب آتا ہے اور صل علیھم کا حکمِ خداوندی بدرجۂ اتم آج تک پورا ہو رہا ہے۔ قبولِ توبہ کے متعلق پھر مزید خبر آیت نمبر ۱۰۴ میں تاکیدِ تام اور تشفیِ کامل کے لیے ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۰۷، ۱۰۸)

اور بعضے ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لیے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) ضرر پہنچائیں اور (اس میں بیٹھ بیٹھ کر) کفر کی باتیں کریں (اور) ایمان داروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا اور رسول (ﷺ) کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس میں کبھی (نماز کے لیے) کھڑے نہ ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (مراد مسجدِ قبا) وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لیے) کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

جھوٹی قسم پر اعتبار جائز نہیں اور نہ شرعاً مطلوب ہے، اگر اس کا جھوٹا ہونا عقلاً ثابت ہو۔ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا کیوں کہ جب کسی کا نفاق یا جھوٹ اس پر ظاہر ہوگیا تو وہ پھر اس کا اعتبار نہیں کرتا اور نورِ خداوندی جو اس کے پاس عطیہ ہے (جعلنا لہ نوراً...) اس کے ذریعے فوراً اسے اس نفاق اور کذب کا ادراک ہوجاتا ہے۔

مسجدِ ضرار کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان منافقین سے وعدہ فرمایا تھا کہ ''جنگِ تبوک سے ہم پھریں گے تو اوّل وہاں نماز پڑھ کر پھر شہر میں داخل ہوں گے۔'' (موضح القرآن) لیکن جب ان کا نفاق ظاہر ہوگیا اور وہاں کھڑا نہ ہونے کا حکم آگیا تو حضور ﷺ نے اس کو ڈھا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو وعدہ دھوکا دے کر لیا گیا ہو اور فریب سے لیا گیا ہو اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے اور جب فریب ظاہر ہوجائے اور دھوکا معلوم ہوجائے تو اس وعدے کو کبھی پورا نہیں کرنا چاہیے۔ اس صادق الوعد کو یہ بات بذریعۂ وحی سمجھا دی گئی اور اب ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے حجت ہوگئی۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۱)

بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللّٰہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور (یہ مسلّم ہے کہ) اللّٰہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے (اللّٰہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھیرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

یہ وہی جنت ہے جس کا ذکر اس سے پہلے آیت نمبر۱۰۰ میں ہے (السابقون الاولون) جن کا مقصود صرف رضائے الٰہی ہے۔ وہی اس کے مصداق ہیں (رضِیَ اللّٰہ عنہم ورضوا عنہ) ان ہی کو عشقِ الٰہی کی لذت حاصل ہے:

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہا شت بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ۔ مجنوں باشی

یہ وہی عشق ہے جو جان پر کھیل جانے کو بہت آسان بنا دیتا ہے۔ جو قتال فی سبیل اللّٰہ پر آمادہ کرتا ہے پھر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے کہ وہ قتل کریں یا خود قتل ہو جائیں یا قتل بھی کریں اور خود بھی شہید ہوں، جو لوگ اس عشق میں مبتلا ہیں وہ یا تو جان پر کھیل کر جان دے چکے ہیں یا اس کے انتظار میں ہیں کہ کب جان پر کھیلنے کا وقت آئے تو وہ بے خطر خود پڑیں یہ وہی عشق ہے جو آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا۔ ان ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے من المومنین رجال صدقوا... وما بدلوا تبدیلا۔ کچھ بھی تو وہ نہیں بدلے۔ مصیبتوں کے پہاڑ آئے، دشمن کے لشکر بڑے بڑے آئے مگر وہ تو جان دینے پر

آمادہ تھے اللہ کی راہ میں۔ ایمان تو دراصل اسی نور کا نام ہے جن کے اندر آفتابِ عشق کی وہ گرمی نہیں ہے وہ بھی مایوس نہ ہوں کیوں کہ ایمان کا ایک ذرّہ بھی جس کے دل میں ہوگا وہ ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور جائے گا۔

اس خرید و فروخت کے معاہدے کے بعد اگر ایک مومن کو دنیا کی کوئی چیز بھی نہ دی جائے اور اسے انتہائی عسرت اور تکلیف میں زندگی گزارنی پڑے تب بھی اس کو راضی رہنا چاہیے اور اپنی بیع پر خوش رہنا چاہیے۔ فاستبشروا ببیعک الذی بایعتم بہ۔ اور واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنایا ہے جس کی فطرت میں متضاد باتیں جمع معلوم ہوتی ہیں اور اس کی فطری ضروریات اور خواہشات بھی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے کہ اس معاہدے کے باوجود اپنی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جائز اور معروف طریقے سے کوشش کرے اور دعا بھی کرے، بلکہ جائز خواہشات کے لیے دعا کرنے کو عبادت بھی قرار دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے، الدعاء مخ العبادۃ۔

اس معاہدے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ مومنین کی آزمائش کی جاتی ہے۔ ڈر، بھوک اور اموال اور جان اور مال اور ثمرات میں نقصانات میں مومنوں کے ایمان کی آزمائش ہے (ولنبلونکم بشیء...) کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بحیثیت خالق اور مالک ہونے کے اپنے مال اور اپنی جانوں پورا تصرف کرنے کا مالک و مختار سمجھتے ہیں یا نہیں۔ سچے مومن ایسا ہی سمجھتے ہیں اور جو کچھ ان پر مصیبت آتی ہے اسے مالکِ حقیقی کی طرف سے سمجھ کر راضی برضا رہتے ہیں اور دل کی اس کیفیت کا اظہار ان کے اس قول سے ہوتا ہے کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ کے حق کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو پہلے ہی جنت کے عوض بیچ چکے ہیں۔ اب جب تک یہ چیزیں ان کے پاس رہ جائیں اللہ تعالیٰ کا محض انعام بلا استحقاق ہے۔ اور دراصل یہ خرید و فروخت بھی محض ان کا احسان ہے کہ جو چیز ان ہی کی ہے اور جس کو واپس لینے کا ان کو ہر وقت حق حاصل ہے اس کو ہماری ملکیت قرار دے کر

ہم سے خرید رہے ہیں تو اس حیثیت سے ہر وقت اللّٰہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اور اوّل الذکر دو حیثیتوں سے صبر واجب ہے اور صبر کامل ہوتا ہے شکر سے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ اسی لیے اکثر شکر اور صبر کا ذکر ایک ہی جگہ آیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۲)

وہ ایسے ہیں جو (گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں (اور اللّٰہ کی) عبادت کرنے والے ہیں (اور) حمد کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے (اور) سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللّٰہ کی حدوں کا (یعنی احکام کا) خیال رکھنے والے (ہیں) اور ایسے مومنوں کو (جن میں جہاد اور یہ صفات ہوں) آپ خوش خبری سنا دیجیے۔

صرف ترتیب پر غور کرو اور جھوم جاؤ۔ توبہ کرنا سب سے پہلے ضروری ہے۔ یہ عبادت کا دروازہ ہے اور تصوف کا یعنی اللّٰہ تعالیٰ تک پہنچنے کا پہلا زینہ ہے۔ توبہ شرک سے، کفر سے، معصیت سے اور غفلت سے۔ اس کے بغیر عبادت کی توفیق نہیں ہوتی اور عبادت مقصدِ زندگی ہے یعنی جس وقت جو خدا کا حکم ہو، جو اس کی مرضی ہو وہ بجالانا۔

پھر عبادت کی توفیق ملنے پر شکر ادا کرو ورنہ سب کچھ رائگاں ہو جائے گا۔ عجب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور عبادت کی توفیق بھی سلب ہو جائے گی۔

''سائحون'' کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے ''بے تعلق رہنے والے'' کیا ہے جو موزوں ترین ترجمہ ہے۔

''کن فی الدنیا کانک غریب او عابری سبیل'' اس لفظ کی تشریح زبانِ نبوت سے ہے۔ ان خصوصیات کے بعد ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونے کا ذکر

ہے۔ سائحون کے بعد راکعون اور ساجدون کا ذکر ان کی کمالِ عبودیت کو ظاہر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق کو ظاہر کرتا ہے کہ باقی تمام سے بے تعلق ہوکر بروقت اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کیے ہوئے ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی توصیف و تحمید میں مصروف ہیں۔

حافظون لحدود اللہ کے درجات ہیں۔ سب سے اعلیٰ درجہ زمین میں حدود اللہ نافذ کرنے والوں اور خود اور دوسروں سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرانے والوں کا ہے۔ (اٰمرون...)

اور خوش خبری ہے ایمان والوں کو کہ یہ سب ایمان ہی کے ثمرات ہیں اور ایمان ہی ہے جس کی مثال شجرۂ طیبہ سے دی گئی ہے۔ یہ ثمرات (یا خصوصیات) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں جس طرح خدا کے صفات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں، مثلاً اس کا احد ہونا یعنی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونا ضروری ہے اور معبود ہونا بھی ضروری ہے۔ ولہ الاسماء الحسنیٰ۔ اسی طرح جنت میں بھی ثمرات ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دیے جائیں گے۔

لقد تَاب اللّٰهُ علی النَّبیِّ وَالْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ ساعة الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۝ وَّعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۷، ۱۱۸)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر (ﷺ) کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جنھوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا

بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جاوے (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر اُن کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو ہر معاملے میں نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ رہے، کبھی بھی کوئی نافرمانی نہیں کی، کبھی جہاد سے رُکے نہیں۔ وہ ان صادقین میں سے تھے جن کا ذکر سورۂ احزاب کی آیت نمبر۲۳ میں ہے: من...صدقوا ما عاھدوا...تبدیلا۔ دوسرے وہ تین حضرات ہیں جن سے ایک مرتبہ نفس کے کید میں پڑ کر جہاد سے رُک جانے کی غلطی ہوئی تھی۔ لیکن انھوں نے فوراً اس کا اعتراف کرلیا اور سچ سچ کہہ دیا کہ ان سے غلطی ہوگئی تھی۔ برخلاف منافقوں کے جنھوں نے جھوٹ موٹ بہانے بنائے۔ ان تین سچے حضرات نے ایسی سچی توبہ کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی پہلے ہی گروہ کے ساتھ رکھا اور وہ بالکل ان کی طرح ہو گئے جو جہاد سے پیچھے نہیں رہے تھے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آیت نمبر۱۱۷ میں بھی تاب اللّٰہ کا لفظ ہے۔ جس کا لازمی اثر (consequence) بندے کا توبہ کرنا ہے۔ تو نبی ہو یا غیر نبی سب کے سب اس رب ذوالجلال کے سامنے اپنی کوتاہیوں کے معترف ہیں کیوں کہ مخلوق کی کیا مجال کہ خالق کے شایانِ شان عبادت بجا لا سکے، اسی معنی کی حدیث شریف ہے کہ کل نبی ادم خطاؤن و خیر الخطاؤن توابون۔

ان دو آیاتِ کریمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بار بار اپنے مومن بندوں پر توجہ فرماتے ہیں کبھی ان کے مجاہدوں کی تحسین فرماتے ہوئے کہ شاباش تم ہمارے فرماں بردار بندے ہو تاکہ وہ اپنی فرماں برداری، جدوجہد اور قربانی پر ثابت قدم رہیں اور کبھی اس لیے کہ ان سے جو کوتاہی ہوئی ہے، اس پر ان کو متنبہ فرمائیں تاکہ وہ توبہ کریں یعنی اپنے رب کی طرف رجوع کریں اور سچی توبہ کریں اور یہ بار بار توجہ فرمانا اس لیے ہے کہ وہ توّاب ہیں اور اپنے بندوں پر رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ توبہ کرنے والوں کے لیے ان آیاتِ کریمہ میں بہت بڑی خوش خبری ہے کیوں کہ توبہ کی توفیق اللہ تعالیٰ کے متوجہ بلطف و کرم ہونے کا نتیجہ ہے اس لیے اس کے قبول ہونے میں شک نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کو بندوں کا توبہ کرنا اتنا پسند ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب نبیِ کریم ﷺ کو جو معصوم اور افضل الخلائق ہیں اور ان کے ساتھی مہاجرین اور انصار کو جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد افضل الخلائق ہیں، ان کو بھی توبہ کا حکم دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۝

(سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۹)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو۔

مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن میں اس آیت کی تفسیر کا عنوان ''امر تقویٰ و صدق'' لکھا ہے اور ترجمہ یہ کیا ہے: ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ پر چلو کہ تم بھی صدق اختیار کرو)۔'' یہ آیت ان تین صحابیوںؓ کی توبہ قبول ہوجانے کے بعد کی آیت ہے۔ اس واقعے کے بعد یہ نصیحت کس قدر کارگر ہوئی ہوگی یہ بات صرف تصور ہی میں لائی جاسکتی ہے۔ اور اس آیتِ کریمہ سے ان حضرات کی کتنی دل جوئی ہوئی ہوگی جن کی

توبہ قبول ہوئی۔ چونکہ سزاءً تمام مسلمانوں کو ان سے میل جول رکھنے کو منع کردیا گیا تھا اس لیے جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی معیت کا حکم دیا۔ وہ نہ صرف اس معنی میں سچے تھے کہ اتنی سختی اور تنگی کے باوجود ایک کافر حکمران کی دعوت کو کہ تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہیں بہت عزت و اکرام دیں گے ٹھکرا دیا تھا۔ اور سچے دین کے سچے شیدائی ثابت ہوئے اور وہ اپنے اس ظن میں کہ لا ملجا...الا الیہ میں بھی سچے تھے۔

مسائل السلوک میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا: فی الروح قیل خالطوا ھم لتکونوا مثلھم فکل قرین بالمقارب یقتدی اھ فضیہ ترغیب لصحبۃ الصالحین۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک دن فرمایا کہ کونوا مع الصادقین کے معنی ہیں کہ حقوق کی حفاظت اور اس کی ادائیگی کرو۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۲۰، ۱۲۱)

مدینے کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گرد و پیش (رہتے) ہیں ان کو یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ (ﷺ) کا ساتھ نہ دیں اور نہ یہ (زیبا تھا) کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں (اور) یہ (ساتھ جانے کا ضروری ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی اور جو ماندگی پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو چلنا چلے جو کفار کے لیے موجبِ غیظ ہوا ہو اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا یقیناً اللہ تعالیٰ

مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اور (نیز) جو کچھ چھوٹا بڑا انھوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان ان کو طے کرنے پڑے یہ سب بھی ان کے نام (نیکیوں میں) لکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے (ان سب) کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔

محبت کا تو تقاضا یہ تھا کہ سر کے بل جان دینے جاتے اور یقیناً بہت بڑی اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جن کے خیال و وہم میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی جان سے اپنی جان کو عزیز تر رکھیں یا ان کی جان کے مقابلے میں اپنی جان کی کوئی حیثیت سمجھیں۔ لیکن چونکہ ان میں بعض کمزور ایمان والے بھی تھے اور بعض منافق بھی تھے اور انسان کی طبعاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ (اگر محبت کا غلبہ نہ ہو) کہ جو تکلیف وہ اٹھائے اس کا کچھ بدلہ بھی ملے، اس لیے اللہ عالیٰ نے مزید رحمت کے طور پر یہ اصول مقرر فرما دیا کہ جو بھی تکلیف اس راہ میں پہنچے گی، سب لکھی جائے گی اور سب کا بدلہ دیا جائے گا، بلکہ احسن ما کانوا یعملون سے اس کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ برائیوں اور لغزشوں سے درگزر فرما دیا جائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمھارے آس پاس (رہتے) ہیں اور ان کو تمھارے اندر سختی پانا چاہیے اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (کی امداد) متقی لوگوں کے ساتھ ہے (پس ان سے ڈریو مت)۔

کبھی نرمی تقویٰ کے اثر سے ہے اور کبھی سختی تقویٰ کے اثر سے ہے اور دونوں طرح کے معاملات میں مدِمقابل کفار ہی ہیں۔ اوّل الذکر حالت پاسِ عہد کی وجہ سے ہے جب کہ کفار نے بھی عہد کا پاس رکھا ہو جیسا اس سورت کی آیت نمبر۷ میں ہے (فما

استقاموالکم فاستقیموالکم)۔

گویا جیسا آقا نے حکم دے دیا ویسے ہی بن گئے۔ اگر کہا کہ اس وقت ریشم بن جاؤ تو ریشم کی طرح نرم ہوگئے اور کہا کہ اس وقت فولاد بن جاؤ تو فولاد کی طرح سخت ہوگئے۔

کفر کا مقابلہ سختی سے کرنا ضروری ہے جیسا کہ اور آیاتِ کریمہ میں بھی اس کا ذکر ہے (اشداء علی الکفار) اور (واغلظ علیھم) اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ امارہ اور شیطان کے مقابلے میں بھی سختی ہونا چاہیے۔ جب کبھی معصیت کا تقاضا ہو کوشش کرکے اپنے نفس پر سختی کرکے معصیت سے رک جائے۔ نرمی سے مقابلہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اپنے نفس کو گناہ سے یا کسی مضر یا لایعنی حرکت سے روکنا ہے تو سختی سے روکنا ہوگا نرمی سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ علامہ شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''...دشمنانِ خدا کے مقابلے میں سخت و شدید ہوتا کہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہوجائے۔''

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۲۷)

اور جب کوئی سورت (جدید) نازل کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں (اور اشارے سے باتیں کرتے ہیں) کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھتا تو نہیں پھر چل دیتے ہیں (یہ لوگ مجلسِ نبوی سے کیا پھرے) خدا تعالیٰ نے ان کا دل (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے، اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں)۔

ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے یا یہ کہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اگر سمجھ سے کام لیتے تو آسانی سے ان کی سمجھ میں آجاتا کہ حضور ﷺ کی مجلس

سے اٹھ کر چلے جانا کتنی بڑی سعادت سے محرومی ہے۔ لیکن چونکہ وہ منافق تھے اور ایمان ہی سے محروم تھے اس لیے یہ بات ان کی سمجھ میں کیسے آتی۔ یہ سمجھ اور فہم ایک حد تک اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں رکھا ہے۔ جیسے آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، اسی طرح دل سمجھتا ہے لیکن کوئی شخص آنکھ بند کرلے، سچ بات نہ سنے اور دل اور ضمیر کی آواز کو نہ سنے تو پھر رفتہ رفتہ اس کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل ختم ہوجاتی ہیں۔ کما قال تعالیٰ ولقد ذرانا... لا یفقھون بھا...

لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۝ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ۝

(سورۃ التوبہ، آیت ۱۲۸، ۱۲۹)

(اے لوگو!) تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمھارے منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں پھر اگر یہ رُوگردانی کریں تو آپ کہہ دیجیے (میرا کیا نقصان ہے) کہ میرے لیے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ و ناصر) کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں میں نے اسی پر بھروسا کرلیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے۔

''بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے۔ حریص ہے تمھاری بھلائی پر۔''

امت پر تو آپ ﷺ حریص ہیں ہی۔ اور امت کے لیے ہمیشہ آسانی مانگتے رہے۔ عامۃ الناس پر بھی حضور ﷺ کی شفقت تمام شفیقوں سے زیادہ تھی۔

اسی لیے ہمیشہ قوم کی ہدایت کے لیے دعا فرمائی اور بددعا سے پرہیز فرمایا۔ اور

ان کی ہدایت کے لیے کُڑھتے رہے۔ فلعلک باخع ...الخ اسی کی تعدیل کے لیے نازل ہوئی۔

جب یہ صفت ہمارے رسول ﷺ کی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی تو وہ دین جو ہمارے سردار لے کر آئے تمام انسانیت کے لیے سراسر بھلائی اور خیر کا دین ہوا اور آپ کی اس صفت کو یعنی پوری انسانیت پر شفیق اور سب کی بھلائی پر حریص ہونے کی صفت کو دشمنوں نے بھی تسلیم کیا۔ اس لحاظ سے اسلام انسانیت (humanity) کا دین ہے بلکہ تمام مخلوق کا دین ہے۔ اس سے آپ ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا صاف ظاہر ہے۔ علاوہ اور رحمتوں کے جو آپ ﷺ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات پر نازل فرمائیں۔

اگر سب لوگ اس دین کو مان لیں تو دنیا ایسی خیر و برکت کا مشاہدہ کرے جو پہلے کبھی کر چکی ہے جب ساری دنیا مسلمان تو نہیں ہوئی تھی مگر اس دین کو ماننے والوں کا معاشرہ تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا اور ساری اقوامِ عالم اس سے مغلوب اور مرعوب تھے (اور اب اس کا الٹ ہو رہا ہے) کہ زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔

جس طرح ایک شفیق باپ پر بہت گراں گزرتا ہے اگر اس کی اولاد قحط یا سخت موذی مرض میں مبتلا ہو جائے اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر بہت گراں گزرتا ہے جب ان کی امت آگ کی طرف جانے لگے اور جہنمی اعمال میں مبتلا ہو جائے یا دنیاوی تباہی و بربادی میں پڑ جائے۔ دونوں باتیں رسول ﷺ پر گراں گزرتی ہیں۔ نفس اور شیطان کے چنگل میں پوری طرح آ جانا۔ ایسے معاشرے میں مبتلا ہو جانا جو تکلیف دہ اور معذب معاشرہ ہو جس کا مظاہرہ آج ہو رہا ہے یہ ''اصر اور اغلال'' ہی تو ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے، ''ویضع عنھم اصرھم ...الخ''

آج بھی یہ بات اس طرح قائم ہے جس طرح رسول ﷺ اور امتی کا رشتہ قائم ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ ہفتے میں دو بار امتیوں کے اعمال حضورِ کائنات ﷺ کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ ہمارے حضور ﷺ کو ہر وقت امتیوں کی فکر ہے۔ گرچہ اس فکر کی شکل بدل گئی ہے اور یہ فکر بربنائے شفقت اور رحمت ہے جیسا کہ ''رؤف رحیم''

ے واضح ہے۔
آپ ﷺ کے جانشینوں اور نام لیواؤں پر بھی شفقت علی الخلق اور خصوصیت
ے ساتھ شفقت علی المومنین ضروری ہے۔
یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب آسودہ حال ہوجائیں تو پھر انسان
جدوجہد کس لیے کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب معاشرہ توازن حاصل کرلیتا ہے تو
اس کے افراد کو اسے برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت جدوجہد کرتے رہنا پڑتا ہے کیوں کہ
نفسانی خواہشات اور شیطان ہر وقت اس توازن کے درپے ہوتے ہیں۔
یہ بات کہ قناعت کے ساتھ ساتھ مادّی ترقی کس طرح ممکن ہے، اس آیتِ
کریمہ سے پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اگر انسان کے دل میں اپنے بھائیوں کی
ضرورتوں کا احساس ہو اور ان کی حاجت روائی کا احساس ہو تو کارہائے خیر میں صرف
کرنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی صفت اپنی امت کے لیے حریص ہونے
کی ایسی تھی کہ ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور نہ ہوگا۔ ہر وقت اپنی امت کو دنیوی اور اخروی
نفع زیادہ سے زیادہ پہنچانے کا خیال تھا۔ ہم امتیوں پر بھی امت کی خیرخواہی فرض ہے۔
لہٰذا جو دنیاوی نفع پہنچا سکتا ہو وہ اسی میں سعی کرے۔ جیسا سیّدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کو ان کی بے حد سخاوت پر کسی نے کہا تھا: ''لا خیر فی الاسراف۔'' اور آپؓ نے جواب
دیا تھا: ''لا اسراف فی الخیر۔''

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ○ (سورۂ یونس، آیت ۶)
بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ
آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید
کے) دلائل ہیں جو (خدا کا) ڈر مانتے ہیں۔

اسی طرح کی صفت یعنی دن اور رات کے بدلنے میں نشانیاں ہیں اولی الالباب اور قوم یعقلون کی بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ صاحبِ تقویٰ ہی صاحبِ عقل وخرد ہیں۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اللّٰہ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علم، تقوی اور عقل میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِھَا وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَO اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَO (سورۂ یونس، آیت ۷، ۸)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔

اس سے پہلے آیت نمبر۶ میں دن اور رات کے بدلنے کا ذکر ہے جس طرح رات کے بعد دن ہے، اسی طرح دنیا کے بعد آخرت ہے۔ لیکن جو اس حقیقت سے غافل رہا اور جو دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہوگیا اور آخرت کا اس کو خیال نہیں رہا، اس کے اعمال تو اسے دوزخ ہی کی طرف لے جائیں گے۔ ان آیاتِ کریمہ سے اشارتاً یہ بات بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ اپنے نیک اعمال کا دنیا میں بدلہ چاہیں۔ اسی طرح یہ بات ہے کہ اور قوموں پر نکبت و افلاس کیوں نہیں ہے جب کہ وہ بھی گناہ کرتے ہیں جیسے ہم گناہ کرتے ہیں، اس طرزِ استدلال کا منشا بھی یہی ہے کہ دنیا میں عیش و آرام مل جائے تو ہم اپنی قسمت سے مطمئن ہوجائیں اور حضرت عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث شریف میں حضور سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان ہے جب انھوں نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ دو جہان کا سردار ﷺ ایسی حالت

میں رہے اور فارس اور روم کے لوگ (یا قیصر و کسریٰ) اتنے عیش سے رہیں: او فی ھذا انت یا ابن الخطاب اولئک قوم عجلت لھم طیباتھم فی الحیوۃ الدنیا. وفی روایۃ اخری اما ترضی ان تکون لھم الدنیا ولنا الاخرہ (متفق علیہ)

اور اس کا بھی اشارتاً جواب ہے کہ کافر اتنے نیک کام کرنے کے باوجود جہنم میں کیوں جائیں گے کیوں کہ کفر بالآخرۃ ایک اختیاری فعل ہے جس کی جزا جہنم ہے۔

مومن کے لیے دنیا راضی ہونے کی جگہ نہیں ہے اور نہ اطمینان سے رہنے کی جگہ ہے۔ فاعوذ باللّٰہ من شرھا۔ ایک تو آخرت کا یقین رکھنے والے کے لیے خواہ دنیا میں کتنی ہی عیش و عشرت مہیا نہ ہو آخرت کا عیش اور وہاں کی نعمتیں ان سے اتنی زیادہ ہیں کہ دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دوسرے ہر وقت دنیا میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو مٹانا یا کم از کم جن سے کراہیت کرنا اس پر فرض ہے، مثلاً بے حیائی سے عورتیں گھومتی پھرتی ہیں۔ ہر جگہ فحاشی اور لغو باتیں ہو رہی ہیں، سود کا کاروبار اتنا چھا گیا ہے کہ جو اس سے بچ جاتا ہے اس تک بھی اس کا غبار پہنچ جاتا ہے (جیسا قربِ قیامت کے بارے میں ایک حدیث شریف میں پیشین گوئی ہے)۔ ان تمام باتوں کو دور کرنے کی کوشش یا کم از کم ان سے دل میں کراہیت ضروری ہے۔ جیسا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرماتے تھے: ”فواحشات سے، منکرات سے دل میں کراہیت تو پیدا کرو۔ کم سے کم عقلاً تو برا سمجھو۔“ ایسے میں اطمینان کیسے رہ سکتا ہے۔ اور اگر ماحول بھی پاکیزہ ہو اور حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے پھر بھی شیطان کو تو قیامت تک کی مہلت دی گئی ہے اور نفس اور شیطان سے مقابلہ قیامت تک رہے گا۔

تیسرے یہ کہ ایک صاحبِ ایمان پر اتنی پابندیاں ہیں کہ خواہ کتنی ہی دولت اور ثروت اس کے پاس ہو وہ کھل کر دادِ عیش نہیں دے سکتا اور آخرت کا خوف ویسے بھی زیادہ دیر تک اسے عیش میں مبتلا نہیں رہنے دے سکتا۔ غرض مومن کے لیے دنیا راضی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

لیکن یہ اطمینان جس کا یہاں ذکر ہے وہ اطمینان نہیں ہے جو حقیقی اطمینان

ہے۔ یہ نصِ قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے جو اپنی خواہشات کو رضائے الٰہی میں فنا کردے، اس کے لیے اطمینان ہی اطمینان ہے مگر یہ اطمینان دنیاوی ساز و سامان اور دنیاوی عافیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ کافروں کا اطمینان یا جسے لوگ عام طور پر سے اطمینان کہتے ہیں وہ نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ آخرت سے غفلت نہیں ہے، بلکہ ہر وقت آخرت پر نظر رکھنے کی وجہ سے ہے۔ دنیا سے راضی اور مطمئن رہنے والوں کی رضا اللہ تعالیٰ کے سچے بندوں کے اطمینان کے مقابلے میں ایسا ہی ہے جیسا دنیا کے مقابلے میں آسمان:

گرچہ آید درنوشتن شیر و شیر

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ ۚ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ○ دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا سُبۡحٰنَکَ اللّٰہُمَّ وَتَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ (سورۂ یونسؑ، آیت ۹، ۱۰)

(اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کا رب ان کو بوجہ ان کے مومن ہونے کے ان کے مقصد (یعنی جنت) تک پہنچا دے گا۔ ان کے (مسکن کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی چین کے باغوں میں ان کے منھ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم اور ان کی (اس وقت کی باتوں میں) اخیر بات یہ ہوگی الحمدللہ رب العالمین۔

ایمان ہی بفضلہٖ تعالیٰ جنت میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ دنیا میں ایمان کی برکت سے جنتیوں کے اعمال کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے۔ آیت نمبر۱۰ میں جو جنتیوں کے اعمال ہیں وہ بھی ان سے دنیا میں سرزد ہوتے رہتے ہیں یعنی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور ہر بات پر آخر میں شکر ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس

کے برعکس جو دنیا ہی سے راضی ہوگئے ان سے اس طرح کے اعمال سرزد نہیں ہوتے، ان سے ایسے ہی اعمال سرزد ہوں گے جو جہنم میں لے جانے والے ہوں گے۔ جیسا کہ بما کانوا یکسبون سے ظاہر ہے۔ دنیا میں دونوں طرح کے لوگوں کے کاموں میں مشابہت ہوسکتی ہے لیکن حقیقتاً دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے جیسے کبر اور خودداری، دنائیت اور تواضع لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا تاکہ اچھے مشہور ہوں یا لوگ ان کے ساتھ بھلائی کریں اور صرف اللہ کے لیے لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ایمان بہترین عملِ صالح ہے اسی طرح کفر بدترین عملِ سیئہ ہے اور اسی حساب سے ان دونوں کی جزا ہے۔

شکر جنتیوں کا وظیفہ ہے ہی دنیا میں بھی مومنوں کے دل شکر سے لبریز رہتے ہیں۔ کیوں کہ اعمالِ صالحہ کی توفیق اللہ تعالیٰ کی عطائے محض ہے جو یھدیھم ربھم سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات ہی ایسی فرمائی ہے اور نفس اور شیطان کو اس طرح انسان کے ساتھ کردیا ہے کہ کوئی بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے جہنم سے بچ ہی نہیں سکتا۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۚ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ O

(سورۂ یونسؑ، آیت ۱۱)

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کے جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کردیا کرتا جس طرح وہ فائدے کے لیے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہوچکا ہوتا سو (اس لیے) ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلا عذاب چند روز) چھوڑ رکھتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عادت اللہ ایسی جاری ہے کہ انسانوں کو ان کے گناہوں کا بدلہ فوراً نہیں مل جاتا بلکہ ایک مقررہ وقت پر ملتا ہے اور اکثر تو معاف بھی ہوجاتا ہے جیسا سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر۳۰ میں یعفوا عن کثیر سے ظاہر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بہت جہالت اور بدتہذیبی کی بات ہے کہ ہم نے کون سا گناہ کیا تھا جو پکڑے گئے؟ یہ تو ضرور ہے کہ عمل اور ردِعمل کا قانون جاری ہے۔ اور نیک لوگوں کو بھی جو تکلیف پہنچتی ہے وہ بھی یا تو ان کی کسی اور کوتاہی کی وجہ سے پہنچتی ہے یا اس لیے کہ معاشرے پر برائی اتنی حاوی ہے کہ وہ اچھائی کو پنپتے دیکھ نہیں سکتی۔ گرچہ جو تکلیف نیک لوگوں کو ان کی نیکی کی وجہ سے پہنچتی ہے یا مومنوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے پہنچتی ہے وہ صرف صوری تکلیف ہوتی ہے۔ ان کا قلب اپنے رب کی یاد کے ساتھ مطمئن رہتا ہے:

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس آیتِ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں (بلکہ اکثر ایسا نہیں ہوتا) کہ جو غلطی آج سرزد ہوئی ہے اس کی سزا بھی آج ہی مل جائے۔ کبھی نہ کبھی بدلہ مل کر رہے گا (اگر معاف نہ ہوجائے، توبہ سے یا محض فضل سے) یا زندگی بھر نہ ملے اور مرنے کے بعد ملے۔ اکثر و بیشتر کفار و فساق کو ڈھیل دی جاتی ہے جو یعمھون کے لفظ سے واضح ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ یونس، آیت۱۲)

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے

کے لیے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا، ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں (جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے)۔

یہ انسان کی سفلی خصوصیات (baser qualities) میں سے ہے اور ان انسانوں کی حالت ہے جن کے دل میں ایمان کی روشنی نہیں ہے جس کے دل میں ایمان داخل ہوگیا اس کی خصوصیت بدل جاتی ہے۔ وہ شدائد اور مصائب میں واویلا نہیں مچاتا ہے اور جب اللّٰہ تعالیٰ کے حکم سے مصائب دور ہوجاتی ہیں تو وہ اللّٰہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍO قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَدْرٰکُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَO (سورۂ یونس، آیت ۱۵، ۱۶)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے (آپ سے) یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائیے یا (کم سے کم) اس میں کچھ ترمیم کر دیجیے۔ آپ یوں کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعے سے پہنچا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہے۔ آپ یوں کہہ دیجیے کہ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر سناتا اور نہ اللّٰہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا کیوں کہ اس سے پہلے بھی تو میں ایک بڑے حصۂ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں پھر کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے۔

نہ صرف وہ بات جو وحی کے ذریعے کہی جا رہی تھی بلکہ حضور ﷺ کو جو تکالیف پہنچائی گئیں اور جو شدائد آپ ﷺ نے برداشت کیں اور اس کے باوجود ایک حرف بھی بدلنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان سب باتوں نے کفار کو یقین دلا دیا تھا کہ یہ آپ ﷺ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ ان کو ایک حد یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس لیے وہ مختلف طریقے سے اس کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے آپ ﷺ کو نعوذ باللہ یہ سمجھ لیا کہ ان پر جن آتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ﷺ اپنی پوری زندگی ان پر پیش کیجیے کہ کیا آپ ﷺ جیسا آدمی بھی جن کے قبضے میں یا اس کے سائے میں جاسکتا ہے۔ اور اگر وہ خدا کو مانتے ہیں (جس کا ان سبھوں کو دعویٰ تھا کہ وہ خدا کو مانتے ہیں) تو اگر اللہ چاہتا تو آپ ﷺ کبھی بھی ان آیات کی تلاوت نہیں کرتے یعنی خدا ہرگز ایک جھوٹے مدعیِ نبوت کو اپنی نشانیاں عطا نہیں کرتا اور نہ اس کی زبان سے ایسا معجزانہ کلام نکلتا جس سے لوگ اشتباہ میں پڑ جائیں۔ یعنی ایک تو خود حضور ﷺ کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ ایسا شخص جس کی پوری عمر ایسی گزری ہو کہ لوگ اس کی صداقت، امانت، دیانت، عقل اور ذہانت کے قائل ہوں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے یا مجنون یا جن کے قبضے میں کس طرح ہوسکتا ہے دوسرے یہ کہ جیسا مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''... سنانا اور اطلاع دینا بدونِ وحی کے بوجہ اس کے معجز ہونے کے ممکن نہیں...''

❁

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورۂ یونس، آیت ۲۴)

بس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس (پانی) سے زمین کے نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہوکر نکلے یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہوگئی اور اس (زمین) کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہوچکے تو (ایسی حالت میں) دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا (جیسے پالا یا خشکی یا اور کچھ) سو ہم نے اس کو ایسا صاف کردیا کہ گویا کل (یہاں) وہ موجود ہی نہ تھی۔ ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔

یہ حیاتِ دنیا کی تصویر کشی اکثر انسانوں کے سامنے آتی ہے۔ خصوصاً جو لوگ طویل امل میں مبتلا ہوں۔ آخر میں پتا چلتا ہے کہ کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ اور جو حیاتِ دنیا میں دل نہیں لگاتے اور آخرت کے طلب گار ہیں، وہ دنیا میں بہت سی امیدیں نہیں باندھتے۔

كذلك حقّتْ كلِمتُ ربّكَ علَى الّذِيْنَ فَسقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ O (سورۂ یونس، آیت ۳۳)

اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی) بات کہ یہ ایمان نہ لاویں گے تمام متمرد (سرکش) لوگوں کے حق میں ثابت ہوچکی ہے۔

فسق ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو مسلمان فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں ان کو جلد توبہ کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہ کرتے کرتے ان کا قلب بالکل سیاہ ہوجائے اور پھر وہ ایمان ہی سے محروم ہوجائیں۔ گناہ سے اس لیے بھی ڈرنا چاہیے کہ کبھی چھوٹی سی چنگاری سے پورا مکان جل جاتا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ O
(سورۂ یونس، آیت ۳۹)
بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس (کے صحیح وسقیم ہونے) کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے اور ہنوز ان کو اس (قرآن کی تکذیب) کا اخیر نتیجہ نہیں ملا۔ جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں اسی طرح انھوں نے بھی (امورِ حقہ کو) جھٹلایا تھا سو دیکھ لیجیے ان ظالموں کا انجام کیسا (برا) ہوا (اسی طرح ان کا ہوگا)۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماننے میں ہچکچاتے ہیں اور اس سے بڑھ کر وہ جو اس میں تبدیلی چاہتے ہیں صرف اس بنا پر کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اس حکم پر آج کل کی دنیا میں عمل ہوسکتا ہے، وہ بھی قریب قریب اسی گروہ میں شامل ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ O (سورۂ یونس، آیت ۴۴)
یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے: ''...لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔'' اور حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنے اوپر تو ظلم کرتے ہی ہیں کہ ایسے کام کرتے ہیں جو دنیا اور آخرت کو برباد کردینے والے کام ہیں۔ لیکن ظلم بالائے ظلم یہ کرتے ہیں کہ توبہ بھی نہیں کرتے۔ اگر توبہ کرلیتے تو ان نقصانات سے بچ جاتے۔ زہر کھاتے رہتے ہیں اور تریاق بھی نہیں کھاتے۔ اگر فطرت سے، طبیعت سے مجبور ہوکر آدمی زہر کھالے تو اس کا تریاق بھی تو موجود ہے، وہ کیوں نہیں کھاتا۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْجَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (سورۂ یونس، آیت ۵۷، ۵۸)

اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو (برے کاموں سے روکنے کے لیے) نصیحت ہے اور دلوں میں جو (برے کاموں سے) روگ (ہوجاتے) ہیں ان کے لیے شفا اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت اور ذریعہ ثواب ہے ایمان والوں کے لیے، آپ (ان سے) کہہ دیجیے تو بس لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے وہ اس دنیا سے بدرجہا بہتر ہے جس کو جمع کر رہے ہیں۔

آیت نمبر ۵۸ میں ''بذلک'' سے مفسرین کے نزدیک قرآن شریف مراد ہے جس کا ذکر اس سے قبل والی آیت میں ہے۔ ذوقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی نعمت ہو اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا فضلِ محض اور اس کی رحمت سمجھ کر اس پر خوش ہوا جائے تو عجب اور کبر پیدا ہی نہیں ہوسکتا کیوں کہ جب نظر اللہ پر ہوگی تو لامحالہ مخلوق سے نظر ہٹ جائے گی اور عجب یا کبر پیدا ہوتا ہے، اپنا مقابلہ دوسروں سے کرنے سے۔ دوسرے کسی کو اللہ تعالیٰ نے کروڑ پتی بنایا ہے اور کسی کو کھانے کو بھی کسی اور کا محتاج بنایا ہے، اس سے ہمیں کیا۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ عطا فرمایا ہے اور ہم پر اس کی بڑی رحمت ہے اور اس کا بڑا فضل ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ چونکہ قلب کی حفاظت ضروری ہے اور ہر وقت اس کی نگہداشت ضروری ہے اس لیے ہر وقت قرآن شریف سے ہدایت اور نصیحت حاصل کرتے رہنا اور جو یاد ہے حرفاً و معناً اس کی حفاظت کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ امراضِ قلب کا علاج یہی ہے جو شفا کے ساتھ رحمت بھی ہے۔ جس کا شکر ادا کرنے کے بارے میں اگلی آیت میں ہے۔ قلب اس فرحت سے بھرا ہوا رہے جس کا یہاں ذکر ہے تو یہی شکر ہے اور یہی قلب کی حفاظت کا بہترین طریقہ ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَO الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَO لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُO وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُO (سورۃ یونسؑ، آیت ۶۲۔ ۶۵)

یاد رکھو اللّٰہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلوب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں وہ (اللّٰہ کے دوست) ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (منجانب اللّٰہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللّٰہ کی باتوں میں (یعنی وعدوں میں) کچھ فرق ہوا نہیں کرتا۔ یہ (بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے اور آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں، تمام تر غلبہ (اور) قدرت بھی) خدا ہی کے لیے (ثابت) ہے۔ وہ (ان کی باتیں) سنتا ہے (اور ان کی حالت) جانتا ہے (وہ آپ کا بدلہ ان سے خود لے لے گا)۔

اولیا اللّٰہ کو جو خوش خبری دنیا اور آخرت کی دی جا رہی ہے اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ زندگی کی جو حلاوت متقیوں کو میسر ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں۔ متقیوں کے نفوس، نفوسِ مطمئنہ ہیں۔ آیت نمبر ۶۵ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی یعنی کفار کی باتیں تمھیں محزون نہ کردیں یقیناً تمام عزت اللّٰہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور وہی جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں کفار اور مشرکین کا تمام استہزا ختم ہوگیا اور ان کا غرور مٹی میں مل گیا اور مسلمانوں کو وہ عزت ملی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور ہمارے حضور ﷺ کی عزت کا تمام عالم معترف ہے یہاں تک کہ آپ کی تعظیم وتکریم آسمانوں پر ہوئی۔ فالحمدللّٰہ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ○ (سورۂ یونس، آیت ۷۱)

اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنائیے (جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا (یعنی وعظ گوئی کی حالت میں) اور احکامِ خداوندی کی نصیحت کرنا بھاری (اور ناگوار) معلوم ہوتا ہے تو میرا تو خدا ہی پر بھروسا ہے سو تم (میرے ضرر پہنچانے کے متعلق) اپنی تدبیر (جو کچھ کرسکو) مع اپنے شرکا (یعنی بتوں) کے پختہ کرلو پھر تمھاری وہ تدبیر تمھاری گھٹن (اور دل تنگی) کا باعث نہ ہونا چاہیے پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) کر گزرو اور مجھ کو (اصلاً) مہلت نہ دو۔

توکّل کا یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام سے بھی اس طرح کا قول منقول ہے۔ (دیکھیے سورۂ ہود آیات ۵۳۔ ۵۶)

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ○ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ○ (سورۂ یونس، آیت ۸۸، ۸۹)

اور موسیٰ نے دعا میں عرض کیا اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامانِ تجمّل اور طرح طرح کے مالِ دنیوی زندگی میں، اے ہمارے رب! اسی واسطے دیے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست و نابود کردیجیے اور ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کردیجیے (جس سے

ہلاکت کے مستحق ہوجائیں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں یہاں تک کہ عذابِ الیم (کے مستحق ہوکر اس) کو دیکھ لیں۔حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی سوتم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔

دعا قبول ہوجانے کی وجہ سے اور ضروری ہوگیا کہ اللّٰہ کی راہ پر ثابت قدم رہا جائے اور نادانوں کے برخلاف جو اللّٰہ تعالیٰ کی نوازشوں کو بھول جاتے ہیں، اللّٰہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ اس کی راہ پر ثابت قدمی ہی اس کا شکر ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ○

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کردیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادے سے (دریا میں) چلا، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہوکر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں۔

اس میں ایک اشارہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں جب تک عذابِ الیم دیکھ نہ لیں اس لیے فرعون عذابِ الیم دیکھنے کے بعد ایمان لایا جس کا اس کو کچھ نفع نہیں ہوا۔

وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ھُوَ ۚ وَاِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ؕ یُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ O (سورۂ یونس، آیت ۱۰۷)

(اور مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ) اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچا دے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی زبردست ہے کہ اگر وہ تمھیں بھلائی پہنچانا چاہے تو کوئی بھی اس کو روک نہیں سکتا اور وہ بھلائی تم تک پہنچ کر رہے گی۔ یہاں تک کہ تم خود بھی اس کو روکنا چاہو تو نہیں روک سکتے۔ اگر تم کوشش کر کے آگ میں گرنا چاہو لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھیں بچانے کا ارادہ فرما لیا ہے تو تم اس میں نہیں کود سکو گے، جس کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔

فسبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ اس کی رحمت کے سامنے تمھاری اپنی کوشش اس کے خلاف یا اس کے حق میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اس کی معافی اور بخشش کے سامنے تمھارے گناہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ اس کی غفور رحیمی ہے کہ وہ گناہوں پر جلد مواخذہ نہیں فرماتا اور کبھی کبھی تو بغیر توبہ کے بھی بالکل معاف فرما دیتے ہیں۔

وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَھُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ O (سورۂ یونس، آیت ۱۰۹)

اور آپ اس کا اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے اور (ان کے کفر و ایذا پر) صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم خواہ دنیا میں آجائے جیسا قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی فتح سے آیا تھا خواہ صرف آخرت میں آئے، کامیابی بالآخر مومنوں ہی کے لیے ہے۔ اس صورت میں یہ آیت: واعبد ربک... الیقین کے ہم معنی ہوگی، یعنی مرتے دم تک اتباعِ وحی کو مضبوطی سے پکڑے رہو یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے جس کے بعد مسلمانوں ہی کو کامیاب ہونا ضروری ہے۔ یہ حکم یوم الدین پر تو ضرور نافذ ہوگا لیکن چھوٹے پیمانے پر دنیا میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ یہاں ''واصبر'' صبر کے تمام معنوں کو محیط ہے یعنی صبر علی الطاعۃ، صبر عن المعصیۃ اور صبر فی الجہاد والقتال یا صبر فی المصیبۃ۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍO اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌO وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍO (سورۂ ہودؑ، آیت ۱۔۳)

الٓر (کے معنی تو اللہ کو معلوم) یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف (بھی) بیان کی گئی ہیں، ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے (ایمان نہ لانے پر عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان لانے پر ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں اور یہ (بھی ہے) کہ تم لوگ اپنے گناہ (شرک وکفر وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو وہ تم کو وقتِ مقرر (یعنی وقتِ موت) تک (دنیا میں) خوشی عیش دے گا اور (آخرت میں) ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا اور اگر (ایمان لانے سے) تم لوگ اعراض (ہی) کرتے رہے تو مجھ کو (اس صورت میں) تمھارے لیے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

کتاب کے نازل ہونے کا اور احکامات کے مفصل بیان کرنے کا مقصدِ عظیم یہ ہے کہ سوائے خدا وحدہٗ لاشریک کے کسی کی عبادت نہ کی جائے لیکن چونکہ توحیدِ خالص اعتقادی اور عملی بہت مشکل ہے اس لیے اپنی کوتاہیوں کے لیے بروقت استغفار کرنے کی ضرورت ہے۔

آیت نمبر۳ کی تفسیر میں حضرت ابنِ عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا (توبوا الیہ) اقبلوا الیہ بالتوبۃ والاخلاص۔ (ذی فضل) فی الاسلام (فضلہ) ثوابہ فی الاخرۃ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ فضل یعنی صاحبِ علم وعمل کا اجر آخرت پر ایمان پر منحصر ہے کیوں کہ اس کے بغیر کوئی عمل آخرت میں نجات نہیں دلا سکتا۔ اور ایمان کے لیے توبہ اور انابت ضروری ہے۔ اگر کوئی توبہ سے انحراف کرے تو یہ صریح کفر ہوجاتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ○ (سورۂ ہودؑ، آیت ۶)

اور کوئی (رزق کھانے والا) جان دار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اُس کی روزی اللّٰہ کے ذمہ نہ ہو اور وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے، سب چیزیں کتاب مبین (یعنی لوحِ محفوظ) میں (بھی) منضبط اور مندرج ہیں۔

اللّٰہ تعالیٰ کا غیرمشروط وعدہ رزق دینے کا ہے۔ اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ رزق حاصل کرنے کے ذرائع و وسائل حلال ہوں۔ اور جن کا یقین مُضبوط ہے وہ رزق حاصل کرنے کی کوشش بھی صرف اللّٰہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں کیوں کہ وابتغوا من فضل اللّٰہ بھی اللّٰہ تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ (سورۂ ہودؑ، آیت ۹۔۱۱)

اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہوجاتا ہے اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو (ایسا اِتراتا ہے کہ) کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب کبھی نہ ہوگا پس) وہ اِترانے لگتا ہے، شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لیے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

عام انسانی فطرت ہے کہ جب پریشانی ہوتی ہے تو یاس اور ناشکری میں انسان مبتلا ہوجاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اسی اللہ نے جس نے سرِدست کوئی نعمت چھین لی ہے کبھی نعمت دی بھی تھی۔ جس نے ہزاروں نعمتیں دی ہیں اگر اس نے ایک آدھ نعمت اپنی روک لی تو اس سے کیا شکایت اور اس کے دربار سے کیسی ناامیدی؟ لیکن یہ بات کسی مومن ہی کی سمجھ میں آسکتی ہے جسے اللہ نے حکمت عطا کی ہو۔ جیسے حضرت لقمانؑ کا واقعہ مروی ہے کہ ایک دن اپنے آقا کے ہاتھ سے خوشی خوشی تلخ ککری کھا گئے اور جب آقا نے اس میں سے تھوڑا چکھا اور اس کو پتا چلا کہ یہ اتنی تلخ ہے تو اس نے پوچھا کہ تم اتنی تلخ ککری کھا گئے اور کچھ نہیں بولے تو انھوں نے فرمایا کہ جس آقا کے ہاتھ سے بارہا شیریں چیز کھائی ہے، اگر اس کے ہاتھ سے ایک بار کوئی تلخ چیز کھا لی تو کیا ہوا۔ تو مصیبت میں صبر واقعی مسلمانوں ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح جب نعمت ملتی ہے تو عام انسان اترا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ جس نے نعمت دی ہے وہ چھین بھی سکتا ہے اور چھین کر دوسرے کو بھی دے سکتا ہے تو کیسا اِترانا اور کیسا غرور؟ یہاں بھی مومنین صالحین اس زمرے سے باہر ہیں۔

یئُس کے ساتھ کفور اور فرح کے ساتھ فخور آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یاس بڑھ کر کفر ہو جاتا ہے اسی طرح فرح بڑھ کر فخر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دونوں سے بچنے اور حدود کے اندر رہنے کی ضرورت ہے۔ مصیبت میں صبر اور عافیت اور خوشی میں عملِ صالح کی طرف سے لاپروائی نہ ہونا یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ یاس اور فرح کو حدود کے اندر رکھتی ہیں۔ تنگی میں بھی اس پر نظر ہو کہ اس کے حکم سے ہوا ہے جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کے حکم سے ہو رہا ہے اور معاملہ اس کے سپرد کر کے اپنے کام میں لگا رہے اور فراخی میں بھی اس پر نظر ہو کہ سب اسی کا انعام ہے۔ ہر واقعے پر خواہ وہ رنج کا ہو خواہ خوشی کا ایمان تازہ کرتے رہنے سے اور اپنا تعلق اللّٰہ تعالیٰ سے قوی کرتے رہنے سے تہذیبِ نفس حاصل ہوتی ہے، تب ان جبلی خصوصیات مایوسی، کفر، عجب اور کبر سے نجات ملتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ صبر اور شکر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں یا یہ کہ صبر اور شکر ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں کیوں کہ یہاں یاس اور کفر اور کبر سے ان لوگوں کو مستثنیٰ فرمایا گیا ہے جو صبر کرتے ہیں اور ہر حالت میں عملِ صالح پر قائم رہتے ہیں۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (سورۂ ہودؑ، آیت ۱۲)

سو شاید آپ (تنگ ہو کر) اُن احکام میں سے جو آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجے جاتے ہیں بعض کو (کہ وہ تبلیغ ہے) چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو) ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا یا ان کے ہمراہ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی بولتا جاتا) کیوں نہیں آیا؟ آپ تو (ان کفار کے اعتبار سے) صرف ڈرانے والے ہیں اور پورا اختیار رکھنے والا ہر شے پر (تو) اللّٰہ ہی ہے۔

بعض ما یوحی الیک سے غالبًا یہاں تبلیغ مراد ہے۔ اور تنگ دلی ان کے مسلسل استہزا کی وجہ سے یا ان کی فرمائش کہ اس پر خزانہ کیوں نازل نہیں ہوتا یا فرشتہ آ کر تصدیق کیوں نہیں کرتا، اس بنا پر تنگ دلی نہیں تھی بلکہ اس لیے تھی کہ ہمارے حضور ﷺ قوم پر بہت شفیق تھے اور ان کے ان احمقانہ سوالات پر آپ کو افسوس ہوتا تھا کہ ایسی احمق اور معاند قوم پر تبلیغ کیا کارگر ہوگی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی تسلی کے لیے ایک کھلا ہوا معجزہ آپ ﷺ کو عطا ہوا جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں ہے۔

یہاں ضیق صدر کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ تو صرف نذیر ہیں باقی باتیں اللہ پر چھوڑیے۔ وہی ہر چیز کا کارساز ہے۔ آپ نہ ان کی ہدایت کے مکلّف ہیں اور نہ ان کی ہر بات کا جواب دینے کے مکلّف ہیں۔ اگر یہ قرآنِ مجید کو جھٹلاتے ہیں تو ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان سے یہ کہہ دیں کہ اس جیسی دس سورتیں لے آؤ۔ امتیوں کے لیے یہ ہدایت ہے کہ اگر لوگ صحیح بات نہیں مانتے یا کسی ایمان دار آدمی کو یہ محسوس ہو کہ اس بے ایمانی اور بددیانتی کے سمندر میں اس کی کوشش رائگاں جا رہی ہے تو اس کی وجہ سے تبلیغ یا ایمان داری کی کوشش چھوڑنا نہیں چاہیے بلکہ اپنا کام کر کے نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑنا چاہیے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝

(سورۂ ہودؑ، آیت ۱۵، ۱۶)

جو شخص (اپنے اعمالِ خیر سے) محض حیاتِ دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور

کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے۔

یہاں سے ان کا جواب شافی ہوگیا جو کہتے ہیں کہ اتنے بڑے بڑے انسانیت کی خدمت کرنے والے اچھے لوگ کیسے جہنم میں چلے جائیں گے؟ جس نے آخرت کو مانا ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے آخرت میں نیک بدلے کا کیا سوال بلکہ انکار کی وجہ سے عذاب جہنم یقینی ہے اور جس نے آخرت کو مانا مگر اس طرح نہیں مانا جس طرح رسول ﷺ نے بتایا ہے وہ دراصل اس آخرت کو نہیں مانتا جو آنے والی ہے بلکہ اس نے اپنی عقل سے یا باپ دادا سے سن کر ایک خیال باندھ لیا ہے۔ لہٰذا وہ آخرت میں رحمت کا حق دار نہیں ہوا بلکہ وحی کا انکار کرنے سے متکبر اور کافر ہے جن کے لیے خلود فی النار لکھا ہوا ہے۔

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنفُسِهِمْ ۖ إِنِّي إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

(سورۂ ہود، آیت ۳۱)

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ (میں یہ کہتا ہوں کہ) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور جو لوگ تمھاری نگاہوں میں حقیر ہوں میں ان کی نسبت (تمھاری طرح) یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ثواب نہ دے گا۔ ان کے دل میں جو کچھ ہو اُس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے میں تو (اگر ایسی بات کہہ دوں تو) اس صورت میں ستم ہی کر دوں۔

جس طرح ان کا مسلمانوں کو حقیر سمجھنا اور حضرت نوح علیہ السلام سے مطالبہ

کرنا یا اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ ان ''رذیل لوگوں'' کو اپنے پاس سے ہٹا دیں گے تب ان کی بات مانیں گے احمقانہ بات تھی، اسی طرح ہمارے حضور نبی کریم ﷺ سے بھی بعض ''بڑے'' لوگوں نے مطالبہ کیا تھا جسے سختی سے رد کردیا گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جو اپنی قوم کو جواب دیا تھا، وہ اس آیتِ کریمہ میں درج ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ان کے دلوں میں کیا ہے یعنی اللّٰہ تعالیٰ ہی ان کے ایمان اور ان کے قلب کی صفات سے واقف ہیں۔ اسی طرح کسی دنیاوی وجاہت اور اعلیٰ درجہ رکھنے والے کو یا کسی عابد و زاہد کو کسی مسلمان کو حقیر اور رذیل سمجھنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس آیتِ کریمہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی عطا اور اللّٰہ تعالیٰ کے ہاں کسی کا مرتبہ اس کے قلب میں ایمان، تعلق باللّٰہ، خشیت، محبت اور دیگر صفاتِ حمیدہ کے درجات کے لحاظ سے ہے اور جب مطلق ''خیر'' کا ذکر ہے تو اس کی کوئی حد نہیں ہے اور اس خیر سے کہیں زیادہ ہوسکتا ہے جو اس عابد و زاہد کو عطا ہوئی ہے۔ جب اللّٰہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کس کے جی میں کیا ہے اور ہمیں نیتوں کا علم نہیں ہے تو ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہوسکتا کہ جس شخص کو ہم نیچا سمجھ رہے ہیں اسے اللّٰہ تعالیٰ نے کن کن انعامات سے نوازا ہے یا آئندہ نوازیں گے۔

وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِيٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (سورۃ ہودؑ، آیت ۳۴)

اور میری خیرخواہی تمھارے کام نہیں آسکتی گو میں تمھاری کیسی ہی خیرخواہی کرنا چاہوں جب کہ اللّٰہ ہی کو تمھارا گمراہ کرنا منظور ہو، وہی تمھارا مالک ہے اور اسی کے پاس تم کو جانا ہے۔

تقدیر پر یقین دراصل اللّٰہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر یقین کا نام ہے اور اس یقین کا فائدہ خود اللّٰہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ یاس کی زیادتی (جو کفر تک پہنچا دیتی ہے)

اور فرح کی زیادتی (جو فخر پر منتج ہوتی ہے) دونوں سے حفاظت رہے۔ یہ نہیں کہ عمل ہی چھوڑ بیٹھے جو گمراہوں کی تاویل ہے۔

یہاں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی مسلسل تبلیغ اور جگر سوزی کے بعد جو لوگ ایمان نہیں لا رہے تھے تو تقدیر پر یقین نے حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو حد سے زیادہ تعب اور پریشانی سے بچا لیا کہ ہوسکتا ہے ان کی قسمت میں گمراہی ہی لکھی ہو تو اللہ تعالیٰ کے ارادے کو کون بدل سکتا ہے۔ پھر جب ان کو وحی سے معلوم ہوگیا جیسا کہ آیت نمبر ۳۶ میں ہے کہ اب اور لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو ان کی طرف سے فارغ ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے کشتی بنانے لگے۔

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (سورۂ ہودؑ، آیت ۳۶)

اورنوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو (اس وقت تک) ایمان لا چکے ہیں اور کوئی (نیا) شخص تمھاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ (کفر و ایذا و استہزا) کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو۔

ایک نبی کے لیے سب سے زیادہ رنج کی بات یہ تھی کہ جس قوم کی طرف وہ مبعوث ہوئے وہ ان پر ایمان نہیں لا رہی تھی۔ اِلاّ معدودے چند افراد کے، بلکہ اس طرح کے کام کر رہی تھی جو ایمان سے روکنے والے کام تھے، مثلاً پیغمبر کا مذاق اڑانا۔ غایت شفقت کی وجہ سے ان کے افعال پر رنج وغم کی بڑی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کو طبعی اذیت پہنچا رہے تھے بلکہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لا رہے تھے بلکہ ایسے کام کر رہے تھے جن سے ان کا ایمان لانا زیادہ سے زیادہ غیرمتوقع ہوتا جا رہا تھا۔ وحی کے ذریعے ان کو یہ بتا کر کہ جو لوگ ایمان لا چکے، ان کے علاوہ اب کوئی ایمان نہیں لائے گا، ان کو اس رنج وغم سے نجات دے دی گئی کہ اب وہ جو بھی کریں کچھ فرق نہیں پڑتا کیوں کہ کفر

پر موت ان کا مقدر ہوچکی ہے۔

بہت سے اعمال ایسے ہوتے ہیں جو ایمان سے روکنے والے ہوتے ہیں، مثلاً پیغمبر کا استہزا یا اس سے قتال۔ ذوقاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اعمال اگر مسلمان سے سرزد ہوں تو ان کے ایمان کے جاتے رہنے کا خطرہ ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ایمان چھن جائے اور ان کو پتا بھی نہ چلے بلکہ جب کوئی آزمائش کا وقت ہوتو پتا چلے یا مرتے وقت پتا چلے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝

(سورۂ ہود، آیت ۳۸)

اور وہ کشتی تیار کرنے لگے اور (اثنائے تیاری میں) جب کبھی ان کی قوم میں سے کسی رئیس گروہ کا ان پر گزر ہوتا تو ان سے ہنسی کرتے، آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو۔

ایک بڑے طوفان اور زبردست باد و باراں کی خبر جو نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو دی اور پھر اسی طوفان سے بچنے کے لیے کشتی بنانے لگے تو اس پر ان کی قوم کے رؤسا کے ہنسنے کی ایک وجہ تو وہی تھی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے کہ پانی کا کہیں نام ونشان ہی نہیں تھا یعنی اس خبر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے بزعمِ خود یہ بے وقوفی کی بات تھی کہ بارش اور طوفان میں تو کشتی والے کوشش کرتے ہیں کہ ساحل پر آکر پناہ لیں یا کسی اونچی جگہ جاکر پناہ لیں اور یہاں خود کو پانی کے حوالے کردینے کی تیاری کی جارہی ہے۔ دوسری طرف یہ واقعہ نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے ایمان کی پختگی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وحی پر ایسا کامل یقین تھا کہ ذرا سا بھی تخلف کا گمان نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کی نبوت کی بھی ایک مضبوط دلیل ہے کیوں کہ جن کو رسالت میں شبہ تھا اکثر اس بنا پر تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی

انسان کو کس طرح دوسرے انسانوں کی طرف مبعوث کرسکتا ہے؟ انھیں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ میں شبہ تھا۔ اگر ان پر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح ہوجاتی اور ان کو اس بات کا علم ہوجاتا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں اور ان کو معجزات دیے تھے کہ جو وہ کہہ دیتے وہ ہوجاتا تھا تو ان کو محمد ﷺ کے رسول مان لینے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ رہ گئے وہ لوگ جو پہلے سے کسی نہ کسی رسول کے قائل تھے ان کا ایمان نہ لانا ان کے علما کی ہٹ دھرمی، بددیانتی اور اکلِ حرام کی وجہ سے تھا جو ڈرتے تھے کہ اگر لوگ مسلمان ہوگئے تو ان کی سرداری کا کیا ہوگا اور ان کے وافر خور و نوش کا انتظام کیسے ہوگا۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ (سورۂ ہودؔ، آیت ۴۳)

وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی (میں غرق ہونے) سے بچالے گا۔ نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ نہ کوئی اور چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہوگئی پس وہ (بھی مثل دوسرے کافروں کے) غرق ہوگیا۔

اس آیت سے یہ خیال آیا کہ جن طوفان و حوادث کے تھپیڑوں میں ہم گھرے ہوئے ہیں ان سے ہماری نجات کی یہی صورت ہے کہ ہم نبیِ کریم ﷺ کی سنت کی کشتی میں سوار ہوجائیں اور باہر جو کچھ ہوتا رہے، ہم کشتی میں مضبوطی سے بیٹھے رہیں، ان شاء اللہ صحیح سالم نکل آئیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم امریکا، روس یا کسی اور طاقت کے پہاڑ پر بھی چڑھ جائیں تو ہم اس طوفان سے نہیں بچ سکتے۔ پہاڑ جیسا مستحکم اور محفوظ سہارا بھی کچھ کام نہیں آتا اگر اللہ رحم نہ فرمائیں۔ حالانکہ پہاڑ پر چڑھ جانا حضرت نوح علیہ السلام

کے اختیار میں تھا جب کہ امریکا یا روس کی حفاظت میں آجانا ہمارے اختیار میں بھی نہیں ہے جس کا مشاہدہ امریکا کی غلامی کر کے بارہا ہو چکا ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍO وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍO (سورۂ ہودؑ، آیت ۵۹، ۶۰)

اور یہ قومِ عاد تھی جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم (اور) ضدی تھے (اور ان افعال کا نتیجہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی خوب سن لو قومِ عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو رحمت سے دوری ہوئی (دونوں جہان میں) عاد کو جو کہ ہود (علیہ السلام) کی قوم تھی۔

اتباعِ امر میں اتباعِ قول بھی شامل ہے۔ کتنی بدبختی کی بات ہے کہ کوئی قوم رسول کی پیروی نہ کرے جو بلند کردار کا بھی مالک ہو، علم وفہم میں بھی اعلیٰ مقام رکھتا ہو اور ان کا خیرخواہ بھی ہو اور بات مانے تو ایسے بدمعاش نانہجار کی جو اللّٰہ سے سرکش ہو اور اس کی مخلوق پر جبار ہو۔ اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہے یا بزدلی کہ تلوار سر پر لٹک رہی ہو تو سمجھتا ہے کہ یہی خدا ہے یا لالچ کہ اس سے دوستی رہی تو فائدہ ہی ہے۔ بہرحال کوئی بھی وجہ ہو اس بدبختی کے اثر سے دنیا میں بھی لعنت کا مستحق ہوا اور آخرت میں بھی۔

رسول ﷺ کی نافرمانی اور سرکشوں کی فرماں برداری میں ہمارا کیا حال ہو رہا ہے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَO اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰکَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَO مِنْ دُوْنِہٖ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِO اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍO (سورۂ ہودؑ، آیت ۵۳۔۵۶)

ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے ہودؑ! آپ نے ہمارے سامنے کوئی دلیل تو پیش کی نہیں اور ہم آپ کے کہنے سے تو اپنے معبودوں (کی عبادت) کو چھوڑنے والے ہیں نہیں اور ہم کسی طرح آپ کا یقین کرنے والے نہیں (اور) ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آپ کو کسی خرابی میں (مثل جنون وغیرہ کے) مبتلا کردیا ہے۔ ہود (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (علی الاعلان) اللّٰہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی (سن لو اور) گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے (بالکل) بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریکِ (عبادت) قرار دیتے ہو سو تم (اور وہ) سب مل کر میرے ساتھ (ہر طرح کا) داؤ گھات کرلو (اور) پھر ذرا مجھ کو مہلت نہ دو، میں نے اللّٰہ پر توکّل کرلیا ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمھارا بھی مالک ہے، جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔

یہ اصلی ایمان اور توحیدِ خالص ہے کہ پوری قوم کو کھلا ہوا چیلنج دے دیا کہ تم سب مل کر میرے خلاف کید کرو۔ تم سب مل کر ہر طرح کا داؤ فریب میرے ساتھ کرلو۔ تم بھی اور جنھیں تم اللّٰہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ خدا سمجھتے ہو وہ بھی، پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو میں نے اللّٰہ پر توکّل کرلیا ہے۔ یہی توحید ہے کہ ساری دنیا اگر مل کر تم کو ذرہ برابر نقصان پہنچانا چاہے تو یقین کرلو کہ تم کو ذرّہ برابر بھی وہ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور تمام دنیا مل کر بھی تم کو ذرّہ برابر بھی نفع پہنچانا چاہے تو نہیں پہنچا سکتے اِلاّ یہ کہ ہمارا رب چاہے جو وحدہٗ لاشریک ہے، تمھارا بھی رب ہے اور ان سبھوں کا بھی رب ہے۔

چو بر پائے ریزی زرش
چو فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نہ باشد نہ کس
ہمیں است بنیاد توحید و بس

اس مضمون کو پوری وضاحت کے ساتھ ایک حدیث شریف میں بیان فرمایا گیا ہے: عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما قال کنت خلف النبیﷺ یوما فقال یاغلام انی اعلملک کلمات: احفظ اللّٰہ یحفظلک، احفظ اللّٰہ یجدہ تجاھک۔ اذا سألت فاسئل اللّٰہ واذا استعنت فاستعن باللّٰہ، واعلم ان الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشیء لم ینفعوک الا بشیء قد کتبہ اللّٰہ لک وان اجتمعوا علی ان یضروک بشیء لم یضروک الا بشیء قد کتبہ اللّٰہ علیک، رفعت الاقلام وجفعت الصحف۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح، ریاض الصالحین، ص۴۲۔)

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُO

(سورۂ ہودؑ، آیت ۸۷)

وہ لوگ یہ (یہ تمام نصائح سن کر) کہنے لگے کہ اے شعیبؑ کیا تمھارا (مصنوعی اور وہمی) تقدس تم کو تعلیم کر رہا ہے کہ ہم ان چیزوں (کی پرستش) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں یا اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ ہیں بڑے عقل مند دین پر چلنے والے۔

جو لوگ نماز کو ritual (رسمی چیز) کہتے ہیں ان کا یہاں رد ہے کہ نماز دراصل معبودانِ باطل کی عبادت سے روکتی ہے اور ہمیں اپنے مال کے خرچ کرنے پر بھی پابندی

لگائی ہے کہ اس طرح خرچ کرو اور اس طرح خرچ نہ کرو۔ اس طرح مال میں اضافہ جائز ہے اور اس طرح ناجائز ہے۔

لیکن جو لوگ اپنی خواہش کی پیروی (اتباعِ شہوات) میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنی نمازوں کو ضائع کر رہے ہیں یعنی اگر پڑھ رہے ہیں تو صرف صورتاً پڑھ رہے ہیں، اللہ کو یاد کرنے کے لیے نہیں پڑھ رہے ہیں یا منافقانہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور اگر نہیں پڑھ رہے ہیں تو اسی وجہ سے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ خواہشاتِ نفس نہیں چھوڑ سکتے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (سورۂ ہودؑ، آیت ۸۸)

شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوت) دی ہو تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمھارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہے اور مجھ کو جو کچھ توفیق ہوجاتی ہے صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے اسی پر میں بھروسا کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

جس طرح شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے میں ان کی قوم کو ایک قباحت یہ تھی کہ وہ اپنے اموال میں سیاہ و سفید کے مالک نہیں رہتے تھے، آج بھی مومنین کو اپنے اموال میں سیاہ و سفید کا اختیار نہیں ہے اور اگر وہ صحیح معنی میں نماز پڑھیں تو یہ پابندی ان کے لیے آسان ہوجاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خیرخواہ اور مخلص کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ جو دوسروں کو کہے وہ خود بھی کرے۔ یہ نہیں کہ اپنے اخلاق و معاملات تو درست ہیں نہیں صرف دوسروں پر تبلیغ کر رہے ہیں۔

یَوْمَ یَاْتِ لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِہٖ فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌO فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَّ شَھِیْقٌO خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُO وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍO (سورۃ ھودؑ، آیت ۱۰۵۔ ۱۰۸)

(پھر) جس وقت وہ دن آوے گا کوئی شخص بدون خدا کی اجازت کے بات تک (بھی) نہ کر سکے گا پھر ان میں بعضے تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعضے سعید (یعنی مومن) ہوں گے سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ پکار پڑی رہے گی (اور) ہمیش ہمیش کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (کیوں کہ) آپ کا رب جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے (اور) وہ اس میں (داخل ہونے کے بعد) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔

دراصل دو ہی گروہ ہیں شقی اور سعید، یعنی جو امتحان میں فیل کر گئے اور جو امتحان پاس کر گئے۔ اس میں ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ جس کا جیسا درجہ اس کا ویسا امتحان۔ پانچویں درجے کا لڑکا پاس کر جائے یا میٹرک کا یا بی اے کا۔ پاس کرنے والے

سب ایک طرف ہیں البتہ ان کے درجات ہیں۔ اسی طرح بی اے کا لڑکا فیل کر جائے یا ایم اے کا فیل کرنے میں دونوں برابر ہیں۔ اور یہ جو بعض جگہ ''سابقون'' کا گروہ الگ بتایا گیا ہے وہ ایسا ہے جیسا امتیازی پوزیشن حاصل کرنا یا سونے کا تمغا حاصل کرنا۔ فیل کرنے میں کوئی امتیازی درجہ یا تمغا نہیں ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی تعلیم ملتی ہے کہ آدمی چاہے باطنی طریقے (یعنی اصلاحِ نفس) کے کسی بھی درجے پر پہنچ جائے فیل ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے اور پاس ہونے کی ہر وقت امید ہے۔ نہ کبر و غرور کی کوئی گنجائش ہے کہ ہم ایم اے میں پہنچ گئے کیوں کہ اگر فیل ہوگیا تو ناکام ہونے والوں میں شامل ہوگا۔ نہ بے فکری کی گنجائش ہے کیوں کہ نہ معلوم تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ آدمی ماں کے پیٹ سے شقی یا سعید پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہنے اور اس کی پناہ مانگتے رہنے کی اور اپنے اعمال جوارح و قلب کی نگرانی کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

آیات نمبر ۱۰۷ اور ۱۰۸ سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ بغیر کسی قدغن کے ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں جگہ الا ماشاء ربک ہے۔ لیکن پہلی آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ ہوسکتا ہے کسی دوزخی کو کبھی دوزخ سے نکال لیا جائے جیسے گناہگار مومنوں کے بارے میں ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتی ہمیشہ ان شاء اللہ جنت ہی میں رہیں گے کیوں کہ وہاں لامحدود عطا کا ذکر ہے۔

یہیں سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ساری دنیا کو بھی جہنم میں بھیج دیں تو ان کے عدل میں ذرّہ برابر کمی کا تصور نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ فعال لما یرید ہیں اور اگر وہ ساری دنیا کو جنت میں بھیج دیں تو ان کی عطا کو کون روک سکتا ہے اور جنت میں جانا حقیقتاً محض ان کی عطا ہے بلکہ جو بھی بھلائی انسان کو پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہی ہے۔ وہ ایسے ہی بخشش والے ہیں۔ اس بات کو پوری طرح ذہن نشین کرنا ہوگا جبھی عبدیت کا حق ادا ہوسکے گا (یعنی حق ادا کرنے کی طرف اقدام ہوگا کیوں کہ پورا حق تو ادا ہونا محال ہے) جبھی انسان تمام عمر مجاہدات کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے

ڈرتا رہے گا اور حقیقتاً اللہ تعالیٰ سے ایمان والے اور علما ہی ڈرتے ہیں جب ہی اکرم الخلوقات حضور نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بھی اپنے اعمال کی بنا پر نہیں جائے گا (بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے جنت میں جائے گا اور) میں بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود عطا کی ایک جھلک اگلی سورت، سورۂ یوسفؑ میں نظر آتی ہے کہ پوری کوشش کے باوجود ان کے بھائی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے، بلکہ ایک قدم اور آگے چل کر یہ دیکھنے کی بات ہے کہ جب وہ اندھے کنویں میں ڈال دیے گئے جس قعر سے وہ خود نہیں نکل سکتے تھے، وہیں سے ان پر عطا اور داد و دہش کا سلسلہ شروع ہوا اور جب سارا قصہ عطا اور احسان کا اور یوسف علیہ السلام کو ظاہری اور باطنی عروج کی چوٹی پر پہنچانے کا بیان فرما چکے تو فرمایا کہ ہم جس پر چاہتے ہیں اپنی رحمت اس پر نازل کردیتے ہیں... نصیب برحمتنا من نشاء... اور اپنے بندوں کا دل رکھنے کے لیے کہ کہیں وہ اعمال سے دل برداشتہ نہ ہوجائیں فرمایا لا یضیع اجر المحسنین۔ اور پھر فرمایا ولاجر الاخرۃ... یتقون۔ یعنی اجر تو ضرور دیں گے خواہ دنیا میں بھی دے دیں لیکن آخرت میں تو ضرور بہترین بدلہ محسنین کو ملے گا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○

(سورۂ ہودؑ، آیت ۱۱۲، ۱۱۳)

تو آپ جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہِ دین پر) مستقیم رہیے اور وہ لوگ بھی (مستقیم رہیں) جو کفر سے توبہ کرکے آپ کی ہمراہی میں ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو یقیناً وہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور (اے مسلمانو) ان ظالموں کی طرف مت جھکو کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جاوے اور اس وقت خدا کے سوا تمھارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر حمایت تو تمھاری ذرا بھی نہ ہو۔

آیت نمبر۱۱۲ میں جو جلال ہے اس کا واقعی یہی اثر ہونا چاہیے کہ آدمی ہر وقت خشیۃ اللہ میں مبتلا رہے اور پھر آپ ﷺ سے اشارتاً یہ مطالبہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو بھی بالکل سیدھا رکھیے اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں جو تم کرتے ہو۔

دوسری آیت میں خصوصیت کے ساتھ کافروں اور مشرکوں کی طرف جھکاؤ سے منع کیا گیا ہے، یعنی صرف اعمال میں سیدھا رہنا مطلوب نہیں ہے بلکہ دل کو بھی بالکل سیدھا رکھنا ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ۝ (سورۂ ہودؑ، آیت ۱۱۴)

اور (اے محمد ﷺ) آپ نماز کی پابندی رکھیے دن کے دونوں سروں پر (یعنی اوّل و آخر میں) اور رات کے کچھ حصوں میں بے شک نیک کام (نامۂ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو، یہ بات ایک (جامع) نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لیے۔

بالکل سیدھا رہنا اور اعمال میں کبھی کوئی کوتاہی یا کجی نہ آنے دینا انسانوں کے بس میں نہیں ہے اس لیے اوامر کو بجالاتے رہنا اور نواہی سے بچنا اور کوتاہیوں پر استغفار اور ندامت کافی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے حسنات میں یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ سیئات کو مٹا دیتی ہیں اور نماز پڑھتے رہنے کو خصوصیات کے ساتھ سیئات کو محو کرنے میں دخل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس گناہوں میں عام قاعدہ یہ نہیں ہے کہ گناہ کرنے سے نیکیاں زائل ہوجاتی ہیں۔ گناہ کرنے سے نیکی کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور قلب پر ایک سیاہ دھبا پڑ جاتا ہے اور بعض گناہ کی یہ خاصیت حدیث شریف میں بتائی گئی ہے جن کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے کہ وہ گناہوں کو کھا جاتی ہیں جیسے زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے یا جلا دیتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے، مثلاً غیبت اور حسد لیکن سچی

توبہ کرنے سے وہ گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں اور قلب کی صلاحیت درست ہوجاتی ہے اور نیکیاں واپس آجاتی ہیں (rétrieve ہوجاتی ہیں) جیسے آدمی کی کوئی گم شدہ چیز واپس مل جائے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ○ (سورۂ ہودؑ، آیت ۱۱۵)
اور صبر کیا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نیکوں کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

یعنی نیک کام کا اگر بدلہ جلدی نہ ملے تو بے صبری نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہرگز احسان کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں فرماتے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان کوئی نیک کام کرے یا کسی کے ساتھ نیکی کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ ہی سے اجر کی امید رکھنی چاہیے اور چاہے عارضی طور پر اس کو نقصان یا اذیت اپنی نیکی کی وجہ سے پہنچے مگر کبھی نہ کبھی ضرور اسے نیکی کا بدلہ ملے گا لیکن اس کے لیے صبر کی ضرورت ہے جس کا انتہا موت تک ہے کیوں کہ مرنے کے بعد ضرور اجر ملے گا۔

نیک اعمال کو ضائع کرنے والے اعمال بے صبری کی وجہ سے ہیں، مثلاً حسد کا بے صبری سے گہرا تعلق ہے۔ اگر جنت میں الطاف وعنایاتِ خداوندی کا یقین ہو تو دنیا میں کسی کو کچھ مل جائے تو یہ حسرت کبھی بھی نہ ہو کہ کاش یہ چیز اس کو ملنے کی بجائے مجھے ملتی۔ اسی طرح غیبت اور بے صبری میں یہ رشتہ ہے کہ آدمی دوسروں کی برائی اس لیے کرتا ہے کہ لوگ اس کی اچھائی کے معترف ہوں (یعنی اس کو appreciate کریں) اگر آدمی اپنی اچھائیوں کو خدا کی طرف سے سمجھے اور اسے یقین ہو کہ باوجودیکہ یہ اچھائی صرف عطائے خداوندی ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں اس کا بدلہ دیں گے تو وہ کبھی دوسروں کی برائی بیان کرکے دراصل اپنی اچھائی لوگوں پر ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے۔
یہاں صبر کو جس کی تفصیل آیاتِ ماقبل میں آچکی ہے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔

یعنی استقامت اختیار کرو جیسا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ انہ بما تعملون بصیر۔ ظالموں کی
طرف مت جھکو۔ نماز قائم کرو دنیا میں جو بندے درجۂ احسان پر فائز ہیں انھیں ہر وقت
اس کا احساس رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں اور یہی احسان کی تعریف حضور
نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے... فانہ یراک (یعنی اگر تم اس کونہیں دیکھ سکتے تو وہ تمھیں
دیکھ رہا ہے)۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝(سورۂ ہودؑ، آیت ۱۱۶، ۱۱۷)

تو جو امتیں تم سے پہلے ہوگزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک میں فساد (یعنی کفر و شرک) پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچا لیا تھا اور جو لوگ نافرمان تھے وہ جس ناز ونعمت میں تھے، اُسی کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہوگئے اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کے سبب ہلاک کردے اور ان کے رہنے والے (اپنے اور دوسروں کی) اصلاح میں لگے ہوں۔

آیت نمبر ۱۱۵ میں تسلی دی گئی ہے کہ کبھی نہ کبھی نیکیوں کا بدلہ ضرور ملے گا۔
آیت نمبر۱۱۶ سے ظاہر ہوتا ہے کہ برائیوں سے منع کرنے والے (جو ایک نیک عمل ہے)
عذاب سے بچ جاتے ہیں خواہ ان کے منع کرنے کا کچھ بھی اثر قوم پر نہ ہو۔ ایک بات
یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ فساد اور ظلم سے منع کرنا خواہ وہ صرف قول ہی سے کیوں نہ ہو
عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے جو لوگ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں وہ نہیں
بچتے۔ لیکن اگر وہ دل سے برا سمجھتے رہے ہیں اور ایمان کا ادنیٰ درجہ ان میں موجود ہے تو

امید ہے آخرت میں بخش دیے جائیں۔

آیت نمبر ۱۱۷ میں ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جہاں کے لوگ مصلحین ہوں وہاں اللہ تعالیٰ ہلاکت نہیں بھیجتے، یعنی جہاں غالب اکثریت اچھے لوگوں کی ہو وہاں عذاب نہیں آتا۔ اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے شعائر کی بے حرمتی ہو رہی ہے، اس کی نافرمانی ہو رہی ہے، ملک میں ظلم اور فساد ہو رہا ہے اور ہم منع نہیں کرتے۔ منع کرنا تو درکنار اکثر معصیتوں سے تو ہمارے دل میں بھی نفرت پیدا نہیں ہوتی کیوں کہ ہم ان کے خوگر ہوگئے ہیں۔ اچھے خاصے نمازی، پرہیزگار لوگ معصیتوں کی طرف سے بے حس ہوگئے ہیں بلکہ بہت سے نمازی کفار کا معاشرہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے عورتیں نماز پڑھتی ہیں، روزے رکھتی ہیں اور آدھی آستین پہنے ہوئے بے پردہ باہر نکلتی ہیں اور گھر میں محرم نامحرم کی تمیز نہیں ہوتی۔ اگر خدانخواستہ مواخذہ ہوجائے تو ہم میں سے شاید کوئی بھی بچ نہ سکے۔

الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِO اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَO نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَO اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَO (سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۔۴)

الٓر، یہ آیتیں ہیں ایک کتابِ واضح کی ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کو تاکہ تم (بوجہ اہلِ لسان ہونے کے اولاً) سمجھو، (اور تمھارے واسطے سے اور لوگ سمجھیں) ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس (کے بھیجنے) کے ذریعے سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس کے قبل آپ محض بے خبر تھے (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب کہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے کہا کہ ابا میں نے

(خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں اور ان کو اپنے روبرو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس سورہ کو احسن القصص غالباً اس لیے فرمایا گیا کہ پوری تفصیل سے ایک جگہ واقعات کے تسلسل (sequence) کے ساتھ یہی ایک قصہ بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس ایک قصے میں اتنی نصیحتیں اور عبرت آموز واقعات کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ یہ اپنی جگہ منفرد قصہ ہے۔

اتمامِ نعمت یوسف علیہ السلام پر بھی اسی طرح کا تھا جس طرح حضرت ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر تھا۔ گرچہ درجات میں باہم مختلف ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی جو نعمت ہوتی ہے وہ کامل ہوتی ہے:

آیات للسائلین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں سبق آموز بھی ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جنھوں نے اپنے صاحب زادے کو اس قصے کو اپنے بھائیوں سے نقل کرنے کو منع کیا تھا، یہ غالباً ان کا کشف تھا جس میں آنے والے واقعات کی پوری تفصیل کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز ایک قسم کی پیش آگاہی (premonition) بھی ہوسکتی ہے۔

''مکنا'' کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک تو جب عزیزِ مصر نے ان کو خریدا تھا تمکین ان کی تربیت کی غرض سے تھی تاکہ وہ پورے آرام و عافیت سے ایک خاص ماحول میں تربیت پائیں اور دوسری جگہ وہاں آیا ہے جب ان کو زمین کے خزانوں پر دسترس دے دی گئی تھی۔ یہ دوسری تمکین تربیت مکمل ہونے (maturity) کے بعد دی گئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے برائی اور بے حیائی سے بچا لیا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے ہی اپنا خاص بندہ ہونے کے لیے چن لیا تھا، یعنی یہ انعامات محض فضل بلاسبب تھے۔ ہر واقعہ جو ہوتا ہے جس سے ہمارا تعلق ہوتا ہے اس کی

نسبت خالق کی طرف بھی ہوتی ہے، بحیثیتِ خالق فعل ہونے کے اور مخلوق کی طرف ہوتی ہے، بہ نسبت فاعل ہونے کے۔ اس پر جزا و سزا بھی ہے۔ تو یوسف علیہ السلام کا بچ جانا، ان کے لیے جزا کا باعث ہوا اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ان پر بڑا فضل ہوا۔

یہ بات کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا زیبا نہیں ہے، ہم پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک نہ کر کے ہم پر بڑا فضل کیا ہے۔ اس پر شکر واجب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (یعنی پھر بھی شرک کرتے ہیں، خفی یا جلی)۔

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے صبر اور شکر اور تبلیغِ توحید کو ان کی طرف منسوب فرمایا اور ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا کہ ہم اسی طرح محسنین کو جزا دیتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو دنیا میں جو جزا ملی اس کی تفصیل اس قصے میں آ گئی اور آخرت کی جزا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی نیکی کا بدلہ ملتا ہے کم از کم یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ مزید نیکی کی توفیق ہوتی ہے۔

یعقوب علیہ السلام نے جو اپنے بیٹوں کو نصیحت فرمائی تھی کہ ایک دروازے سے سب داخل مت ہونا، یہ ان کے دل میں ایک بات آئی تھی جو انھوں نے کی اور اس پر کوئی تنبیہ نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے (جب کوئی غیر شرعی عقیدے کی بنا پر نہ ہو)۔

ہوسکتا ہے یوسف علیہ السلام نے خود ہی پیالہ رکھ دیا ہو اور پھر لوگوں سے تلاش کرنے کو کہا ہو اور چونکہ یہ سب ان کے بھائی کی رضامندی سے ہوا تھا جن کو وہ روکنا چاہتے تھے اس لیے اس میں کوئی ظلم بھی نہیں ہوا اور نہ کسی کو جھوٹ بولنا پڑا۔

دوسری مرتبہ جب بھائیوں سے ملاقات ہوئی جب کہ ان پر یوسف علیہ السلام کے احسانات کا اظہار ہو چکا تھا اور ان کا تقویٰ اور صبر سب پر مسلّم ہو چکا تھا اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک جو تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اس میں گو ایک طرح کی خودستائی ہے مگر اس

کے لیے نہیں جو اپنی ہر اچھائی کو اللہ تعالیٰ کا انعامِ محض سمجھ رہا ہو۔ یہاں گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان انہ من یتق و یصبر ...الخ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے نکل رہا ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۵)

انھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے روبرو بیان مت کرنا پس وہ تمھاری (ایذا رسانی کے) لیے کوئی خاص تدبیر کریں گے بلاشبہ شیطان آدمی کا صریح دشمن ہے۔

معلوم ہوا کہ کتمانِ سِر (یعنی اپنا راز پوشیدہ رکھنا) حکمت کا پہلا سبق تھا جو حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کے والدِ ماجد نے سکھلایا۔ اس آیت کے بعد ہی اس خواب کی تعبیر ہے وکذلک یجتبیک ...خواب بھی ایک راز ہے جسے ہر کس و ناکس کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے ہدایت کی کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں سے نہیں کہنا ورنہ وہ تمھارے خلاف خفیہ تدبیریں کریں گے۔ جس طرح یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب اپنے والد سے بیان کیا اسی طرح اپنے والد یا مربی یا شیخ کے سامنے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس پر قیاس کرکے کوئی راز کی بات ایسی نہیں ہے جو دوسروں سے کہہ دی جائے۔ بلاضرورت راز کی بات کسی سے کہنا مصلحت کے خلاف ہے جس کی حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے:

چوں کہ اسرارت نہاں در دل بود — آں مرادت زود تر حاصل بود
گفت پیغمبر کہ ہر کو سر نہفت — زود گردد با مراد خویش جفت

(یہ اشارہ اسی حدیث شریف کی طرف ہے استعینوا فی الحوائج بالکتمان، کلید

مثنوی، حضرت تھانویؒ)

گرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی پیغمبر کی اولاد تھے لیکن شیطان ہر وقت انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور وہ ہماری دشمنی کی وجہ سے بھائیوں میں حسد، رقابت اور ناچاقی پیدا کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔

ایک اور نکتہ یہاں پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ برائی اور دشمنی کو اپنے اصلی دشمن کا فعل قرار دینے سے آپس کی تلخیاں کم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ چنانچہ تمام واقعات گزرنے کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف فرما دیا تب بھی بھائیوں کی پچھلی دشمنی کو شیطان ہی کا فعل قرار دیا تاکہ دل سے قصور معاف ہوجائے اور بھائیوں کو بھی زیادہ شرمندگی نہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(سورۂ یوسفؑ، آیت ۶)

اور اسی طرح تمھارا رب تم کو منتخب کرے گا اور (تم کو علومِ دقیقہ بھی دے گا مثلاً) تم کو خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور (نعمتیں دے کر بھی) تم پر اور یعقوب کے خاندان پر اپنا انعام کامل کرے گا جیسا اس کے قبل تمھارے دادا پردادا یعنی ابراہیم و اسحاق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کرچکا ہے، واقعی تمھارا رب بڑا علم و حکمت والا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں تاویل الاحادیث کا ذکر تین آیتوں میں ہے۔ ایک یہاں جو یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے پیشین گوئی کی۔ دوسرے آیت نمبر۲۱ میں جب یوسف علیہ السلام غلام بنا کر پہنچے گئے جس کے بعد

کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یوسف علیہ السلام کسی اعلیٰ مرتبے پر پہنچیں گے لیکن اسی واقعے کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت یعنی علمِ تاویل الاحادیث کا ایک زینہ بتا رہے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور علمِ کاملہ کا پتا چلتا ہے۔ واللّٰہ غالب علیٰ امرہ۔ تیسری جگہ آیت نمبر ۱۰۱ میں جب پیشین گوئیاں پوری ہوچکی تھیں تو یوسف علیہ السلام (آیت نمبر ۶۱) اللہ تعالیٰ کی دو بڑی نعمتوں کو یاد کرکے اور ان کا ذکر کرکے (مملکت کا مالک ہونا اور تاویل الاحادیث جاننا) بڑے الحاح وزاری کے ساتھ دعا فرماتے ہیں کہ اسلام پر خاتمہ ہو اور صالحین کے ساتھ حشر ہو۔

تاویلِ احادیث حکمت کا ایک اہم شعبہ معلوم ہوتا ہے یعنی بات سن کر اس کی تہہ کو پہنچ جانا۔ ظاہر سے باطن کو پہچان لینا، خیرِ کثیر ہے جو دنیاوی حکومت اور جاہ و جلال سے بڑی ہے اس لیے کہ (۱) یہ اجتبیٰ اور اتمامِ نعمت کے درمیان مذکور ہے۔ (۲) یہ اٰتیتنی من الملک کے بالمقابل مذکور ہے اور (۳) یہ انتظامِ مملکت کے لیے ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کو یہ عطا ہو اس کو ملک بھی عطا ہو۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تاویل احادیث دنیاوی نعمت ہونے کے علاوہ آخرت کی بھی بڑی نعمت ہے کیوں کہ جو ظاہر کی باتوں سے باطن تک پہنچ جائے گا وہ شیطان کے کہے کو پہچان لے گا اور کسی مفسد کی گمراہ کن باتوں میں نہیں آئے گا خواہ وہ کتنی ہی تقویٰ کی باتیں معلوم ہوں نیز جو شخص نفس کی تاویلات پہچان گیا اور اس کے کید سے واقف ہوگیا، وہ بہت سے گناہوں سے بچ گیا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اتمامِ نعمت کے لیے نعمتوں کی کمی یا زیادتی معیار نہیں کیوں کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کے لیے اتمامِ نعمت ہوئی اسی طرح ان کے آبا پر اتمامِ نعمت ہوئی (کما اتمھا علی ابویک...) گرچہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے لیکن کمال اور اتمام کے لیے کمیت معیار نہیں ہے۔ یوسف علیہ السلام کو نعمت بھی ملی وافر ملی اور نقائص سے پاک ملی مثلاً عفت، تاویلِ احادیث وغیرہ جس طرح سورج اپنی جگہ کامل ہے اور چودھویں کا چاند اپنی جگہ کامل ہے اسی طرح گرچہ مومنین کے درجات میں بے انتہا تفاوت

ہوگا مگر ہر مومن کا ایمان غفرانِ کاملہ اور لطفِ خداوندی سے اپنی اپنی جگہ کامل ہوگا۔ اسی لیے جنتی کہیں گے ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا، یعنی جو نقائص گناہوں کی وجہ سے اس نور میں رہ گئے ہیں وہ مغفرت سے دور ہوجائیں۔

اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ○(سورۂ یوسفؑ، آیت ۹)

یا تو یوسف علیہ السلام کو قتل کر ڈالو یا ان کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال آؤ تو (پھر) تمھارے باپ کا رخ خالص تمھاری طرف ہوجاوے گا اور تمھارے سب کام بن جاویں گے۔

اس طرح کا منصوبہ کہ پہلے گناہ کرلو پھر بعد میں نیک ہوجائیں گے کبھی سچا ارادہ نہیں ہوتا اور نفس اور شیطان کا فریب ہوتا ہے۔ نفس کا فریب بہت باریک چیز ہے کیوں کہ یہ ہم سے بھی پوشیدہ رہتا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی اس قبیح حرکت کو اور ان کے ظلم کو شیطان کی طرف منسوب کیا کہ شیطان نے ان کے اور ان کے بھائیوں کے درمیان دشمنی پیدا کردی تھی۔

لہٰذا یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہیے کہ آج کی برائی کل کی مجوزہ اچھائی سے neutralise ہوجائے گی یا معاف ہوجائے گی، بلکہ بسا اوقات ایک گناہ کی وجہ سے کئی گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو بھی ایک گناہ کے چھپانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑا اور پھر اس پر زمانۂ دراز تک اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ مصر میں جب بادشاہ کا پیالہ گم ہوا تو انھوں نے اپنے بھائی پر تہمت لگائی کہ اس بھائی نے چوری کی تھی۔ دنیا کی بھی ذلت ہوئی اور بعد میں جو صالحین میں سے بھی جانے کا ارادہ تھا وہ بھی پورا نہیں ہوا۔ اور نہ والد کی محبت حاصل ہوئی جس کے لیے یہ سب کیا۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَالَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝
(سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۱)
سب نے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ہم ان کے (دل و جان سے) خیرخواہ ہیں۔

یعنی ہم ان کے خیرخواہ ہیں پھر آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جانے دیتے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت دراصل خیرخواہی ہے۔ اگر نصیحت کرنے والا خیرخواہی سے نصیحت نہیں کر رہا ہے اور اپنے کو مخاطب سے افضل سمجھ رہا ہے تو اس نصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوگا یا ہوگا تو محض وقتی۔ خیرخواہی میں نظر مخاطب کی بھلائی پر ہوتی ہے یا اس کو کسی برائی سے بچانا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ مخاطب کو حقیر سمجھ کر نہیں پیدا ہوسکتا۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۳)
یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جاوے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو۔

یہ غالباً اس صورت کا عکس حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل پر آیا ہوگا جو بعد میں ان کے لڑکے کہتے ہوئے آئے۔ یا ان کا یہ اندیشہ کشف کی بنا پر ہوگا کہ ان کے لڑکوں کو بہانہ بنانا تھا اور ان کو خوف ہوا کہ شاید ایسا ہی نہ ہو یا ان کی فراست اور عقل مندی تھی کہ انھوں نے سمجھا کہ یہ یوسف علیہ السلام کو راستے سے ہٹانے کا بہانہ ہے۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو انھوں نے اپنے اس اندیشے پر عمل نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کو وحی کے ذریعے

ایسا کرنے سے روکا نہیں گیا تھا اور اسی ابتلا میں اللہ تعالیٰ کی ہزاروں مصلحتیں اور ہزاروں رحمتیں شامل تھیں۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ يَّجۡعَلُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ‌ ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ لَـتُنَـبِّئَـنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ۝ (سورۃ یوسفؑ، آیت ۱۵)

سو جب اُن کو لے گئے اور سب نے پختہ عزم کرلیا کہ ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ تم ان لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو پہچانیں گے بھی نہیں۔

اس وحی کا پوشیدہ رکھنا بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھلا دیا ورنہ ان کے ساتھ کوئی اور کید کیا جاتا۔

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَتَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ‌ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ۝ وَجَآءُوۡ عَلٰى قَمِيۡصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ‌ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَـكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا‌ ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ۝ (سورۃ یوسفؑ، آیت ۱۷، ۱۸)

کہنے لگے کہ ابا ہم سب تو آپس میں دوڑنے میں لگ گئے اور یوسف علیہ السلام کو ہم نے اپنی چیز بست کے پاس چھوڑ دیا بس (اتفاقاً) ایک بھیڑیا (آیا اور) اُن کو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے (کیوں نہ) ہوں۔ اور یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات

بنالی ہے سو (خیر) صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا اور جو باتیں
تم بناتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے۔

آیت نمبر۱۷ میں جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جھوٹ بول کر اپنا سچا ہونا ثابت کرنا چاہا کہ آپ ہماری باتیں مانیں گے نہیں گرچہ ہم سچے ہی ہوں یہ جملہ اب بھی بہت سے جھوٹے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ خصوصاً جو بے ایمان ہیں وہ اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

آیت نمبر۱۸ میں قرائن سے اگر کوئی جھوٹا معلوم ہوتا ہے تو اس کو جزم کے ساتھ یہ کہنا جائز ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اس جملے کی تفسیر میں لکھا ہے i.e. you invented a tale. بلکہ اگر کوئی کسی پر تہمت لگا رہا ہو اور قرائن سے وہ جھوٹ ہو تو اس کو جزم کے ساتھ جھٹلانا واجب ہے جیسا کہ واقعہ افک کے بعد مسلمانوں کی سرزنش کی گئی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ اسی طرح قرائن کی بنا پر کسی واقعے کی تصدیق جائز ہے جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واقعۂ معراج سنتے ہی اس کی پُرزور تصدیق کردی اور ثقہ آدمیوں سے تصدیق کے منتظر نہیں رہے کیوں کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے تو وہ ضرور سچ ہوگا۔

بہرحال حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو جھٹلا تو دیا لیکن چونکہ ان کے گناہ کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور نہ اس پر کوئی وحی آئی تھی اس لیے خاموش رہے اور صبر کیا۔

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۲۱)

اور جس شخص نے مصر میں ان کو خریدا تھا (یعنی عزیزِ مصر) اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو خاطر سے رکھنا کیا عجب ہے کہ (بڑا ہوکر) ہمارے کام آوے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں اور ہم نے اسی طرح یوسف (علیہ السلام) کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہے) اور تاکہ ہم اُن کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں اور اللّٰہ تعالیٰ اپنے (چاہے ہوئے) کام پر غالب (اور قادر) ہے (جو چاہے کرے) لیکن اکثر آدمی (اس بات کو) نہیں جانتے۔

جس نے انھیں خریدا تھا وہ اس جگہ کا حاکم تھا (مشہور ہے کہ عزیزِ مصر تھا) اور چونکہ اس کا خیال تھا کہ ہم شاید اس کو بیٹا بنالیں اس لیے ان کی پرورش پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ غلاموں کی طرح پرورش نہیں کی گئی ہوگی۔ اس طرح کی پرورش سے ایک مصلحت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ''تاویلِ احادیث'' سکھانا تھا۔ گرچہ اس کی تفسیر بعض علما نے خواب کی تعبیر سے کی ہے۔ مگر اس ناچیز کے خیال میں یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مخاطب جو بات کہہ رہا ہے اس کے اصل معنی کیا ہیں۔ بسا اوقات کہنے والا مخاطب کے رعب کی وجہ سے یا بے وقوفی کی وجہ سے یا جھوٹ چھپانے کے لیے پوری بات صحیح طور پر نہیں کہتا لیکن اہلِ فراست اصل بات تک پہنچ جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حکومت کرنے کے لیے یہ فراست ضروری ہے تاکہ وہ دھوکا کھانے سے بچے۔

جس گھر میں حضرت یوسف علیہ السلام پرورش پا رہے تھے اس میں ایک شخص نے اپنی فراست سے (یا الہام) سے لوگوں کو صحیح معیار بتایا تھا کہ جو معاملہ ان کے اور ان کے آقا کی بیوی کے درمیان ہوا تھا اس میں کون سچ بول رہا ہے کون جھوٹ بول رہا ہے اس کا پتا چل جائے کہ اگر ان کی یعنی یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ اس طرح اس خاتون کو مصر کی عورتوں کی سرگوشیوں کا پتا چلا تو اس کو فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ عورتیں اس کے خلاف کیا سازش کر رہی ہیں اور اس کو اس نے اپنی فراست سے ان کو اپنے گھر بلا کر ختم کردیا کہ جس مرد کے بارے میں وہ غلط افواہ اڑا رہی ہیں وہ آدمی نہیں ہے بلکہ ایک شریف فرشتہ ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیۡنٰهُ حُكۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۲۲)

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلا دیا کرتے ہیں۔

یوسف علیٰ نبینا و علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو یہاں پر بھی محسنین کی فہرست میں فرمایا گیا۔ اس کے بعد جیل میں بھی جب ان سے دو قیدیوں نے اپنے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو ان کو کہا کہ آپ محسنین میں سے ہیں اور ان کے بھائیوں نے بھی ان کو اسی لقب سے یاد کیا۔

احسان سے مراد بندوں کے معاملے میں کسی کو بغیر کسی اور کے حق کے ضائع کیے ہوئے اس کے حق سے زیادہ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان بندوں پر یہ ہے کہ وہ بلا استحقاق اس کو اپنی نعمتوں سے نوازتے رہتے ہیں اور بندے کی طرف سے احسان یہ ہے کہ وہ خوب اچھی طرح حقِ عبادت ادا کرتا رہے گویا کہ وہ ہر وقت اور ہر معاملے میں اپنے مالک کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حق تو ادا ہو نہیں سکتا لیکن بندہ اگر اپنی استطاعت بھر فرماں برداری کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کی عبادت کو احسان کے زمرے میں لکھ لیتے ہیں۔

حضرت یوسف علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہاں محسنین کے زمرے میں اس لیے شامل فرمایا گیا کہ آپ (علیہ السلام) عدل و تقویٰ میں اعلیٰ درجے پر فائز ہوں گے۔ اور قیدیوں نے اس لیے کہا کہ آپ کسی کا حق ضائع نہیں کرتے ہوں گے بلکہ دوسروں پر احسان کرتے رہتے ہوں گے اور بھائیوں نے اس وقت کہا، جب آپ (علیہ السلام) کی داد و دہش عام تھی اور ان کے ساتھ بھی خصوصیت کے ساتھ احسان کیا تھا کہ ان کا سامان بھی واپس کرا دیا تھا اور غلہ بھی دے دیا تھا بغیر کسی عوض کے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَکَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَO وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَO (سورۂ یوسفؑ، آیت ۲۳،۲۴)

اور جس عورت کے گھر میں یوسف (علیہ السلام) رہتے تھے وہ اُن پر مفتون ہوگئی اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کو ان کو پھسلانے لگی اور (گھر کے) سارے دروازے بند کردیے اور (ان سے) کہنے لگی کہ آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا اللہ بچائے (گناہ کے علاوہ) وہ (یعنی تیرا شوہر) میرا مربی (اور محسن) ہے کہ مجھ کو کیسی اچھی طرح رکھا ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال (عزم کے درجے میں) جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انھوں نے نہ دیکھا ہوتا تو زیادہ خیال ہوجانا عجب نہ تھا، ہم نے اسی طرح اُن کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں۔

تمام فطری تقاضے اپنا کام کر رہے تھے اور ان کا یہ میلان طبعی میلان تھا جو کمال کے منافی نہ تھا بلکہ اس میلان کا نہ ہونا کمال کے منافی ہے۔ اور یہی طبعی کشش اور ایمان کے تقاضے میں جب مصر کی عورتوں کے پیہم ورغلانے کی وجہ سے جب یوسف علیہ السلام نے محسوس کیا کہ اب بچنا مشکل ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے نزدیک جیل خانے میں رہنا آپ کی نافرمانی سے زیادہ محبوب ہے اور آپ ہی بچائیں گے تو بچ سکوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس نفسانی اور شہوانی ماحول سے ان کو نکال لیا اور وہ جیل چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے خاص بندوں کو بچاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسی بات ہوجاتی ہے جسے لوگ سزا اور مصیبت سمجھتے ہیں لیکن وہ ان کے لیے عین رحمت ہوتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ زنا فحش بات ہونے کے علاوہ بری بات بھی ہے۔ جیسا یہاں فرمایا گیا ہے لنصرف عنہ السوء والفحشاء۔ اور اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے خاص بندوں کو بے حیائی اور برائی سے بچا لیتے ہیں۔

جب تمام راستے مسدود ہوجائیں اور نکلنے کی راہ نظر نہ آئے جیسا یہاں حسب روایت سات دروازے بند کیے گئے تھے اور جب انسان کی نفسانی اور شہوانی خواہش اور ایمان اور دیانت داری کے تقاضوں میں بے انتہا کش مکش ہو جیسا یہاں ہوا ہوگا کہ ایک طرف تمام شہوانی داعیہ اور بات نہ ماننے پر سزا کا خوف، دوسری طرف ایمان کا تقاضا اور ضمیر کی آواز ایسے میں اللہ تعالیٰ ہی راستہ پیدا فرما دیتے ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کے بھی مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔ انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کو پکارا اور ان کو بھی اللہ نے نجات دی۔ ان کی قدرت کامل ہے۔ ان کو پکارنا خواہ پناہ مانگنے کی (استعاذہ کی) شکل میں ہو خواہ استغفار اور ندامت کی شکل میں ہو جیسا یونس علیہ السلام نے لا الہ الا انت... الخ فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے جس کلمے کی تعریف فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ضرور متوجہ ہوتی ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ (سورۂ یوسف، آیت ۳۱)

سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بدگوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ اُن کو بلا بھیجا (کہ تمھاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکیہ لگایا اور ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دے دیا اور کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آجاؤ سو عورتوں نے جو ان کو دیکھا تو (ان کے جمال سے) حیران رہ گئیں اور (اس حیرت میں) اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہنے لگیں حاشا للہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

مکر اس لیے کہ یہ افواہ پھیلانا تھا rumor mongering اور اس کا مقصد ان عورتوں کا عزیزِ مصر کی بیوی کو ذلیل کرنا تھا اور عقل و دانش مندی کا تقاضا تھا کہ اس کو رفع کیا جائے اس لیے خواتین کی نشست کا انتظام کیا گیا۔ جو اس زیرکی کی اعلیٰ مثال تھی۔ جب انھوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کی شکل سے معصومیت اور شرافت ٹپکتی تھی اور ان کو یقین ہوگیا کہ جو خبر گشت کر رہی تھی وہ جھوٹ تھی۔ ایسا شخص کسی عورت کا چوری چھپے آشنا نہیں ہوسکتا۔ بسااوقات فریب اور پروپیگنڈے کے زبانی جواب دینے کی بجائے عملی جواب دینا کہیں بہتر ہوتا ہے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ کَیْدَهُنَّ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ ○ (سورۃ یوسفؑ، آیت ۳۳-۳۵)

یوسف (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب جس (واہیات) کام کی طرف یہ عورتیں مجھ کو بلا رہی ہیں اس سے تو جیل خانے میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو ان کی (صلاح کی) طرف مائل ہوجاؤں گا اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا سو ان کی دعا ان کے رب نے قبول کی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا بے شک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا (اور ان کے احوال کا) خوب جاننے والا ہے پھر مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کو (یعنی عزیز کو اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت (خاص) تک قید میں رکھیں۔

فاستجاب لہ ربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ جیل خانہ جانا اس دعا کی وجہ سے نہیں تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ وہ کیا دعا

مانگ رہے ہیں اور السجن احب الی کہنے کی وجہ سے ان کو تنبیہاً جیل نہیں بھیجا گیا، بلکہ بعد میں کچھ اور باتیں ہوئیں جس سے ان لوگوں نے ان کو جیل ہی بھجوانا زیادہ مناسب سمجھا۔ ان باتوں کا جو ان لوگوں کو بعد میں معلوم ہوئیں یہاں ذکر نہیں ہے۔ مجملاً اس لیے ذکر کردیا گیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ ان کو جیل بھجوانا کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔

تکوینی طور پر یہ بات ایسی ہی ہونی تھی کیوں کہ یوسف علیہ السلام کی تربیت ایک خاص نہج پر ایک خاص مدت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کو منظور تھی۔ چنانچہ جیل کے اندر رہ کر جو ان کو تبلیغ کا موقع ملا اور ان کی شرافت اور کریمی دیکھ کر جیل کے رہنے والے جو ان کے گرویدہ ہوئے، اس سے ان کو عزت و اکرام بھی ملا اور قیدیوں پر ان کی باتوں کا اثر بھی زیادہ ہوا۔ چنانچہ دو قیدیوں نے اپنا خواب ان کو سنایا تو جو ان کی عزت ان کی نظروں میں تھی، وہ یہ کہہ کر ظاہر کی، ''انا نزٰک من المحسنین۔'' اور اس موقعے کو بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے ضائع نہ ہونے دیا بلکہ تبلیغ کرنے میں استعمال کیا۔ اس کے ساتھ یوسف علیہ السلام صبر کی منازل بھی طے کرتے رہے۔ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے مناسب موقع دیکھ کر ایک قیدی سے اشارتاً انھیں رہائی کے لیے کہلوا بھی بھیجا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی مزید تربیت قید خانہ میں منظور تھی اس لیے وہ رہا ہونے والا قیدی اس بات کو بھول گیا اور پھر جب بالآخر بادشاہ نے ان کو بلوا بھیجا تو آپ نے بروقت یہ دریافت کروایا کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے؟ شاید وہ حالات جو اس وقت اربابِ اختیار پر ظاہر ہوئے تھے جن کا ذکر آیت نمبر۳۳ میں ہے، ان میں ان عورتوں کا بھی دخل ہو۔ غرض نہایت عزت اور اکرام سے بادشاہ کے دربار میں پہنچے اور پھر بھی اپنے نفس کی برأت کا اظہار کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر کرتے رہے اور اسی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہے۔ وما ابری نفسی...رحیم۔

قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ○ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۳۷)

(حضرت) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمھارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لیے (جیل خانے میں) ملتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں، یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے، میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں کسی کام کے کرنے کے ارادے کے اظہار سے قبل ''ان شاء اللہ'' زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے۔ اس موقعے پر ان کو بالجزم ہی کہنا چاہیے تھا تاکہ خواب کے تعبیر پوچھنے والوں کو تسلی ہو کہ ان کے خواب کی تعبیر عنقریب مل جائے گی اوراس تسلی کے بعد وہ لوگ جو کچھ ان سے حضرت یوسف علیہ السلام دین کی بات یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید ان کو بتانے والے تھے، اسے غور سے سنیں، بلکہ ایک جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول قرآن شریف میں ہُد ہُد کے بارے میں نقل فرمایا گیا ہے کہ میں ضرور اس کو ذبح کردوں گا اور ضرور... وہاں بھی ''ان شاء اللہ'' نہیں کہا گیا ہے۔ اگر وہ اس جزم کے ساتھ نہیں فرماتے تو وہ جو اپنی رعایا میں ڈر اور خوف پیدا کرنا چاہتے تھے وہ نہیں ہوتا۔ ویسے تو ہر کام ہی میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ جہنم میں خلود فی النار کے بارے میں بھی ہے الا ما شاء ربک۔ اور حضور ﷺ سے جو فرمایا گیا کہ لا تقولن لشیء... الا ماشاء اللہ وہ ایک قاعدہ کلیہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر موقعے پر اور ہر جگہ زبان سے بھی ان شاء اللہ کہا جائے، مثلاً خلیفہ سے بیعت کے موقعے پر یہ نہیں کہا جاتا کہ ان شاء اللہ آپ کی اطاعت کریں گے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ○ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ
اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ○(سورۃ یوسفؑ،
آیت ۳۸، ۳۹)

اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیم علیہ السلام کا اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کا ہم کوکسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں (اور) یہ (عقیدۂ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے اے قید خانے کے رفیقو! متفرق معبود اچھے یا ایک معبودِ برحق جو سب سے زبردست ہے، وہ اچھا (جواب اس کا ظاہر ہے)۔

یہ بات کہ ہم کوکسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک (عبادت) قرار دیں، اللہ تعالیٰ کا ہم پر بڑا فضل ہے۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا اور اپنے باپ دادا کا موحد ہونا ان کو بتا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یہ اللہ کا ہم پر بڑا فضل ہے۔کسی انعام کے متعلق یہ احساس کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے یہی شکر ہے۔نعمتوں کو دل سے اللہ تعالیٰ کا انعام اور احسان سمجھنا شکر کی روح ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امر اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور کسی کو یہ اختیار تفویض نہیں کیا ہے نہ کوئی اپنا شریک بنایا ہے نہ کسی کو خدائی میں اپنا نائب بنایا ہے اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر ایک احسانِ عظیم بتلایا ہے۔ اور پھر لوگوں کو اس بات کا علم بھی دیا ہے یہ بھی احسان ہے۔ ورنہ اگر انسان کو بفرضِ محال بہت سوں کو سجدہ کرنا پڑتا اور الگ الگ کاموں کے لیے الگ الگ خداؤں کے سامنے گڑگڑانا پڑتا تو بہت مصیبت میں پڑ جاتے۔ لوگوں پر عام رحمت یہ ہے کہ جو چاہے توحید کو اپنا کر سیکڑوں خداؤں کی طوقِ غلامی اور نفس پرستی کی مشقت سے آزاد ہوسکتا ہے۔ آیت نمبر ۳۹ میں یوسف علیہ السلام کی یہی بات نقل فرمائی گئی ہے کہ تم خود ہی ذرا غور کر کے دیکھو تو کہ بہت سے خدا بہتر ہیں یا ایک خدا جو اکیلا اور زبردست ہے۔ اگر نعوذ باللہ کئی خدا ہوتے یا اللہ تعالیٰ نے

اپنی قدرت کو چھوٹے چھوٹے خداؤں کو بانٹ دی ہوتی جیسا کہ مشرکین کا عقیدہ ہے تو انسان کتنی مصیبت میں پڑ جاتا۔ یہاں تک کہ اگر ہم کو خود بھی اپنے معاملات کا مختار بنا دیا جاتا تو ہم کس مصیبت میں پڑ جاتے۔ واقعی اللہ تعالیٰ کے اوصاف ایسے ہیں کہ ان میں کوئی بھی شریک نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود اکثر لوگ شکر نہیں کرتے کہ توحید اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس تبلیغ کا جو بشکل سوال تھی کس قدر اثر ہوا ہوگا۔ ان لوگوں کا جواب یہاں نقل نہیں فرمایا گیا کیوں کہ ان کا جواب ظاہر تھا۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ○ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ○ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ○ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ○ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۴۶۔۴۹)

اے یوسف (علیہ السلام) اے صدقِ مجسم آپ ہم لوگوں کو اس (خواب) کا جواب (یعنی تعبیر) دیجیے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دُبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں تا کہ میں اُن لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں اور بیان کروں تا کہ ان کو بھی معلوم ہوجاوے آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر (خوب) غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو تو اس کو بالوں میں رہنے دینا (تا کہ گھن نہ لگ جاوے) ہاں مگر تھوڑا سا جو تمھارے کھانے میں آوے پھر اس کے بعد سات برس اور ایسے سخت (اور قحط کے) آویں گے جو کہ اُس (تمام تر) ذخیرہ کو کھا جاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا ہاں مگر تھوڑا سا جو بیج کے واسطے رکھ چھوڑو گے پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں

لوگوں کے لیے خوب بارش ہوگی اور اس میں شیرہ بھی نچوڑیں گے (اور شرابیں پیویں گے)۔

صدیق نہ صرف مصدق کو کہتے ہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے صادق کو بھی کہتے ہیں جیسا یہاں پر ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر پوچھنے والوں کو جو تعبیر دی اس میں ان شاء اللہ نہیں کہا غالباً اس میں مصلحت یہ ہوگی کہ وثوق کے ساتھ پوچھنے والوں کو بتا دیا جائے اور ایک بار حضور ﷺ کو خطاب ہوا کہ ہرگز کوئی بات (آئندہ کی) کہتے ہوئے ان شاء اللہ کہنا نہ بھولو۔ وہ موقع ایسا تھا کہ وثوق سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر موقعے پر زبان سے ان شاء اللہ کہنا ضروری نہیں ہے۔ جیسا مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ بعض مرتبہ عارفین بھی زبان سے استثنا نہیں کہتے حالانکہ وہ ''جانِ استثنا'' ہوتے ہیں یعنی ان کے دل میں یہ بات ہر وقت رہتی ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے چاہنے سے ہوگا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ○ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ○ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ○ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (سورۂ یوسف، آیت ۵۰۔۵۳)

اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ چنانچہ یہاں سے قاصد چلا پھر جب ان کے پاس وہ قاصد پہنچا (اور پیغام دیا تو) آپ نے فرمایا کہ تو اپنی

سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہے) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے میرا رب ان عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے، کہا کہ تمھارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی خواہش کی، عورتوں نے جواب دیا کہ حاش اللّٰہ ہم کو ان میں ذرا بھی تو برائی کی بات نہیں معلوم ہوئی عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہو ہی گئی میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی اور بے شک وہی سچے ہیں۔ یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تاکہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہوجاوے) کہ اللّٰہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔ اور (باقی) میں اپنے نفس کو (بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیوں کہ) نفس تو (ہر ایک کا) بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔

پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو قید سے نکلنے کی جلدی نہیں تھی۔ ان کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ نکلیں تو سارے الزامات سے اور شکوک سے بری ہوکر نکلیں، اس لیے انھوں نے بادشاہ کے فرستادہ کو واپس کردیا کہ پوچھ کر آؤ کہ ان عورتوں کا کیا حال ہوا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اپنے کردار کو لوگوں کی نظروں میں بھی شکوک وشبہات سے پاک رکھنا محمود ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے کسی موقع پر اپنے ایک صحابی سے فرمایا تھا کہ یہ میری بیوی صفیہ ؓ ہے۔ جب صحابی ؓ نے فرمایا کہ یارسول اللّٰہ بھلا ہمارے دل میں بھی کبھی شبہ پیدا ہوسکتا تھا تو آپ نے فرمایا (جہاں تک مجھے یاد ہے) کہ شیطان انسان کے خون میں چکر لگاتا رہتا ہے اوکما قال ﷺ۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی فراست سے معلوم کرلیا کہ یہ وقت ہے اپنے اوپر سے شکوک وشبہات دور کرلینے کا۔

چوتھی بات یہ کہ یوسف علیہ السلام کو بہکانے والیاں بہت تھیں صرف عزیز کی بیوی نہیں تھی۔ ''راودتن'' کا لفظ اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ اپنے آپ کو تہمت سے بچانا اور اپنی شہرت اچھی رکھنا ضروری ہے لیکن اس کے باوجود اپنے نفس کو بری سمجھنا بھی غلط ہے۔ اس لیے آپ علیہ السلام نے اپنی عاجزی کا اظہار بھی فرما دیا۔ بادشاہ پر اور عوام پر یہ ثابت کردینا ضروری تھا کہ آپ علیہ السلام خائن نہیں تھے اگر بغیر اس اہتمام کے رہا ہوجاتے تو لوگ سمجھتے کہ بادشاہ نے خود ہی معاف کردیا ہوگا کوئی سفارش پہنچ گئی ہوگی۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام جیسے مضبوط کردار کا آدمی بھی اپنے نفس کو برائی سے بری نہیں کہہ رہا ہے تو کسی اور کی کیا مجال جو اپنے کو پاک سمجھے۔ بظاہر یہ باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں کہ ایک طرف تو اپنی پاکی اور معصومیت ثابت کی جارہی ہے۔ دوسری طرف ما ابری نفسی بھی فرما رہے ہیں لیکن حقیقتاً یہ متضاد باتیں نہیں ہیں۔ اپنے کردار کو بے داغ رکھنا اور بری شہرت سے پاک رکھنا بھی ضروری ہے اور اپنے نفس کی شرارتوں سے ہشیار رہنا اور نیکی اور نیک نامی کو اللہ تعالیٰ کا انعام اور اس کی غفور رحیمی کا مظہر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ نفسِ امارہ کا کام برائی پر اکسانا ہے لیکن اللہ تعالیٰ جس پر رحم فرمائیں اس کو برائی سے محفوظ رکھتے ہیں اور یہ رحمت بڑی عام ہے۔ یہاں تک کہ گناہ گار آدمی کو بھی مزید گناہ سے محفوظ رکھتے ہیں حالانکہ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ تک لے جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بغیر توبہ کیے معاف کرتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ دوسرے گناہ کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ اور توبہ کرنے پر تو سب ہی معاف فرما دیتے ہیں اور یہ ان کی غفور رحیمی ہے۔

قال اجعلنی علی خزآئن الارض انی حفیظ علیم O (سورہ یوسف، آیت ۵۵)

یوسف(علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کردو میں (ان کی) حفاظت (بھی) رکھوں گا (اور) خوب واقف ہوں۔

یعنی قحطِ عام کا انتظام کون اپنے سر دھرے تو انھوں نے فرمایا تھا کہ میں کرسکتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ اجعلنی... علیم... آپ(علیہ السلام) نے اس موقعے پر تواضع سے کام نہیں لیا، ورنہ ساری مخلوق تباہ ہوجاتی... کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت پہنچا سکتا ہوں اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضے میں پہنچے گی تو راحت نہیں مل سکتی اور اس کو مال اور جاہ کی بالکل پروا نہ ہو تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو کام اپنے لیے تجویز کیا تھا، وہ اس درجے اور اس نوعیت کا تھا جس کے لیے جسمانی قوت سے کہیں زیادہ علم کی ضرورت تھی۔ اس سے اشارتاً یہ معلوم ہوا کہ نگرانی کے اعلیٰ مناصب مثلاً وزارت کے لیے جو ضروری صلاحیتیں (qualifications) ہیں ان میں حفاظت کرنے کی صلاحیت جس میں امانت، محنت، دیدہ ریزی، دانائی اور بہت سی باتیں شامل ہیں اور علم جس میں حکمت بھی شامل ہے بطورِ خاص ضروری اور اہم ہیں۔ البتہ جہاں افرادی قوت کی ضرورت ہو مثلاً اگر کوئی ملازم رکھنا چاہے تو اس کے لیے قوت اور امانت دو خوبیاں ہیں جن کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک صاحب زادی نے کیا تھا ان خیر من استأ جرت... امانت بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔ ایک کی امانت حضرت شعیب(علیہ السلام) کی صاحب زادیوں نے دیکھا تھا اور دوسرے کی امانت بادشاہ خود دیکھ چکا تھا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے قریب قریب ہم معنی بات لکھی ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ ''انبیا علیہ السلام... ہمدردی خلائق کے لیے مالیات کے قصوں میں پڑنا شانِ نبوت یا بزرگی کے خلاف نہیں

سمجھتے۔ایک شخص مسلمانوں کی خیرطلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی درخواست کرسکتا ہے اور اگر حسبِ ضرورت اپنے بعض اعمالِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود امارت طلب کرے تو اس کا بار اس کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے (یعنی اعانت نہیں ہوتی) یہ اس وقت ہے جب طلب کرنا محض نفس پروری اور جاہ پسندی وغیرہ اغراض کی بنا پر نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ اقول: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منصب طلب کرنا اس لیے بھی ناپسندیدہ بات تھی کیوں کہ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کسی نااہل کو کوئی منصب دیا جائے گا۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۶۴)

یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمھارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا کہ اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف علیہ السلام) کے بارے میں تمھارا اعتبار کرچکا ہوں سو اللہ (کے سپرد وہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک ان کے بیٹوں کا کہنا 'نحفظ اخانا' ویسا ہی جھوٹ تھا جیسا حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ''انا لہ لحافظون'' کہنا تھا لیکن چونکہ ضرورت شدید تھی اس لیے آپ علیہ السلام نے ان کو ان کے بھائیوں کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اور ان کی حفاظت میں کردیا۔ عام قانونِ عدل کے مطابق ان کو بھائیوں کے ساتھ بھیج دینا سخت نادانی ہوگی لیکن اللہ کی رحمت کا قانون ایسا ہے کہ کسی حال میں ناامیدی درست نہیں اگرچہ آدمی خود اپنے آپ کو دشمنوں کے نرغے میں پھنسا دیتا ہے پھر بھی وہ ایسے حفاظت کرنے والے ہیں کہ اس کو اس نرغے

سے صاف نکال لیتے ہیں اور وہ ایسے رحم کرنے والے ہیں کہ ان کے رحم کے سامنے ہمارے گناہوں کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ اگر ہم خود اپنے آپ کو قعرِ ہلاکت میں ڈالنا چاہیں پھر بھی وہ اگر چاہیں تو بچا لیتے ہیں اور بار ہا ایسا ہوا ہے۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ۝ وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۶۶ ۔ ۶۸)

یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اس وقت تک ہرگز اس کو تمھارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے (چنانچہ سب نے اس پر قسم کھائی) سو وہ جب قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انھوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو کچھ بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ ہی کے حوالے اور (چلتے وقت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو! سب کے سب ایک ہی دروازے سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا اور خدا کے حکم کو تم پر سے نہیں ٹال سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا (چلتا) ہے (باوجود اس تدبیرِ ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسا کرنے والوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔ اور جب (مصر پہنچ کر) جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا (اسی طرح شہر کے) اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا (باقی) ان کے باپ کو ان سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا

حکم ٹالنا مقصود نہ تھا لیکن یعقوب (علیہ السلام) کے جی میں (درجۂ تدبیر میں) ایک ارمان (آیا تھا) جس کو انھوں نے ظاہر کردیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے ان کو علم دیا تھا لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔

یہ بات بھی اسی طرح کے خطرے کا عکس دل پر پڑنے کی وجہ سے کہی گئی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ دل میں کوئی خیال از قسم تدبیر آجائے تو یہ جانتے ہوئے بھی اس پر عمل کرنا جائز ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ٹل سکتا۔ کیوں کہ یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کا (کہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا) ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ذوعلم لما علمنا فرمایا۔ گرچہ اس ترکیب سے ان کے بیٹوں کی مصیبت جو ان کے لیے مقدر ہوچکی تھی، نہیں ٹل سکی لیکن غالباً اسی ترکیب کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کو اپنے حقیقی بھائی سے الگ بات کرنے کا موقع مل گیا جس کی وجہ سے آئندہ جو انتہائی پریشانی کی بات پیش آئی، اس میں ان کو تسلی رہی کہ سرکاری آدمی جو کررہے ہیں کرنے دو، میرا وہ کچھ نقصان نہیں کرسکتے، گرچہ بظاہر قید کردیے گئے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ یوسف، آیت ۶۹)

اور جب یہ لوگ (برادران) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں ان سے) کہا کہ میں میرا بھائی یوسف ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا رنج مت کرنا۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ میں تمھارا بھائی ہوں سو جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں، اس پر غمگین مت ہو۔ تو جب وہ اپنے بھائی کے پاس پہنچ کر اپنا سب غم بھول گئے اور اس کے بعد بھی جو کچھ ان کے ساتھ ہوتا رہا مثلاً گرفتاری یا بھائیوں کی افترا پردازی کہ اگر اس نے چوری کی تو اس کے بھائی نے بھی

چوری کی تھی یہ سب ان کے لیے آسان ہوگیا تو ہمارا رب تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے جو دیکھ بھی رہا ہے کہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں بلکہ تکوینی طور پر اسی کے حکم سے ہو رہا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی ایما پر پیالے کی تلاش ہوئی... اور ہم چونکہ بحمداللّٰہ ایمان کی دولت سے مشرف ہیں اس لیے اللّٰہ تعالیٰ ہمارے ولی ہیں تو ہم کیوں نہ مطمئن ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اچھا ہو رہا ہے اور آخر میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ والعاقبۃ للمتقین۔

شاید یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی سے یہ بات اس لیے کہی ہوگی کہ ماضی کی کلفتوں کو بھولنے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی کسی واقعے سے پریشان نہ ہوں کیوں کہ جو آگے ہونے والا تھا وہ ان ہی کی ایما سے ہونے والا تھا مگر اس بات کو بالکل پوشیدہ رکھنا تھا کہ نہ اور بھائیوں کو خبر ہو اور نہ حقیقی بھائی کو۔ روح المعانی میں بھی اسی طرح کی تشریح ہے۔ قال ابن عطیہ: **وعلیٰ ھذا التاویل یحتمل ان یشیر (بما کانوا یعملون) الی ما یعملۃ فتیانہ علیہ السلام من السقایہ ونحو ذلک**... (جلد۱۲، ۱۳، مکتبہ رشیدیہ، صف۲۳)

فلمّا جھّزھُم بِجھازِھِم جعلَ السّقایَۃ فِیْ رحلِ اخیہِ ثُمّ اذّنَ مؤذّنٌ ایّتُھا الْعِیْرُ اِنّکُم لسٰرِقُوْنَO قالُوْا و اقبلُوْا علیْھِم مّاذا تفْقِدُوْنَO قالُوْا نفْقِدُ صُوَاعَ الْملِکِ ولِمنْ جآءَ بِہٖ حِمْلُ بعِیْرٍ وّ انا بِہٖ زعِیْمٌO قالُوْا تاللّٰہِ لقدْ عَلِمْتُمْ مّا جِئْنا لِنُفْسِدَ فِی الْارْضِ وما کُنّا سٰرِقِیْنَ O قالُوْا فما جزآؤُہٗٓ اِنْ کُنْتُمْ کٰذِبِیْنَO قالُوْا جزآؤُہٗ منْ وُّجِد فِیْ رحْلِہٖ فھُو جزآؤُہٗ ؕ کذٰلِکَ نجْزِی الظّٰلِمِیْنَO فبدا باوْعِیتِھِمْ قبْلَ وِعَآءِ اخِیْہِ ثُمّ اسْتخْرجھا مِنْ وّعآءِ اخِیْہِ ؕ کذٰلِکَ کِدْنا لِیُوْسُفَ ؕ ما کانَ لِیاْخُذَ اخاہُ فِیْ دِیْنِ الْملِکِ اِلّآ اَنْ یّشآءَ اللّٰہُ ؕ نرْفعُ

دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ O(سورۂ یوسفؑ، آیت ۷۰-۷۶)

پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان تیار کردیا تو پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلے والو! تم ضرور چور ہو۔ وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے کہ تمھاری کیا چیز گم ہوگئی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہے) اور جو شخص اس کو (لاکر) حاضر کرے اس کو ایک بارِ شتر غلّہ ملے گا اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں۔ یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم لوگ ملک میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں اُن (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا، اچھا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس (چور) کی کیا سزا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا، ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں پھر یوسف(علیہ السلام) نے اپنے بھائی (کے اسباب) کے تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتدا اوّل دوسرے بھائیوں کے (اسباب کے) تھیلوں سے کی پھر (آخر میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کرلیا۔ ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح تدبیر فرمائی یوسف(علیہ السلام) اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر) کے قانون کی رو سے نہیں لے سکتے تھے مگر یہ ہے کہ اللہ ہی کو منظور تھا ہم جس کو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے۔

ہوسکتا ہے یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کا پیالہ (اپنے بھائی کے ایما سے) ان کے سامان میں رکھ دیا ہو اور پھر کسی سے کہا ہو کہ بادشاہ کا پیالہ تلاش کرو۔ اور پھر تمام واقعات ہوگئے۔ دوسرے بھائیوں کے سامان کی پہلے تلاشی لینا بھی ہوسکتا ہے بظاہر اتفاق ہو دراصل حکم تکوینی کے تحت یہ سب ہو رہا تھا کیوں کہ پتا ہلے یا زلزلہ آئے سب حکمِ تکوینی سے ہوتا ہے۔ اب اس حکم تکوینی کی تکمیل میں ہوسکتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام

کی براہِ راست planning (تدبیر) نہ ہو اور وہ اس طرح کام کر رہے ہوں جس طرح حضرت خضر علیہ السلام کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو براہِ راست اپنی طرف منسوب فرمایا ہے "کذلک کدنا لیوسف۔" یہ تدبیر اس لیے ضروری تھی کہ بادشاہ کے قانون کے تحت (دین الملک) وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔

اس واقعے سے مندرجہ ذیل ہدایات ملتی ہیں خصوصاً ایک عہدے دار کے لیے جو ایسے نظام میں کام کر رہا ہوں جو اسلامی نظام نہ ہو جیسے ہماری حکومت کے قوانین اور اندازِ کار ہیں:

(۱) کید کرنا کبھی کبھی ضروری ہوتا ہے اور اگر غرض فاسد نہ ہو تو کرنا چاہیے۔

(۲) اگر ملک میں اسلامی نظام نافذ نہ ہو تو کبھی کبھی صحیح کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور غلط کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے غیر مشروط ظاہری و باطنی پابندی دین الملک کی ضروری نہیں ہے غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کی ضروری ہے۔

(۳) اس طرح منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے کہ کوئی قانونی گرفت نہ ہو سکے اور نہ ہی عوام کی نظر میں بے وقعتی کا سبب ہو۔

(۴) بعض موقعے پر حکومت کے قانون یا کسی حکم سے ٹکر لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقعے پر حکمت اور تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ کام بھی شرعاً غلط نہ ہو اور حکومت کی گرفت میں بھی آدمی نہ آئے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ○ (سورۂ یوسف، آیت ۷۷)

کہنے لگے کہ (صاحب) اگر اس نے چوری کی تو (تعجب نہیں کیوں کہ) اس کا ایک بھائی (تھا وہ) بھی اسی طرح اس کے پہلے چوری کر چکا ہے بس یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا

اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے) ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا
کہ اس (چوری) کے درجے میں تم تو اور بھی زیادہ بڑے ہو اور جو کچھ تم بیان
کر رہے ہو اس (کی حقیقت) کا اللہ ہی کو خوب علم ہے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے لیے جس سیاست کی ضرورت ہے، اس میں زبان پر اور خیالات اور جذبات کے اظہار پر قابو ہونا ایک اہم بات ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا فطری جذبہ یہ ابھرا ہوگا کہ اپنے بھائیوں کو کہیں کہ تم جھوٹے ہو لیکن وہ اس وقت خاموش رہے اور دل میں انتم شرمکانا... کہہ لیا۔ اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے لاتقصص رؤیاک... کہا تھا وہ بھی اسی تربیت کے لیے کہا تھا کہ جو جی میں بات آئے وہ کہہ دینا عقل مندی نہیں ہے۔ بسا اوقات اپنا پروگرام یا اپنے منصوبے سے کسی کو قبل از وقت مطلع کردینا نقصان دہ ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف بھی اس مضمون کی ہے کہ اپنے حوائج پورے کرنے میں کتمان سے مدد لو یعنی اگر ان کو پوشیدہ رکھو گے تو تمھارے لیے مفید ہوگا۔

اسی طرح نصیحت کرنے کا بھی ایک موقع ہوتا ہے۔ بے موقع نصیحت بے فائدہ اور نقصان دہ ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے قیدی ساتھیوں پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تبلیغ ایک خاص موقعے پر کی تھی جب وہ لوگ ان کی بات سننے کو تیار تھے۔

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا
لَصٰدِقُوْنَ ○ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

(سورۂ یوسف، آیت ۸۲، ۸۳)

اور اس بستی (یعنی مصر) والوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم (اس وقت) موجود

تھے اور اس قافلے والوں سے پوچھ لیجیے جن میں ہم شامل ہوکر (یہاں) آئے ہیں اور یقین جانیے ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ یعقوب (علیہ السلام) فرمانے لگے بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (مجھ کو) اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا (کیوں کہ) وہ خوب واقف ہے بڑی حکمت والا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قال بل سولت... الخ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:
''ایہام تیقن جب کہ قلب میں نہ ہو عفو ہے۔ بالخصوص اگر مقصود اخبار نہ ہو بلکہ استکشاف ہو۔ جیسا موضع تفتیش میں عادت ہے کہ صیغہ خبر کا تکلم کیا کرتے ہیں تا کہ مہتم سمجھے کہ ان کو خبر ہے اور اس وجہ سے واقعے کا انکار نہ کر سکے۔'' الحمدللہ اس سے (احقر کی) اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ بعض مواقع پر یقین کے ساتھ الزام لگانا تفتیش کی غرض سے جائز ہے گرچہ اس بات کی قیمت صرف ظنی ہو۔

پہلے بھی جب انھوں نے واقعی جھوٹ بات بنائی تھی جب بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہی فرمایا تھا، ''بل سولت... فصبر جمیل۔'' وہاں بھی نورِ نبوت سے یہی سمجھا تھا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کا کھا جانا درست بات نہیں تھی۔ یا فراست سے یہ سمجھا تھا۔ یہاں بھی جب وہ لوگ اپنی دانست میں سچ کہہ رہے تھے تو یعقوب علیہ السلام نے ان کو جھٹلایا کیوں کہ ان کو علم تھا کہ یہ بات محال ہے۔ اور چونکہ ایک بار پہلے بھی ان سے اس طرح کا واقعہ ہو چکا تھا، اس لیے اس ظنِ غالب کی اور تقویت ہوگئی اور درحقیقت بھی ان کی بات درست نہیں تھی کیوں کہ یوسف علیہ السلام کے ان بھائی نے چوری نہیں کی تھی جن پر یہ الزام لگایا گیا تھا۔

جو لوگ جھوٹے ہوں اور بات گڑھنے کے عادی ہوں یا جھوٹے ثابت ہو چکے ہوں ان کو جھوٹا سمجھنا فطری عقل مند کی بات ہے گرچہ وہ اپنی دانست میں سچ بات کہہ رہے ہوں۔ گرچہ اس جھوٹ پر بغیر کسی اور شہادت کے ان کو سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔ اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو کچھ سزا نہ دی بلکہ پہلے موقع پر فصبر جمیل کہا

اور اس موقع پر بھی صرف افسوس کر کے اور معاملہ خدا کے سپرد کر کے رہ گئے۔

محسوسات میں بھی جو بات بدیہی معلوم ہوتی ہے، ہوسکتا ہے وہ بات غلط ہو۔ لہٰذا اگر کوئی بزرگ (اور نبی علیہ السلام بدرجۂ اولیٰ) کا کوئی قول ایسا ہو جو بظاہر واقعات کے خلاف معلوم ہوتا ہو یا کسی بظاہر بدیہی بات کی تردید ہوتی ہو تب بھی ہم ان ہی کی بات سچ سمجھیں گے اور جس کو ہم محسوسات کے ذریعے سچ سمجھ رہے ہیں اس کو غلط سمجھیں گے کیوں کہ درحقیقت ایسا ہی ہوگا جیسا کہ یہاں ہوا تھا۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(سورۂ یوسفؑ، آیت ۸۷)

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتا دیا گیا ہوگا کہ دونوں ایک ہی ساتھ دوبارہ ملیں گے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کذلک کدنا... کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ، ''کسی کا علم ذاتی اور محیط نہیں ہے۔'' پیغمبروں کو بھی اتنا ہی علم دیا جاتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہوتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے ناامیدی کی شناخت معلوم ہوتی ہے۔ اور تجربہ ہے کہ ناامیدی کبھی کبھی بڑھ کر کفر ہوجاتا ہے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

(سورۂ یوسفؑ، آیت ۹۸)

یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمھارے لیے اپنے رب سے دعائے مغفرت کروں گا بے شک وہ غفور رحیم ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ کہنا غالباً اسی وجہ سے ہوگا کہ ابھی زخم تازہ تھا جو بدمعاملگی ان کے ساتھ ہوئی تھی اور جتنا غم انھوں نے اٹھایا تھا اس کا اثر فوراً تو نہیں چلا جاتا۔ اس لیے انھوں نے استغفار کو مؤخر فرما دیا۔

یہاں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اگر زبان سے ان شاء اللہ نہ بھی کہا جائے اور دل میں ان شاء اللہ ہو اور ہر وقت توجہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف لگی ہوئی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے لوگ ہیں جو زبان سے ان شاء اللہ کہتے ہیں لیکن دل میں ان کے کچھ اور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک کے صدقے میں اپنا صحیح اور قوی تعلق عطا فرمائیں۔ (آمین)

وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِيۡلُ رُءۡيَاىَ مِنۡ قَبۡلُ ۖ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّىۡ حَقًّا ؕ وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِىۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِىۡ مِنَ السِّجۡنِ وَجَآءَ بِكُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّيۡطٰنُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَ اِخۡوَتِىۡ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَطِيۡفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۰۰)

اور اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا اور سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے آگے سجدے میں گر گئے اور یوسف (علیہ السلام) نے کہا اے میرے باپ یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانے میں دیکھا تھا جس کو میرے رب نے سچا کر دیا اور خدا نے میرے ساتھ احسان کیا کہ ایک تو اس نے مجھے قید سے نکالا اور دوسرا یہ کہ تم سب کو جنگل سے یہاں لایا (یہ سب کچھ) بعد اس کے ہوا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوا دیا تھا بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کرتا ہے بلاشبہ وہ بڑے علم اور حکمت والا ہے۔

شروع سورت میں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب اپنے والد سے کہا تھا وہاں بھی انھوں نے کہا تھا کہ اپنے بھائیوں سے اس کا ذکر نہ کرنا ورنہ وہ تمھارے خلاف کوئی کید کریں گے وہاں بھی فرمایا گیا تھا کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور یہاں حضرت یوسف علیہ السلام بھی اپنے والد ماجد کی بات دُہرا رہے ہیں کہ شیطان نے میرے اور بھائیوں کے درمیان دشمنی پیدا کردی تھی۔ اگر آدمی اپنے اصل دشمن کو پہچان لے تو آپس میں محبت برقرار رہے اور نفرت اور دشمنی کا اثر باقی نہ رہے۔ درحقیقت انسان بنیادی طور پر (at the core) اچھا ہوتا ہے، اگر شیطان اس پر سوار نہ ہوجائے۔ اس قول میں یوسف علیہ السلام کے کرم کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ حلم اور عفو کی یہ بہترین مثال ہے۔ اور تعلیم بھی نہایت اچھوتی ہے کہ بھائیوں نے جو ظلم اور زیادتی کی اس کو شیطان کی طرف منسوب کردیا اور اپنی رفع منزلت اور اخلاق کی پختگی جوان کے جیل سے نکلنے کے بعد سب پر ظاہر ہوگئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور احسان کی طرف منسوب کیا۔ درحقیقت جس کی نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے الطاف وعنایات اور احسانات پر رہے گی وہ کیا دوسروں کی دشمنی کا خیال کرے گا۔

قَالُوٓا ءَاِنَّكَ لَاَنۡتَ يُوۡسُفُ‌ ؕ قَالَ اَنَا يُوۡسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىۡ‌ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا‌ ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۹۰)

کہنے لگے کیا سچ مچ تم ہی یوسف (علیہ السلام) ہو؟ انھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف (علیہ السلام) ہوں اور یہ (بنیامین) میرا (حقیقی) بھائی ہے ہم پر اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ صبر اور شکر دراصل ایک ہی چیز ہے یا ایک سکّے کے دو رُخ ہیں جس طرح شکر ادا کرنے والے کے لیے لازیدنکم کا وعدہ ہے، اسی طرح صبر

کرنے والے کے لیے بھی اجر کا وعدہ ہے جیسا سورۂ ہود علیہ السلام کی آیت نمبر۱۵ میں ہے واصبر... لایضیع ۔ وہاں بھی صبر اور احسان کا گہرا تعلق بتلایا گیا ہے اور یہاں بھی یوسف علیہ السلام کے صبر اور تقویٰ کو بھی احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ''احسان'' جب بندوں کے مابین بولا جائے گا تو وہاں مہربانی اور کرم اور بدلے سے زیادہ عطا کرنے والا مراد ہوگا جیسا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے پہلی بار کہا تھا انا...المحسنین۔ اور یوسف علیہ السلام میں یہ سب خصوصیات یکجا تھیں۔ یعنی صبر، تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ احسان اور شکر یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا احساس اور اپنی بے مائگی (وما ابری نفس...) کا احساس تو ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک بات سے ظاہر ہوتا تھا۔

یوسف علیہ السلام کا صبر ان کی ابتدائی زندگی میں اور پھر جیل کی زندگی میں صبر علی المصیبۃ تھا اور عزیزِ مصر اور زنانِ مصر کے معاملے میں صبر علی التقویٰ کی اعلیٰ مثال تھی کہ اتنی ترغیباتِ جنسی اور اتنی سزا کی دھمکیوں کے باوجود پاک دامنی اور امانت پر قائم رہے اور جیل سے اس وقت تک نہیں نکلے جب تک ان کی برأت علی الاعلان ظاہر نہیں ہوگئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام پر انعامات ایک لحاظ سے حضرت یعقوب علیہ السلام پر بھی انعام تھا اور ان کے صبر کا بدلہ تھا کہ ہر بار اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے رہے اور صرف ظنِ غالب کی بنا پر اپنے دوسرے بیٹوں کو کوئی سزا نہیں دی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۰۱)

اے میرے پروردگار آپ نے مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جوکہ علمِ عظیم ہے) اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مجھ کو

پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجیے اور مجھ کو خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجیے۔

تاویل الاحادیث حکمت کا ایک اہم شعبہ معلوم ہوتا ہے اور یہ خیرِ کثیر ہے جو دنیاوی جاہ وجلال سے بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ:

(۱) آیت نمبر۶ میں اجتبیٰ اور اتمامِ نعمت کے درمیان مذکور ہے۔ جس طرح دنیا میں جو کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا کامل اور نقائص سے پاک تھا اس طرح آخرت میں بھی مسلمانوں کو جو عطا ہوگا وہ کامل اور نقائص سے پاک ہوگا اور اعمال میں نقائص کا جو عکس ہوگا اس کے دور کرنے کے لیے ان کی دعا ہوگی ربنا اتمم لنا نورنا... اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے کامل انعامات ملیں گے۔ جیسے سورج اپنی جگہ کامل ہے اور چاند چودھویں رات کا اپنی جگہ کامل ہے گرچہ روشنی میں بے انتہا فرق ہے اسی طرح مختلف درجات کے مومنین کو اپنی اپنی جگہ کامل نور عطا ہوگا۔

حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَآءَ ھُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ O (سورۂ یوسفؑ، آیت ۱۱۰)

یہاں تک کہ پیغمبر (اس بات سے) مایوس ہوگئے اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہوگیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی ان کو ہماری مدد پہنچی پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا، ''یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد...'' حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''تطویلِ مدتِ مہلت کی وجہ سے پیغمبروں نے سمجھ لیا

کہ وعدۂ الٰہی کا جو اجمالی وقت اپنے اجتہاد سے معین کر کے ہم نے اپنے ذہن میں قرار دے رکھا تھا... (اس میں) ہم سے غلطی ہوئی اور اپنے ایک بدیعہ میں اس کا ترجمہ فرمایا ہے کہ رسول مایوس ہوگئے، ''اے من ایمان قومھم'' اور دوسرے جزو کا ترجمہ کیا ہے اور ''کفار نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا۔''

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے تفسیر میں لکھا کہ... ''کفار نے یقینی طور پر خیال کرلیا کہ انبیا سے جو وعدے ان کی نصرت اور ہماری ہلاکت کے لیے کیے گئے تھے، سب جھوٹی باتیں ہیں... کچھ بعید نہیں کہ ایسی مایوس کن اور اضطراب انگیز حالت میں انبیا کے قلوب میں بھی یہ خیالات آنے لگے ہوں کہ وعدۂ عذاب کو ہم نے جس رنگ میں سمجھا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وساوس وخطرات کے درجے میں بے اختیار یہ وہم گزرنے لگے ہوں کہ ہماری نصرت اور منکرین کی ہلاکت کے جو وعدے کیے گئے تھے کیا وہ پورے نہ کیے جائیں گے...؟''

اس درجے میں کسی طرح کا بھی وسوسہ قابلِ مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لفظ کذبوا کی قرأت ''کُذِبُوْا'' کی ہے۔ بعض تراجم/تفسیر درجہ ذیل ہیں:

(۱) یہاں تک کہ ناامید ہوئے پیغمبر ان کے ایمان لانے سے اور جانا کافروں نے کہ جھوٹے تھے جو کہتے تھے کہ ہم پیغمبر ہیں، تم ہمارا کہنا نہ مانو گے تو تم پر عذاب آوے گا۔'' اس بات کو کافروں نے جھوٹ جانا اور جب وقت اس عذاب کا آن پہنچا... (موضح القرآن: شاہ عبدالقادرؒ)

(۲) بدروغ وعدہ کردہ شد بایشاں۔ (شاہ ولی اللہؒ)

(۳) یہاں تک کہ جب اللہ کے رسول (ان کے ایمان لانے سے) مایوس ہوگئے اور لوگوں نے خیال کیا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا تو پھر (اچانک) ہماری مدد ان کے پاس آ پہنچی۔ (ترجمان القرآن: ابوالکلام آزاد مرحوم)

(۴) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وظنوا حین ضعفوا وغلبوا انھم

قدا اخلفوا. ماوعدهم اللّٰہ من النصر و قال کانوا بشرا وتلا (وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول...) فاراد بالظن ما یخطر بالبال ویهجس فی القلب من شبه الوسوسة وحدیث النفس علی ما علیه البشریة دون ترجح احدا الجائزین علی الاخرلان ذلک غیر جائز علی المسلمین فما بال رسل اللّٰہ الذین هم اعرف الخلق بربهم وانه متعال عن خلف المیعاد. (روح البیان)

(۵) حضرت عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ عنہا کی قرأت کُذِبُوْا نقل کر کے فرمایا کہ اگر خیال ہو کہ کافر تو جھٹلا رہے ہی تھے تو اس کا گمان کیا معنی کہ جھٹلائے گئے تو جواب یہ ہے کہ رسولوں نے یہ سمجھا کہ کہیں میرے ماننے والے بھی مجھ سے بدگمان ہو کر مجھے جھٹلا نہ رہے ہوں۔ (ابنِ کثیر)

(۶) حضرت عبداللّٰہ ابن مسعودؓ... رسول ناامید ہو گئے یعنی اپنی قوم کے ایمان سے اور نصرت خدا میں دیر دیکھ کر ان کی قوم گمان کرنے لگی کہ وہ جھوٹا وعدہ دیے گئے تھے۔ (ابنِ کثیر)

(۷) تفسیرِ کبیر میں بہت سی احادیث (دونوں قرأتوں کی روشنی میں) درج کی گئی ہیں، مثلاً (قال سعید بن جبیرؓ) ظن قوم الرسول ان الرسل قد کذبوا۔

(۸) انگریز قاموس نگار لین (Lane) اپنی معروف لغت Arabic English Lexicone میں اس لفظ کو چار طرح سے نقل کیا ہے: کُذِبُوْا، کُذِّبُوْا، کَذِبُوْا، کَذَّبُوْا۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عبداللّٰہ ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما دونوں کی روایتیں (کُذِّبُوْا اور کُذِبُوْا) نقل کی ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورۂ یوسفؑ، آیت ۳)

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کیے شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشی) کو چھپا دیتا ہے ان امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں۔

اضداد کا پیدا کرنا نباتات اور جمادات میں بھی مثلاً دن اور رات ان سے خالق کی بے حد و حساب قوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان میں ایسا وزن (balance) قائم ہے کہ دونوں اپنے اپنے حدودؒ میں ہیں۔ ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ تمام مخلوقات یوں ہی بغیر کسی حکمت (plan) کے پیدا نہیں ہوگئی ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○ (سورۃ الرعد، آیت ۱۱)

ہر شخص کی (حفاظت) کے لیے کچھ فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکمِ خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کرلیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں اور کوئی خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں تین اصول (principles) بیان کیے گئے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے (فرشتے) ہر شخص کے آگے اور پیچھے حفاظت میں اس کے حکم سے لگے ہوئے ہیں۔ اگر یہ غیر مرئی (unseen) انتظام نہ ہو تو انسان کے اتنے

دشمن ہیں، دوسری مخلوقات میں سے اور خود ایک دوسرے کے کہ اسے ایک منٹ میں چٹ کر جائیں۔ جو خطرات اور دشمن نظر آتے ہیں ان سے کئی گنا زیادہ نظروں سے پوشیدہ خطرات اور دشمن ہیں۔ لہٰذا جب تک خدا کا حکم نہ ہو تمھیں کوئی بھی ذرّہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیوں کہ اس کے ''پھیری والے'' (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ) ہر وقت موجود رہتے ہیں حفاظت کے لیے آگے سے بھی اور پیچھے سے بھی۔

(۲) اسی حفاظت کے قانون کے تحت قوموں کی بھی حفاظت ہوتی ہے۔ اس آیت کی نہایت غلط تفسیر عوام میں حالؔی کے اس شعر کی وجہ سے مشہور ہوگئی۔ خدا نے آج تک ...الخ جیسے شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی اللہ اپنی مہربانی اور نگہبانی سے محروم نہیں کرتا کسی قوم کو جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہے جب تک وہ اپنی چال اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ بدل دیں۔ مولانا تھانویؒ نے بھی فرمایا ہے، ''ہر شخص کی حفاظت کے لیے کچھ فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکمِ خدا اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے...'' اور معارف القرآن میں اس شعر کے بارے میں ہے کہ گرچہ یہ بات ایک حد تک درست ہے مگر اس آیت سے یہ بات نہیں نکلتی۔ اوّل کیوں کہ کسی قوم کی بدحالی کو خوش حالی سے بدلنے کے لیے کوئی سبب ہونا ضروری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے لیے سبب کی ضرورت نہیں ہے۔ تفسیر ابنِ عباس میں ہے۔ (یحفظونہ) مقدم و مؤخر (من امراللّٰہ) بامر اللّٰہ و یدفعونہ الی المقادیر... (مابقوم) من امن ونعمۃ (حتیٰ... بانفسھم) بترک الشکر۔

(۳) یہ تو ہوئی تکوینی بات۔ اب جب ترکِ شکر کے سبب کسی قوم کی ہلاکت کا حکم ہوگیا تو ٹل نہیں سکتا۔ اب وہ قوم ایک دن میں ہلاک ہو یا ہزار برس میں، ہلاکت یقینی ہے۔ بڑی ہی عبرت کا مقام ہے۔ توبہ اسی وقت تک قابلِ قبول ہے جب تک موت آ نہ پہنچے۔ یہی حال اقوام کا ہے۔ فرد کے ساتھ وقتِ نزاع تھوڑی دیر کا ہوتا ہے، اقوام

کے لیے ایک زمانہ ہوسکتا ہے۔ یعنی پھر اس کے بعد اس کی حالت گرتی ہی جاتی ہے اور اور اس کی ناشکری بڑھتی ہی جاتی ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ○ (سورۃ الرعد، آیت ۱۷)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب خس و خاشاک کو بہا لایا جو اس (پانی) کے اوپر (آرہا) ہے اور جن چیزوں کو آگ کے اندر زیور یا اور اسباب بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آجاتا) ہے اللہ تعالیٰ حق (یعنی ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے سو جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے کارآمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کرتے ہیں۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ انسانوں کو اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے والے ہوئے ہیں وہ دھیمے ہیں۔ ہلچل، شور، ہنگامہ جو آج کل اونچی سوسائٹی میں برپا ہے وہ ''زبد'' ہے جو جھاگ بن کر اڑ جانے والا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ

قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝

(سورۃ الرعد آیت ۲۸۔ ۲۹)

اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ آپ کہہ دیجیے کہ واقعی اللّٰہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کردیتے ہیں اور جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو اپنی طرف ہدایت کردیتے ہیں مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللّٰہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللّٰہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوجاتا ہے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے خوش حالی اور نیک انجامی ہے۔

منیبین کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسے مومنین ہیں جن کے قلوب اللّٰہ کے ذکر سے چین پکڑتے ہیں جو حقیقی وجہِ اطمینان ہے اور یہ حالتِ ایمان اور عملِ صالح سے لاینفک (inseparable) ہے۔ اعمالِ سیئہ سے ذکر اللّٰہ سے غفلت ہوتی ہے جس کی وجہ سے دل کا اطمینان رخصت ہوجاتا ہے اور پھر ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، خدا محفوظ رکھے۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۙ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝

سَلٰمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِO وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ" اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِO اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌO (سورۃ الرعد، آیت ۱۹۔ ۲۶)

جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ سب حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طرح ہوسکتا ہے جو کہ اندھا ہے پس نصیحت تو سمجھ دار ہی لوگ قبول کرتے ہیں (اور) یہ سمجھ دار لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انھوں نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں اور (اس) عہد کو توڑتے نہیں اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم کیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ اپنے رب کی رضامندی کے جویا رہ کر مضبوط رہتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے چپکے بھی اور ظاہر کر کے بھی خرچ کرتے ہیں اور بدسلوکی کو حسنِ سلوک سے ٹال دیتے ہیں اس جہان میں نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتیں جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور بی بیوں اور اولاد میں جو (جنت کی) لائق ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے اور فرشتے ان کے پاس ہر (سمت کے) دروازے سے آتے ہوں گے (اور یہ کہتے ہوں گے) کہ تم صحیح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم (دینِ حق پر) مضبوط رہے تھے سو اس جہان میں تمھارا انجام بہت اچھا ہے اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معاہدوں کو ان کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے علاوہ اُس جہان میں خرابی ہوگی اللہ جس کو چاہے رزق زیادہ دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگی کردیتا ہے اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگی پر اِتراتے ہیں اور یہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں بجز ایک متاعِ قلیل کے اور کچھ بھی نہیں۔

اس پورے رکوع میں بہت سی حکمتیں بیان فرمائی گئی ہیں جن کا جاننا دنیاوی لحاظ سے بھی مفید ہے اور اُخروی لحاظ سے بھی۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ایمان والے ہی آنکھ والے (اولو الالباب) ہیں گرچہ ان میں سے کچھ بیوقوف اور پریشان حال نظر آتے ہوں۔ مگر مجموعی حالت ان کی بہت اچھی ہے اور جب دنیا کو آخرت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو وہ کافروں سے بے انتہا زیادہ عقل مند ہیں۔

صبر بذاتِ خود ایک روشنی ہے اور صبر اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے کیوں کہ وہی اجر دینے والا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ خدا کے لیے صبر ایک غیرمتزلزل بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی قوت بھی اسی حساب سے غیرمتزلزل ہوتی ہے۔ نماز اور انفاق فی سبیل اللہ بذاتِ خود بھی ضروری اعمال ہیں اور ان کو صبر کی تربیت میں بھی بہت دخل ہے۔ ساری خصوصیات ایک دوسرے کی مدد و معاون ہیں۔

یدرؤن بالحسنۃ... جس کا شعار رہا وہ دنیا میں بھی حکیم اور عقل مند کہلایا چاہے وہ غیرمسلم ہی کیوں نہ ہو، مثلاً افلاطون (Plato) گرچہ کفر کی وجہ سے ان کا اجر آخرت میں نہ ملے۔

اللہ یبسط الرزق... اس لحاظ سے بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دنیاوی صلاحیت پر پورا دار و مدار رزق کی فراخی کا نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ مومنوں کو بھی فراخ رزق ویسا ہی ملتا ہے جیسا کافروں کو اور مومنوں کا رزق کافروں سے بہت بہتر (superior) ہے کیوں کہ متاع اور اصل کا کیا مقابلہ۔ دنیا والے اپنی دنیا پر پھولے نہیں سماتے اور آخرت پر نظر رکھنے والے اللہ یبسط... یقدر کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں کہ عیش و عشرت کے لحاظ سے بھی دنیا اور آخرت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مسرور ہیں۔ کون عقل مند ہوا؟

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا
تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝
(سورۃ الرعد، آیت ۴۲)

اور ان سے پہلے جو (کافر) لوگ ہو چکے ہیں انھوں نے تدبیریں کیں سو اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو بھی کرتا ہے اور ان کفار کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصے میں ہے۔

شاہ عبد القادرؒ نے ترجمہ کیا ہے "...اللّٰہ کے ہاتھ ہیں سب فریب..." اللہ اللّٰہ ذرا خیال تو کرو کتنا وسیع جال پھیلا ہوا ہے! اللّٰہ کے مکر کے سامنے کس کا مکر چل سکتا ہے؟ اسبابِ ظاہری کا جال۔ کتنا مضبوط ہے اور کتنا باریک (intricate) پھر اس پردے کے پیچھے دوسرے اسباب ہیں۔ اضافی (relative) اعتبار سے ان کو حقیقی اسباب، باطنی اسباب، روحانی اثرات اعمال کے نتیجے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس پردے کے پیچھے اور ہی اسباب نظر آتے ہیں ان کے مقابلے میں یہ ظاہری اسباب ہو جاتے ہیں اور وہ باطنی یا حقیقی۔ اسی طرح نہ معلوم کتنے پردوں کے پیچھے لوحِ محفوظ ہے جس سے کوئی رطب و یابس چھوٹا ہوا نہیں ہے اور اس کے پیچھے تمام حقیقتوں کی حقیقت اللّٰہ کا ارادہ ہے۔

یہ پردوں پر پردے تو معاملۂ خلق و امر میں ہے۔ ذاتِ حق کے لامحدود پردوں کے بارے میں تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ حجابہ نور اس کی شان ہے۔ پاک ہے وہ اس سے کہ اس کی کوئی مثال بھی سوچی جا سکے۔ تمام مخلوقات جن میں انبیا و رسل بھی شامل ہیں سب کے ادراک سے پاک ہے۔

اب ذرا دوسرے پہلو کو دیکھیے کہ ظاہری طور پر بھی اس نے ایسا مکار (شیطان) پیدا فرمایا جسے "الغرور" کہتے ہیں۔ کتنے بڑے بڑے مکر اس کے اور اس کی ذرّیات کے ہاتھوں سے وقوع پذیر ہوئے لیکن اللّٰہ کے مکر کی تدبیر کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ اس کی کئی مثالیں سورۂ یوسفؑ میں ہیں۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ O (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۱)

الر، یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف یعنی خدائے غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں۔

یعنی کتاب آلہ ہے اور فاعل رسول اللہ ﷺ ہیں اور فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں۔ اب بھی نور حاصل کرنے کے لیے تمسک بالرسول ضروری ہے اور جہاں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں وہ جگہ مخزنِ انوار ہے جہاں جو شخص صدقِ نیت سے پہنچ گیا انوار کے وافر حصہ سے سرفراز ہوا۔ اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ کا فیضِ باطنی ہر جگہ جاری ہے جو بہت سے قلوب کو منور کیے ہوئے ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ O (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۳)

ان کافروں کو جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور (بلکہ) اللہ کی راہ (مذکورہ) سے روکتے ہیں اور اس میں کجی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں۔

یہ کفار کی تعریف ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا اور آخرت میں اکثر تضاد رہتا ہے کہ ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہے۔ ایسے موقع پر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا کفر ہے۔ حب الدنیا رأس کل خطیئۃ اور انسان جب دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگے تو وہ نہ صرف خود راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی راہِ راست پر اطمینان سے چلنے نہیں دیتا یعنی اس کی دنیا طلبی دوسروں کے لیے باعثِ اذیت یا باعثِ گمراہی ہوجاتی

ہے جو اوّل الذکر سے بھی زیادہ سخت ہے، یعنی وہ دوسروں کو بزبانِ قال اور بزبانِ حال اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتا ہے جیسے پرویز یا قادیانیوں کا پیشوا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۬ۙ وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍO (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۵)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر کی) تاریکیوں سے (ایمان کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات (نعمت اور نقمت کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر شاکر کے لیے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ ان واقعات کے یاد دلانے کا حاصل یہ ہے کہ ''جو لوگ پہلے کامیاب ہوئے ہیں وہ سختیوں پر صبر اور نعمائے الٰہیہ پر شکر کرنے سے ہوئے ہیں۔''

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی رحمتہ اللہ علیہ نے جمعہ ۱۰ رمئی ۸۴ء کی مجلس میں دو باتیں فرمائیں جن سے صبر اور شکر کا ربط واضح ہوتا ہے۔ فرمایا کہ شکر کی عادت ڈال لی جائے۔ اس سے یہ ہوگا کہ مصیبت کے وقت آدمی گھبرائے گا نہیں۔ مصیبت اور تکلیف سے پریشانی نہیں ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ بیمار تھے۔ کوئی صاحب عیادت کے لیے آئے اور انھوں نے حال پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا الحمدللہ ہر طرح اچھا ہوں۔ پھر کہا مجھے یہ تکلیف ہے، یہ بیماری ہے، وغیرہ وغیرہ۔ عیادت کرنے والے صاحب نے پوچھا کہ ابھی تو آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ ہر طرح اچھا ہوں اور ابھی آپ نے ساری بیماریوں کے نام گنوا دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیماری تو ہے لیکن الحمدللہ یہ بیماری اور

تکلیف عارضی ہے دائمی نہیں۔ آج ہے کل نہیں رہے گی، قابلِ تحمل ہے ناقابلِ تحمل نہیں۔ الحمدللہ بیماری نے حواس باختہ نہیں کردیا۔ حواس معطل نہیں ہوئے ہیں اور یہ تکلیف دنیا کی ہے آخرت کی نہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمایا کہ آخری ایام مرض الموت میں اسہال بہت آنے لگے تھے۔ ہر وقت کوئی وضو کرا دیتا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ کو تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی۔ کہا کہ آپ ایک تکلیف کو دیکھتے ہیں۔ تکلیف تو ہے لیکن ایک تکلیف کے ساتھ الحمدللہ ہزاروں راحتیں ہیں۔ تیماردار موجود ہیں۔ ہر وقت خدمت کرنے والے (وضو کرانے والے وغیرہ) موجود ہیں۔ غذائیں موجود ہیں، علاج ہو رہا ہے، دوائیں موجود ہیں۔ اتنی نعمتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں اور آپ ایک تکلیف کو دیکھتے ہیں۔

تو جو خدا کی نعمتوں پر ہر وقت نظر رکھتا ہے اس کی مصیبت ہلکی ہوجاتی ہے۔

اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جو صبار ہو یعنی صبر فی الجہاد، صبر علی التقویٰ، صبر عن المعاصی اور صبر عند الشدائد اختیار کرتا ہے، وہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ صبر اپنے وسیع معنی میں شکر کا عملی پہلو ہے۔ یعنی شکر فعل قلب ہے اور صبر اسی شکر کے افعال جوارح میں ظاہر ہونے کا نام ہے۔

صبار اور شکور ایک ہی شخص کے دو صفات ہیں اور میرے خیال میں ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً لازم و ملزوم ہیں۔ صبار وہ ہے جو ہر طرح کی ناگواریوں کو برداشت کرے اور ہر طرح کے نامساعد حالات میں ثابت قدمی کے اعلیٰ معیار پر ہو۔ خدا کے لیے صبر اور خدا کی نعمتوں کا شکر ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں۔ اس کی تفصیل اگلے رکوع میں ہے۔ قومِ نوح، عاد اور ثمود وغیرہ کے ذکر میں انبیائے کرام علیہم السلام کے جوابات جو انھوں نے اپنی قوم کو دیے ان میں دو جملوں پر غور کیجیے، ''ان نحن... مثلکم'' اور ''ولکن اللّٰہ ...عبادہ۔'' اور اس احسان کے لیے وہ اتنے شکر گزار تھے کہ اللہ کی راہ میں ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار تھے ولنصبرن... اذ یتمونا۔ یہ صبر اور خوشی خوشی تکالیف برداشت کرلینا اسی شکر کی وجہ سے تھا جو ان کے قلب میں موجزن تھا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ○ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ○ (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۶-۷)

اور اس وقت کو یاد کیجیے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان تھا۔ اور وہ وقت یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے تم کو اطلاع فرما دی کہ اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو (سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون سے نجات دینا محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا ورنہ وہ قوم اتنی پسی ہوئی تھی اور قعرِ مذلت میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ شاید اسے نکلنے کا خیال بھی نہیں آتا ہوگا۔

آیت نمبر ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر جو تمام معاصی کی جڑ ہے، شکر کا antonym (الٹا) ہے لہٰذا معاصی سے بھی نعمتوں میں اضافہ رک جاتا ہے اور حضرت ابنِ عباسؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے ''کفرتم بی او بنعمتی۔'' اور اعمال صالحہ بڑی نعمت ہیں لہٰذا ان پر بھی شکر واجب ہے ورنہ کفرانِ نعمت کا گناہ ہوگا۔'' اور عملی شکر یہ ہے کہ ان اعمالِ صالحہ کو عجب، غیبت وغیرہ میں مبتلا ہوکر ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث شریف نقل کی ہے کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت و زیادت سے محروم نہیں رہے گا (رواہ ابن مردویۃ عن ابنِ عباسؓ۔ تفسیرِ مظہری، معارف القرآن، جلد پنجم) یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہوسکتی ہے اور ان کے بقا و دوام میں بھی۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے نعمتوں کا اضعاف مضاعفۃ ہونا مقدر فرما دیا ہے کہ نعمتوں کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی پھر شکر کی توفیق ہوئی پھر اس شکر کی وجہ سے نعمتوں میں اضافہ ہوا۔ پھر اس کا شکر بندے نے ادا کیا۔ یہ لامحدود سلسلہ (ad-infinitum) ہے۔ اور اس کے علاوہ آخرت میں دینے کا وعدہ فرما کر یہ بتا دیا کہ منّت اور احسان اس کے طرف سے باقی رہا۔ ہمارا شکر کہاں اس لائق کہ اس کے دربار میں پیش کیا جاسکے لیکن اپنے کمالِ کریمی سے اس نے قبول فرما لیا اور سنجزی الشاکرین فرما کر مزید بندہ پروری کا وعدہ فرمایا جس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (سورۃ ابراہیمؑ آیت ۱۱،۱۲)

ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ ہم بھی تمھارے جیسے آدمی ہی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرما دے اور یہ بات ہمارے قبضے کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلاسکیں بغیر خدا کے حکم کے اور اللہ ہی پر سب ایمان والوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔ اور ہم کو اللہ پر بھروسا نہ کرنے کا کون امر باعث ہوسکتا ہے حالانکہ اس نے ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) راستے بتلا دیے اور تم نے جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرنے والوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔

چاہے مدد خدا کی طرف سے بطور معجزہ آنے کا مطالبہ کافروں کی طرف سے ہو چاہے بندوں کی ایذا پر صبر ہو۔ ہر حال میں توکّل خدا ہی پر ہونا چاہیے اور یہی توکّل بندے کے لیے بہترین سہارا ہے جس سے صبر آسان ہوجاتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ O (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۱۸)

جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے جیسے کچھ راکھ ہو جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جائے (اسی طرح) ان لوگوں نے جو کچھ عمل کیے تھے ان کا کوئی حصہ ان کو حاصل نہ ہوگا (راکھ کی طرح برباد ہوجائے گا) یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے۔

راکھ کی مثال بھی مٹی کی مثال کی طرح ہے۔ کلمۂ خبیث کی مثال شجرۂ خبیث سے دی گئی ہے جو زمین سے اکھاڑ دی گئی ہو کہ اس کے لیے کوئی ثبات و قرار نہیں ہے یہاں کافروں کے اعمال کی مثال راکھ سے دی گئی ہے جس کا زمین سے مستقل اتصال نہیں ہوتا اس کے برخلاف کلمۂ طیبہ کی جڑیں مٹی میں مضبوطی سے لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ مومنوں کے اعمال میں وزن ان کے ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے اور کافروں کے اعمال ان کے کفر کی وجہ سے بے وزن ہوتے ہیں۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۲۲)

اور جب (قیامت میں) تمام مقدمات فیصل ہوچکیں گے تو شیطان جواب میں کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے سچے وعدے کیے تھے اور میں نے بھی کچھ وعدے کیے تھے سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کیے تھے اور میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو بلایا تھا سو تم نے (باختیار

خود) میرا کہنا مان لیا تو تم مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو نہ میں تمھارا مددگار ہوسکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہوسکتے) ہو میں خود تمھارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے۔

لیکن اکثر لوگ اس کے ادراک سے محروم ہیں کہ شیطان کی دوستی سے کسی طرح کا فائدہ نہیں۔ دنیا میں دوستی اور صحبت کے ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ کوئی نیک آدمی کسی برے آدمی کے ورغلانے سے کسی برائی میں مبتلا ہوجائے اور خدا کی مصلحت ایسی ہو کہ دونوں پکڑے جائیں تو جس نے مشورہ دیا تھا وہ کبھی اپنے ساتھی کی برأت میں زبان نہیں کھولتا۔ اور کبھی اس کی سزا اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ اس سے شکایت کرتا ہے کہ یار میں تو پہلے ہی اس کے لیے تیار نہیں تھا تم نے مجھے مفت میں پھنسا دیا، اب تم چھوٹنے کی کوئی ترکیب بتاؤ تو وہ ہمیشہ یہی جواب دے گا کہ میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا تم میرے مشورے کو نہ مانتے۔ میرا تم پر کیا زور تھا، تم تو جانتے ہی تھے کہ میں کیسا آدمی ہوں اور میں نے کتنوں کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ ما کان لی... بسلطان الادن... فاستجبتم لی۔ اب اپنے آپ ہی پر ملامت کرو۔ فلاتلوموني... انفسکم۔ جہاں تک بچانے کا سوال ہے تو میں اس میں بالکل مجبور ہوں۔ جو حالت تمھاری ہے وہی میری ہے۔

جب قیامت میں شیطان اور انسان کا مکالمہ ہوگا تو اس طرح کی بات چیت ہوگی۔ اللّٰہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھیں۔ (آمین)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِO تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَO

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ○ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ○ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ○ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ○ (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۲۴۔ ۲۷)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (توحید و ایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ (ایسی) مثالیں لوگوں کے واسطے اس لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہوکہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے اس کو کچھ ثبات نہ ہو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ کی برکت) سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے بجائے نعمتِ الٰہی کے کفر کیا اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں آپ کہہ دیجیے کہ چندے عیش کرلو کیوں کہ اخیر انجام تمھارا دوزخ میں جانا ہے۔

ایمان کی آبیاری کرتے رہنا پڑتی ہے، اعمالِ صالحہ سے، شکر سے اور اللہ کی یاد سے جس میں توبہ اور انابت شامل ہے۔ اور اللہ کا فضل مثل بارش کے ہے اور انسان کی کوشش مثل باغ کے مالی کی کوشش کے ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کوشش اور ظاہری سبب کے عطا فرما دیں۔ جس طرح جنگل میں خود بخود اونچے اونچے تناور

درخت ہوجاتے ہیں اور کوئی ان کی دیکھ بھال نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ہی پرورش فرماتے ہیں۔ لیکن بندے کے لیے اسباب مہیا نہ کرنا اور اس امید پر رہنا کہ خود بخود ہی کام ہوجائے گا سخت بدتہذیبی ہے۔

کلمۂ طیبہ کی مثال ہر اچھی بات پر صادق آتی ہے لیکن سب سے زیادہ طیب کلمہ کہلانے کا مستحق کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ہے۔ جس کی اصل دل میں ثابت ہے اور اس کے سوتے دماغ سے لے کر تمام قویٰ تک پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی شاخیں (فرع) آسمانوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مومن اپنے ایمان کے زور سے کہاں تک پہنچتا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے اور ہر وقت اس سے اچھے اچھے پھل ملتے رہتے ہیں یعنی ہر وقت اچھے اعمال کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ نگاہ کی باریکی اور بصیرت بھی ایمان کی شاخ ہے۔ مومن اعمالِ صالحہ کی لذت ہر دم محسوس کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس بری بات جس میں سب سے زیادہ بری بات شرک ہے اس میں کوئی پائیداری نہیں۔ نہ اس سے اعمالِ صالحہ کے پھل حاصل ہوتے ہیں، نہ روحِ انسانی (برخلاف طبیعتِ حیوانی) کو اس سے کوئی غذا ملتی ہے نہ اس کی دیرپا لذت دل میں رہتی ہے اور جب یہ ایمان کے مقابلے میں آئے گا تو فرار ہوجائے گا کیوں کہ یہ جڑ سے اکھڑا ہوا درخت ہے۔

آیات ۲۷۔ ۳۰ میں کفار کے کئی لایعنی سوالات کا جواب ہے، مثلاً انھیں ظالم ہی کیوں بننے دیا گیا یا سبھوں کو ایک طرح کا کیوں نہیں بنایا گیا۔ اس کا جواب یفعل اللّٰہ ما یشاء سے دیا گیا۔ آگے ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے خود اور اپنے ماننے والوں کو ناشکری اور کفرانِ نعمت میں مبتلا کیا اور کشاں کشاں خود بھی جہنم میں گئے اور اپنی قوم کو بھی لے گئے جس سے واضح ہوگیا کہ وہ بالکل ٹھیک جہنم واصل ہوئے۔ اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''بڑے لوگ'' نہ صرف اپنے آپ کو تباہی کے گھر میں اتارتے ہیں بلکہ اپنی قوم کو بھی اور ان کی کفرانِ نعمت کا اثر نہ صرف ان تک محدود رہتا ہے بلکہ پوری قوم پر ہوتا ہے۔ کفرانِ نعمت کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی پڑتا ہے، اس طرح ضروری ہے کہ کچھ لوگ ان کو روکتے رہیں اور اس اثر کو معاشرے میں پھیلنے نہ دیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَالْبَوَارِ○ جَھَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَھَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ○ (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۲۸، ۲۹)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے بجائے نعمتِ الٰہی کے کفر کیا اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے انعامات اس قوم پر ہو رہے تھے پھر اس نے اللہ سے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کی اور اس کے بدلے میں وہ نعمتیں چھن گئیں اور ان کی بجائے نقمت اور ذلت قسمت میں لکھ دی گئی، یعنی جہنم ان کا مقدر ہوگئی۔ کفرانِ نعمت امرا اور حکمرانوں کو برے ٹھکانے کو لے جاتا ہے جس کی انتہا جہنم ہے اور یہ سزا پوری قوم کو ملتی ہے اس لیے کہ انھوں نے ان کی امارت اور قیادت قبول کرلی اور اس پر راضی ہوگئے۔ البتہ جو لوگ ایسے لوگوں کو برائی سے منع کرتے رہے ان کے عام عذاب سے محفوظ رہنے کی امید ہے۔ یا ابراہیم علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کی پیروی میں ان سے الگ رہے۔ عدوا... منہ۔ اخیر درجہ ایمان کا شاید یہ بھی ہو کہ دل میں اپنے کو اس قوم سے الگ سمجھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ یااللہ اگر یہ قوم فتنے میں پڑنے والی ہے تو مجھے اس سے محفوظ رکھیے وتوفنی غیر مفتون۔

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ○ (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۳۱)

جو میرے خالص ایمان والے بندے ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ وہ نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور آشکارا

خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف بے توجہی اور مخلوق کی طرف بے توجہی یہ دو باتیں بہت بڑے بڑے revolutions (انقلابات) کا باعث بنیں یا کم از کم ان کو سب سے اہم وجوہات (contributory factors) شمار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب اور اشتراکی انقلاب۔ اگر لوگ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال کرتے اور امیر لوگ غریبوں کو اپنے مال میں سے ان کو حق دار سمجھ کر دیتے رہتے اور دنیاوی زندگی کو سب کچھ نہ سمجھ لیتے تو یہ خونیں انقلابات جو قیامتِ صغریٰ تھیں، نہیں آتے۔ ان میں آدمی مال دے کر اپنی جان بچا نہیں سکتا تھا اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ مگر چونکہ کئی کئی پشت تک ان بداعمالیوں کی سزا نہیں ملتی ہے اس لیے جب تک قیامت میں ان پر باز پرس کا یقین لوگوں میں راسخ نہ ہو اس وقت تک صالح معاشرہ نہیں بن سکتا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَلَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَلَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَلَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَلَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝

(سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۳۲-۳۳)

اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی (یعنی مینہ) برسایا پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمھارے لیے رزق پیدا کیا اور تمھارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو مسخر بنایا کہ وہ خدا کے حکم (و قدرت) سے دریا میں چلے اور تمھارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا اور تمھارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں اور تمھارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا۔

جمعرات ۵ر جولائی ۱۹۷۹ء کو لاہور کا موسم ماشاء اللہ بہت اچھا تھا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) نے فرمایا کہ یہ سب انتظام اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی لیے کیا ہے، ہوگا اوروں کے لیے بھی لیکن ہمیں تو یہی سمجھنا ہے کہ ہمارے لیے ہے۔ جب تک یہ انفرادی خصوصیت محسوس نہیں ہوگی شکر کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا۔ یہ باتیں گویا ان آیاتِ کریمہ سے متاثر ہوکر فرمائیں۔ آسمان و زمین میں کروڑ ہا مخلوق کی مصلحتیں ہوں گی لیکن ہمیں یہی سمجھنا ہے کہ یہ سب ہمارے ہی لیے ہے۔ غور کرنے سے اس بات کی صداقت معلوم ہونے لگے گی۔ ان تمام باتوں پر شکر واجب ہے۔ فالحمدللّٰہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ سیّدنا محمد وعلیٰ الہٖ۔ یہ آیاتِ کریمہ دعوت الی التسخیر نہیں ہے جیسا بعضوں کا خیال ہے بلکہ دعوت الی الشکر ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ○ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○ (سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۳۳،۳۴)

اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا۔ اور جو جو چیز تم نے مانگی تم کو ہر چیز دی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے۔

بنائی تو یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے لیے بھی ہوں گی لیکن ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ یہ سب چیزیں ہمارے ہی لیے بنی ہیں۔ یہ بات انفرادی طور پر بھی صادق آتی ہے اور بنی نوعِ انسان کے لیے اجتماعی طور پر بھی اور صبح سے شام تک ہزاروں مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہمارا کام کر رہی ہے۔ گویا ہماری خدمت پر مامور ہے۔ ان میں سے کچھ کو تو ہم دیکھتے ہیں جیسے چاند، سورج وغیرہ اور کچھ کو نہیں دیکھتے جیسے فرشتے اور نظر نہ آنے

والے جان دار مثلاً microbes ہمیں تو یہ یہی سمجھنا ہے کہ سب اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بنایا ہے جب ہی تو شکر ادا ہوگا۔ انسان واقعی بڑا ہی ناشکرا ہے اور نافرمانی اس کی ایک فرد ہے جس کا انتہائی درجہ (extreme) کفر ہے۔

یہاں ''ماسالتموہ'' کے الفاظ ہیں۔ یہ مانگنا زبانِ حال سے تھا یعنی انسانیت کی بقا اور فروغ کے لیے جن نعمتوں کی ضرورت وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی گئی وہ سب ملتی رہیں اور بہت سی نعمتیں تو انسان کی تخلیق سے پہلے ہی پیدا کر دی گئیں۔

شکر تو جیسا کہ حق ہے اس کا ایک ذرّہ بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اتنا بھی تو نہ ہو کہ انسان طغیان اور کفر میں مبتلا ہو جائے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ○ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○(سورۃ ابراہیمؑ، آیت ۳۵، ۳۶)

اور جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیجیے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھیے اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا پھر جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے ہی اور جو شخص (اس بات میں) میرا کہنا نہ مانے سو آپ تو کثیر المغفرت (اور) کثیر الرحمت ہیں۔

یہ پورا رکوع حضرت ابراہیم علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں سے پُر ہے۔ جب ان کے جیسے مضبوط موحد کو ہر وقت ایمان کی سلامتی کی دعا مانگنی پڑتی تھی تو ہما شما کیا چیز ہیں۔ آگے اسکنت من ذریتی حالانکہ وعدۂ خداوندی کے تحت تھا پھر بھی دعا کی کہ جو کچھ عطا ہوگا وہ فضل سے ہوگا استحقاق کچھ بھی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ تھے، وہ اشارے کو پہنچانتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کو گناہ معاف

کرنا اور رحم کرنا کس قدر پسند ہے۔ اس لیے اپنے نافرمانوں سے بھی بیزاری کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ اپنی نافرمان اولاد کا معاملہ اللّٰہ تعالیٰ کی غفور رحیمی پر چھوڑ دیا۔ حدیث شریف میں بھی ایک شخص کے اونٹ کا سفر میں گم ہوجانے اور پھر مل جانے کا ذکر اس بات کو تفصیل سے سمجھانے کے لیے ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کو بندے کا توبہ کرنا کس قدر پسند ہے۔

اسی رکوع میں آگے الحمدللہ ...علی الکبر... سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ سے مانگنے کا یہ ادب ہے کہ پہلے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے پھر دعا مانگی جائے۔

لِيَجْزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِO

(سورۂ ابراہیمؑ، آیت ۵۰)

تاکہ اللّٰہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کیے کی سزا دے یقیناً اللّٰہ تعالیٰ بڑی جلد حساب لینے والا ہے۔

یہ جو جاہل لوگ کہتے ہیں کہ اتنا ظلم ہو رہا ہے اللّٰہ تعالیٰ کیوں نہیں ان کو سزا دیتے ہیں یہاں اس کا جواب ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ ان کو اس دن تک کے لیے مہلت دے رہے ہیں جس دن آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی۔ اگلی آیاتِ کریمہ میں مزید اس دن کی ہولناکیوں کا ذکر ہے۔تو وہ سزا بہت کافی ہے۔ البتہ اگر کسی کی سزا مصلحتاً دنیا میں بھی کچھ ہوجائے تو یہ اور بات ہے۔ اب رہی مظلوموں کی اعانت اور ان کو بدلہ ملنے کی بات تو اس کا بھی ذکر چند آیتوں کے بعد ہے جس میں ذکر تو صرف رسولوں کا ہے جن سے وعدہ کیا گیا۔لیکن تبعاً ان کے متبعین بھی شامل ہیں اور اشارتاً تمام مظلومین کا تو وہ بھی آیت نمبر۵۰ میں مذکور ہے یعنی حساب کے دن سب کو جزا اُن کے اعمال کے مطابق ملے گی۔ آیت نمبر۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل اور ردِعمل کا لامتناہی سلسلہ ہے جو حساب کے دن اختتام کو پہنچے گا اور پورا پورا حساب لگانا اور بدلہ دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اتنے variables ہیں اور اتنے weightages (اوزان) ہیں کہ ایک آدمی کا بھی

پورا حساب لگانا مشکل ہے چہ جائے کہ کروڑہا کروڑ انسانوں کا حساب۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت کا یہاں ذکر ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سریع الحساب ہیں۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَO لَايُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَO (سورۃ الحجر آیت ۱۲،۱۳)

اس طرح ہم یہ استہزا ان مجرموں کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے۔

یہ آیات شروع سورت سے حضور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لیے نازل ہوئیں۔ ذوقاً ان دو آیات میں اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایسا کردیتے ہیں لہٰذا تم کو اس پر دل گیر نہیں ہونا چاہیے۔ کما قیل: ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔ اور چونکہ ہم نے ایسا کردیا ہے اس لیے یقین رکھو کہ اس میں ہزاروں مصلحتیں ہیں۔ لہٰذا ہم پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اس میں خیر ہی خیر ہے۔ ان کا ایمان لانا تمھارے اختیار سے باہر ہے لہٰذا ان کے پیچھے جان مت ہلکان کرو۔ وہ تو کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جب امید ہی نہیں ان کے ایمان لانے کی تو ان کے کفر و تکذیب سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَO (سورۃ الحجر، آیت ۲۲)

اور ہم ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اتنا پانی جمع کر کے نہ رکھ سکتے تھے۔

جتنے بڑے بڑے ڈیم چاہے ہم بنالیں، اگر ایک سال بھی بالکل بارش نہ ہو تو ہمارے سارے ڈیم بے کار ہو جائیں اور سارے منصوبے ناکام ہو جائیں، بلکہ ایک زمانے تک بارش نہ ہونے سے زیرِ زمین پانی بھی کم یاب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں کبھی بھی خالقِ قدرت کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے رکنا نہیں چاہیے۔

قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَالَکَ اَلَّا تَکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَO قَالَ لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍO(سورۃ الحجر، آیت ۳۲، ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہو؟ کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے۔

آیت نمبر ۳۱ میں انسان کو صلصال من حماء مسنون سے اور جنوں کو نارِ مسموم سے پیدا کرنے کا ذکر تھا۔ آیت نمبر ۳۲ میں ابلیس سے سوال سجدہ نہ کرنے کا اور آیت نمبر ۳۳ میں اس کے جواب کا ذکر ہے۔ ابلیس کا یہ کہنا کہ وہ ایسی مخلوق کو سجدہ نہیں کرسکتا جو مٹی سے بنائی گئی ہے کیوں کہ وہ خود آگ سے بنایا گیا ہے، اس کی صریح نادانی کی وجہ سے تھا کیوں کہ وہ آگ کو ہر حال میں مٹی سے افضل سمجھتا تھا اور اس کی نظر خالق کی قدرت کی لامتناہی وسعتوں اور گہرائیوں تک نہیں تھی کہ وہ جب چاہے جس کو چاہے دوسرے پر فضیلت دے دے۔ کوئی صفت کسی مخلوق کی مستقل نہیں ہے بلکہ خالق کی مشیت پر منحصر ہے۔

ان آیاتِ کریمہ سے چند باتوں کا اشارہ ملتا ہے:

(۱) یہ کہ بعض مرتبہ انکار بصورتِ سوال ہوتا ہے۔

(۲) دلائل تو شیطان کے پاس بھی ایک سے ایک ہیں اور بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا جواب آسانی سے نہیں بن پڑتا۔ جیسا کہ یہاں بظاہر شیطان اپنے انکار کا بہت ہی معقول جواز دے رہا ہے مگر یہ ایسوں کے لیے ہے جنھیں خدا کی قدرت کا علم نہیں ہے۔ اس کا ہر حکم عین مصلحت پر مبنی ہے اور اس کے لیے مزید مصلحت دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے حکم کے سامنے چون و چرا کرنا کبر ہے۔

(۳) یہ کہ ایک ہی بات کو مختلف طرح سے کہا جاتا ہے۔ جیسا اس معاملے میں شیطان کا ایک جواب یہاں ہے۔ دوسرا جواب سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ ءَ اسجد لمن خلقت طینا (آیت نمبر۶۱) تیسرا سورہ صٓ میں ہے کہ میں اس سے بہتر ہوں... وخلقتہ من طین (آیت نمبر۷۶) یہ تینوں باتیں ایک ہی ہیں، الفاظ مختلف ہیں۔ ممکن ہے شیطان کی یہ گفتگو زبان کے واسطے کے بغیر ہوئی ہو۔ اسی طرح قیامت کے ذکر میں بھی مجرموں کے بارے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان میں ان کی بے کسی اور ندامت کا نقشہ مختلف انداز میں کھینچا گیا ہے یعنی ایک ہی منظر کی صورت کشی مختلف الفاظ سے کی گئی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قیامت کے دن کے مختلف مناظر کا بیان الگ الگ جگہوں پر گیا ہو۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ○ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ○ (سورۃ الحجر ۳۹ ـ ۴۱)

کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھے (بحکمِ تکوین) گمراہ کیا، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔

شیطان کی یہ بات کتنی غیر منطقی (illogical) اور self-contradictory ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے سجدہ نہ کرنے کا الزام نعوذ باللّٰہ اللّٰہ تعالیٰ سبحانہ پر رکھ رہا ہے کہ جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا۔ استدلال درپردہ یہ ہے کہ اگر تو نہیں چاہتا تو میں یہ نافرمانی نہیں کرتا۔ لیکن فوراً اسی سانس میں اپنے اختیار کا حتمی اثبات کر کے کہہ رہا ہے کہ میں ضرور تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا (برائی کو ان کے سامنے مزین کر کے)۔ حالانکہ وہ اگر اللّٰہ ہی کو ہر بات کا فاعل مانتا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ رحم کی درخواست کرتا۔ لیکن ظالم فوراً جبری سے قدری بن گیا۔ یہی حال اس کے پیروؤں کا ہے کہ سارا الزام اپنے گناہوں کا اللّٰہ تعالیٰ پر ڈال دیتے ہیں اور اگر کہیں فائدۂ عاجلہ نظر آیا تو فوراً وہ کام کر لیتے ہیں اس وقت یہ نہیں کہتے کہ اللّٰہ چاہے گا تو ایسا خود بخود ہو ہی جائے گا۔

شیطان کے قول کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی اور کہا رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی۔ اور جب شیطان نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو جواب ملا ھذا... مستقیم۔ مقسوم۔ یعنی اللّٰہ تعالیٰ غنی ہیں اگر وہ بہت کثیر مخلوق کو بھی جہنم میں ڈال دیں تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

گرچہ تکوینی طور پر سب کچھ اللّٰہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کے علم میں ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں اور کون جہنم کے کس دروازے سے جائے گا۔ لیکن مخلوق میں سے جن کو کسی درجہ کا اختیار دیا گیا ہے وہ اپنے کیے کے ذمہ دار ہیں۔

اگر آج کسی کو بتا دیا جائے کہ اس کی قسمت میں جہنم میں جانا ہے تو کیا وہ اس کو آسانی سے قبول کر لے گا یا دن رات استغفار اور آہ و زاری میں مشغول رہے گا۔ اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ فما اصبرھم علی النار۔ یہ صبر اس لیے ہے کہ لوگ جہنم کی ہولناکیوں سے ناواقف ہیں اور عملاً ان کے نزدیک جنت اور جہنم کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ جواب کہ جب خدا ہی نہیں چاہتا تو ہم کیسے نیک بنیں، اس لیے ہے کہ لوگ دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہے ہی نہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍO
(سورۃ الحجر، آیت ۲۱)

اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے (بھرے پڑے ہیں) اور ہم اس (چیز) کو ایک معین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں۔

Modern technology has opened a vast field of vision in this respect.
بارش ہی کو دیکھ لو۔ بارش چند سالوں تک نہ ہو تو دریا خشک ہونے لگتے ہیں اور زیرِ زمین پانی بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اور بارش جتنی بھی ہو سمندر کے پانی میں کمی نہیں آتی۔ یہ خزانہ بارش کا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور جب چیزوں کی ماہیت کی تبدیلی ایک بدیہی بات ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو ستارے اور سیارے بنائے ہیں ان کے وزن اور ان کی حرارت (energy) کا اندازہ لگانا ناممکنات میں سے ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا ستارہ بھی ٹوٹ جائے اور اس کا ایک بہت چھوٹا ٹکڑا بھی پانی بن جائے تو پوری دنیا پانی میں ڈوب جائے۔ فالحمد للہ العلی الکبیر۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَO وَاِنْ کَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْکَةِ لَظٰلِمِیْنَO فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍO(سورۃ الحجر، آیت ۷۷۔۷۹)

ان بستیوں میں اہلِ ایمان کے لیے بڑی عبرت ہے اور بن والے (یعنی شعیب (علیہ السلام) کی امت) بڑے ظالم تھے سو ہم نے ان سے (بھی) بدلہ لیا اور دونوں (قوموں کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں۔

آیت نمبر ۷۷ سے قبل لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر تھا۔ لعمرک... الخ پھر ان پر عذاب آیا۔ مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں، حدیثِ ترمذی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اتقوا فراست المومن فانہ ینظر بنور اللہ اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی

(بیان القرآن)۔ مومن اللہ تعالیٰ کی کسی بھی مخلوق کو بے کار نہیں سمجھتا اور عالم خلق میں غور وفکر کرتا رہتا ہے اور واقعاتِ سابقہ سے وہ نصیحت حاصل کرتا ہے مثلاً قومِ لوط(علیہ السلام) کی ہلاکت سے ان کی قوم کے فعلِ قبیح کے ہولناک نتائج۔ اس غور وفکر کے صلے میں اسے فراست عطا ہوتی ہے۔ اسی لیے مومن کی شان میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

انتقام کبھی دنیا ہی میں لے لیا جاتا ہے کبھی آخرت میں، کبھی دونوں جگہ۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ O الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ O وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ O فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ O وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ O (سورۃ الحجر آیت ۹۴۔ ۹۹)

غرض آپ کو جس بات کا حکم کیا گیا ہے اُس کو (تو) صاف صاف سنا دیجیے اور ان مشرکین کی پروا نہ کیجیے یہ لوگ جو (آپ پر) ہنستے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان سے آپ کے لیے ہم کافی ہیں سو ان کو ابھی معلوم ہوجاتا ہے اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے اور نماز پڑھنے والوں میں رہیے اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

جو لوگ استہزا کر رہے ہیں ان کو تو ضرور اس کا بدلہ ملے گا اور ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی خوش خبری آیت ۹۶ میں دے دی گئی ہے اس کے باوجود آپ ﷺ کے قلبِ مبارک پر شفقت کی وجہ سے ان کی باتیں گراں تھی جس کا علاج اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اور اس کا شکر ادا کرنا بتایا گیا ہے جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ ہی حکم سے

ہو رہا ہے اور اچھا ہی ہو رہا ہے گرچہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہم سے پوشیدہ ہو اس لیے شکر واجب ہے نیز ضیقِ صدر کا یہ شافی علاج ہے کیوں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات ہم پر ہو رہے ہیں جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں لہٰذا تسبیح و تحمید اور سجدے کا ہر وقت داعیہ موجود ہے اور ان میں مشغول رہ کر انسان ضیقِ نفس سے نجات پا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوجایئے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قلب کو صدمہ ہو رہا ہے ان کی باتوں سے لیکن آپ ﷺ اپنے رب کی تسبیح اور اس کے شکر ادا کرنے میں اور نماز میں مشغول رہیے۔ جو کام آپ ﷺ کے ذمے ہے آپ تمام عمر وہی کام کرتے رہے۔ ہمارے لیے بھی یہی حکم ہے اور ہمارے لیے ایک بڑی تسلی ہے کہ ہمارے رب کو ہماری ایسی تکالیف کا بھی علم ہے جس سے صرف ہمارا قلب واقف ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ضیقِ نفس اس کی مخلوق پر شفقت کی وجہ سے ہے۔ اس لیے نظرِ کرم ہم پر پڑ رہی ہے۔ اس سے تمام کلفتیں دور ہوجاتی ہیں اور چونکہ یہ جدوجہد اور شفقت اور اس کے جواب میں خدا کی طرف سے رحمت اور دل جوئی اور اس کے جواب بندے کی طرف سے شکر اور پھر جدوجہد پھر دل جوئی پھر شکر مرتے دم تک جاری رہے گی اور اس کی رضا جوئی میں مشغول اور اس کا شکر ادا کرتے رہنا عبادت ہے اس لیے فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۝ (سورۃ النحل آیت ۲)

وہ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل (علیہ السلام)) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں (یعنی انبیا پر) نازل فرماتے ہیں، یہ کہ خبردار کردو کہ میرے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں سو مجھ سے ڈرتے رہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ خدا کی طرف رجوع ہو۔ البتہ ماحول کے یا دوسرے اثرات سے کوئی بادشاہ یا حاکم کو خدا بنا رہا ہے، کوئی پہاڑ کو، کوئی کسی جانور کو اور کوئی اپنے نفس کو خدا بنا رہا ہے اس لیے بار بار اس تاکید کی ضرورت ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ O (سورۃ النحل آیت ۴)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال (بد) ان کی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے اس جہلِ مرکب میں حق سے دور) بھٹکتے پھرتے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ اگر نہ ہو تو انسان ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہوتا ہے اور وہ جو اس کا جی چاہتا ہے، کرتا ہے بشرطے کہ قانون یا معاشرے کی طرف سے کسی سزا کا خوف نہ ہو۔ تہذیبِ نفس کے لیے ٹھوس بنیادیں نہیں ہوتیں اور اس کو اپنے اعمال اچھے لگنے لگتے ہیں۔

ایمان بالآخرۃ کے درجات کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بہت اچھی کسوٹی ہے کہ اگر انسان کو اپنے اعمال اچھے لگنے لگیں اور وہ اپنی اصلاح کی طرف سے بے فکر ہو جائے تو اس کا ایمان کمزور ہونے لگتا ہے۔ خشیتِ الٰہی اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا رہے اور اپنے اعمال کے نقائص سے توبہ کرتا رہے۔ ایمان اور محبت لازم وملزوم ہیں اور محبت کی یہ خاصیت ہے کہ جب یہ بڑھتی نہیں تو گھٹتی ہے۔

Love is like a tide, when it does not increase, it decreases.

وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO
(سورۃ النحل آیت ۱۸)
اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے لگو تو (کبھی) نہ گن سکو واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

اسی توحید کو راسخ کرنے کے لیے دو رکوع میں اپنی بے شمار مخلوقات کو اپنی نشانیوں اور مہربانیوں کے طور پر بیان فرمایا اور پھر فرمایا ''افمن یخلق... الخ'' اور آیت نمبر۱۸ میں فرمایا کہ تم گن نہیں سکوگے اس کی نعمتوں کو۔ تا کہ توحید خالص ثابت ہوجائے۔

نیکی کی توفیق ہوجانا بھی نعمت ہے اوراس پر شکر اورعمل میں نقص کی وجہ سے استغفار کرتے رہنا چاہیے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ O لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَO (سورۃ النحل آیت ۲۲،۲۳)
تمھارا معبود، برحق ایک ہی معبود ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل (معقول بات سے) منکر ہو رہے ہیں اور وہ (قبولِ حق سے) تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے احوال پوشیدہ و ظاہر جانتے ہیں یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ تو ہر نعمت کی جواب دہی کے خیال سے ہراساں اور پریشاں ہیں اور اپنی تقصیرات پر ہر وقت نادم ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کو جواب دہی کا خیال ہی نہیں آتا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں

ان کو آپ ان سے ظاہر کردیں اور تا کہ وہ (ان میں) فکر کیا کریں جو لوگ بری بری تدبیریں کرتے ہیں کیا ایسے لوگ پھر بھی اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللّٰہ تعالیٰ ان کو زیرِ زمین دھنسا دے یا ان پر ایسے موقعے سے عذاب آپڑے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو۔

یہ حسنہ ظاہری حسنات یعنی اچھی چیزوں کو بھی شامل معلوم ہوتا ہے، مثلاً اچھے مکانات، باغات وغیرہ۔ اس کا اشارہ لفظ ''لنبوّئنھم'' سے ملتا ہے۔ جس قوم نے اللّٰہ کے لیے ہجرت کی اس کے ساتھ یہ وعدہ عام طور سے ظاہری اور باطنی دونوں معنی میں پورا ہوتا رہتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی صبر اور توکل اختیار کرے گا، اس کو عطا ہوگا خواہ ہجرتِ مکانی نہ بھی کرے (جیسا آج سے پچاس سال پہلے سعودیوں کو عطا ہوا تھا کہ جب وہ نفاذِ شریعت پر کمربستہ ہوگئے تو چند سالوں (decades) کے بعد ان کے ہاں پیٹرول کی دولت آنی شروع ہوئی)۔ بعض مہاجرین دنیا میں صلہ ملنے سے پہلے اپنے رب سے جا ملتے ہیں اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر سبھوں کو مل جایا کرتا تو امتحان کیا ہوتا۔ امتحان تو ہوتا ہی یہی ہے کہ کوئی کٹھن راہ گزر ہو جس سے سلامت گزر جانا یقینی نہ ہو جیسے فی سبیل اللّٰہ قتال۔ لیکن ایک بار جب اخلاص کے ساتھ ہجرت میں قدم رکھ دیا تو اس کا اجر اللّٰہ ہاں ثابت ہوگیا۔ اور جو لوگ اس نیت سے ہجرت کریں کہ مال و دولت حاصل ہوگا، ان کی ہجرت صحیح معنوں میں ہجرت ہی نہیں ہے۔ جیسا حدیث شریف میں ''انما الاعمال بالنیات'' کے تحت واضح طور سے مذکور ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (سورۃ النحل آیت ۶۱)
وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ

اَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَ نَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَO

(سورۂ یونس آیت ۱۱)

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍO (سورۃ الشوریٰ آیت ۳۰)

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تو سطحِ زمین پر کوئی (حس و) حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے لیکن ایک میعادِ معین تک مہلت دے رہے ہیں پھر جب ان کا وقتِ معین آ پہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

اوراگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کے جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کردیا کرتا جس طرح وہ فائدے کے لیے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا سو (اس لیے) ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے، ان کے حال پر (بلا عذاب چند روز) چھوڑ رکھتے ہیں۔

اورتم کو (اے گنہگارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمھارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو درگزر ہی کردیتا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادت اللہ ایسی جاری ہے کہ انسانوں کو ان کے گناہوں کا بدلہ فوراً نہیں مل جاتا بلکہ یا تو معاف ہوجاتا ہے (آیت نمبر۳) یا ایک وقت مقررہ پر ملتا ہے (آیات نمبرا،۲)۔ لہٰذا یہ کہنا کہ میں نے کون سا گناہ کیا جو پکڑے گئے، سراسر بدتہذیبی اور بے وقوفی ہے اور اپنے گناہوں میں اضافہ کرنا ہے۔ فاعوذ باللہ من ذالک۔

کیوں کہ یہ تو ضرور ہے کہ جس مصیبت میں انسان گرفتار ہوتا ہے وہ خود اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے جیسا کہ آیت نمبر۳ سے واضح ہے۔ action اور reaction کا قانون ہر جگہ کام کر رہا ہے یہاں تک کہ اگر انسان کوئی نیک کام کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بھی اس کے اپنے ہی choice

کی وجہ سے ہے، گرچہ یہ ایسی تکلیف ہے جس پر ہزاروں راحتیں قربان ہیں۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو غلطی آج ہوئی ہے اس کی سزا آج ہی مل جائے، ہوسکتا ہے وہ معاف ہوگئی ہو جیسا کہ یعفوا عن کثیر سے امید ہوتی ہے۔ یا ہوسکتا ہے وہ نامۂ اعمال میں باقی رکھی گئی ہو۔ پھر اس کا یہ بدلہ دنیا میں کسی اور مقررہ وقت پر مل جائے یا آخرت میں اس کی سزا ملے یا دونوں جگہ سزا ملے۔ فاعوذ باللّٰہ من ذالک واستغفرہٗ واتوب الیہ۔

اسی طرح یہ کہنا کہ کافر تو ہم سے زیادہ گناہ کرتے ہیں پھر ان کی پکڑ کیوں نہیں ہوتی؟ اس سے زیادہ بیوقوفی ہے کیوں کہ ان کی فوراً پکڑ نہ ہونے کی وجہ آیت نمبر۱۲ میں بیان کردی گئی ہے۔ اکثر و بیشتر ان کو ڈھیل دی جاتی ہے جو یعمھون کے لفظ سے واضح ہے۔ فاعوذ باللّٰہ من الکفر والشقاق والنفاق۔

کما قال الشیخ اشرف علی رحمہ للّٰہ فی خطابہ المسمی بہ اصلاح النفس:

صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب کرنا چاہیے تھا۔ دیکھو جو شخص روزانہ ڈکیتی ڈالتا ہو اگر وہ چھ مہینے تک بچا رہے تو تعجب ہونا چاہیے اور پکڑا جائے تو کچھ بھی تعجب نہیں۔

ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جو گناہ ہم روزانہ کرتے ہیں ان پر پکڑ نہیں ہوتی خدا تعالیٰ ان سے تو ناراض نہیں ہوتے وہ تو معاف ہوگئے۔ اسی وجہ سے جب مصیبت کے وقت فکر کرتے ہیں تو نئے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر آج گناہ کیا ہو تو آج ہی اس کی سزا مل جائے، مثلاً مٹھائی کھانے کی وجہ سے پھوڑے پھنسیاں اسی روز نہیں نکلتیں۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِي ذَالِکَ لَاٰيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ○ (سورۃ النحل آیت ۶۷)

اور (نیز) کھجوراور انگوروں کے پھلوں سے تم لوگ نشے کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی دلیل ہے جو عقلِ (سلیم) رکھتے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ شراب رزقِ حسنہ نہیں ہے اور جب صرف طیبات حلال ہیں تو شراب حلال نہیں ہوئی۔ یہ ایک اور آیت حرمتِ خمر کے متعلق ہے اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ نشے میں آجانا ضروری نہیں ہے بلکہ مسکرات مطلقاً حرام ہیں۔ فالحمدللّٰہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ وعلیٰ من اتبع الھدیٰ۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ (سورۃ النحل آیت ۱۶)

اور بہت سی نشانیاں بنائیں اور تاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں۔

یہ آیتِ کریمہ اور اس طرح کی کئی آیات جو اس رکوع میں اور اس کے بعد والے رکوع میں ہیں، اللّٰہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحضار کے لیے ہیں تاکہ انسان ان پر شکر ادا کرے اور کفر سے بچے۔ آج بھی جب کہ جہتوں اور سمتوں کو جاننے کے لیے بہت سے آلات ایجاد ہو چکے ہیں، ستارے ایسے مقرر کردہ نشانات ہیں جو سائنس دانوں کے لیے سب سے بہتر رہنما ہیں جہتوں کو متعین کرنے میں۔ خدا کی شان ہے کہ جس طرح ایک جاہل دیہاتی کو ستارے راستہ دکھاتے ہیں اسی طرح ایک پڑھے لکھے جہاز ران کو بھی ستارے راستہ دکھانے میں مددگار ہیں۔ فالحمدللّٰہ۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (سورۃ النحل، آیت ۲۸)

جن کی جان فرشتوں نے حالتِ کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے) پھر کافر لوگ صلح کا پیغام ڈالیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہ کرتے تھے کیوں نہیں بے شک اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

یہ وہ گفتگو ہے جو فرشتوں اور کافروں کے درمیان ہوگی۔ کلامِ الٰہی کا یہ اعجاز ہے کہ مرنے کے بعد کافروں کی گفتگو کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ان کی پریشانی اور ان کا واویلا مچانا مختلف طریقوں سے ہوگا۔کبھی تو وہ اپنا جرم علی الاعلان مان لیں گے اور اس پر افسوس کریں گے کہ ہائے یہ ہم نے کیا کیا تھا۔کبھی وہ کہیں گے کہ ہم نے تو کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا،کبھی وہ کہیں گے کہ کاش ہم مٹی میں مل کر مٹی ہی ہوجاتے اور دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے۔ قیامت کے دن ان کی پریشانی اور مایوسی کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوگا اور مختلف آیات میں ان کے مختلف اور متضاد اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ۝ (سورۃ النحل آیت ۵۳)

اور تمھارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تم کو (ذرا) تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں کا ذکر ہے اسی طرح سے کہ نعمت کا ہر واسطہ اور اس سلسلے کی ہر کڑی اللہ تعالیٰ کی الگ نعمت ہے۔ اضطرار میں خدا کو پکارنے کی فطری خواہش جس پر انسان آج تک قابو نہیں پاسکے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ نعمتیں بھی تمام اسی کی طرف سے ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ النحل آیت ۹۳)

اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقے کا بنا دیتے لیکن جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں اور تم سے تمہارے اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی۔

جبر اور قدر دونوں مسئلوں کو اس ایک آیتِ مبارکہ میں سمو دیا گیا ہے۔ اللہ کیا چاہتا ہے کیا نہیں چاہتا اس کا تو ہمیں علم نہیں ہے، کس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے کس کو ہدایت دینا یہ اسی کو معلوم ہے۔ اس کی قدرت پر یقین رکھنا ایمان بالغیب میں شامل ہے۔ تم جو کچھ کرتے ہو، اس کے بارے میں تم سے پرسش ہوگی۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ النحل آیت ۹۶)

اور جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ ختم ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔

صبر کا ایک طریقہ تو یہ ہے جو معروف ہے کہ مصیبت کو برداشت کیا جائے۔ ایسی لذات کو چھوڑ دیا جائے جو ناجائز ہوں یا معصیت کی طرف لے جانے والی ہوں خواہ ان کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ ہو اور طاعات پر جمے رہا جائے خواہ اس کو کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ شکر کے ذریعے صبر حاصل کیا جائے، مثلاً کوئی ناگواری ہوئی تو یہ خیال کیا جائے کہ ایک ناگواری ہے تو کیا ہوا ہزاروں نعمتیں بھی تو اللہ تعالیٰ کی اس وقت ہمارے شاملِ حال ہیں۔ ان نعمتوں میں

سے بعض کا استحضار کیا جائے تو ناگواری دور ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک لذت کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو سیکڑوں چیزیں ایسی ہیں جو بے حد لذیذ ہیں اور ہمیں جائز طریقے سے حاصل ہیں یا حاصل ہوسکتی ہیں، مثلاً ایک محبت ہی ہے کہ کسی سے ہوجائے تو ہزاروں غم کا مداوا ایک اس غم سے ہوجائے۔ چہ جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوجائے تو پھر اس کی لذت کے سامنے کسی اور چیز کی کیا حقیقت ہے۔

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اور

از محبت تلخہا شیریں شود

اسی طرح کسی طاعت کو جی نہ چاہتا ہو یا کوئی خارجی مشکل یا مدافعت ہو تو انسان سوچے کہ جس اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں اس کا اتنا سا حکم نہ مانیں، بڑے شرم کی بات ہے۔ کیا یہی شکر ہے اس کی نعمتوں کا؟

اس طرح نعمتوں کے استحضار سے اور ان پر شکر ادا کرتے رہنے سے صبر کی دشوار گزار وادیاں خود بخود طے ہوتی رہتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا۔ اسی سے صابر اور شکور کا ربط سمجھ میں آتا ہے۔

انَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○
اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○
(سورۃ النحل آیت ۹۹، ۱۰۰)

یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسا رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

شیطان اپنی تمام قوتوں اور فتنہ پردازیوں کے باوجود اور تمام مکر و فریب اور

وساوس و خطرات کے لشکروں کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے بے بس ہے جو اپنے رب پر کامل بھروسا رکھتے ہیں۔ جن کی نظر ہر وقت اپنے رب پر رہتی ہے۔ اگر کبھی شیطان (یا نفس) ان سے کوئی گناہ کرا بھی دیتا ہے تو وہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ اور اللّٰہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ اگر کوئی نیکی کرتے ہیں تو اس کو محض اللّٰہ تعالیٰ کا فضل سمجھتے ہیں۔ اپنی عقل اپنی قوت اور اپنے ساز و سامان اور اپنے حامیوں پر بھروسا کرنا تو درکنار ان کی طرف نظر بھی نہیں کرتے۔ اسی طرح اپنے دشمنوں کے ساز و سامان سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ شیطان کا مقابلہ اپنے تقویٰ کے بھروسے پر نہیں کرتے بلکہ محض اللّٰہ کے بھروسے پر کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر اپنے علم و فضل یا اپنے تقویٰ پر ذرا سا بھی بھروسا کیا تو سمجھ لیجیے کہ شیطان کا پہلا وار خالی نہیں گیا اور لڑائی شروع ہونے سے قبل ہی اس شخص کی ہار کا فیصلہ ہوگیا۔

اس کی بین تفسیر ان بزرگ کا قصہ ہے جن کو شیطان نے کہا تھا تم اپنے علم کی وجہ سے بچ گئے ورنہ میں نے تم کو شکار کر ہی لیا تھا اور انھوں نے لاحول پڑھی تھی۔ اسی طرف اشارہ تھا حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللّٰہ علیہ کا جب انھوں نے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سے حدیث شریف کی یہ دعا نقل کی تھی۔ اللّٰھم اصلح لی... ولاتکلنی الٰی نفسی... الخ۔ دوسری آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شیطان سے تعلق رکھتے ہیں اور مشرک ہیں وہ تو شیطان کے قبضے میں ہیں ہی۔ ان پر تو اس کی حکومت ہے۔ لہٰذا ان کی کسی بات کی خواہ وہ معاشرت کی ہو یا اخلاق کی کبھی تقلید نہیں کرنی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی دل کو لگتی ہو کیوں کہ اس میں ضرور شیطان کا کوئی نہ کوئی کید چھپا ہوا ہوگا۔ البتہ اگر اس کی سند ہمارے دین سے مل جائے تو دوسری بات ہے۔

وضرب اللّٰهُ مثلًا قَرْيَة كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا
مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ

وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ O (سورۃ النحل آیت ۱۱۲)

اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں (رہتے) تھے (اور) ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چار طرف سے اُن کے پاس پہنچا کرتی تھیں سو انھوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دنیاوی مصیبتیں الجوع و الخوف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا بن کر پہنچتی ہیں۔ خواہ کفرانِ نعمت کی وجہ سے خواہ اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا۔ باوجودیہ کہ یہ نعمتیں ان کو اللہ تعالیٰ ہی عطا فرما رہے تھے۔۔ ؏

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ط وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ O شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ط اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ O وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ O (سورۃ النحل آیت ۱۲۰۔۱۲۲)

بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے مقتدا تھے، اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کرلیا تھا اور ان کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ فرمایا، اصل ابراہیم علیہ السلام تھا راہ ڈالنے والا... مولانا موصوفؒ معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

بے شک ابراہیم علیہ السلام ایک کامل امت تھے یعنی وہ ایسے امام اور ہادی اور پیشوا تھے کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات و کمال جمع تھیں جو متفرق طور پر ایک امت کے قائم مقام تھے لیس علی اللہ مستنکر ۔ ان یجمع العالم فی واحد۔

جاناں تو یگانہ دے ذات تو مست
مجموعۂ آثار کمالات ہمہ

اور بعض کہتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر سوائے ابراہیم علیہ السلام کے کوئی مومن نہ تھا۔ وہ تنہا امت تھے اس لیے ان کو امت کہا گیا۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَاتَکُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْکُرُوْنَ○ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ○ (سورۃ النحل آیت ۱۲۷، ۱۲۸)

اور آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجیے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوجیے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کی معیت صابرین کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صابرین ہی متقین اور محسنین ہیں۔ اس لحاظ سے شاکرین بھی یہی ہوئے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ

سَبِيلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ O وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ
مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ ط وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ O وَاصْبِرْ وَمَا
صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَاتَکُ فِیْ ضَيْقٍ مِّمَّا
يَمْکُرُوْنَ O (سورۃ النحل آیت ۱۲۵۔ ۱۲۷)

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے سے بلائیے اور (اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے (کہ اس میں شدت وخشونت نہ ہو)۔ آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے رستے سے گم ہوا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اگر بدلا لینے لگو تو اتنا ہی بدلا لو جتنا تمھارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجیے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوجیے۔

ذوقاً یہ اسی طرح کی معیت ہے کہ جیسے اللّٰہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو میدانِ کارزار میں بھیج کر دیکھ رہے ہوں کہ یہ کس طرح جنگ کرتا ہے، کتنی استقامت سے لڑتا ہے، اس کی نگاہیں ہماری طرف رہتی ہیں یا کسی اور کی طرف؟ صبر عن المعصیت، صبر علی الطاعۃ، اور صبر فی الشرۃ سب ہماری رضا سمجھ کر کرتا ہے یا نہیں اور فرما رہے ہیں کہ بس اب یہ رزم ختم ہی ہونے کو ہے۔ اس کے بعد تم کو ہمارے ہی پاس واپس آنا ہے۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم مت گھبراؤ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے پاس آکر دیکھو۔ ہم نے تمھارے لیے کیا کیا اچھا بدلہ رکھا ہے اور تمھارے دل جوئی کے کیا کیا سامان ہمارے پاس ہیں۔ اسی طرح جہاں جہاں اس طرح کے وعدے ہیں۔ حقاً علینا نج المومنین یا مؤمنون کی نصرت کا وعدہ ہے یا الارض یرثھا عبادی الصالحون کا وعدہ ہے وہاں ایک تو وجہ یہ بھی ہے کہ یہ سب وعدے قیامت سے متعلق ہیں۔ جس روز پورا پورا انصاف ہوگا گرچہ دنیا میں بھی نجات، نصرت اور وراثتِ ارض مومنوں کو ملتی ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ
بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ
اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ O ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ O
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ O (سورۃ النحل آیت ۱۰۶۔ ۱۰۸)

جو شخص ایمان لائے پیچھے اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جاوے بشرطے کہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی (اور) یہ (غضب اور عذاب) اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت نہیں کیا کرتا یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں۔

ایمان کے بعد کفر کی دو ہی وجہ ہوسکتی ہیں۔ (۱) یا تو شروع ہی سے براہِ نفاق ایمان لایا ہے اور یہ ایک کید ہے۔

(۲) یا سرسری طور پر مسلمان ہوا (ولما یدخل الایمان.. اور اسی اسلام کو یہاں عرفاً ایمان کہا گیا ہے اور پھر دنیا کی صعوبتوں سے اکتا گیا اور دین سابق پر چلا گیا۔

اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہی وجہ ہے۔ اوّل الذکر میں شروع سے ایمان کا شائبہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ بھی یہی حبِ دنیا تھی اور اسی ترجیح حیاتِ دنیا کی اگلی آیت میں غفلت سے تعبیر کی گئی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰي هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝ (سورۃ النحل آیت ۳۵۔ ۳۹)

اور مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بدون (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں ایسی ہی حرکت انھوں نے بھی کی تھی، سو پیغمبروں کے ذمے تو صرف (احکام کا) صاف صاف پہنچا دینا ہے اور ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان کے رستے سے بچتے رہو سو ان میں بعضے وہ ہوئے کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی اور بعضے ان میں وہ ہوئے جن پر گمراہی کا ثبوت ہوگیا تو (اچھا) زمین میں چلو پھرو پھر (آثار سے) دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا برا انجام ہوا ان کے راہِ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کرتا جس کو گمراہ کرتا ہے اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مرجاتا ہے اللہ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ کیوں نہیں زندہ کرے گا اس وعدے کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لازم کر رکھا ہے لیکن اکثر لوگ یقین نہیں لاتے تاکہ جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کیا کرتے تھے ان کے روبرو اس کا (بطور معائنے کے) اظہار کردے اور تاکہ کافر لوگ (پورا) یقین کرلیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے۔

یہ وہی جواب ہے جو سورۃ الحجر میں درج ہے۔ اور دراصل خدا اور یومِ آخرت کا انکار ہے (اس طرح رسول کا انکار خدا اور آخرت ہی کا انکار ہے اور تینوں میں سے کسی ایک کا انکار سب کا انکار ہے)۔

چنانچہ آیت نمبر ۳۸ میں اسی قول کا ذکر ہے، ''لایبعث اللّٰہ من یموت۔'' اور قیامت میں معلوم ہوجائے گا کہ یہی کفار جھوٹے تھے۔

رہ گئی تکوینی بات تو جسے خدا گمراہ کرتا ہے اسے ہدایت نہیں دیتا۔ چاہے آپ ﷺ کتنا ہی چاہیں۔ لہٰذا اس کی فکر نہیں کیجیے۔ آپ کے ذمے صرف بلاغِ مبین ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوْا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَ اَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝

(سورۃ النحل آیت ۱۱۹)

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لیے جنھوں نے جہالت سے برا کام کرلیا پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور (آئندہ کے لیے) اپنے اعمال درست کرلیے تو آپ کا رب اس (توبہ) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

اوّل الذکر وہ لوگ ہیں جو دن رات جہاد میں گئے ہوئے ہیں۔ اللّٰہ کی راہ میں ہجرت کر رہے ہیں۔ صبر کر رہے ہیں، لیکن پھر بھی اللّٰہ تعالیٰ سے ڈر رہے ہیں۔ وبالا سحارم یستغفرون۔ کیوں کہ بڑا سے بڑا عمل ہمارا اللّٰہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے سب کچھ مٹا دینے کے بعد اگر قبول ہونے کا اشارہ ہوجائے تو بہت بڑی بات ہے۔

ہمارے اعمال خواہ کتنے ہی اچھے ہوں اس ذاتِ عالی اور رفیع الدرجات ذوالعرش کی بارگاہ کے لائق نہیں ہوسکتے ان کے لیے مغفرت اور رحمت کا ایک نہایت

دل نشین انداز میں ایک طرح کا وعدہ ہے۔

ثانی الذکر وہ لوگ ہیں جو گناہ بھی کرتے ہیں اور نادم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے بھی اسی طرح غفران اور رحمت کی بشارت ہے۔ خواہ ہم تقویٰ کے کسی بھی درجے پر ہوں۔ نہ تو ناز زیبا ہے اور نہ ہی ناامیدی۔ ہمیشہ استغفار ہی کرتے رہنا چاہیے۔ نیکی کر کے ڈرتے رہنا چاہیے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو نہ معلوم کتنے نقائص رہ گئے ہیں۔ شاید نیکی کر گناہ لازم والی بات نہ ہوجائے۔ نیکی کر کنویں میں ڈال کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا۝ (سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۳۸ اور ۳۹)

یہ سارے برے کام تیرے رب کے نزدیک (بالکل) ناپسند ہیں، یہ باتیں اُس حکمت میں کی ہیں جو خدائے تعالیٰ نے آپ پر وحی کے ذریعے سے بھیجی ہیں اور اللہ برحق کے ساتھ کوئی اور معبود تجویز مت کرنا ورنہ تو الزام خوردہ اور راندہ ہوکر جہنم میں پھینک دیا جاوے گا۔

یہ تمام باتیں حکمت کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق علیا عین حکمت پر مبنی ہیں۔ چنانچہ یہاں توحید کو، والدین کے ساتھ احسان کو، ادائے حقوقِ انسانی کو، بخل اور اسراف سے اجتناب کو، پورا وزن تولنے کو، متکبرانہ چال سے بچنے کو اور اس طرح کی باتوں کو جن کا تعلق اخلاقیات سے ہے، حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لاتجعل مع اللہ الہ اخر کو ان باتوں سے پہلے بھی لایا گیا ہے اور بعد میں بھی۔ پس ظاہر ہوا کہ اصل

حکمت توحید ہے۔ جس پر تمام کا تمام تقویٰ مبنی ہے۔ چنانچہ راس الحکمۃ مخافۃ اللّٰہ فرمایا گیا اور ایک روایت کے مطابق تورات میں ہے کہ ''خداوند کا خوف علم کا شروع ہے۔''

ان میں سے تو بہت سی باتیں ظاہر نظر میں بھی حکمت یعنی عقل مندی کی معلوم ہوتی ہیں اور ان کو اختیار کرنے میں دینی اور دنیاوی فائدہ ہے، مثلاً بخل اور اسراف سے بچنا۔ بہت سی باتیں فردِ واحد کے لیے ہوسکتا ہے، دنیاوی نقطۂ نگاہ سے فائدہ مند نظر نہ آتی ہوں مگر پوری قوم اگر ان کو اختیار کرلے تو سب کے لیے فائدہ ہے، مثلاً جو قوم ناپ تول میں کمی نہیں کرتی ہے اور اشیائے فروخت میں ملاوٹ نہیں کرتی (جو ایک طور سے ناپ تول میں کمی ہے) اس کے فلاح دنیوی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اور بعض باتوں کا فائدہ تھوڑے تامل سے معلوم ہوجاتا ہے، مثلاً لا تقف...علم میں لایعنی باتوں سے بچنے کی تربیت ہے۔ کان، آنکھ اور دل سے بازپرس کا اندیشہ خواہشات پر قابو پانے اور ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی تربیت کرتا ہے۔ اگر انسان اپنی قوتوں کا صحیح رخ متعین کرے تو یہ اس کے لیے بے انتہا ترقی کا باعث بنتا ہے۔ قیامت میں تو پرسش ہاتھ پاؤں سے ہوگی اور رسول اللّٰہ ﷺ نے تو صرف دو ہی چیزوں کی ضمانت مانگی تھی مابین شفتین اور مابین رجلین کی لیکن جن تین چیزوں کا یہاں ذکر ہے وہ انسان کے وہ اعضا ہیں جن کے ذریعے وہ علم حاصل کرتا ہے جو اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی تمام خواہشات و جذبات کو ابھارنے کے ذرائع یہی اعضا ہیں۔ بغیر ان کی حفاظت کے نہ زبان کی حفاظت ہوسکتی ہے نہ مابین رجلین کی اور قلب یا تو عرشِ انوارِ الٰہی ہے یا ظلمت کدہ ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت بہت ضروری ہے اور خیالات کو بھی پاکیزہ رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ قلب میں ظلمت نہ آئے۔

قال محمد ابن الحنفیہ یعنی شہادت الزور، وقال قتادہؒ لاتقل رأیت ولم تر وسمعت ولم تسمع وعلمت ولم تعلم... نہی۔ عن القول بلاعلم... وفما الحدیث۔ ایاکم۔ والظن فان الظن اکذب الحدیث۔ (ابن کثیر) وقال ابن عباسؓ (کقول قتادہؒ و قال) (ان السمع) ما یسمعون (والبصر) ما تبصرون (والفؤاد) ما تتمنون... اعمال القلوب یظھر فی اعمال اجوارح

کما قال تعالیٰ ''ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم۔'' وکمال قال فی اموال الیتمیٰ، واللّٰہ یعلم المفسد من المصلح۔''

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ (سورۃ النمل آیت ۷۵، ۷۶)

اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے درمیان میں ایک پردہ حائل کردیتے ہیں اور (وہ پردہ یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈالتے ہیں اس سے کہ وہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دیتے ہیں اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لوگ نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ فہمِ قرآن کے لیے آخرت پر ایمان ہونا لازمی ہے۔ یہ تفسیر ہے ان ابتدائی آیات سورۂ بقرہ کی جن میں ایمان بالغیب، ایمان بالآخرۃ وغیرہ کو ہدایت بالکتاب کی شرط بتائی گئی تھی جب فہم ہی مسدود ہوتو ہدایت ملنا محال ہے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۳)

اورآپ میرے (مسلمان) بندوں سے کہہ دیجیے کہ ایسی بات کہا کریں جو بہتر ہو، شیطان لوگوں میں فساد ڈلوا دیتا ہے واقعی شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

بولنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بہتان، غیبت اور کذب بڑے گناہ ہونے کے علاوہ آپس میں جھگڑے کی جڑ ہیں۔ افراد کے مابین بھی اور گروہوں کے مابین بھی۔ اور اس طرح قوم میں تفرقہ بازی ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی ہم کوئی ایسی بات کہتے ہیں اپنے کسی عزیز یا دوست کے متعلق جو ہمارے خیال میں قابلِ اعتراض نہیں ہوتی اور ہماری نیت بھی درست ہوتی ہے لیکن یہ بات اس تک توڑ مروڑ کر کے پہنچتی ہے جس سے اس کے دل میں کدورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور شیطان اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ دو بھائیوں کے درمیان کس طرح سے تفرقہ ڈالے۔ اور اگر یہ بات یاد رہے تو بھائیوں کے درمیان رنجش پیدا نہ ہو اور ہو بھی جائے تو زیادہ دن قائم نہیں رہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے انتہائی تکلیف دہ طرزِ عمل کے باوجود اس ناچاقی کو شیطان کی چال کی طرف منسوب کرکے فرمایا، ''...من بعد ان نزغ الشیطان...'' جن اعزا و اقارب یا عام مسلمانوں سے ہمارا جھگڑا ہوجائے ان کی طرف سے کینہ پیدا نہ ہونے دینے کے لیے یہ تیر بہ ہدف نسخہ ہے۔

اگر دونوں یہ سوچیں کہ ہم نے تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں کہی تو دشمنی ختم نہیں ہوگی۔ بہت دفعہ بہت چھوٹی بات ہوتی ہے لیکن دوسرا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ بات اس نے اس لیے کہی کہ وہ مجھ سے جلتا ہے یا وہ مجھے برا آدمی سمجھتا ہے پھر اس کا اثر پہلے آدمی کی سوچ پر پڑتا ہے اور بات بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک یہ سوچ لے کہ یہ شیطان ہے جو میرے دل میں میرے بھائی سے نفرت یا حسد ڈال رہا ہے تو بات آگے نہ بڑھے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۶۱، ۶۲)

اور جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم(علیہ السلام) کو سجدہ کرو سو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا اور) کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے، کہنے لگا کہ اس شخص کو جو آپ نے مجھ پر فوقیت دی ہے تو بھلا بتلایئے تو خیر اگر آپ نے مجھ کو قیامت کے زمانے تک مہلت دے دی تو میں (بھی) بجز قدرے قلیل لوگوں کے اس کی تمام اولاد کو اپنے بس میں کروں گا۔

ان آیات میں شیطان کی مردودیت کا قصہ ہے جو سراسر کبر پر مبنی تھا۔ اس کی نظر اپنی عبادت پر اور آدم علیہ السلام کی تخلیق میں جو کم زوریاں تھیں، ان پر تھی اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں عابد و زاہد، فرشتوں کے ساتھ رہنے والا اس معمولی گارے سے بنی ہوئی مخلوق سے کس طرح کم تر ہوسکتا ہوں۔ اس تکبر کے ساتھ ساتھ حسد کا مادہ اپنی تمام ظلمتوں کے ساتھ ابھرا کہ اچھا دیکھیے پھر ہم اس کی اولاد کو کیسا مزہ چکھاتے ہیں۔ اس سے کم درجہ لیکن ملتے جلتے تکبر کا اظہار انسانوں سے بھی ہوتا ہے (دیکھیے سورۂ انعام آیت نمبر۱۲۴) ان آیات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بعض مرتبہ انکار بصورتِ سوال ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر شیطان کا براہِ راست جواب منقول ہے مثلاً ...خلقتہ من طین۔ (الحجر، آیت نمبر۳۳) یا انا خیر منہ... طین (صٓ، آیت نمبر۷۶)

ٹھیک اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اپنی فضیلت اور اعلیٰ درجات کو محض اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھتے ہیں، (دیکھیے آیات نمبر۸۶، ۸۷ سورۂ بنی اسرائیل)۔

ابلیس جو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار سے بخوبی واقف تھا وہ بھی عالمِ اسباب میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو محدود اختیارات دیے ان کو دیکھ کر بول اٹھا ''لاحتنکن'' حالانکہ مشیتِ الٰہی میں یہی تھا کہ شیطان آدم کو اور اس کی اولاد کو بہکائے گا۔ یہ قدر و اختیار کے دائرے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اس طرح چلتے رہتے ہیں (یعنی

synchornised ہیں) کہ فہم سے باہر ہیں پھر بیان کیسے ہوسکتے ہیں؟ البتہ مشاہدے سے دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں اور سبحانک اللّٰھم کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا O رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا O (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶۵، ۶۶)

میرے خاص بندوں پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا اور آپ کا رب کافی کارساز ہے، تمھارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمھارے لیے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اس کے رزق کی تلاش کرو بے شک وہ تمھارے حال پر بہت مہربان ہے۔

یہ بات مستحضر رکھنا کہ اللّٰہ تعالیٰ ہمارے رب ہیں اور ہم پر رحیم ہیں، پریشانیوں سے نجات دینے میں مدد و معاون تو ہے ہی، معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے شر اور وساوس سے بھی محفوظ رہنے میں بہت مفید ہے۔

وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ خَلِیْلًا O وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا O اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا O (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۷۳۔۷۵)

اور یہ (کافر) لوگ آپ کو اس چیز سے بچلانے ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر وحی کے ذریعے سے بھیجی ہے تاکہ آپ اس کے سوا ہماری طرف غلط بات کی نسبت کریں اور ایسی حالت میں آپ کو گاڑھا دوست بنالیتے اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب

جا پہنچتے (اور) اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو حالتِ حیات میں اور بعد موت کے
دُہرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔

اسی صفتِ بے پایاں اور بے مثال کا مظاہرہ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ بھی ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ثابت قدم رہے۔ ورنہ ان کا کید اتنا عظیم تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کے قدم متزلزل ہوجاتے یہاں تک کہ عظیم ترین انسان بھی تھوڑا سا تو ان کی طرف جھک ہی جاتا اگر اللہ تعالیٰ ثابت قدم نہ رکھتے۔ اور وہ کفار تو یہی چاہتے تھے کہ تھوڑی سی بھی بات ان کی مان لی جائے پھر تو وہ زیر کر ہی لیں گے یا کم از کم ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر دونوں دین ساتھ ساتھ چلتے۔ لیکن یہ تھوڑا سا جھک جانا بھی دراصل بہت بڑی بات ہوتی کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنے کے مترادف ہوتا جو اس کی طرف سے نہ ہوتی اور اسی لیے اس تھوڑے سے جھکاؤ کی سزا اتنی سخت ہوتی یعنی ضعف الحیواۃ اور ضعف المماۃ کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس تھوڑے سے بھی جھکاؤ سے محفوظ رکھا۔ دوسرے یہ تھوڑا سا جھکاؤ بھی آگے چل کر بہت بڑا فرق پیدا کردیتا جیسا کہ دو خطوطِ مستقیم کے درمیان شروع میں بہت تھوڑے زاویے کا بھی فرق ہو تو آگے پہنچ کر بہت بڑا فرق ہوجاتا ہے۔ گرچہ اس ''معمولی'' سی بات کے عوض اپنی مستقل دوستی پیش کر رہے تھے، ''لاتخذوک خلیلا۔''

''یہ نص ہے اس میں کہ انبیا کا بھی محافظ اللہ ہے۔ بدون اس کے قوۃ قدسیہ کافی نہیں۔ تو دوسرے کو تو اپنے تقدس ونسبتِ باطنہ پر ناز کرنے کا کوئی حق ہی نہیں اور ممکن ہے کہ خود وہ نسبت بھی موہومہ ہی ہو۔'' (مسائل السلوک)

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ
عَلَیْنَا وَکِیْلًاO اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ
کَبِیْرًاO (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۶، ۸۷)

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کرلیں پھر اس کے (واپس لانے کے) لیے آپ کو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ ملے مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بے شک آپ پر اس کا بڑا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ ان آیاتِ کریمہ میں اپنے محبوب ترین بندے کا حال بتاتے ہیں جن کو یقینِ کامل تھا کہ رسالت اور وحی کی یہ عظیم ترین نعمتیں محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہیں اور وہ جب چاہیں واپس لے لیں۔ ایسا کہ کہیں نام و نشان تک نہ رہے۔ اس لیے شروع سورت میں آپ کی صفتِ عبدیت کا ذکر فرمایا کیوں کہ ''عبودیت اشرفِ اوصاف ہے اور یہ بعد معرفتِ کاملہ کے ہوتا ہے۔''

حضور ﷺ کے طفیل میں ہم پر بھی اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم ہے کہ ہم ان کے امتی ہیں، اور اس پر شکر ادا کرتے رہنا ضروری ہے۔

اِنَّھُمۡ اِنۡ یَّظۡھَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ یَرۡجُمُوۡکُمۡ اَوۡ یُعِیۡدُوۡکُمۡ فِیۡ مِلَّتِھِمۡ وَلَنۡ تُفۡلِحُوۡۤا اِذًا اَبَدًا۝ (سورۃ الکھف، آیت ۲۰)

اگر وہ لوگ کہیں تمھاری خبر پاجاویں گے تو تم کویا تو پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تم کو (جبراً) اپنے طریقے سے پھیر لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہوگی۔

اگر اللہ تعالیٰ کافروں کے شر سے محفوظ رکھیں اور گوشۂ عافیت عطا فرمائیں تو خواہ مخواہ بغیر اپنی قوت کا اندازہ کیے ہوئے ان سے لڑائی مول لینا اچھا نہیں ہے۔ یہاں سے تبلیغ اور امر بالمعروف کے حدود و شرائط کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَکَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًاO وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًاO (سورة الکہف، آیت ۲۸، ۲۹)

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجیے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں اور دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا (یہ) حال حد سے گزر گیا ہے اور آپ کہہ دیجیے کہ (یہ دین) حق تمھارے رب کی طرف سے (آیا) ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے، بے شک ہم نے ایسے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں اس کو گھیرے ہوں گی اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جاوے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا مونہوں کو بھون ڈالے گا، کیا ہی برا پانی ہوگا اور دوزخ (بھی) کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

سب سے پہلے تو ان آیاتِ کریمہ میں خدا کی رحمت اور مومنین پر ان کی خاص شفقت اور التفات اور نظرِ عنایت کا ذکر ہے۔ اپنے حبیب ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی نظر ان کی طرف سے نہ ہٹائیے۔ آپ ﷺ کی نظر ان کے لیے روح پرور ہے، شفاء لمانی فی الصدور ہے، وجہِ تسکین ہے اور نگاہوں کے لیے ٹھنڈک ہے۔ آپ اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے نظر ہٹا دیں خواہ وہ مملکت کی کتنی ہی ضروری مصلحت کی بنا پر کیوں نہ ہو تو ان کے دل کو ٹھیس لگ جائے گی اور ان ہی کی دلدہی خدا کو منظور ہے۔ وہ

تربیت سے اتنی دیر کے لیے محروم ہوجائیں گے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔

ایک بات یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی غفلت کو اپنی تکوینی مصلحت کی طرف منسوب فرمایا، ''اغفلنا قلبہ۔'' تاکہ رسول اللہ ﷺ کو جوفکر ان کی طرف سے تھی کہ کسی طرح وہ ایمان لے آئیں، دور ہوجائے۔ کیوں کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو جب نظر خالق کی طرف پڑ جاتی ہے کہ ان ہی کی طرف سے ہو رہا ہے تو ناگواری کم ہوجاتی ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے ان کے فکر کا اس درجہ پر ہونا مقصود ہو جس سے ایمان کی طرف آنا ناممکن ہوجاتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی و نفسی ومالی کا زینۃ حیاۃ دنیوی چاہنا یقیناً صرف اسلام کی سربلندی کے لیے تھا کہ ''رئیس مسلمان ہوجائیں تو اسلام میں زیادہ جمال و کمال ہوگا۔'' (کما فسرہ الشیخ تھانویؒ) لیکن حضور ﷺ کو اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے تمھاری نگاہیں مخلص مسلمانوں کی طرف سے ہٹ جائیں۔ ''لاتطع'' سے مراد ہے کہ ان کی بات نہ مانیے مثلاً وہ اپنی حیثیت عام مسلمانوں سے جداگانہ چاہتے تھے۔ جب حضور ﷺ کو اس کا حکم ہوا حالانکہ حضور ﷺ کا دوسروں سے ملنا سراسر خیر ہی تھا کیوں کہ آپ ﷺ پر صحبتِ بد کا اثر محال تھا اور دوسروں پر صحبتِ نیک کے اثر کی کافی امید تھی تو دوسرے مسلمانوں کے لیے اور بھی ضرور ہوگا کہ وہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کریں جو دن رات اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہتے ہوں۔

اب ذرا ان لوگوں کو دیکھنا چاہیے جو اپنے خیال میں اسلام کی سربلندی کی خاطر حکومت اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ہمہ تن لگے رہتے ہیں خواہ اس کے لیے کافروں کے ہتھکنڈے ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں یا مصلحتاً ان کی کوئی بات ہی کیوں نہ ماننی پڑے۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی کام اگر مصلحت کی خاطر کیا جائے خواہ کتنا ہی عقل مند شخص کیوں نہ ہو اور کتنے ہی خلوص سے وہ کام کیوں نہ ہو اگر وہ خدا کے حکم کے سرِمو بھی خلاف ہو تو اس کام کو فوراً ترک کردینا ضروری ہے۔ حضور ﷺ سے زیادہ عاقل اور مخلص کون ہوگا، ان کو بھی کفار کی بات ماننے

سے (کہ ان سے الگ مجلس میں بات کی جائے جہاں عوام نہ ہوں) منع فرما دیا گیا۔ اور متنبہ کردیا گیا کہ اس ظاہر سامان سے اسلام کا جمال و کمال نہیں ہے بلکہ اس کا مدار اخلاص و اطاعت کاملہ سے ہے گو فقرا ہی سے ہو۔

آیت نمبر۲۹ میں تبلیغ کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے انکار کرے۔نہیں ماننے والوں کے زیادہ پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیت نمبر۲۸ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی اطاعت یعنی مشورہ قبول کرنا ہرگز عقل مندی کا کام نہیں ہے جس کا قلب خدا کی یاد سے غافل ہو وہ تو جاہلِ محض ہے خواہ وہ کتنا ہی اچھا مشورہ معلوم ہوتا ہو اس میں کوئی نہ کوئی چال ہوگی یا کوئی نہ کوئی خرابی مضمر ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلب کا اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہونا ہی بڑے غضب کی بات ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی ہوا کی پیروی کرنے لگتا ہے اور معاملات اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں رہتا تو اس کے تمام کام خدا اور رسول ﷺ کی مرضی کے موافق ہوتے ہیں اور ''عدل'' پر مبنی ہوتے ہیں اور بقول حضرت تھانویؒ ایک درجہ وہ بھی آتا ہے کہ اس کو پے بہ پے الہامات ہوتے رہتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلب کے غافل ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس شخص نے اپنے خواہشات کی پیروی کی اور اس کے کام حد سے گزرے ہوئے ہوگئے۔

ولا تقولنّ لشایْءٍ انّی فاعلٌ ذٰلک غدًاO الّا انْ یّشآء اللّٰہُ واذکُرْ رّبّک اذا نسیْتَ وقُلْ عسٰی انْ یّھْدِینِ ربّیْ لاقْربَ منْ ھٰذا رشدًاO (سورۃ الکھف، آیت، ۲۳،۲۴)

اور آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجیے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا

کے چاہنے کو ملا دیا کیجیے اور جب آپ بھول جاویں تو اپنے رب کا ذکر کیا کیجیے اور کہہ دیجیے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی) دلیل بننے کے اعتبار سے اس سے بھی نزدیک تر بات بتلا دے۔

عام حکم یہی ہے لیکن بعض حالات میں زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً جہاں کسی عزم کا اظہار ہو جیسا سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کے قصے میں ہے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ (سورۃ الکہف، آیت، ۳۵،۳۶)

اور وہ اپنے اوپر جرم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہنچا (اور) کہنے لگا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ یہ باغ (میری مدتِ حیات میں) کبھی بھی برباد ہو اور میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آوے گی اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا تو ضرور اس باغ سے بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ (سورۃ الکہف، آیت، ۳۹-۴۲)

اور تو جس وقت اپنے باغ میں پہنچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو

منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں، اگر تو مجھ کو مال اور اولاد میں کم تر دیکھتا ہے تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دے دے اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے بھیج دے جس سے وہ باغ دفعتاً ایک صاف میدان ہوکر رہ جاوے یا اس سے اس کا پانی بالکل اندر (زمین میں) اتر (کر خشک ہو) جاوے پھر تو اس کی کوشش بھی نہ کرسکے اور اس شخص کے سامانِ تمول کو آفت نے گھیرا پھر اس نے جو کچھ اس باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا۔

تکبر کا سبب اپنے سے کم نعمت پانے والے کو دیکھنا ہے۔ اگر نعمت دینے والے پر ہر وقت نظر ہو تو تکبر ہو ہی نہیں سکتا۔ جس نے دیا ہے وہ دوسرے کو تم سے بہتر چیز بھی دے سکتا ہے اور تم سے اپنی نعمت چھین بھی سکتا ہے۔ اعادنا اللّٰہ عنہا۔ اس لیے ماشاء اللّٰہ لا قوۃ الا باللّٰہ دل و زبان سے کہنا تکبر کا علاج ہے۔ اگر وہ باغ والا یہ کہہ دیتا تو بعد کے وبال سے بچ جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تکبر شرک کی ایک قسم ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے، ''الکبر ردائی او کما قال۔

کبھی کبھی دنیا میں بھی عذاب کا مزہ چکھایا جاتا ہے جیسے اس باغ والے کے ساتھ ہوا۔ ھنالک الولایۃ... خیر عقبا۔ یا مثلاً اصحاب السبت کا جو حشر ہوا۔ اسی طرح دنیا میں اجرِ مزید کے طور پر کبھی کبھی نعمت بھی دی جاتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام اسی طرح ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ ایمان لاتے... لاکلوا من فوقھم... لیکن دراصل حیواۃ الدنیا کی مثال ویسی ہے جیسی واضرب لھم مثل الحیواۃ الدنیا میں بیان فرمائی گئی ہے اس لیے امید وابستہ رکھنے کی چیز باقیات الصالحات ہی ہیں جو اللّٰہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور جو آخرت میں ملے گی۔ ان شاء اللّٰہ تعالیٰ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (سورۃ الکہف، آیت، ۵۰)

اور جب کہ ملائکہ کو ہم نے حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا سو اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا سو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کے چیلے چانٹوں کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں، یہ ظالموں کے لیے بہت برا بدل ہے۔

معارف القرآن میں ہے: بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا۔ گرچہ وہ فرشتوں کے زمرے میں شامل کردیا گیا تھا۔ چوں کہ وہ ان مخلوق میں سے ایک تھا جو مسئول عنہ ہیں اس لیے اس میں گناہ کرنے کی طاقت باقی بھی تھی یعنی درحقیقت فرشتہ نہیں تھا جو گناہ کر ہی نہ سکے۔ معلوم ہوا کہ انسان خواہ کتنا ہی مقرب نہ ہوجائے تقاضائے بشری سے مغلوب ہوجانے سے مامون نہیں ہوسکتا اور مرتے دم تک اپنے نفس کی نگرانی اور اللہ تعالیٰ سے استعانت اور استغفار کرتے رہنا ضروری ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے دو باتوں کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کفر اور ایمان میں دوستی نہیں ہوسکتی۔ کافر کا دوست اللہ کا دوست نہیں ہوسکتا ہے کیوں کہ اس سے اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے۔ لہٰذا ''صلحِ کل'' بایں معنی کہ اس سے بھی دوستی ہے اُس سے بھی دوستی ہے، بالکل لغو بات ہے۔ شیطان کی دوستی اللہ کو چھوڑ کر ہی اختیار کی جاسکتی ہے۔ اور آج کل جو قومیں اور حکومتیں کافر کی اقوام کے اشاروں پر چلتی ہیں وہ گویا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ چکی ہیں پھر کیوں نہ ذلیل وخوار ہوں۔

دوسرے یہ کہ دشمن کے ساتھ دو ہی طرح معاملہ ہوسکتا ہے یا بدلہ لے لیا جائے یا معاف کردیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اس کو دوست بنالینا یہ بہت برا بدلہ ہے۔

برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا مشورہ مانا جائے، ان سے دوستی کی جائے یا ان کی پیروی کی جائے۔ ظالموں کے ساتھ بھلائی یہ ہے کہ ان کو ظلم کرنے سے روک دیا جائے۔ اگر ان کی اعانت کی جائے تو یہ مظلوموں کے ساتھ ظلم ہے:

چو نیکی با بداں کردن چناں است

کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

قَالَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا○ وَکَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا○ قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا○ (سورۃ الکھف، آیت، ۶۷۔۶۹)

ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر (میرے افعال پر) صبر نہ ہوسکے گا اور (بھلا) ایسے امور پر آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا ان شاء اللّٰہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پاویں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلافِ حکم نہ کروں گا۔

معلوم ہوا کہ علمِ لدنی جن کو حاصل ہے اور جو صاحبِ تصرفات ہیں ان سے علم حاصل کرنے کے لیے مناسبت کی شرط ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو ان سے ملنے کا کہا گیا تھا وہ کسی خاص مصلحت کے تحت کہا گیا تھا۔ شاید یہ مصلحت ہو کہ ان کو معلوم ہوجائے کہ بہت سے علوم ایسے ہیں جو ان کو معلوم نہیں ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے کسی اور بندے کو وہ علوم عطا فرمائے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کا مشاہدہ ہوجائے کہ تکوینی طور پر جو بات بھی ہو رہی ہے اچھی ہی ہے خواہ ہمیں اپنی کم علمی کی وجہ سے وہ ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں۔

یہ بھی مسلم ہوا کہ علمِ لدنی معیارِ فضیلت نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام رسول تھے اور جن بزرگ سے ملے، ان کے نبی یا رسول ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ برگزیدہ

بندے تھے، عبدا من عبادنا۔ بہت ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مجموعی علم ان بزرگ سے کہیں زیادہ ہو۔

آیت نمبر ٦٩ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ تھا اور انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا وعدہ کوئی چیز نہیں ہے جیسے یہاں موسیٰ علیہ السلام اپنے ارادے کو پورا نہیں کر سکتے۔

ان تینوں قصوں میں بہت بڑی نصیحت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ جو بات بھی ہو رہی ہے خواہ ہمیں کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہو رہی ہے اور اچھی ہو رہی ہے۔

اس کے بعد والے پورے رکوع میں جن واقعات کا ذکر ہے ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ بہت سی باتیں ہمارے نزدیک بہت بری ہوتی ہیں لیکن مصلحتِ خداوندی چونکہ ہمیں نہیں معلوم ہے اس لیے ایسا سمجھتے ہیں ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسی کی مصلحت کے تحت ہو رہا ہے اور سب اچھا ہو رہا ہے جو بھی غیر اختیاری تکلیف یا پریشانی ذہنی یا جسمانی پہنچے اسے منجانب اللہ سمجھنا ضروری ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیسری بار کا پوچھنا اس سلسلے کو توڑ دینے کا سبب ہوا غالباً فطرتِ انسانی یہی ہے کہ وہ دو غلطیوں سے درگزر کرتا ہے، تیسری غلطی معاف نہیں کرتا۔ دوسری بات اشارتاً یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاید تیسرا سوال جدائی کا سبب اس لیے بھی ہو کہ پہلی دو باتیں جو خضر علیہ السلام نے کیں وہ عرفاً بھی غلط تھیں۔ اور ان کی تیسری بات کسی طرح ظلم یا منکر نہیں تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ پیغمبر تھے اور اپنی امت کے لیے نمونہ تھے اس لیے ان کے نزدیک یہ بات بہت عجیب تھی اور قابلِ اعتراض تھی اس لیے یہ تیسرا اعتراض خضر علیہ السلام کو برداشت نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ عدم مناسبت، نکتہ چینی، دائرۂ کار کا اختلاف وغیرہ آپس کے ذاتی تعلقات پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ اگر اختلافات نیک نیتی کی بنا پر ہوں تو آپس کی محبت قائم رہتی ہے اور گروہ بندی کا سبب نہیں بنتے۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا ۝ قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَمَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَہَلۡ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَہُمۡ سَدًّا ۝ (سورۃ الکہف، آیت، ۹۳،۹۴)

یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان میں پہنچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے انھوں نے (ذوالقرنین) سے عرض کیا کہ اے ذوالقرنین قوم یاجوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں ہماری) اس سرزمین میں (کبھی کبھی) بڑا فساد مچاتے ہیں کیا ہم لوگ آپ کے لیے کچھ چندہ جمع کردیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان میں کوئی روک بنادیں (کہ وہ پھر آنے نہ پاویں)۔

سبحان اللہ کتنی بڑی سلطنت ہوگی اور کتنی مشہور ہستی ہوگی ذوالقرنین کی کہ جو قوم بات چیت بھی نہیں کرسکتی تھی اس نے بھی مدد چاہی اور خراج دینے کو آمادہ ہوگئی اور کتنی بے پروائی تھی کہ انھوں نے ان چیزوں پر نظر نہیں کی اور فرمایا کہ جو مجھے میرے رب نے دیا ہے وہ بہت بہتر ہے اور اتنی بادشاہت پر بھی توکّل کا یہ حال تھا۔ آج کوئی معمولی عہدے دار ایسا کرے تو اس کا کتنا چرچا ہوتا ہے۔

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ۝ لَقَدۡ اَحۡصٰہُمۡ وَعَدَّہُمۡ عَدًّا ۝ وَکُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ۝ (سورۂ مریم، آیت، ۹۳۔ ۹۶)

جتنے بھی کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہوکر حاضر ہوتے ہیں (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور سب کو شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے روز سب کے سب اس کے پاس تنہا

تنہا حاضر ہوں گے بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کردے گا۔

اس افراتفری کے دن جب کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا اور لوگ گروہ در گروہ ہوں گے اس دن بھی حساب فرداً فرداً اور بخشش فرداً فرداً ہوگی۔ اس کا اندیشہ کسی کو نہ ہو کہ اس غنیِ مطلق اور قادرِ مطلق کے ہاں اس ناچیز کی نیک نیتی کا کیا شمار جہاں ایک وقت میں کروڑ دو کروڑ لوگ جنت میں جا رہے ہیں اور اسی حساب سے جہنم میں جا رہے ہیں۔ اس کا جواب محبت ہے رحمٰن کی طرف سے ملا کہ اس کی بھی قدر ہوگی۔

اَفَحَسِبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا عِبَادِیۡ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نُزُلًا ○ (سورۃ الکھف، آیت ۱۰۲)

سو کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز (یعنی معبود و حاجت روا) قرار دیں ہم نے (تو) کافروں کی دعوت کے لیے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے۔

ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کافرین جو خدا کا انکار کرتے ہیں اور اس کی نافرمانیوں میں مصروف ہیں اور اس کے بعض نیک بندوں کے ساتھ یا کسی نیک بندے کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کے وہ بندے اللہ کو چھوڑ کر ان کے دوست ہوجائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح جو اللہ کی رحمت کا انکار کرتے ہیں اور اس کی امید نہیں رکھتے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی کیسے امید رکھ سکتے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًاO اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًاO اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًاO (سورۃ الکہف، آیت،۱۰۳۔۱۰۵)

آپ (ان سے) کہیے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں، یہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گزری ہوئی اور وہ (بوجہ جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رب کی آیتوں کا (یعنی کتبِ الٰہیہ کا) اور اس کے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں سو (اس لیے) ان کے سارے کام غارت ہوگئے تو قیامت کے روز ہم ان (کے نیک اعمال) کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے۔

معلوم ہوا کہ اعمال کا وزن ایمان کے لحاظ سے ہوگا جس کا ایمان اللہ پر اور یومِ آخرت پر جتنا قوی ہوگا اتنا ہی اس کے نیک اعمال کا وزن ہوگا۔

یہ بہت واضح آیات ہیں اس کے متعلق کہ بعض کفار بڑے مخیرؔ ہوتے ہیں اور دنیا میں بھی اپنی خیرات کا بدلہ نہیں چاہتے کیوں کہ کسی نہ کسی طرح دوسری زندگی کے قائل ہیں لیکن اس طرح قائل نہیں ہیں جیسے رسول ﷺ نے کہا ہے تو ایسے لوگوں کو کیوں جہنم کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ چونکہ کفر اور انکارِ آخرت ایک چیز ہے، لہٰذا ان کو ان کے اعمالِ خیر کا بدلہ آخرت میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔ ان کی ساری عمر کی ریاضت (تپسیہ، رہبانیت) یہ سب دنیاوی زندگی ہی میں گم ہوگئیں چونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر سن کر ان پر ایمان نہیں لائے۔

بعض اوقات مومنوں کے اعمال بھی بعض گناہوں کی وجہ سے حبط ہوجاتے ہیں مثلاً رسول اللہ ﷺ کے سامنے زور سے بولنا حبطِ اعمال کو دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح بعض گناہ بعض نیکیوں کو کھا جاتے ہیں، مثلاً غیبت اور حسد۔ اسی طرح غیبت سے نیک اعمال دوسروں کو دے دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی کے ساتھ نیکی کر کے آدمی عجب

میں مبتلا ہوجائے تو عجب کا گناہ نیکی کے ثواب سے کہیں زیادہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ریا ایسے طریقے سے انسان کے دل میں داخل ہوتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ نفس کے کید کی طرف اس روایت میں خبردار کیا گیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ المخلصون علی خطر عظیم۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۝ (سورۃ الکہف، آیت، ۱۱۰)

(اور) آپ (یوں بھی) کہہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود (برحق) ایک ہی معبود ہے سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اعمالِ صالحہ تمام کی تمام عبادات ہیں۔ عبادت کی روح اخلاص ہے یعنی تمام عبادات میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی فرماں برداری مطلوب ہو اور یہی توحید ہے۔ جب توحید دل میں راسخ ہوجاتی ہے اور نفع نقصان کلیتہً اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہونا محسوس ہونے لگتا ہے تو اخلاص خود بخود آجاتا ہے اور اخلاص کی ضد ریا ہے جس سے بچنے کے لیے مجاہدے کرائے جاتے ہیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۝

قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّاO قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَکَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّاO (سورۂ مریم، آیت، ۱۶۔ ۲۱)

اور (اے محمد ﷺ) اس کتاب میں مریم (علیہا السلام) کا بھی ذکر کیجیے جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لیے) گئیں پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے انھوں نے پردہ ڈال لیا پس (اس حالت میں) ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتے جبرائیل کو بھیجا اور وہ ان کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ کہنے لگیں کہ میں تجھ سے (اپنے خدائے) رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاوے گا) فرشتے نے کہا کہ میں تمھارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں وہ (تعجباً) کہنے لگیں کہ (بھلا) میرے لڑکا کس طرح ہوجاوے گا حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتے نے کہا کہ یوں ہی (اولاد) ہوجاوے گی تمھارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے اور اس طور پر اس لیے پیدا کریں گے تاکہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لیے ایک نشانی (قدرت کی) بنادیں اور باعثِ رحمت بنادیں اور ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہوگی)۔

حضرت عیسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش میں اور ان کی ولادت سے قبل اور بعد اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں تھیں۔ جن لوگوں کے قلوب میں ذرّہ برابر بھی پاکیزگی تھی، یعنی ان میں ملکوتیت کا لمس تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے ان کے لیے ہر ہر واقعے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی خاص نشانی تھی۔ سب سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا دورِ نبوت پھر ان کی دعا پھر اس کی قبولیت کی عجیب نشانی پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش پھر حضرت مریم علیہ السلام کی پیدائش، ان کی والدہ کی نذر، ان کی کفالت کا عجیب واقعہ پھر ایک بڑے پیغمبر کے زیرِ کفالت رہنا۔ گوشۂ تنہائی میں رہنا، پھر فرشتے کا آنا اور ان کا اللہ تعالیٰ سے استعاذہ اور فرشتے کے جواب سے مطمئن ہوجانا۔

جو ملکوتیت کی شان کے مطابق تھا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام۔ یہ سب بڑے معجزات تھے اور محمد ﷺ کی تشریف آوری کا پیش خیمہ تھے ٹھیک اسی طرح جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کے ہاتھ سے جو معجزات ظاہر ہوئے ان کو دیکھ کر کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ جن کا ایمان خدا پر سرسری تھا ایمان نہیں لائے اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگانے کے گناہِ عظیم میں مبتلا ہوئے اور بعض لوگ اتنے حد سے بڑھے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہی بنالیا۔ اسی لیے فرمایا فاختلف الاحزاب... دنیا تو بنی ہی اس لیے کہ کچھ لوگ مومن ہوں کچھ کافر۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝ (سورۃ مریم، آیت، ۵۹۔۶۰)

پھر ان کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے ہاں مگر جس نے توبہ کرلی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کرنے لگا سو یہ لوگ جنت میں جاویں گے اور ان کا ذرا نقصان نہ کیا جاوے گا۔

اس سے قبل انبیا و رسل علیہم السلام کا ذکر تھا جب ان پر ہماری آیات کہ بعد میں جو لوگ آئے انھوں نے اپنی نمازوں کو ضائع کیا، اور اس کے نتیجے میں اتباعِ شہوات میں مبتلا ہوئے۔ اور علاج دوسری آیت میں ہے۔ بغیر توبہ کے ایمان مکمل نہیں اور بغیر ایمان کے عملِ صالح کا کوئی وزن نہیں اور یہ تینوں باتیں بھی ایک دوسرے سے مربوط ہیں جس طرح اضاعتہ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

اضاعتہ صلوٰۃ کی ایک شکل یہ ہے کہ نماز میں خشوع میسر نہیں ہوتا۔ جو شخص بھی

اپنی کسی شہوت کے پیچھے پڑ جاتا ہے، مثلاً شہوت للنسا تو نماز میں بھی ان ہی باتوں کا خیال رہتا ہے یا مثلاً جاہ کی خواہش، وہ بھی خشوع کے ضائع کرنے والی چیز ہے۔

دوسری شکل اضاعۃ کی یہ ہے کہ نماز کا ثواب ایسے اعمال سے ضائع ہوجائے جو اعمال حبطِ کرنے والے ہیں، مثلاً غیبت یا حسد اور یہ غیبت اور حسد بھی اتباعِ شہوات ہی کی وجہ سے ہے۔

اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آدمی اپنی تمام خواہشات سے اگر منہ موڑ لے تو زندگی کی حسین اور پُرلطف چیزوں سے محروم رہ جائے گا۔ اور اگر اسے یہ چیزیں مل بھی گئیں تو بھی وہ لطف اندوز نہیں ہوسکے گا کیوں کہ اس کا دل ان چیزوں سے ٹوٹ چکا ہوگا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ شخص جو اتباعِ حق کی خاطر اتباعِ شہوات چھوڑ دیتا ہے وہ ادنیٰ لطف کو چھوڑ کر اعلیٰ لطف حاصل کرتا ہے۔محض دنیادار کے نقطۂ نگاہ سے بھی جسمانی (اور جنسی) لذتیں ادنیٰ ہیں اور محبتِ مجازی اعلیٰ لذت ہے۔محبوب کے لیے جسمانی اذیت اٹھانا بھی لطف دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مثلاً ملک کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی جسمانی لذت کی قربانی آسانی سے دے دیتا ہے۔ اور اگر انسان میں تھوڑی سی بھی شرافت ہوتو اپنا کھانا کسی دو تین وقت کے بھوکے آدمی کو کھلا کر اسے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا بھی اپنا کھانا کھا کر خوشی نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تمام مخلوق عاجز ہے فسبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم جو غیر جان دار ہے اس کے قبضے میں تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔

جو جان دار ہے وہ اپنی ضروریات سے مجبور ہے اور اس پر قادر نہیں ہے کہ ان سے بالکل بے نیاز ہوجائے۔ اور نہ اپنی ضروریات کے پورا کرنے پر قادر ہے۔ خواہ کتنا ہی کوئی دنیا سے بے تعلق ہو، کھانے پینے کی ضرورت تو باقی ہی رہے گی۔ تو اب اگر انسان ان کو حدود اللّٰہ میں رہتے ہوئے پورا کرے گا تو جسمانی لذت بھی ملے گی اور خدا کی رضا بھی ملے گی۔ فطری لذت تو بدلتی نہیں مثلاً چینی ہمیشہ میٹھی ہی رہے گی (سوا اس

کے کہ انسان مریض ہو) لہٰذا فطری لذت اور رضائے خداوندی جمع ہوسکتی ہے اور اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اصل مقصود انسان کا ایک ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن ثانوی مقصود یا ثانوی غرض اور بھی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اتباع ایک ہی کا ہوسکتا ہے اتباعِ حق (اتبعوا ما انزل... اتبعونی... یہ سب ایک ہی بات ہے) یا اتباعِ باطل (اتباعِ شہوات... اتباعِ شیاطین... اتباعِ ہویٰ... یہ سب ایک ہی بات ہے) مگر عملی طور پر انسان بیک وقت ایک کام بھی کرتا ہے اور کئی کام بھی، مثلاً دیکھ بھی رہا ہے، کھا بھی رہا ہے، اور بات بھی کر رہا ہے اور دل خدا کی طرف متوجہ ہے۔ مجازی معاملات میں بھی اگر کوئی شخص اپنے محبوب کے ساتھ کھانے کو بیٹھے تو بات بھی کر رہا ہے، کھا بھی رہا ہے اور کھلا بھی رہا ہے لیکن دراصل صرف ایک کام کر رہا ہے یعنی محبوب کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پس حدود اللہ میں رہ کر نفس کے حقوق بھی ادا کر رہا ہے اور لذت بھی حاصل کر رہا ہے لیکن دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول ہے۔ تو دونوں میں کچھ تضاد نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا○ (سورۂ مریم، آیت، ۹۶)

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کردے گا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا یحبھم ویحببھم الی المؤمنین۔ اور ایک روایت کے مطابق جسے اللہ تعالیٰ اپنا دوست بنا لیتے ہیں ان کی محبت اپنی مخلوق کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔ سوائے کافروں کے تمام جن و انس حیوانات، جمادات، نباتات سب لفظ ''مؤمنین'' میں شامل ہیں۔

اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡO

(سورۂ طٰہٰ، آیت،۱۴)

(وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۔

نماز تو حضوری ہے اپنے رب کے سامنے، محبوبِ حقیقی کے سامنے، اپنی عبدیت کے اظہار کے لیے۔ نماز تو نام ہے اپنی خواہشات کو فنا کردینے کا۔ تجدیدِ عہد کا، اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنے کو قربان کردینے کے جذبے کو بیدار کرنے کا۔ ایک مسلمان کی تو ساری زندگی ہی تسلیم و رضا میں گزرنی چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری ضروریات اور خواہشات بھی پیدا فرمائی ہیں لہٰذا کبھی کبھی ظلم اور جہل کے حرکات کا صدور ہماری فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی یاد کے لیے ہمیں پانچ وقت اپنے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا تاکہ ہم اس کے سامنے تسلیم و رضا کے پیکر بن جائیں۔ اگر ایسا ہوتا کہ صرف اظہارِ عبدیت اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے میں وقت صرف ہوتا تب بھی احسان تھا کہ حضوری نصیب فرمائی لیکن کرم بالائے کرم یہ ہے کہ عین اس وقت بھی ہمیں اپنی حاجت مانگنے کی اجازت دے دی اور بعض حاجات کے عرض کرنے کا حکم بھی دیا۔ اب اگر اس کے باوجود بھی خیالات منتشر رہیں تو اللہ تعالیٰ ہی سے پنا مانگنی چاہیے۔

موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ کو بھی۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰیO فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنۡہَا مَنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِہَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ فَتَرۡدٰیO (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۱۵، ۱۶)

(دوسری بات یہ سنو) کہ بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے سو تم

کو قیامت سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے کہیں تم (اس بے فکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہو جاؤ۔

اگر قیامت کے دن کو مخفی نہیں رکھا جاتا تو پھر امتحان ہی کیا رہ جاتا۔ اگر جزا و سزا فوراً ہوجایا کرتی یا یہی بات ظاہر ہوجاتی کہ اس کا یہ اثر ظاہر ہونے والا ہے تو اس کا کیا معیار ہوتا کہ کس نے کون سا کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بغیر دنیاوی فائدہ و نقصان کا خیال رکھے ہوئے کیا ہے اور کس نے وہ کام دنیاوی فائدے کے لیے کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں طرح کے اعمال کے اجر میں فرق ہونا چاہیے۔ دوسری بات ذوقاً یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں ہر کسی کو اس کے عمل کا بدلہ ملنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ کارخانۂ عالم اس نہج پر قائم کیا گیا ہے کہ فوری سزا نہ ہو۔ کوئی مومن ہو کوئی کافر ہو دونوں کی مدد کی جاتی ہے۔ کلا ---۔ ھولاء... الخ

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر قیامت کو مخفی نہیں رکھا جاتا تو لوگ ہیبت کی وجہ سے مفلوج ہوجاتے۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہوجاتی جیسا کہ تمام بڑی آفتوں میں مشاہدہ ہے۔ ایک حدیث شریف بھی اس مضمون کی ہے کہ اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو مجھے معلوم ہیں تو تم نہ ہنستے، نہ بولتے، نہ اپنی بیویوں کے پاس جاتے۔ پھر اعمال اور ان کی جزا سزا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس دن کی سختی اور ہولناکی کو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ رکھا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے جو قیامت اور آخرت کی خبر دی ہے اس پر ایمان رکھنا اور اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور کب آئے گی یہ کسی کو پتا نہیں ہے۔ اگر یہ احساس قائم نہ رہے تو آدمی کو شہوات کی پیروی سے، حسد، کینہ، لوٹ مار، عیاشی اور ظلم سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ پھر نفس کا بندہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس احساسِ جوابدہی کے علاوہ تمام قوانین ایسے ہیں جن سے آدمی کسی نہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ مثلاً پولیس کو، عدالت کو، گواہوں کو رشوت دے کر بچ جانے کی امید کرسکتا ہے لیکن کسی طرح سے آخرت کے حساب کتاب سے بچ نہیں سکتا۔ جو آخرت

پر ایمان نہیں رکھتے وہ خود بھی نفس کے بندے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنی طرح کا بنانا چاہتے ہیں لہٰذا ان سے خبردار رہنے کا حکم دیا گیا۔ موضح القرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بری صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کیا ہے؟

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْO وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْO وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْO يَفْقَهُوْا قَوْلِيْO وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْO هٰرُوْنَ اَخِيْO اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْO وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْO كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًاO وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًاO اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًاO قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰىO (سورۃ طٰہٰ، آیت، ۲۵ تا ۳۶)

عرض کیا اے رب میرے، میرا حوصلہ فراخ کردیجیے اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجیے اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت) ہٹا دیجیے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کردیجیے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعے سے میری قوت کو مستحکم کردیجیے اور ان کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کردیجیے تا کہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک و نقائص سے) بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں، بے شک آپ ہم کو دیکھ رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ تمھاری (ہر) درخواست منظور کی گئی۔

شرحِ صدر سے کام آسان ہوجاتا۔ پھر اس کی تدبیر کی جاتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسی ترتیب سے دعا کی۔ جب حضرت عمرؓ کو شرح صدر ہوگیا کہ حضرت ابوبکرؓ کا اصرار مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کا برحق ہے تو وہ اس کے لیے تیار ہوگئے اور بالآخر فتح ان ہی کی ہوئی۔

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْO (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۳۹)

اور میں نے تمھاری اوراپنی طرف سے ایک اثرِ محبت ڈال دیا اور تا کہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔

جس کے قلب میں اللہ تعالیٰ جس کی محبت ڈال دے اور جس کو وہ چاہے لوگوں کا محبوب بنادے۔ جیسا اس موقع پر ہوا کہ جس کے قتل ہوجانے کا ۹۹ فی صد سے زیادہ خطرہ تھا اس کی پرورش بادشاہ اور ملکہ کے ہاتھوں کروا دی فسبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ہماری فہم کے اعتبار سے ہمارے محاورے کے مطابق فرمایا ہے۔

اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ یَّکْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰکَ اِلٰٓی اُمِّکَ کَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰکَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰکَ فُتُوْنًا ۟ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰیO (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۴۰)

(یہ قصہ اس وقت کا ہے) جب کہ تمھاری بہن چلتی ہوئی آئیں پھر کہنے لگیں کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتا دوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمھاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کو غم نہ رہے اور تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی اور ہم نے تم کو خوب محنتوں میں ڈالا پھر (مدین پہنچے اور) مدین والوں میں کئی سال رہے پھر ایک خاص وقت پر تم (یہاں) آئے اے موسیٰ۔

فرعون جیسے متکبر، جبار اور ظالم کے لاڈلے رہے، اپنی ماں کی رضاعت میں رہے، پھر چند سال مدین میں رہے تب کہیں جا کر تربیت مکمل ہوئی اور اس اندازے پر

جو ان کے لیے مقدر کیا گیا تھا جو ایک قوم کی سربراہی کے لیے اور اس کو فرعون کی غلامی سے نکالنے کے لیے جو قوم زمانۂ دراز سے غلامی کی لعنت میں مبتلا تھی اس تمام تربیت سے اور ان تمام ادوار سے گزرنا ضروری تھا۔ داؤد علیہ السلام کی تربیت کا حال ہمیں معلوم نہیں ہے لیکن سلیمان علیہ السلام کی تربیت مختلف طریقے پر ہوئی اور غیر کی بادشاہت میں رہتے ہوئے زمین کے خزانوں کا مالک ہوجانا حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے مقرر تھا اس لیے ان کی تربیت مختلف طریقے پر ہوئی۔ گویا جس سے جو کام لینا تھا اور اس کے لیے جن صلاحیتوں کا پیدا ہونا ضروری تھا اور جس طرح کی تربیت ضروری تھی اس کو اسی طرح کی تربیت دی گئی۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۴۴)

پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کرلے یا (عذابِ الٰہی سے) ڈر جائے۔

اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون کا کیا حشر ہونے والا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہیں تھا انھیں ان کے علم اور ان کی قدرت کے حساب سے حکم دیا جارہا ہے۔ اب وہ اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی نہ پوچھیں کہ حضور کو تو سب معلوم ہی ہے پھر مجھے پریشان کرنے کا کیا فائدہ (فائدہ تو بعد میں ظاہر ہوا اور خوب ظاہر ہوا) اور اس زمانے میں ایسے ایسے گستاخ ہیں کہ احکام کی علت پوچھتے رہتے ہیں۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ○ (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۴۵)

عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک فطری چیز ہے اور خشیۃ سے مختلف ہے کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام تو مومنِ کامل تھے جن کی شان ہے... ولم یخش الا اللّٰہ پھر نبوت ملنے کے بعد خوف کا اظہار کیسا۔ گرچہ خوف کھانے سے بھی منع کیا گیا اور فرمایا گیا۔ لاتخف مگر اسی قول میں خوف دور کرنے کا بھی ایک فطری طریقہ بتایا گیا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سنتا اور دیکھتا ہوں۔ یعنی اپنی معیت کو پیشِ نظر رکھنے کو کہا گیا کہ میری لامحدود قدرت سے تو سب واقف ہیں اور جب میں تمھارے ساتھ ہوں تو تمھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی بات مختلف انداز میں حضور نبیِ کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے غار میں فرمائی تھی کہ مت ڈرو اللّٰہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ حالانکہ وہ بھی مومنِ کامل تھے اور لم یخش الا اللّٰہ ان پر صادق آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک اضطراری اور عارضی حالت کا نام ہے جو خدا کی معیت اور اس کی قدرت کے استحضار سے دور ہوجاتی ہے اور خشیت عام طور سے اللّٰہ سے ڈرنے کو کہا جاتا ہے جو ایک مستقل نسبت ہے۔

فَلَنَاْتِیَنَّکَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَکَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَکَانًا سُوًى ○ (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۵۸)

سو اب ہم بھی تمھارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کرلو جس کا نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم کرو کسی ہموار میدان میں (تاکہ سب دیکھ لیں)۔

یہاں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وعدے کے لیے جو بنیادی بات ہمیشہ سے چلی آرہی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریق برابر حیثیت رکھتے ہوں اسی اصول پر فریقین کا بالغ

ہونا ضروری ہے اور اشیا کے فروخت کے لیے ان کی قیمت یا معاوضہ طے کرنا ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ معاوضہ کوئی مادی ہی شے ہو، محبت کی وجہ سے ہبہ کردینا بھی درست ہے۔

•

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى○ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۶۳)

(آخرکار سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بے شک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمھاری سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمھارے عمدہ (مذہبی) طریقے کا دفتر ہی اٹھا دیں۔

گرچہ ہر معاشرے میں تبدیلی سے resistance ایک فطری چیز ہے اور معاشرے کی بقا کے لیے ایک حد تک ضروری ہے لیکن تبدیلی کی ہر حال میں اور ہمیشہ مخالفت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ موجودہ حالت، موجودہ قوانین اور موجودہ ڈگر پر قائم رہنے سے جو معاشرے کے سرکردہ لوگ ہیں ان کو ہمیشہ فائدہ ہی ہوتا ہے لیکن معاشرے کے لیے ہمیشہ مفید نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب کوئی نئی بات کہی جائے تو اس کو یہ کہہ کر رد کردینا کہ یہ ہمارے اگلوں کی روش کے خلاف ہے، درست نہیں ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق یہ بات کیسی ہے۔ جس طرح انفرادی طور پر اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اسی طرح اجتماعی طور پر بھی معاشرے کو اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى○ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۷۳)

پس اب تو ہم اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے تاکہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر

وغیرہ) معاف کردیں اور تو نے جو جادو (کے مقدمے) میں ہم پر زور ڈالا
اس کو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ (تجھ سے) بدرجہا اچھے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان جادوگروں کو پہلے سے یہ گمان تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا وہ مقابلہ نہیں کرسکیں گے کیوں کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی فرعون کے ڈر سے وہ جادو کرنے کو تیار ہوگئے۔ فرعون کی طرف سے کتنا دباؤ تھا اور ان کے دل میں کتنی کراہیت تھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف مقابلے کے لیے آئے تھے لیکن دوسروں کو تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہوگا کہ وہ زور شور سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی کراہیت اس وجہ سے ہو کہ ازل سے ان کی قسمت میں مومن ہونا تھا۔ اس سے السعید من سعد فی بطن امہ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے دل کی اصلی کیفیت ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے اور ان کی خوش نصیبی مقدر ہوچکی ہوتی ہے اور زندگی کے سفر میں کوئی موڑ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کفر یا فسق چھوڑ کر پکے مومن بن جاتے ہیں لہٰذا کسی کو اپنے سے کم تر سمجھنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَکَ مِنْۢ بَعْدِکَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ۝

(سورۂ طٰہٰ، آیت، ۸۵)

ارشاد ہوا کہ تمھاری قوم کو تو ہم نے تمھارے (چلے آنے کے) بعد ایک بلا
میں مبتلا کردیا اور ان کو سامری نے گمراہ کردیا۔

آزمائش ارادۃ اللہ کے تحت ہے کہ دیکھیں ایسے وقت میں کون کیا کرتا ہے۔ نبلوکم بالخیر والشر فتنہ۔ تو جس طرح مادی لحاظ سے اچھی اور بری حالتیں آزمائش کی ہیں اس طرح روحانی لحاظ سے بھی آزمائشیں ہیں، مثلاً ایسا زمانہ لے آنا جس میں جسے دیکھو کفر و الحاد

میں مبتلا ہو رہا ہے تو یہ زمانہ خدا ہی کی مرضی سے ہے اور اس کی مصلحت اسی میں ہے۔

مگر گمراہ کرنے کا فعل سامری کا ہے اور اس کو اس کی سزا ملے گی گرچہ اس کا گم راہ کرنا ارادۃ اللّٰہ کے موافق ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو گمراہ کرنا۔ ہر کام خدا ہی کے حکم سے ہے اس کے باوجود دنیا میں ذمہ دار انسان ہے، اچھے کا بھی اور برے کا بھی۔ دونوں حکم الگ الگ ہیں تکوینی اور تشریعی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ○ (سورۂ طٰہٰ، آیت، ۱۱۶)

اور وہ وقت یاد کرلو جب کہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ (تحیت) کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اس نے انکار کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس صرف عابد و زاہد اور عالم تھا، محبوبِ حقیقی کا عاشق نہیں تھا (جیسا حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے) عشقِ الٰہی کے بغیر عبادت، علم و زہد سب برباد ہیں۔ عشق ہوتا تو ابٰی ہرگز نہیں کرتا۔ عشق میں انکار کی گنجائش کہاں؟ آنکھوں کے سامنے گلاس میں زہر گھول کر بھی کہے کہ پی جاؤ تو پی جاؤ۔ حضرت آدم علیہ وعلٰی نبینا الصلوٰۃ والسلام کا گناہ ''انکار'' نہیں تھا بلکہ صرف ''عصیان'' تھا جو ''نفسی'' کہہ کر درگزر کردیا گیا پھر توبہ سے نوازا گیا پھر معاف کیا گیا۔ پھر جو ازل سے مقدر ہو چکا تھا وہی کیا گیا کہ دونوں نیچے اترو... آدم علیہ السلام اور ابلیس مردود کے حکم کی خلاف ورزی میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ○ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ
هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰىO وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰىO قَالَ رَبِّ لِمَ
حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًاO قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ
اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰىO وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ
اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰىO

(سورۂ طٰہٰ، آیت،۱۲۲۔ ۱۲۷)

پھر ان کو ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنا لیا سو اس پر توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر (ہمیشہ) قائم رکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں جنت سے اترو (اور دنیا میں) ایسی حالت سے (جاؤ) کہ ایک کا دشمن ایک ہوگا پھر اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا، ارشاد ہوگا کہ ایسا ہی تیرے پاس ہمارے احکام پہنچے تھے پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاوے گا اور اسی طرح (ہر) اس شخص کو ہم (مناسب عمل کے) سزا دیں گے جو حد (اطاعت) سے گزر جاوے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لاوے اور واقعی آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے اور بڑا دیرپا ہے۔

توبہ کی توفیق عطا فرمانا اس کی رحمت کا پہلا درجہ ہے پھر اسے قبول فرمانا رحمت کا دوسرا درجہ ہے پھر مزید توبہ کی توفیق عطا فرمانا جیسا کہ متقیوں کی توبہ ہے یہ رحمت کا اس سے اوپر کا درجہ ہے اور قبول فرمانا اس سے اوپر کا درجہ ہے۔ یہ رحمت کے درجات ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں

فرمایا۔ (ثم اجتباہ) اصطفاہ (ربہ) بالتوبۃ (فتاب علیہ) فتجاوز عنہ (وھدیٰ) ھداہ الی التوبہ۔

توبہ کی رحمت عام ہے عامی کے لیے بھی اور مقرب بندے کے لیے بھی اور چونکہ درجات کی کوئی حد نہیں ہے اس لیے کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حضورﷺ بھی روزانہ ستر بار استغفار کیا کرتے تھے۔

اور یہ توبہ کی توفیق بندے کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ خود بندے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جب فضل بلاسبب ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ توفیق کسی کو کیوں ملی اور کیوں نہیں ملی۔

تکوینی اور تشریعی امور کی complexity آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ہبوط الی الدنیا سے شروع ہوتی ہے۔ توبہ جب قبول ہوگئی تو دنیا میں بھیجا جانا بطور سزا کے نہیں تھا اور جب آدم علیہ السلام دنیا میں بھیجے گئے تو شروع ہی سے معصوم بنا کر بھیجے گئے، معتوب بنا کر نہیں۔ دنیا میں آنا تو حکمِ تکوینی کے تحت تھا۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ ہی سے یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ یہ مقدر ہو چکا ہے لیکن جس طریقے سے یہ ہوا اس سے ایسا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی سزا تھی۔ آدم علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے نقطۂ نظر سے یہ عین معافی تھی کہ پہلے شیطان لعین کا جو حشر ہوا وہ دیکھ چکے تھے۔ گرچہ جنت کے مقابلے میں دنیا دار البلاء ہے لیکن اگر محبوب کی ناراضگی نہیں ہو تو کوئی تکلیف تکلیف نہیں ہے۔ ایک عاشق کے نزدیک اگر محبوب کے لطف و کرم کا اشارہ ہوجائے تو بڑی سے بڑی مصیبت معمولی ہوتی ہے چہ جائے کہ رضائے کاملہ کا وعدہ ہوجائے کہ بس تم نے یہ کرلیا تو میری توجہ اور رحمت اور رضا کے پورے طور پر مستحق ہوجاؤ گے۔

اس عظیم واقعے سے حضرت آدم علیہ السلام پر اپنی کمزوریاں بھی واضح ہوگئیں اور تقویٰ کی یعنی شیطان کے فریب سے ہوشیار رہنے کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر پوری طرح قائم رہنے کی (خواہ مصلحت کچھ بھی ہو یا کوئی اپنی طرف سے کچھ بھی مصلحت بتائے اس پر دھیان نہ دینے کی) اہمیت بھی واضح ہوگئی۔ اور قیامت تک کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے لیے قرآن شریف میں اس واقعے کا ذکر ہونے سے

نصیحت ہوگئی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سہارا پکڑے رہنا کتنا ضروری ہے۔ باوجود اپنی خلقی جہالت کے (انہ کان ظلوما جھولا) نورِ وحی کا انسان اگر اتباع کرے تو گمراہ نہیں ہوسکتا ورنہ عقل کی کوتاہی (جہل) اور نفس کی سرکشی (ظلم) سے بہت سے لوگ گمراہ ہوگئے ہیں۔ ولا یشقی سے اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جانے والی زندگی جو آرام ہی آرام ہوگا وہ مراد ہے۔ اور اگر دنیوی اور اخروی زندگی دونوں کو دیکھا جائے تو دنیوی زندگی اتنی مختصر ہے کہ یہاں اگر پریشانی و مشقت بھی ہو تو وہ قابلِ التفات نہیں ہے۔ نیز اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ مومن کو اتنا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے میں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بڑی سی بڑی مشقت بھی کوئی چیز نہیں رہتی۔ بادشاہوں کو بھی ویسا اطمینان اور ویسی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ اس مختصر زندگی کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جیسے ایک مشاق آگ سے گزر جاتا ہے اور اس کے جسم پر آبلہ بھی نہیں پڑتا۔

حضرت تھانویؒ نے آیت ۱۲۴ میں ''معیشۃ ضنکا'' کا ترجمہ فرمایا ہے ''تنگی کا جینا'' اور مسائل السلوک میں فرمایا: قال عبدالضعیف فیہ ذکر بعض اقسام القبض المسبب عن المعصیۃ وھو القبض الحقیقی یدل علیہ قولا ضنکا...'' ذوقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ذکر سے اعراض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیکی کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اور نیک کام کرنا نہایت دشوار ہوجاتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی تنگی ہے۔ جیسے حرص و ہوس کا بڑھ جانا، جس کا لازمی نتیجہ عافیت کا مفقود ہوجانا ہے اور اس طرح کی تنگی میں کفار ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں اور امراض و آلام میں گرفتار ہوجانا بھی ایک طرح کی تنگی ہے جس کا اثر مومنِ صادق پر بہت کم ہوتا ہے کیوں کہ ظاہری مصیبتوں کے باوجود اس کا قلب اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مطمئن رہتا ہے۔

اور اعراض کے اقسام میں شدید ترین قسم کا اعراض کفر ہے، پھر نافرمانی پھر مشغولیت فی مالا یعنی اور غفلت عن الذکر ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ O یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ O (سورۃ الانبیاء، آیت، ۱۹،۲۰)

اور (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ) جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے ہیں اور (ان میں سے) جو اللہ کے نزدیک (بڑے مقبول و مقرب) ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں (بلکہ) شب و روز (اللہ کی) تسبیح کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے۔

کبر، عبادت میں کاہلی، فرض عبادات میں تھک جانا، یہ سب خدا سے بعد کی نشانیاں ہیں جو خدا سے قریب ہیں ان کی نشانیاں ان آیات میں بیان فرمائی ہیں۔

لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا ٭ اِنْ کُنَّا فٰعِلِیْنَ O بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَکُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ O (سورۃ الانبیاء، آیت، ۱۷،۱۸)

(اور) اگر ہم کو مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا تو ہم خاص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا بلکہ ہم حق بات کو باطل پر پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (مغلوب ہو کر) دفعتاً جاتا رہتا ہے اور تمھارے لیے اس بات سے بڑی خرابی ہوگی جو تم گھڑتے ہو۔

باطل کی پیدائش اس لیے ہے کہ اس کو مٹانے کے لیے حق پیدا کیا جائے۔
آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے شیطان موجود تھا۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَO (سورۃ الانبیا، آیت ۲۳)
وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے۔

یہ بات کہ کس طرح اللہ کی رحمت اور اس کا انصاف ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اگر اس کا یقین ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل لامحدود ہے اور اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ رحمتی وسعت کل شئی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں بے حساب دے دیں۔ ایک کا حصہ کاٹ کر دوسرے کو اگر دیا جائے تو انصاف کے خلاف ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر کسی کو اس کے کسی عمل کے سبب مصیبت میں گرفتار کردیں تو کسی کو پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ یا کسی کو محض آزمائش کے لیے کسی مصیبت میں مبتلا کردیں یا رفع درجات کے لیے ایسا کریں۔ یا کسی بہت گناہ گار اور ظالم کو کوئی سزا نہ دیں تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اگر مجھ جیسے بہت سے گناہ گاروں کی کوئی سزا نہیں ہوئی تو مجھ کو کیوں سزا ملی یا یہ کہ فلاں آدمی تو بہت اچھا ہے اس نے کیا قصور کیا تھا کہ اس پر یہ مصیبتیں آرہی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے بارے میں اعلان فرمایا ہے کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے اسی طرح اپنی صفتِ عفو کے بارے میں اعلان فرمایا ہے کہ وہ بہتیروں کو معاف فرماتا رہتا ہے۔ البتہ اگر کسی کو کسی گناہ کی مقرر کردہ سزا سے زیادہ سزا دی جائے تو یہ انصاف کے خلاف ہو۔ لیکن ایسا ہونا محال ہے۔ اسی طرح اگر آخرت میں پوری پوری جزا کا وعدہ نہ ہوتا تب بھی مظلوم یہ شکایت کرنے میں ایک حد تک حق بجانب ہوتا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا لیکن مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلانے کا دن یومِ حساب ہے۔ دنیا میں جو بعض ظالموں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے تو اس میں بھی بہت سی مصلحتیں ہیں۔

اَوَ لَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا‌ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ‌ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ○

(سورۃ الانبیا، آیت، ۳۰)

کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا اور ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جان دار چیز کو بنایا ہے کیا (ان باتوں کو سن کر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اس ناچیز کے خیال میں یہاں ہر زندہ چیز کو پانی سے بنانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ایسی ہے کہ پانی جیسی حقیر چیز سے جس کی صورت یا رفتار اس کے اپنے قبضے میں نہیں ہے ایسی حقیر شے سے تمام زندہ چیزوں کو پیدا کیا۔ پانی یا کوئی اور سیال چیز جس برتن میں رکھی جائے اس کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور جس رفتار سے اس کو بہایا جائے اسی رفتار سے بہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صدیوں گزر جانے کے بعد لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ واقعی ہر جان دار چیز کی تخلیق کا مادہ سیال ہوتا ہے۔ قرآن شریف کا ایک معجزہ ہے کہ اس حقیقت کی خبر صدیوں پہلے دے دی۔

كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ‌ؕ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً‌ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ○ (سورۃ الانبیا، آیت، ۳۵)

ہر جان دار موت کا مزہ چکھے گا اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں اور پھر (اس زندگی کے ختم پر) تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے۔

موت اتنی ضروری چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو پھر شر اور خیر سے جو ہمیں آزمایا جارہا ہے اس کی جزا نہ ہو۔ اگر اعمال کا بدلہ ملنا ضروری نہ ہوتا تو موت بھی ضروری نہیں ہوتی۔ اگرچہ تمام قومیں موت کو برحق مانتی چلی آرہی ہیں لیکن ان میں موت کا جو ایک انتہائی اہم جزو ہے ''الینا ترجعون''، اس کا اعتقاد راسخ نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے

سامنے جوابدہی کا یقین راسخ نہیں ہے۔ ورنہ یہ بات ان کے عمل اور طرزِ زندگی سے ظاہر ہوتی۔ بہت سے لوگ اس کو اعمال کا قاطع سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ تمام تکالیف کا خاتمہ سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ تمام تعلقات کا خاتمہ سمجھتے ہیں اور اس لیے موت سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان بھی موت سے ڈرتے ہیں لیکن وہ اپنے اعمال کی خدا کے سامنے پیشی سے ڈرتے ہیں۔ کسی بڑے امتحان کے نتیجہ نکلنے کے وقت بھی آدمی کا دل دھڑکتا ہے کہ نہ معلوم کیا نتیجہ نکلے۔

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَO (سورۃ الانبیا، آیت، ۷۰)
(جب انھوں نے متفق ہوکر آگ میں ڈال دیا تو اس وقت) ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہوجا ابراہیم (علیہ السلام) کے حق میں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ قدس اللہ سرہٗ نے ایک دن فرمایا کہ آج کے جہنمی ماحول سے نجات کی کیا صورت ہے؟ کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ ہر طرف جہنمی اعمال ہو رہے ہیں۔ ظلم، فساد، بے شرمی، بے حیائی، فسق و فجور یہ سب جہنمی اعمال ہی تو ہیں۔ اگر سوئچ آف کر دیا جائے تو یہی اعمال شعلے بن کر بھڑکنے لگیں۔ ان سے بچنے کی صورت نظر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے مثال دے کر بتلا دیا کہ دیکھو ہم اس طرح بچاتے ہیں۔ اگر آج بھی ہمارا اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق ہو اور ہم اس کی پناہ مانگیں تو وہ ضرور ہمیں بچالیں گے اور ہم اس ماحول میں رہ کر بھی معصیت سے محفوظ رہیں گے۔

دوسری مثال حضرتؒ نے یوسف علیہ السلام کی بتائی ہے کہ کس طرح انتہائی شہوانی ماحول میں رہ کر بھی حضرت یوسف علیہ وعلٰی نبینا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ O (سورۃ الانبیا، آیت ۸۰)

اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی تاکہ وہ (زرہ) تم کو لڑائی (میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے سو تم شکر کرو گے بھی (یا نہیں)۔

بہت سے انعامات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر پشت ہا پشت تک رہتا ہے جیسے حضرت داوٗد علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کو زرہ بنانا (اور لوہے کو گرم کرنا) سکھایا اور اس کا فائدہ ہم کو ہو رہا ہے تو ان پر جو نعمت ہوئی اس کا شکر ہم پر واجب ہے۔ جس طرح والدین پر جو انعامات اللہ تعالیٰ نے کیے ان کا شکر ادا کرنا اولاد پر واجب ہے۔ لیکن کسی چیز کے استعمال کے جب ہم عادی ہوجاتے ہیں تو شکر ادا کرنے کا خیال نہیں آتا حالانکہ جب وہ چیز ایجاد ہوئی ہوگی یا دریافت ہوئی ہوگی تو کتنی بڑی خوشی ہوئی ہوگی اور وہ شکر کا کتنا بڑا داعیہ رہا ہوگا۔ اب بھی وہ داعیہ ان لوگوں کے لیے موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کرتے ہیں اور سرسری طور پر زندگی نہیں گزار رہے ہیں۔

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

یوں تو ہر دریافت و ایجاد میں شکر کا داعیہ موجود ہے، مثلاً بجلی کی دریافت میں لیکن اس خاص ایجاد میں اللہ تعالیٰ کا انعام در انعام ہے کہ اپنے ایک ایسے برگزیدہ بندے کو یہ سکھلایا جو اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بدرجۂ اولیٰ معترف تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں بھول جاتے ہیں کہ کن کن مراحل سے گزر کر وہ نعمتیں ہم تک پہنچیں۔ اسی طرح کبھی اس نعمت کے عام ہونے کی وجہ سے ہم اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر ان کے استحضار کا اور ان پر شکر ادا کرنے کا حکم فرمایا، مثلاً کھانے کا ہم تک پہنچنا کن کن مراحل سے گزر کر ہوا۔ انا

صبنا المآء.. الخ) اور مثلاً پانی کے بارے میں فرمایا کہ اگر ہم پانی خشک کردیں تو کون تمھیں صاف ستھرا پانی دے گا؟

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ○ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُـۨجِى الْمُؤْمِنِيْنَ○ (سورۃ الانبیا، آیت ۸۳ اور ۸۷، ۸۸)

اور ایوب (علیہ السلام) کا تذکرہ کیجیے جب کہ انھوں نے (بعد مبتلا ہونے مرض شدید کے) اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔ اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام) کا تذکرہ کیجیے جب وہ (اپنی قوم سے) خفا ہوکر چل دیے اور انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر (اس چلے جانے میں) کوئی دار و گیر نہ کریں گے پس انھوں نے اندھیروں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے آپ (سب نقائص سے) پاک ہیں میں بے شک قصوروار ہوں سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب و بلا سے) نجات دیا کرتے ہیں۔

حضرت عبدالحئی عارفیؒ نے فرمایا کہ ایوب اور نوح علیہما السلام کی دعائیں دینی معاملات میں مغلوبیت کے لیے بھی اکسیر ہیں، مثلاً معاشرے سے مجبور ہیں، اولاد کی بے راہ روی سے مجبور ہیں نیز حضرت ذوالنون علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں صاحب بڑا مشکل ہے آج کل (قرآن و سنت پر عمل کرنا) بڑی مجبوری ہے۔ اور یہ شعر پڑھ دیتے ہیں:

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

تو اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی حضرت یونس علیہ السلام کی کہ واقعی قعرِ دریا میں پہنچا دیے گئے پھر وہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں (عجز و ندامت کا اظہار کیا اور انھوں نے) کہا لا الٰہ الا انت... الخ (اور بس اس کے ساتھ ہی ان کی پریشانیاں دور ہوگئیں) یہ کلمات ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: کذلک نجی المؤمنین اور قیامت تک کے لیے جو بھی مومن یہ کلمات کہے گا اس کو ہم نجات دیں گے (یہ کلمات اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے)۔ یہاں یہ بات انفرادی ہے پوری قوم قعرِ دریا میں نہیں گئی تھی تو یہ بھی انفرادی تھی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍO (سورۃ الحج آیت ۳)

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے (یعنی ذات یا صفات میں) بے جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

خدا کی ذات و صفات میں جھگڑا کرنے والا یعنی کافر، نبی ﷺ کی اتباع سے برگشتہ ہوکر ہر شیطان کا اتباع کرنے لگتا ہے جس نے بھی سبز باغ دکھایا یا نفسانی خواہشات، مثلاً روٹی حاصل کرنے میں اس کی مدد کی، اس کی پیروی کرنے لگا۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِO (سورۃ الحج آیت ۴)

جس کی نسبت (خدا کے یہاں سے) یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ جو شخص اس سے تعلق رکھے گا (یعنی اس کا اتباع کرے گا) تو اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس کو (راہِ حق سے) بے راہ کردے گا اور اس کو عذابِ دوزخ کا رستہ دکھلا دے گا۔

چونکہ اس کے لیے یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو اس سے تعلق رکھے گا وہ اسے گمراہ کرکے جہنم میں پہنچا دے گا تو اب اس سے کسی بھلائی کی امید رکھنا عبث ہے۔ اسی طرح یہ امید رکھنا کہ شیطانی معاشرے میں رہ کر خیر یا عافیت حاصل ہوگی، امیدِ موہوم ہے۔ اگر اپنے اختیار سے اس سے باہر نہ نکل سکتا ہو اور اس سے مقابلہ نہ کرسکتا ہو تو کم از کم دل ہی میں برا سمجھے اور اس سے نکلنے کی دعا کرتا رہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝ (سورۃ الحج آیت، ۱۱۔۱۳)

اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کسی چیز کے) کنارے پر (کھڑا) ہو پھر اگر اس کو کوئی (دنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پا لیا اور اگر اس پر کوئی آزمائش ہوگئی تو منھ اٹھا کر (کفر کی طرف) چل دیا (جس سے) دنیا اور آخرت دونوں کھو بیٹھا، یہی کھلا نقصان (کہلاتا) ہے۔ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کو نفع پہنچا سکتی ہے یہ انتہا درجے کی گمراہی ہے وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اس (کی عبادت) کا ضرر بہ نسبت اس کے نفع کے زیادہ قریب الوقوع ہے ایسا کارساز بھی برا اور ایسا رفیق بھی برا۔

جب مصیبت کا وقت آئے اور ایمان کی آزمائش ہو اس وقت ایمان کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ضروری ہے کیوں کہ دنیا تو گئی ہی اگر آخرت بھی ہاتھ سے گئی تو خسر

الدنیا والآخرۃ والی بات ہے۔ بہت سے لوگ مصیبت سے گھبرا کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں جن سے فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ یہ دونوں بلاشرکتِ غیرے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر ظاہری طور پر کوئی فائدہ پہنچ بھی جاتا ہے تو اس سے پہلے نقصان پہنچ جاتا ہے کیوں کہ تم پہلے ہی اس کی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈال چکے ہوتے ہو اور خودداری سے دستبردار ہوگئے ہو۔ اب آئندہ نہ معلوم اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ آئندہ تمھارے کام آنے کی بجائے تم ہی کو اپنے مقصد براری کے لیے استعمال کرتا رہے۔

نیز دنیاوی فائدہ بھی بعد کی چیز ہے لیکن فوری ضرر غیراللہ کو مدد کے لیے پکارنے کا یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ختم ہوجاتا ہے۔ یہ نقصان بالکل فوری اور لٰہذا تمام نتائج سے اقرب ہے۔ لٰہذا کسی طرح کا بھی شرک فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہے کیوں کہ موہوم فائدہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو اس کے لیے آدمی یقینی نقصان نہیں کرتا۔ چہ جائے کہ وہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ بڑے سے بڑا دنیاوی فائدہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ○ مَنْ کَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ ھَلْ یُذْھِبَنَّ کَیْدُہٗ مَا یَغِیْظُ ○ (سورۃ الحج، آیت، ۱۴، ۱۵)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمادیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اللہ تعالیٰ جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے جو شخص (رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخالفت کرکے) اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ رسول ﷺ کی دنیا اور

آخرت میں مدد نہ کرے گا تو اس کو چاہیے کہ ایک رسّی آسمان تک تان لے
پھر (اس کے ذریعے سے آسمان پر پہنچ کر اگر ہوسکے) اس وحی کو موقوف
کرادے تو پھر (اب) غور کرنا چاہیے آیا اس کی (یہ) تدبیر اس کی ناگواری
کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کرسکتی ہے۔

جو پورے مومن نہیں ہیں اور معمولی سے امتحان میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں ان کی مثال آیت ۱۵ میں دی گئی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں یا گمان رکھتے ہیں کہ اس مصیبت میں جس میں وہ پڑ گئے ہیں اللہ ان کی مدد نہیں کرے گا۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ یہ قانون اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے اور اس کے ارادے کو کون روک سکتا ہے۔ ایمان عطا ہونا بھی ان ہی کے ارادے پر موقوف ہے۔ اس لیے نہ تو اپنے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر نازاں ہونا چاہیے اور نہ ہی گنہگاروں کو اس کی رحمت سے ناامید ہونا چاہیے۔ جب اس کی شان یہ ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے اور اس کا اعلان یہ ہے کہ اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے تو پھر ناامیدی کیسی؟

اس سے قبل ارشاد تھا کہ سبھی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔ چاند، سورج وغیرہ اور بہت سے لوگ جن پر عذاب کا فیصلہ ہوچکا ہے یعنی تکوینی طور پر سب اس کے آگے سربسجود ہیں۔

ومن یھن... تکوینی بات بھی ہے اور تشریعی بھی۔ سوال یہ ہے کہ اہانت اور اکرام دونوں میں سے ایک کسی نہ کسی فریق کو ملنا ہے یہ تو تکوینی بات ہے رہی تشریعی بات کہ تو اب کس کو اہانت ملنی چاہیے اور کس کو اکرام؟ فالذین کفروا... اس کا جواب ہے۔ جو لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ جو کافر اچھے اچھے کام کرتے ہیں ان کو کیوں عذاب ہوگا وہ اس تکوینی امر کا انکار کرتے ہیں اور درپردہ خدا کا انکار کرتے ہیں یعنی ان صفات کے ساتھ نہیں مانتے جن کے ساتھ ماننا واجب ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تمام کفار

میں جو قدر مشترک ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت اور اس کی دوسری صفات کا انکار ہے جو رسولوں کے واسطے سے ہمارے علم میں لائی گئی ہیں۔ اس کے برعکس مومنین کو اللہ تعالیٰ پر اس کی تمام صفات کے ساتھ ایمان ہے اور یہی بات ان میں قدرِ مشترک ہے ورنہ اچھے اور برے کام تو دونوں گروہوں سے ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری وجہ بعض لوگوں کے اشتباہ میں پڑ جانے کی یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ تقریباً مفقود ہے حالانکہ ان کی مخالفت اعلانیہ اور درپردہ جاری ہے۔ اگر مسلمان آنکھیں کھول کر دیکھیں تو ان کو معلوم ہوجائے کہ وہ اور کفار دو الگ الگ فریق ہیں جن میں اختلاف اللہ تعالیٰ کے ماننے نہ ماننے پر ہے تو اب کفار پر عذاب ہونا بالکل فطری بات معلوم ہوگی۔ خواہ ان میں سے بعض کتنے ہی ''نیک'' کیوں نہ ہوں۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِO وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍO لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَO ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِO ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِO حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍO ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِO لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِO

(سورۃ الحج آیت، ۲۶۔۳۳)

اور جب کہ ہم نے ابراہیم کو خانۂ کعبہ کی جگہ بتلا دی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا اور میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں کے اور (نماز میں) قیام و رکوع و سجدہ کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا اور (ابراہیم سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کردو، لوگ تمھارے پاس (حج کو) چلے آویں گے پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز رستوں سے پہنچی ہوں گی تا کہ اپنے (دینیہ و دنیویہ) فوائد کے لیے آ موجود ہوں اور (اس لیے آویں گے) تا کہ ایامِ مقررہ (یعنی ایامِ قربانی) میں ان مخصوص چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں (یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہیں) جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیے ہیں، سو ان (قربانی کے) جانوروں میں سے تم (کو) بھی (اجازت مع الاستحباب ہے کہ) کھایا کرو اور (مستحب یہ ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو۔ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کردیں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور (ان ہی ایامِ معلومات میں) اس مامون گھر (یعنی خانۂ کعبہ کا) طواف کریں۔ یہ بات تو ہوچکی اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی وقعت کرے گا سو یہ (وقعت کرنا) اس کے حق میں اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے اور ان مخصوص چوپاؤں کو باستثناء ان (بعض بعض) کے جو تم کو پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں تمھارے لیے حلال کردیا گیا ہے تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے (بالکل) کنارہ کش رہو اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو اس طور سے کہ اللہ کی طرف جھکے رہو (اور) اس کے ساتھ شریک مت ٹھیراؤ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اس کو ہوا نے کسی دور دراز جگہ میں لے جا پٹکا۔ یہ بات بھی ہوچکی اور (قربانی کے جانور کے متعلق اور سن لو کہ) جو شخص دینِ خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خداتعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے پھر (یعنی بعد ہدی بننے کے) اس کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیتِ عتیق کے قریب ہے۔

انسان کی فطرت کسی ٹھوس چیز کی تلاش میں رہتی ہے تا کہ وہ اپنی محبت کا

اظہار کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے یہ خواہش بڑھ کر اور صراطِ مستقیم سے ہٹ کر بت پرستی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے خانۂ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا تاکہ لوگ اس کا طواف کریں، اسے بوسہ دیں اور اس کا احترام کریں۔ اس کی طرف دیکھنا بھی ثواب ہے۔ اسی طرح شعائر اللہ میں ''البدن'' بھی شامل ہے اور یہ اللہ کی محبت اور اس کی عظمت کے اعتراف کی حسی (physical) شکلیں ہیں تاکہ یہ خواہش بھی تشنہ نہ رہے۔ اس سے آگے یعنی نعوذ باللہ خود خدا کی تمثیل اتارنے کی کوشش کرنا نادانی، جہل اور کفر ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌO اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِO (سورۃ الحج آیت، ۳۹-۴۱)

(اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے (آگے ان کی مظلومیت کا بیان ہے) جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک کا دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو (اپنے اپنے زمانے میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں

اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہوگئے ہوتے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبے والا ہے (وہ جس کو چاہے غلبہ اور قوت دے سکتا ہے)۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ نے ایک مرتبہ اس ناچیز سے فرمایا کہ ''میں نے ایک جلسے میں یہ کہا کہ گرچہ مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں آپ سے کہنا چاہ رہا ہوں اس کے کہنے کا وقت نہیں ہے اور نہ آپ میری بات سنیں گے لیکن چونکہ میں نے آج تک یہ مسئلہ بیان نہیں کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا رہ جائے اس لیے میں آپ سے یہ شرعی مسئلہ بیان کر رہا ہوں کہ حکومت مہاجرین کا حق ہے۔ اور میں نے یہ آیات تلاوت کیں۔ ان آیاتِ کریمہ کی شانِ نزول مہاجرین سے متعلق تھی اور ان کو جہاد کی اجازت ملی تھی (یا یہ فرمایا کہ جہاد فرض ہوا تھا) یہ پہلی آیت تھی جہاد کے متعلق، اس سے پہلے مسلمانوں کو ہاتھ روکنے کا حکم تھا۔ ان کی بے سرو سامانی اور دشمن کے ساز و سامان دیکھ کر جو فطری حیرت ہوتی تھی اس کا جواب وانَّ اللّٰہ علیٰ نصرھم تقدیر سے دیا اور اگلی آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آیت مہاجرین کی شان میں ہے اور اس سے اگلی آیت میں ان کی فتح کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بات تو عقائد میں شامل ہے۔ وہی اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ وہی مظلوم تھے، حق کے لیے اور ان ہی سے دوسرے قتال کیا کرتے تھے اور آیت ۴۰ کا ربط اگلی آیت سے بہت واضح ہے کہ جو لوگ صرف اللہ کے لیے گھر بار چھوڑ دیں وہ اللہ کے احکام کی خود اعلیٰ درجے کی پابندی کریں گے اور ان ہی سے یہ توقع ہے کہ اگر ان کو زمین میں حکومت دی گئی تو وہ سب سے بہتر طریقے سے اور سب سے زیادہ تن دہی سے ان احکامات کی دوسروں سے بھی

پابندی کراسکیں گے۔ البتہ وہ لوگ جنھوں نے محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہجرت نہیں کی ہو وہ حدیث شریف انما الاعمال بالنیات کی رُو سے مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اور ان سے یہ توقعات بھی وابستہ نہیں ہوسکتیں۔ ہوسکتا ہے یہ بھی ایک وجہ ہو پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہوسکنے کی کہ مہاجرین کی کثیر تعداد نے اللہ کے لیے ہجرت نہیں کی تھی۔

ولو لا دفع... سے اس بات کا اشارہ ہوسکتا ہے کہ ہر زمانے میں اللہ کے نام پر جو عبادت گاہیں بنائی گئی ہوں وہ محترم ہونے کی وجہ سے ان کی حفاظت کا یہ انتظام کیا گیا ہو۔

ان آیات سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کا عزم رکھتے ہوں ان کی ضرور مدد ہوگی، خواہ وہ کتنے ہی کم زور کیوں نہ ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایسے بظاہر کم زور لوگوں کی جو اپنے گھر سے نکالے گئے ہوں ان کی ایسی مدد فرمائی کہ دس پندرہ سال کے اندر سب لوگوں پر حاکم ہوگئے۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۝ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ۝ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

(سورۃ الحج آیت ۴۲، ۴۴)

اور (یہ مجادل) لوگ اگر آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو (آپ مغموم نہ ہو جیے کیوں کہ) ان لوگوں سے پہلے قوم نوح (علیہ السلام) اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم (علیہ السلام) اور قومِ لوط (علیہ السلام) اور اہلِ مدین بھی (اپنے اپنے انبیا علیہم السلام کی) تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی (قبط کی طرف سے کاذب قرار دیا گیا سو (تکذیب کے بعد) میں نے (ان) کافروں کو (چندے) مہلت دی پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا سو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا۔

حضرات نوح، ابراہیم اور لوط علیہم السلام کی قوم کا ذکر ان کے نام کے ساتھ فرمایا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ''کُذِّبَ'' فرمایا کیوں کہ ان کی قوم بنی اسرائیل تھی اور ان کو جھٹلانے والے فرعون اور اس کے ماننے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ ''قوم'' کا لفظ انسانوں کے اس مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے جن میں کوئی بات وجہ اشتراک ہو، مثلاً ایک خطۂ زمین میں مستقل آبادی یا ایک جدِ امجد کی اولاد ہونا۔ اس لیے ہم وطن اور ہم قوم کے الفاظ ایک دوسرے کے متبادل ہیں۔ البتہ ''ملت'' کا لفظ ایسا ہے جو وطن اور زبان کے قیود سے آزاد ہے گرچہ اس میں بعض لوگوں کو اشتباہ ہوجاتا ہے۔ مسلمان ایک ''ملت'' کے افراد ہیں ''ملۃ ابیکم ابراہیم۔''

وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ وَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ‌ؕ وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ۝ (سورۃ الحج آیت۔ ۴۷)

اور یہ لوگ (نبوت میں شبہہ نکالنے کے لیے) ایسے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ اللّٰہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کا دن امتداد میں) برابر ایک ہزار سال کے ہے تم لوگوں کے شمار کے موافق۔

جو قوم فسق و فجور میں مبتلا ہے اس کی سزا کیوں نہیں ہو رہی۔ لینصرن اللّٰہ من ینصرہ کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ اللّٰہ کے نزدیک ایک دن تمھارے ہزار سال کے برابر ہے۔ اگر قوموں کی سرکشی اور ان کی گرفت کے درمیان کئی سو سال بھی الگ جائیں تو گویا چند گھنٹے لگے۔

وقت کا حساب ہر جگہ کا الگ ہے یہاں تک کہ کبھی سارے آسمانوں کی سیر ہوجاتی ہے جو ہزاروں سال کی بات ہوتی ہے اور زمین پر صرف چند منٹ ہی گزرے ہوتے ہیں جیسا معراج کے واقعے میں ہوا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمین پر ہزار سال

گزر جاتے ہیں اور آسمان کے حساب سے ایک دن ہوتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ڈھیل دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عذاب نہیں آئے گا وہ ضرور آئے گا، چاہے ہزار برس بھی گزر جائیں اور جو وقت مقرر ہے وہ اسی وقت آئے گا اور اس پابندیِ وقت میں فرشتے ایک گھنٹا بھی آگے پیچھے نہیں کرتے۔ اور اللّٰہ کا حکم اتنی جلدی نافذ ہوتا ہے کہ اگر ایک دور کے ستارے سے بھی آئے تو لاکھوں برس لگ جائیں اور آسمان تو ستاروں سے بھی اوپر ہے لیکن اللّٰہ تعالیٰ کا حکم اس سے بھی زیادہ سریع ہے۔ ہمارے برس اور دن کو عالمِ بالا کے برس اور دن سے کوئی نسبت نہیں ہے بلکہ وہ تو زمان اور مکان سے بالا ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (سورۃ الحج آیت، ۷۸)

اور اللّٰہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اس نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو اس (اللّٰہ) نے تمھارا لقب مسلمان رکھا ہے (نزولِ قرآن سے) پہلے ہی اور اس (قرآن) میں بھی تا کہ تمھارے (قابلِ شہادت اور معتبر ہونے کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں اور (اس شہادتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل) تم لوگوں کے مقابلے میں گواہ (تجویز) ہو سو تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللّٰہ تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمھارا کارساز ہے (کسی کی مخالفت تم کو حقیقتاً ضرر نہ کرے گی) سو کیا اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار ہے۔

ذوقاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین میں تنگی نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ کھلی شاہراہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے چلی آرہی ہے اور اس کے احکام میں کسی قسم کا کوئی تضاد یا الجھاؤ نہیں ہے۔ اگر یہ معنی ہوتے کہ دین پر چلنے میں کسی قسم کی مشقت نہیں ہے تو یہ آیت جَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ سے شروع نہیں ہوتی۔

حضرت تھانویؒ والذین جاھدو فینا لنھدینھم سبلنا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''جاھدوا کا حاصل یہ چیزیں ہیں، غور وفکر، دعا و التجا وسعی۔ خدا کے سامنے گریہ و زاری و تواضع و انکسار، عجز و خاکساری، تکبر اور نخوت کو دماغ سے نکال کر پھینک دینا۔ اس کے بعد ان شاء اللّٰہ تعالیٰ مقصود میں کچھ دیر نہ ہوگی۔'' (افاضات الیومیہ، حصہ پنجم، ص۲۲۴) سورۂ حج کی آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ سنت ہی اصل طریق ہے (تاکہ تم پر رسول گواہ ہوں) نماز اور زکوٰۃ، جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کا حصہ ہیں اور اصل بات ہر معاملے میں اعتصام باللّٰہ ہے۔

نزولِ وحی کے وقت کے جو مخاطب تھے وہ تو بدرجۂ اولیٰ ساری دنیا کے لیے معیار تھے ہی (تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو) بعد کے مسلمان بھی اسی ملتِ ابراہیمی کے فرد ہیں اور ان پر بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ رسول اللّٰہ ﷺ کی پوری طرح پیروی کریں اور تمام انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بنیں۔ ہمیں ایک لمحے کے لیے رک کر یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح کا نمونہ انسانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ کیا وہ کوئی قابلِ تقلید نمونہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا کہ ہم لوگوں کے سامنے وہ نمونہ پیش کرتے جو رسول اللّٰہ ﷺ نے ہمارے سامنے چھوڑا ہے (زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں ہدایت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ ان کی ایک ایک ادا محفوظ ہے) تو ساری دنیا ہمارے قدموں میں ہوتی اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے رہتے۔ ہمارے دلوں سے جہاد کا شوق نکل گیا، نماز اور زکوٰۃ سے غفلت برتنے لگے اور مقصدِ رسالت پورا کرنے میں ہم کامیابی سے بہت دور ہوگئے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَO الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَO وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَO وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَO وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَO اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَO (سورۃ المؤمنون، آیت، ۱۔۶)

بالتحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی (حرام شہوت رانی سے) حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیوں کہ ان پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔

یہاں جو مومنوں کی صفات بیان فرمائی گئی ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں گرچہ ان کا ربط اتنا واضح نہیں ہوتا۔ نماز میں خشوع نہ ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:

(۱) لغو باتوں میں دل کا مشغول ہونا۔

(۲) مال کی محبت کی وجہ سے مالی امور کی طرف التفات ہونا۔

(۳) جنسی کشش کی وجہ سے شہوانی خیالات کا بار بار آنا۔

تو جو شخص لغو باتوں سے ویسے ہی پرہیز کرے گا اس کی توجہ لغویات سے خودبخود ہٹ جائے گی اور جو شخص زکوٰۃ دیتا رہے گا اس کے دل سے مال کی محبت خودبخود کم ہوتی جائے گی:

زر فزاید الفتِ زر کم کند

اور جو شخص اپنی عصمت کی حفاظت کرے گا اور اپنی بیوی یا کنیز کے علاوہ کسی اور کی طرف ملتفت نہیں کرے گا، اس کا التفات شہوانی خیالات کی طرف سے خودبخود کم ہوجائے گا۔

خشوع حاصل کرنے کا اور لغویت سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس کام میں آدمی مصروف ہو (اور جو وقت کا تقاضا ہو اس کے مطابق کام میں مصروف رہنا پاکیزگی سے طہارت سے عین رضائے الٰہی کے مطابق ہے کما قال الدکتور عبدالحئ عارفی قدس اللہ سرہ) اور پوری توجہ سے مصروف ہو۔ اگر کوئی کتاب پڑھ رہا ہو تو اس پر پوری توجہ مرکوز ہو۔ بیوی سامنے آگئی تو اس کی طرف پوری توجہ ہے۔ کسی سے گفتگو کر رہا ہو تو اس کی گفتگو پوری توجہ سے سنے۔ اگر آدمی کی آنکھیں فائل پر ہوں اور دماغ میں لغو خیالات ہوں تو گویا اس نے فائل دیکھنے کا حق ادا نہیں کیا۔ جب اس طرح خیالات کو ایک جگہ مرکوز کرنے کی عادت ہوجائے گی تو ان شاء اللہ تعالیٰ نماز میں بھی خشوع ہونے لگے گا۔ اگر ہر نعمت کا شکر ادا کرنے کی کوشش انسان کرتا رہے اور اس کی عادت ہوجائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ نماز میں بھی خشوع ہونے لگے گا کیوں کہ یہ اعظم ترین نعمتوں میں سے ہے۔ اگر اس میں جزوی کامیابی بھی ہوگئی تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ حقوق ادا کرنے کے لیے علم بھی ضروری ہے اور عقل بھی۔ لیکن ایک عمدہ ذریعہ اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ دل میں شکر کا جذبہ رفتہ رفتہ عملی شکر ادا کرنے کا واسطہ بن جاتا ہے۔ جب آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو، سوچے کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں الحمدللہ رب العالمین۔ اور یہ نہ سوچے کہ نماز پڑھ لوں گا تو فلاں کام کروں گا۔ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ کام کرلینا ابھی تو شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو اس کی نازل کردہ اس سے دعائیں مانگ رہے ہو۔ اگر کچھ اور سوچو گے تو وہ لغو بات ہوگی۔ لغو باتوں سے اعراض خشوع حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

ایک بار حضرت ڈاکٹر عبدالحئ قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ جس طرح اعمال جوارح میں بہت سے لغو افعال شامل ہیں (یعنی ایسے کام جن سے نہ دنیا کا فائدہ ہو نہ آخرت کا۔ اسی طرح اعمالِ قلبی میں بھی بہت سے لغو کام ہیں ان سب سے احتراز کرو۔ خود سے اپنے آپ کو وساوس میں مبتلا کرنا، نفسانی خیالات، شہوانی خیالات اور اس

طرح کی باتیں سوچنا سب لغو باتیں ہیں۔ جب ایسے خیالات آئیں فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوجاؤ۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔ غیرضروری باتوں کی طرف آدمی کی توجہ نہیں ہونی چاہیے۔ گناہ بھی لغو کا ایک شعبہ ہے اور اس کا سب سے اسفل درجہ ہے۔

حضرت تھانویؒ نے نماز میں ضروری باتیں یاد آجانے کی کئی صورتوں میں خشوع کا منافی نہیں بتایا ہے۔ وہ سب ایسی ہیں جو لغو نہیں ہیں۔

عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال، قال رسول اللہ ﷺ من حسن الاسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (رواہ الترمذی وغیرہ وحسنہ الحافظ ابن رجب الحنبلیؒ فی جامع العلوم والحکم)۔ حافظ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں، عنایۃ لغت میں کسی چیز کے خاص طور پر اہتمام کرنے کا نام ہے۔ اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی شان یہ ہونا چاہیے کہ جو قول وفعل بھی اسلام کی نظر میں قابلِ اعتنا اور لائقِ اہتمام نہ ہو اس سے یک لخت کنارہ کش ہوجائے (ترجمان السنہ، جلد اوّل، ص۵۲، ایچ ایچ سعید کمپنی، کراچی)۔

اعراض عن اللغو اور اعراض عن الغیر (یعنی توجہ الی المخلوق نہ ہونا) بعض معاملات میں ناجائز ہے کیوں کہ وہ محض صورتاً توجہ الی الخیر ہے۔

سب سے مشکل کام لغویت سے بچنا ہے کیوں کہ اس کو بہت معمولی بات سمجھی جاتی ہے اور جو مرض آسان سمجھا جاتا ہے، وہ لاعلاج ہوتا ہے۔ حالانکہ لغو سے بچنا اتنا اہم ہے اور لغو یا لایعنی بات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ نے لکھا ہے:

''اے برادر حدیث میں وارد ہے: علامۃ اعتارضہ تعالیٰ عن العبد اشتغالہ بما لا یعنیہ فرائض میں سے کسی بھی فرض سے اعراض کر کے نوافل میں سے کسی نفل عبادت میں مشغول ہونا لایعنی اور بے فائدہ ہے... ایک نفلی حج کی خاطر اتنے ممنوعات کا مرتکب ہونا اچھا نہیں...'' (مکتوب نمبر۱۱۴، بنام ملا طاہر بدخشی، جلد اوّل، حصہ سوئم، اردو ترجمہ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی) مترجم نے کہا ابن حجر نے شرحِ اربعین میں اسے امام

حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول قرار دیا ہے اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بایں الفاظ مرفوعاً روایت کی ہے: من حسن الاسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (سورۃ المؤمنون، آیت، ۵۱)

اے پیغمبرتم (اور تمھاری امتیں) نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو (اور) میں تم سب کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں۔

تمام انبیا و رسل صلوٰۃ اللہ علیہم کھانے پینے اور دوسرے ضروریاتِ بشری کے لیے اللہ تعالیٰ کے محتاج تھے جیسے کہ تمام انسان ہیں۔ ضروریاتِ بشری حلال اور طیب چیزوں سے پوری کرنی اور نیک کام کرنا بس ان ہی دو چیزوں کا مطالبہ سبھوں سے رہا ہے۔ اور ان ہی کا ادا کرتے رہنا کمالِ انسانیت ہے گرچہ بہت لوگ ان کو چھوٹی باتیں سمجھتے ہیں۔ اور یہی معیارِ بزرگی ہے کہ وہ معاملات و معاشرت اور کھانے پینے میں حلال اور حرام کی تمیز رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے نیکی کے کام سیّد المرسلین ﷺ کی پیروی میں کرتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (سورۃ المؤمنون، آیت، ۲۴، ۲۵)

(نوح علیہ السلام کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں جو کافر رئیس تھے (عوام سے) کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اس کے کہ تمھاری طرح کا ایک (معمولی)

آدمی ہے اور کچھ نہیں (اس دعوے سے) اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر
ہوکر رہے اور اللہ کو (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو فرشتوں کو بھیجتا، ہم نے یہ
بات اپنے پہلے بڑوں سے نہیں سنی بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہوگیا
ہے سو ایک وقت خاص (یعنی اس کے مرنے کے وقت) تک اس (کی
حالت) کا اور انتظار کرلو۔

حضرت نوح علیہ السلام پر دو اعتراضات ان کی قوم کے سرکردہ کفار کی طرف سے تھے (۱) یرید ان یتفضل علیکم اور (۲) رجل بہ جنۃ۔ ظاہر ہے کہ مجنون کو فضل حاصل کرنے کا خیال کیسے پیدا ہوگا اور ترکیب کیسے آئے گی۔ لہٰذا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متعارض contradictory ہیں۔ جس نے ان سرکردہ لوگوں کے اعتراضات کا لغو ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۝ (سورۃ المؤمنون، آیت، ۶۰)

اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود دینے
کے) ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس
جانے والے ہیں۔

اس طرح کی خشیت تمام طاعات اور اعمالِ صالحہ میں مطلوب ہیں۔ کیوں کہ ہمارا ہر عمل ناقص ہے اور کوئی بھی طاعت بارگاہِ صمدیت میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن کسی دوسرے کو کچھ دینے میں خواہ صدقہ ہو خواہ امداد ہو قلب میں خشیت کا پیدا ہونا ضروری ہے کیوں کہ اس وقت عجب میں مبتلا ہوجانے کا بلکہ اس سے بڑھ کر کبر میں مبتلا ہوجانے کا بہت خطرہ ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ تم کسی کو کچھ بھی دے دو اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جو بڑی بڑی نعمتیں بندوں کو عام طور سے حاصل ہیں ان کے سامنے بڑے بڑے دولت مندوں کی دولت ایسی ہی ہے جیسے ہمالیہ پہاڑ کے سامنے گندم کا اونچا ڈھیر اور اس میں سے وہ ایک نا قابلِ ذکر حصہ کسی مسکین کو دیتا ہے جیسے کسی کے پاس پہلے ہی سے پچھتر کروڑ روپے ہوں اور کوئی شخص اس کو پچاس روپے دے دے۔ تو اللہ تعالیٰ اس حقیر رقم کو بھی اگر اس کو خوش کرنے کی نیت سے دی گئی ہو، قبول فرمالیتے ہیں اور یہی ان کا بڑا کرم ہے اور اگر وہ حساب لینا شروع کردیں کہ میری بقیہ نعمتوں کو (۷۴،۹۹،۹۹،۹۵۰ روپے سے کہیں زیادہ رقم کو) کہاں خرچ کیا اور ناشکری کی وجہ سے اپنا فضل بہت تھوڑا سا بھی روک لیں تو یہ عدل ہوگا۔

الحمد للّٰہ ایک حدیث شریف اس معنی کی کہ ہر طاعت پر خشیت مطلوب ہے مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ نے بھی معارف القرآن میں نقل کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا سے ایک قراۃ اس کی یأتون مااتو بھی منقول ہے یعنی عمل کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔'' اور حضرت عائشہؓ ہی سے منقول ایک حدیث شریف میں ہے کہ ان کے اس سوال پر کہ یارسول اللّٰہ آیا یہ آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں (ترمذی) آپ ﷺ نے فرمایا... بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں اس کے باوجود ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللّٰہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب) قبول نہ ہوں... حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کرکے اتنے ڈرتے تھے کہ تم برے عمل کرکے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔''

اگر نماز میں... راجعون کا احساس قوی ہوجائے تو نماز میں بھی قلب کی یہی کیفیت ہو کہ خدا کے خوف سے لرزتا رہے اور نماز کو آسان کرنے کے لیے یہ بات قرآن شریف میں آئی ہے کہ جو لوگ اللّٰہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا یقین رکھتے ہیں وہی لوگ خشوع کرنے والے ہیں اور ان کے لیے نماز آسان ہے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِیْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ○ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْئَرُوْنَ○ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ قف اِنَّکُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ○

(سورۃ المؤمنون، آیت ۶۳ ـ ۶۵)

بلکہ ان کفار کے قلوب اس دین کی طرف سے جہالت (اور شک) میں ہیں اور اس کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی (برے برے) عمل ہیں جن کو یہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوش حال لوگوں کو عذاب (بعد الموت) میں دھر پکڑیں گے تو فوراً چلا اٹھیں گے (اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) اب مت چلاؤ ہماری طرف سے تمھاری مطلق مدد نہ ہوگی۔

کافروں کی آخرت کی طرف سے بے پروائی بے انتہا موثر اور دل پذیر پیرائے میں بیان فرمائی گئی ہے۔ آخرت کی طرف سے تو ہوش ہی نہیں اور اس کے علاوہ ان کو بہتیرے کام ہیں جن میں وہ لگے ہوئے ہیں۔ اس مشغولیت میں عمریں گزر جاتی ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوجاتی ہے تب وہ چلاّنے لگتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ○ (سورۃ المؤمنون، آیت ۷۸)

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

یہاں ایک نہایت بلیغ طریقہ اختیار فرمایا اپنی ربوبیت سے معاد کے حق ہونے کا۔ دوسری جگہ سمع، بصر اور فؤاد کے مسئول عنہ ہونے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ کس قدر شکر کیا نعمتوں کا اس کے پوچھنے کا کوئی دن مقرر ہوگا۔ شاکرین کو جزا ملنا اور جو شکر ادا نہیں کرتے یعنی کافرین کو سزا ملنا زندگی کا منطقی نتیجہ ہے۔ پھر اس کے آگے

تخلیق اور اس کے منطقی انجام یعنی خالق کی طرف لوٹنے کا ذکر فرمایا۔ وھو الذین ذراکم... الیہ تحشرون۔ پھر دن اور رات کے اختلاف کا ذکر فرمایا گیا۔ اس کے بعد کفار کے اعتراض کا ذکر ہے کہ کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈی ہوجائیں گے... اور اس کے بعد کی آیتوں میں اس کا شافی جواب ہے۔

اِنِّی جَزَیْتُھُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّھُمْ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۞
(سورۃ المؤمنون، آیت، ۱۱۱)
میں نے ان کو آج ان کے صبر کا یہ بدلہ دیا ہے کہ وہی کامیاب ہوئے۔

جو لوگ خدا کے لیے صبر کریں ان کو نیک بدلہ ملنا اور دوسروں پر فائز المرام ہونا عین عدل کا تقاضا ہے اسی طرح کفار و منافقین کا جہنم میں جانا عدل کا تقاضا ہے۔

(سورۃ النور، رکوع نمبر۱)

اس سورۂ کریمہ میں اور ان آیاتِ کریمہ میں حضور ﷺ کی سچائی اور آپ ﷺ کی نبوت کی بہت سی نشانیاں ہیں اور بہت سے قوانین اور اصول بتائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی متعدد نعمتیں ایسے پہلوؤں سے یاد دلائی گئی ہیں کہ آدمی کو ہمیشہ یاد رہیں اور اپنے دشمنوں اور حاسدوں کی نشانیاں اچھی طرح بتا دی گئی ہیں۔

قوانین و اصول جو بتائے گئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں: (۱) قانونِ شہادت کے اصول (۲) امت کے اجتماعی کردار کے اصول۔

(۱) سے متعلق یہ ارشادات ہیں (ا) زنا کے الزام کے لیے چار شہادتوں کی ضرورت ہے اس سے (ب) یہ بھی معلوم ہوا کہ جرم کی سنگینی اور نوعیت کے اعتبار سے

شاہدوں کی کم از کم تعداد کا تعین ضروری ہے، مثلاً لعان میں صرف شوہر کی شہادت کافی ہے نکاح کو فسخ کرنے کے لیے، البتہ اگر بیوی اس کے خلاف شہادت دے تو اس کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی (ج) اگرچہ مسلمانوں سے اس زمانے میں جھوٹ بولنے کی توقع ایک فی صد بھی نہیں تھی لیکن چونکہ قیامت تک کے لیے اسی دین کو قائم رہنا تھا اس لیے شہادت کو جھٹلانے کی گنجائش رکھی گئی۔ (د) جرم کی سزا صرف شک کی بنا پر نہیں دی جاسکتی جب تک کہ پوری شہادت نہ ہو (ہ) زنا کا الزام لگانے والے ایسی اشخاص کو جو چار گواہ نہ لاسکیں سزا دی جائے گی اور اس کے علاوہ ان سے کبھی گواہی نہیں قبول کی جائے گی۔ اس اصول پر دوسرے جرائم کا الزام لگانے والوں کو بھی الزام ثابت نہ کرسکنے پر سزا دی جاسکتی ہے اگر انھوں نے جھوٹا الزام لگایا ہو۔

ان اصولوں سے اسلام کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ ایسے اصول ہیں جو قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان اصولوں پر اسی وقت تک عمل ہوسکتا ہے، اگر سب لوگ سچے اور اعلیٰ کردار کے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خیر القرون میں لوگوں کا کردار اتنا اعلیٰ تھا کہ ایک عورت نے بغیر کسی ترغیب و ترہیب کے لیے بار بار اپنے کو دربارِ رسالت میں زنا کی شہادت کے لیے پیش کیا۔ اس کے باوجود قانون میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ کہیں کوئی مرد اپنی بیوی کو جھوٹ بول کر زنا کی سزا نہ دلوا دے۔ (ویدرؤا عنہا العذاب... الخ)

(۲) اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لیے یہ اصول بتایا گیا کہ اگر کوئی کسی پاک دامن کے متعلق کوئی نازیبا بات کہے تو اس کو فوراً جھٹلانا چاہیے۔ اسی اصول پر کسی ایسے شخص کے متعلق جس کی شہرت اچھی ہو اگر کوئی شخص الزام تراشی کرے تو اس کو جھٹلانا چاہیے۔ خصوصاً اگر وہ تمھارا بڑا ہو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے فرمایا کہ ''حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللّٰہ علیہ تو روایات سنتے ہی نہیں تھے اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ کا عجیب معمول تھا کہ سب سن لیتے تھے۔ دوسرے دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ پر بڑا اثر ہو رہا ہے اور جب بیان کرنے والا خاموش ہوجاتا تو

حضرت بے تکلف فرما دیتے کہ یہ سب غلط ہے۔ وہ شخص ایسا نہیں اور اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ چاہے واقع میں صحیح ہو مگر چونکہ شرعی شہادت نہیں اس لیے اس کے ساتھ کذب کا سا معاملہ کیا جائے۔ یہی محل ہے اس آیت کا ...... الکاذبون۔

عند اللّٰہ سے یہاں مراد ہے فی دین اللّٰہ۔ فی قانون اللّٰہ یعنی شریعت کے قانون کی رُو سے تم جھوٹے ہو۔ تمھارا کہنا سب غلط ہے۔ بس اس تقریر کے بعد یہ شبہ نہ رہا کہ متحمل الصدق کو جزماً کیسے کاذب فرما دیتے تھے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی صاف مستنبط ہے کہ حسنِ ظن کے لیے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سوئے ظن کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔'' (صفحہ ۳۸۰، ملفوظات، کمالاتِ اشرفیہ)

اگر ہر معاملے میں آدمی (ثبوت قطعی نہیں ہونے کی صورت میں) یہ کہتا رہے کہ شاید ایسا ہی ہو جیسا یہ شخص کہہ رہا ہے یا شاید یہ بات غلط ہو تو دنیا کا کام ہی نہ چلے۔ لہٰذا جہاں موقع ہو وہاں بالجزم کہہ دینا چاہیے جس طرح آئندہ کے ارادے کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی بالجزم بھی کہنا ضروری ہوتا ہے جیسا حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کے بارے بالجزم بغیر ان شاء اللّٰہ کہے اپنے ارادے کا اظہار فرمایا تھا۔ (ب) بعض باتیں لوگوں کے نزدیک معمولی سمجھی جاتی ہیں لیکن وہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی بات جس کا علم نہ ہو منھ سے نہیں نکالنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات جھوٹ ہو اور اللّٰہ کے نزدیک بہت بری بات ہو۔ (ج) فحش باتوں کا بے محابہ ذکر کرنے سے فحاشی پھیلتی ہے۔ کسی کے بارے میں سن لیا کہ فلاں سے فلاں کا ناجائز تعلق ہے اور اس کو مشہور کردیا، بہت بڑا گناہ ہے اور معاشرے میں فحاشی رائج کرنے کا ذریعہ ہے لہٰذا اس سے بہت بچنا چاہیے (د) افترا پردازوں سے ہشیار رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ایسی افواہ پھیلانے سے ان کا مقصد معاشرے میں فحاشی اور برائی پھیلانا ہوتا ہے، اس کو روکنا نہیں ہے۔

منافقوں کے اندازے کے برعکس یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے خیر کا باعث ہوا اس طرح سے کہ:

(ا) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا کی برأت ثابت ہوگئی۔

(۲) ایسے زبردست اصول و قوانین عطا کیے گئے ہیں جن سے قیامت تک راہ نمائی ہوتی رہے گی۔

(۳) مسلمانوں کو اپنے ایک بڑے جرم پر جس کو وہ معمولی سمجھ رہے تھے، متنبہ کیا گیا۔

(۴) معاشرے میں فحاشی پھیلانے کی کوشش جرمِ عظیم قرار پائی۔

(۵) مسلمانوں کو پتا چل گیا کہ ان کے درپردہ دشمن کون ہیں جو مسلمان بنے ہوئے ہیں جو اس الزام تراشی اور افواہ پھیلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے (والذی تولیٰ کبرہ منھم) ان کا مسلمان نہ ہونا یا دائرۂ اسلام سے خارج ہونا ظاہر ہوگیا۔ اور عام مسلمانوں میں سے جو اس کو جھٹلا نہیں رہے تھے ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ سارا شاخسانہ کافروں اور منافقوں کا کھڑا کیا ہوا تھا جو چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں فحاشی پھیل جائے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو تھا... یعلم ... لاتعلمون۔

...لاتحسبوہ شرا لکم... الخ سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہماری طرف سے خواہ کتنا ہی برا عمل ہو اور دوسرے خواہ کتنا ہی شر و فساد پھیلائیں جب وہ باتیں (اور ان کے نتائج) خدا کی مخلوق کی حیثیت سے دیکھی جائیں گی تو یہی کہنا پڑے گا کہ سب کچھ اچھا ہو رہا ہے یعنی من حیث کسی مخلوق کے عمل کے وہ بات قابلِ ستائش ہوگی۔ وقیل الحمدللہ رب العالمین۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال خواہ کیسے ہی ہوں، زمانہ خواہ کیسا ہی ہو، دور دورہ فسق و فجور کا ہو یا ظلم و جبر کا جو بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اچھا ہی ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح سے ہماری آزمائش منظور ہے الحمد للہ علیٰ کل حال۔ یہاں بھی واقعہ افک ایک جاں گداز واقعہ تھا جس سے کتنے ہی معصوم لوگ خصوصاً اور عام مسلمان عموماً غم اور تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کو شر سمجھنے سے منع فرمایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ تمھارے لیے خیر تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح بتا دی گئی کہ جن لوگوں نے اس افواہ کے پھیلانے میں حصہ لیا انھوں نے بہت برا کیا اور جو شخص اس میں آگے

آگے تھا اس کے لیے سخت عذاب کی وعید بھی سنا دی گئی۔ اس طرح کی افواہ پر مسلمانوں کا کیا ردِعمل ہونا چاہیے تھا، وہ بھی بتلا دیا گیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (سورۃ النور، آیت ۲۱)

اے ایمان والو! تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی اس کے اغوا پر عمل مت کرو) اور جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلتا ہے تو وہ تو ہمیشہ ہر شخص کو بے حیائی اور نامعقول ہی کام کرنے کو کہے گا اور اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا ولیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک صاف کردیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے سب کچھ جانتا ہے

دنیا کا نظام (Scheme of things) اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا پھر اس کے ساتھ شیطان لگا دیا جو ہر وقت اس کو بہکاتا رہتا ہے۔ اس طرح انسان ہر وقت ایک عظیم خطرے میں مبتلا رہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فیصلہ فرمایا کہ وہ جسے چاہے گا اس خطرۂ عظیم سے محفوظ رکھے گا۔ ان عبادی... بسلطان۔ تو معلوم ہوا کہ نظامِ کائنات میں سب سے زیادہ اہم چیز اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے باوجود درجاتِ عظیم پر فائز رہنے کے اپنی نجات کو اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہونا تصریحاً ارشاد فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ مزید رحمت اللہ تعالیٰ کی یہ ہے جو بھی اس کی رحمت تلاش کرے اور اس کے فضل کا امیدوار ہو اس پر فضل فرما دیتے ہیں۔ کبھی بلا کوشش اور محنت کے صرف مانگنے سے ہی اور کبھی کبھی بلا

مانگے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ فضل فرما دیتے ہیں جس طرح ساحرانِ فرعون کو ایمان عطا فرما کر بلند درجات عطا فرمائے۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورۃ النور، آیت ۲۲)

اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہلِ قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں اور چاہیے کہ یہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے قصور معاف کردے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

یہ آیت بھی واقعۂ افک کے ذکر سے متعلق ہے۔ بنیادی اصول یہ بتایا گیا کہ خواہ کسی مسلمان سے کوئی بھاری گناہ کیوں نہ سرزد ہوجائے اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے باز رہنے کا ارادہ جائز نہیں۔ مسلمان ہر حالت میں دوسرے مسلمانوں کا خیرخواہ ہے۔ قیامِ حدود اور سزا بھی اسی خیرخواہی کی شق ہے جس میں معاشرے میں جو فساد ہوگیا تھا، اس کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور مفسد کی بھی۔ اگر کسی ایذا دہی سے ہم نے اس کی خیرخواہی بحیثیت مسلمان بھائی کے چھوڑ دی تو خدا کی رحمت کی امید بھی چھوڑ دی۔ کیا ہم گناہ کرنے کے بعد رحمت کی امید نہیں رکھتے؟ رحمت للعالمین کی خیرخواہی تو تمام مخلوقات کے لیے ہمیشہ قائم رہی اور ان لوگوں کے لیے بھی جن سے حضور ﷺ کو بہت ایذا بھی پہنچی لیکن حضور ﷺ ان کے لیے دعا ہی فرماتے رہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ط ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ O (سورۃ النور، آیت، ۳۰)

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

غضِ بصر کو پاک دامنی میں بڑا اثر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اجنبیہ کی طرف دیکھے ہی نہیں تو وہ بہت سے شہوانی تقاضوں سے محفوظ رہے گا۔ اس میں فحش لٹریچر اور ٹی وی وغیرہ پر نامحرموں کو دیکھنے کی ممانعت بھی داخل ہے کیوں کہ جس طرح دیکھنے سے ایک تاثر پیدا ہوتا ہے جو آگے بڑھتے بڑھتے زنا تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح صنفین کے اختلاط کے بارے میں پڑھنے سے ذہن میں ایک تاثر پیدا ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّاشَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ O (سورۃ النور، آیت، ۳۵)

اللہ تعالیٰ نور (ہدایت دینے والا) ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کے نور (ہدایت) کی حالتِ عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل ایک طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمک دار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل)

سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت ہے) جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رخ ہے اور نہ پچھّم رخ ہے، اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو نورعلیٰ نور ہے (اور) اللّٰہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے اور اللّٰہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے۔

اپنے کو آئینہ سمجھو اور دوست کی طرف متوجہ رہو جب تک آئینے کا منھ دوست کی طرف ہے اسی وقت تک وہ خوب ہے کیوں کہ اس میں خوباں کا عکس ہے۔ جب وہ اپنی طرف متوجہ ہوا اور اس کا منھ دوست کی طرف سے ہٹا تو وہ زنگ ہے۔ اور اس کے اوپر صرف زنگار ہے (جو شیشے کے ایک طرف اس کو آئینہ بنانے کے لیے کیا جاتا ہے) تو جو بھی اچھائی تمھیں اپنے اندر نظر آتی ہے وہ تم میں نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے عنایت ہے۔ ایک جگہ قرآن شریف میں بہت واضح طریقے سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کہہ دیجیے اگر میں گمراہ ہوجاؤں تو وہ میرا قصور ہے اور ان اھتدیت فیما یوحی الی ربی ہے۔ اور نورِ وحی سے آپ ﷺ منور ہوئے اور آپ ﷺ کے پرتو سے بہت سے آئینے منور ہوئے پھر ان کے پرتو سے دوسرے منور ہوئے اس طرح ہم تک اس کا نور پہنچا جو آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور اپنی اس صفت میں بھی یکتا ہے۔ پھر اس کا مقابلہ تو لغو ہے کہ احمد پر خدا کا فضل زیادہ ہے یا حامد پر۔ اگر ایک ذرّہ بھی نور کا ہمارے قلب میں ہے تو اس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا اور اگر اس نے بہت دیا ہے تب بھی اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اس سے زیادہ نہ دے سکے۔ عطائے فضل کے ساتھ ظرف بھی عطا ہوتا ہے۔ معمولی داتا نہیں ہے کہ فقیر کی جھولی میں کچھ ڈال دیا۔ بہت بڑا سخی بھی یہ کرتا ہے کہ جتنی جھولی ہوئی اسے بھر دیا بلکہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، خلعت سے جس کو نوازتا ہے اس کو خوان بھی دیتا ہے۔ جوڑا اور اشرفی طشت میں دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب بھی اپنی طرف دیکھو گے کہ میرے پاس اتنا ہے تو وہ دیکھنا ایسا ہے جیسا آئینے

کا رخ محبوب کی طرف سے ہٹا لینا۔ جب رخ ہٹاؤ گے تو زنگار رہ جاؤ گے۔

جب بھی اللہ تعالیٰ اپنے نور سے نوازتا ہے تو اس کے نور کے پرتو سے حکمتِ جاریہ بہتوں کے قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں اس کو خوب بیان کیا ہے اور اس کو ایک قصے سے شروع کیا ہے جو حدیث شریف کے راویوں نے روایت کیا ہے:

پیش از عثمانؓ یکے نساخ بود
کہ بنسخ وحی جہدے می نمود
چوں نبی ﷺ از وحی فرمودے سبق
او ھماں را وا نوشتے بروق
پرتو آں وحی بروی تافتی
از درون خویش حکمت یافتی
عین آں حکمت بفرمودی رسول ﷺ
زیں قدر گمراہ شد آں بوالفضول
کاں چہ می گوید رسول مستنیر
مر مراست آں حقیقت در ضمیر
پرتو اندیشہ اش زد بر رسول ﷺ
قہر حق آورد برجانش نزول
پرتو آں ناگہش بردل بتافت
در درون خویشتن حرفے تیافت
ہم ز فسانے برآمد ھم زدیں
شہ عدوے مصطفیٰ ﷺ از روئے کیں
مصطفیٰ ﷺ فرمود کائے گبر و نمود
چوں سیہ گشتی اگر نور از تو بود

☆

اے برادر پرتو حکمت جاریہ ست
آں ز ابدال است پرتو عاریست
گرچہ درخود خانہ نورے یافتست
آں ـــ منور تافت است
شکر کنی غرہ مشو بینی مکن
گوش دارو ہیچ خودبینی مکن

☆

گرچہ آہن سرخ شد او سرخ نیست
پرتو عاریت آتش زنیست
گر شود پر نور روزن یا سرا
تو مداں روشن مگر خورشید را
ہر در و دیوار گوید روشنم
پرتو غیرے ندارم ایں منم
پس بگرید آفتاب اے نارسید
چوں کہ من غائب شرم آید پدید

☆

صد ہزاراں سال ابلیس لعیں
بود ابدال و امیر المؤمنین
پنجہ ز د با ادم از نازے کہ داشت
گشت رسوا ہم چو سرگیں وقت چاشت

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ

ذِکۡرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ ○ لِیَجۡزِیَہُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَیَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ○ (سورۃ النور، آیت، ۳۶۔ ۳۸)

ایسے گھروں میں (جاکر) عبادت کرتے ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے ان (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں) میں بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد سے اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور) ایسے دن (کی داروگیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جاویں گی، انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار دے دیتا ہے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے علاوہ دوسرے گھروں کو بلند بنانا ناپسندیدہ ہے (اور ہوسکتا ہے جائز بھی نہ ہو) جیسا کہ ایک صحابیؓ کا مشہور واقعہ ہے جنھوں نے ایک قبہ بنایا تھا جس پر رسول اللہ ﷺ نے اس کو گرانے کا حکم تو نہیں دیا لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ان صحابی رضی اللہ عنہ وارضاہ نے چپ چاپ اس قبے کو گرا دیا اور حضور ﷺ سے اس کا اظہار بھی نہیں کیا۔ بعد میں یہ معلوم کرکے کہ ان صحابیؓ نے قبہ گرا دیا ہے حضور ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ ہوسکتا ہے اس زمرے میں یادگار دیواریں یا عمارتیں بھی آتی ہوں جو کسی واقعے یا کسی شخص کو یاد رکھنے کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ مسجد میں صبح و شام تسبیح پڑھنے والے لوگ ایسے بھی ہیں جو تجارت بھی کرتے ہیں اور دنیا کے کاروبار بھی کرتے ہیں لیکن یہ چیزیں ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے نہیں روکتیں۔ جب کسی کی محبت دل میں رچ بس جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا

ہے کہ: دل بیار و دست بکار۔ اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ: ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور۔ وہ ناواقفیت کی وجہ سے کہا ہے ورنہ تسبیح و مصلیٰ اور تلوار و معرکہ آرائی میں کوئی حقیقی تضاد نہیں ہے۔ اس عدم غفلت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جب اذان ہو مسجد میں نماز کے لیے چلا جائے اور جب زکوٰۃ واجب ہوجائے، زکوٰۃ ادا کردے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی وقت بھی دل اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو اور ہر کام یہاں تک کہ کھانا اور سونا بھی اللہ کے لیے ہونے لگے اور بیوی بچوں سے پیار محبت اور دوستوں کی دل جوئی سب اللہ ہی کے لیے ہو۔

تیسرے یہ کہ آخرت کا خوف ہی مومنوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ورنہ کافروں کے دل میں آخرت میں جواب دہی کا کیا سوال۔ جو مومن معمولی درجے پر ہیں ان کو آخرت میں عذاب کا خوف تقویٰ پر مجبور کرتا ہے اور جو اعلیٰ درجے پر ہیں ان کو محبوب کی ناراضگی کا خوف اس کی نافرمانی سے دور رکھتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (سورۃ النور، آیت، ۳۹)

اور جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کا پیاسا (آدمی) اُس کو (دور سے) پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آیا تو اس کو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور قضائے الٰہی کو پایا، سو اللہ تعالیٰ نے اُس (کی عمر) کا حساب اُس کو برابر برابر چکا دیا (یعنی عمر کا خاتمہ کردیا) اور اللہ دم بھر میں حساب کردیتا ہے۔

موت کے وقت اور قیامت کے دن تو یہ حالت ہوگی ہی، بسا اوقات دنیا میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی چیز کے پیچھے پھرتا رہتا ہے کہ وہ مل جائے تو آرام و

عیش سے رہیں گے لیکن جب وہ چیز مل بھی جاتی ہے، مثلاً مال و دولت، زن و فرزند یا عزت و شہرت تب اس کو پتا چلتا ہے کہ آرام و سکون اب بھی میسر نہیں۔ وہ تو محض سراب تھا اور اسی طرح سراب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے زندگی فتح ہوجاتی ہے لیکن مومن کا حال ایسا نہیں ہے کیوں کہ اس کو تو آخرت کی زندگی کی فکر ہوتی ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے ادنیٰ سے ادنیٰ مومن ایسا نہیں ہے جس کی زندگی کا کوئی حصہ، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، آخرت کے لیے نہ گزرا ہو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (سورۃ النور، آیت ۴۳، ۴۴)

کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اس بادل (کے مجموعے) کو باہم ملا دیتا ہے پھر اس کو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس (بادل) کے بیچ میں سے نکلتی ہے اور اسی بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصوں میں سے اولے برساتا ہے پھر ان کو جس (کی جان پر یا مال) پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اس کو ہٹا دیتا ہے (اور) اس بادل کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس نے اب بینائی لی (اور نیز) اللہ تعالیٰ رات اور دن کو (بھی) بدلتا رہتا ہے اس (سب مجموعے) میں اہلِ دانش کے لیے استدلال (کا موقع) ہے۔

اندھیری رات میں بجلی کا چمکنا اسی طرح کی نشانی ہے جس طرح دن اور رات کا الٹنا پلٹنا، اس میں روشنی کی چمک ایک لمحے کے لیے اور پھر اندھیرا اور پھر روشنی

اور پھر اندھیرا ہوتا ہے لیکن جو آنکھ والے نہیں ہیں ان کو یہ نظر نہیں آتا۔ اس طرح جن کو نورِ بصیرت حاصل نہ ہو وہ اس تقلب میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں نہیں دیکھ سکتے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ O (سورۃ النور، آیت، ۵۲)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے۔

اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی ایک ہی چیز ہے۔ رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے اور دونوں میں فرق کرنے والا کافر ہے۔ یہی حال محبت کا ہے۔ مگر خشیت کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ سے خشیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بامراد ہونے کا وعدہ آخرت کے لیے ہے جیسا حضرت تھانویؒ نے ترجمہ فرمایا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اطاعت وتقویٰ ہی دراصل کامیابی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O (سورۃ النور، آیت، ۵۵)

(اے مجموعۂ امت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے (نفع آخرت کے) لیے قوت دے گا اور ان کے اس

خوف کے بعد اس کو مبدل بہ امن کردے گا بشرطے کہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدے) کے ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں۔

مسلمانوں سے خلافتِ ارض کا وعدہ تھا تاکہ وہ امن وسکون سے اللہ تعالیٰ کی بلاشرکتِ غیرے عبادت کرسکیں۔ یہاں یہ باتیں یاد رکھنے کی ہیں:

(۱) یہ وعدہ قوم سے تھا۔ اب بھی اگر پوری قوم اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار ہوجائے تو دنیا اس کی غلام خوشی سے ہوجائے کیوں کہ اسلام میں فطری کشش ہے۔ قوم کے چند افراد کے نیک اور متقی ہونے سے وہ بھی ناقص تقویٰ سے یہ امید رکھنا کہ ان کو خلافتِ ارضی حاصل ہوجائے گی، درست نہیں معلوم ہوتی ہے۔

(۲) دوسری قوموں کے اقتدار میں ہونے کی یہاں نفی نہیں کی گئی ہے۔ یہ اقتدار اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر اللہ کی اطاعت شروع کردی ہو اور عارضی طور پر دیا جاسکتا ہے تاکہ مسلمانوں کا امتحان ہو۔

(۳) اقتدار میں آنے کے بعد قوم کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے قوانین کا نفاذ کرے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ O (سورۃ النور، آیت، ۵۶)

اور (اے مسلمانو) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسول ﷺ کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے۔

اس طرزِ بیان سے یہ بات واضح ہے کہ اطاعتِ رسول دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَۃٍ ط وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّھُنَّ ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (سورۃ النور، آیت،۶۰)

اور بڑی بوڑھی عورتیں جن کو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی کچھ امید نہ رہی ہو ان کو (البتہ) اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے اتار رکھیں بشرطے کہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں اور (ہر چند کہ بڑھیوں کو منھ کھولنے کی اجازت ہے لیکن اگر) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لیے اور زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ (سب کچھ) سنتا ہے (سب کچھ) جانتا ہے۔

بوڑھی عورتوں کو جو کپڑا اتارنے کی اجازت ہے وہ اس کپڑے کے اتارنے کی اجازت ہے جو عورتوں کو اپنے لباس کے اوپر اوڑھنے کا حکم تھا (یضربن......) جس کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ ان کی زینت پوری طرح سے چھپ جائے، مثلاً سر اور پورے جسم کو ایک کپڑے سے ڈھک لیں۔ لیکن بوڑھی عورتوں کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ اپنی زینت دکھلاتی پھریں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا ط قَدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا ج فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

(سورۃ النور، آیت،۶۳)

تم لوگ رسول ﷺ کے بلانے کو ایسا (معمولی بلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہوکر تم میں سے (مجلسِ نبوی سے) کھسک جاتے ہیں سو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو کہ بواسطۂ رسول ﷺ کے پہنچا ہے) مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر (دنیا میں) کوئی آفت

(نہ) آن پڑے یا ان پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل
(نہ) ہوجائے۔

یہاں بھی اطاعتِ رسول سکھائی جارہی ہے اور رسول کے حکم سے سرتابی کی سزا بتائی جارہی ہے کہ جو لوگ حکم سے سرتابی کریں گے ان کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی مصیبت میں (فتنہ یا بڑی آزمائش) میں نہ ڈال دیے جائیں یا کسی درد ناک عذاب میں مبتلا کردیے جائیں۔ اگر دنیا میں یہ عذاب نہ آئے تو مرنے کے بعد ایسے لوگ جہنم میں جائیں ہی گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَکُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَکَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًا ۝ (سورۃ الفرقان، آیت، ۲۰)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تم (مجموعۂ مکلفین) میں ایک کو دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے، کیا صبر کرو گے (یعنی صبر کرنا چاہیے) اور آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ انبیا علیہم السلام کے کھانے پینے اور دیگر حالاتِ بشریہ سے امت کی آزمائش منظور ہے کہ ”کون ان حالاتِ بشریہ پر نظر کرکے تکذیب کرتا ہے اور کون ان کے کمالاتِ نبوت پر نظر کرکے تصدیق کرتا ہے۔“ لیکن یہ ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہم نے بعض کو بعض کے لیے فتنہ بنایا ہے۔ ماں، باپ، بیوی، بیٹا، بیٹی کوئی بھی جس کے ذریعے ہماری آزمائش نہیں ہو رہی ہو جس طرح انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو صبر کا حکم تھا جس کو وہ بطریقِ احسن بجا لائے اور لوگوں کے اعتراضات، ایذا رسانی اور پھبتیوں کو خاطر میں لائے بغیر تبلیغ

کرتے رہے اور اپنے دشمنوں کی بھی خیرخواہی کرتے رہے، اس طرح عام مومنین سے بھی صبر کی فرمائش ہے۔ بقول حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کے ایک کتا بھی آپ پال لیتے ہیں تو کوئی اس کو بغیر آپ کی اجازت کے مار نہیں سکتا ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی ہمارے ساتھ کوئی برائی کرتا ہے تو خالقیت کی نسبت سے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہماری آزمائش کے لیے ہوتا ہے کہ ہم صبر کرتے ہیں یا نہیں اور اگر ایسے موقع پر کان ربک بصیرا کا استحضار ہوجائے تو صبر کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔

اس سے مدافعت کی نفی نہیں ہوتی کیوں کہ جس طرح دوسروں کے عمل میں ہماری آزمائش ہے اسی طرح ہمارے ردِعمل میں دوسروں کی آزمائش ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ دنیا میں ہر نسل کم از کم دو فاعل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ایک فاعلِ مجازی اور ایک فاعلِ حقیقی۔ کبھی کبھی فاعلِ مجازی بھی کئی ہوتے ہیں مثلاً کسی کی ترقی کے احکام صادر ہوئے تو حکم نامہ لکھنے والا بھی فاعل ہے اور اسٹیبلشمنٹ سیکریٹری بھی فاعل ہے اور صدر یا وزیراعظم بھی فاعل ہے لیکن بالآخر فاعلِ حقیقی ایک ہی ہے اور اس کے حکم سے سب کام ہوتے ہیں تو جب اس کام کا انتساب فاعلِ مجازی کی طرف کیا جائے گا تو وہ کام اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب اس کا انتساب فاعلِ حقیقی کی طرف کیا جائے گا تو وہ ہمیشہ اچھا ہی ہوگا کیوں کہ اس کی غایت آزمائش ہوتی ہے یعنی اچھوں کو انعام دینا اور بروں کو عقوبت۔

اب مثلاً زید نے بکر کو بلاوجہ مارا تو زید نے برا کیا اسی طرح اگر اس نے بکر کی غیبت کی تو برا کیا اسی طرح ہر برائی کی ذمہ داری کسی نہ کسی شخص پر آئے گی اور انسان اپنی ذمہ داری کو اتار پھینکنے پر قادر نہیں ہے۔ ایک دفعہ خلافت فی الارض کی ذمہ داری قبول کرلی تو اب اس کو اتار پھینکنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ بہرحال مثالِ بالا میں زید نے برا کیا اور بکر کے ساتھ برا ہوا جس کی ذمہ داری زید پر ہے۔ لیکن زید کے افعال کے

خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں لہٰذا جب اس نسبت سے دیکھا جائے تو بکر کے ساتھ جو کچھ ہوا، اچھا ہوا کیوں کہ یہ اس کے لیے ایک آزمائش ہوئی اور اگر اس نے صبر کیا اور قصاص سے زیادہ بدلہ نہ لیا یا بالکل معاف کردیا یا اس کی غیبت کے بدلے میں غیبت نہیں کی تو وہ اجرِ عظیم کا مستحق ہوا۔ اس طرح اس کا پٹنا، زید نے جو اس کی غیبت کی وہ فال کے اعتبار سے اس کے لیے اچھا ہوگیا تو انسان کسی طرح کی پریشانی میں مبتلا ہو جائے اگر اس حقیقت کو جان لے کہ یہ سب اسی قانونِ خداوندی کے تحت ہو رہا ہے کہ بعض بعض کے لیے فتنہ ہیں اور خالق ان تمام اعمال کا وہی سمیع و بصیر ہے جسے ہماری آزمائش منظور ہے تو وہ اس پریشانی سے سرخرو اور کامیاب ہو کر نکلتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○

(سورۃ الفرقان، آیت، ۲۱)

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ اس کے منکر ہیں) وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں۔ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

دیدہ دلیری کی حد ہے کہ خدا سے ملنے کا تو یقین نہیں ہے اور پھر بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے ان سے بات کریں یا اپنے پروردگار کو دیکھیں۔ جب وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانا نہ لانا برابر ہوگا اور اس طرح کا مطالبہ ان کے تکبر کو ظاہر کرتا ہے اور یہ تکبر ہی کا مادہ تھا جو اس کو ایمان لانے سے روکے ہوئے تھا۔ یہ پورا رکوع اس یومِ عظیم کی بہترین تفصیل ہے جس روز کفار مجبوراً پکاریں گے۔

وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝

(سورۃ الفرقان، آیت، ۲۳)

ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا (بیکار) کردیں گے جیسے پریشان غبار۔

قال الشیخ تھانویؒ... ''روح میں ابن عطا سے مذکور ہے انھوں نے ان اعمال کو نگاہِ رضا سے دیکھا، پس ہماری نگاہ سے گر گئے (یعنی عجب حابط اعمال ہے)۔

وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ۝ یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ۝

(سورۃ الفرقان، آیت، ۲۷، ۲۸)

اور جس روز ظالم (یعنی آدمی غایت حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھاوے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسول ﷺ کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا، ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔

یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ ایمان لائے اور اس پر قائم رہے وہ ان لوگوں میں شامل رہے جنھوں نے رسول ﷺ کے ساتھ راستہ پکڑا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ برے لوگوں کی صحبت اور ان کی پیروی انسان کو جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِیْنَ ؕ وَكَفٰی

بِرَبِّکَ ھَادِیًا وَّ نَصِیْرًا O (سورۃ الفرقان، آیت، ۳۰، ۳۱)

اور (اُس دن) رسول ﷺ کہیں گے کہ اے میرے پروردگار! میری (اس) قوم نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظرانداز کر رکھا تھا۔ اور ہم اسی طرح (یعنی جس طرح یہ لوگ آپ سے عداوت کرتے ہیں) مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہے ہیں اور ہدایت کرنے کو اور مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ مفہوم لیا ہے کہ حضور ﷺ یہ شکایت اپنے گنہگار امتیوں کے بارے میں کریں گے، اس ناچیز کے خیال میں یہ درست نہیں۔ رسول ﷺ سے تو گنہگار سے گنہگار امتی بھی شفاعت کا امیدوار ہو گا اور کریم سے یہ بات بعید ہے کہ آس لگانے والوں کی آس توڑ دے... اور الٹا ان ہی کی شکایت رب العزت کی بارگاہ میں پیش کرے۔ معلوم ہوتا ہے یہاں "قوم" سے وہ قوم مراد ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی طرف بلایا اور وہ اس پر ایمان نہیں لائے۔ اگلی آیت میں صاف آپ ﷺ کے اور اگلے رسولوں کے دشمنوں کا ذکر ہے اور فاسق سے فاسق امتی کو اس زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں جس کا ایمان ہی چھن جائے اور وہ کافر ہوکر مرے تو اور بات ہے جو نام کے مسلمان ابولہب اور ابوجہل کی طرح قرآن اور شریعت کا استہزا کریں وہ ان ہی کی صف میں ہیں۔

ہر نبی کے لیے دشمن ہونا لازم ہے، مثلاً آدم علیہ السلام کے لیے ابلیس دشمن تھا۔ اسی طرح ان کے متبعین کے ساتھ بھی ایک درجے میں ہوتا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن بھی پیدا کیے جو ان کو گمراہ کرنے کی تدبیر کرتے رہتے ہیں بہلا پھسلا کر اور ڈرا دھمکا کر اور ان کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں طرح کے شر سے ان کو بچاتا رہتا ہے۔ اس لیے یہاں ھادیاً اور نصیراً دونوں الفاظ آئے ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: "... اور (جس کو ہدایت

دینا منظور ہو) اس کی ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم رہے اس کے مقابلے میں آپ کی) مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے...'' ان دونوں باتوں سے حضور نبیِ کریم ﷺ کی تسلی مقصود ہے۔ یعنی کفار کی ہدایت نہ ہونے میں اور چندے ان کے ایذا کے دفع نہ کرنے میں اللہ کی حکمت ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے مومنوں کی بھی تسلی ہوتی ہے اور اس کے دو پہلو ہیں ایک تو مومنوں کا کفار کے گمراہ ہونے سے آزردہ رہنا دوسرے ان سے مغلوب ہوجانے کا خطرہ۔ یہ لوگ پہلے تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کو اپنے معاشرے میں، اپنی تہذیب میں جذب کرلیں اور ہم عقائد و معاملات میں ان کے ہم مشرب ہوجائیں، جب اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو ان کے درپے آزار ہوجاتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں جب طاغوتی طاقتیں تمام چھائی ہوئی ہیں اور مسلمانوں میں بھی بڑی حد تک غیراسلامی معاشرت اور تہذیب رائج ہے اس آیتِ کریمہ میں مومنوں کے لیے بڑی تسلی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں (آیت ۳۰ میں) ایک عظیم قانونِ قدرت کی نشان دہی بھی فرمائی گئی ہے اور صبر، شکر اور توکّل کی بہت بڑی تعلیم بھی ہے کہ دشمنوں کی ایذا رسانی دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری آزمائش ہے جس میں ہمیں صبر کرنے کی اور دین پر ثابت قدم رہنے کا حکم ہے اور ان سے ہر طرح کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جس پر شکر واجب ہے اور دشمنوں سے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا بھی وعدہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کا مقابلہ بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر مقابلہ نہ ہو تو کسی فریق کی نصرت بے معنی ہے۔

الَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ۚ
ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۝ (سورۃ الفرقان، آیت ۴۵)

۱ (اے مخاطب) کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ

اس نے سایہ کو کیوں کر (دور تک) پھیلایا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھیرایا ہوا رکھتا پھر ہم نے آفتاب کو اس (سایہ کی درازی اور کوتاہی) پر علامت مقرر کیا۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اس کی صناعی دیکھنا گویا اللہ تعالیٰ ہی کو دیکھنا ہے، اس معنی کو مشاہداً محبوبِ حقیقی ہر وقت حاصل ہوسکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝ (سورۃ الفرقان، آیت،۵۴)

اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا اور (اے مخاطب) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔

انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں۔ مٹی سے لے کر انسان پیدا ہونے تک بہت سے مراحل ہیں۔ مختلف جگہوں کی مٹی سے مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اجناس، سبزیاں اور پھل۔ پھر ان میں سے بہت سی چیزیں ایسے جانوروں کی غذا بنتی ہیں جنھیں ہم کھاتے ہیں، مثلاً مرغ، چوپائے اور مچھلیاں۔ لیکن پیدائش کے یہ مراحل بہت سے جانوروں میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ انسان کی فضیلت یہ ہے کہ اس کے صلبی اور سسرالی رشتے دار ہوتے ہیں جو انتظام انسان کے نسب کی حفاظت کا ہے اس کا عشرِعشیر انتظام بھی کسی اور جانور کے نسب کی حفاظت کا نہیں ہے۔ پھر جب تمام مراحل پیدائش کے طے ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس میں روح پھونکتے ہیں جس کو انھوں نے اپنی طرف انتساب کیا۔ یہ بھی انسان کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے کہ جو ذرّہ برابر اختیار اس کو دیا گیا ہے وہ بڑے سے بڑے جانور کو بھی نہیں دیا گیا ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًاO وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۚ O الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًاO وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًاO (سورۃ الفرقان، آیت، ۵۷۔۶۰)

آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ہاں جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرلے اور اس حی لایموت پر توکل رکھیے اور (اطمینان کے ساتھ) اس کی تسبیح وتحمید میں لگے رہیے اور وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے وہ ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر تخت (شاہی) پر قائم ہوا وہ بڑا مہربان ہے تو اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیے اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو (بوجہ جہل و عناد کے) کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے، کیا ہم اُس کو سجدہ کرنے لگیں جس کو تم سجدہ کرنے کے لیے ہم کو کہو گے اور اس سے اُن کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

جو مشن حضورﷺ لے کر آئے تھے اس کی کامیابی جن باتوں میں مضمر معلوم ہوتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ کامیابی تو دراصل اللّٰہ تعالیٰ کی عطا ہے اور حضورﷺ کے لیے مقدر ہوچکی تھی مگر جو اشارت یہاں ملتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت فراہم کرتے ہیں:

(۱) لوگوں کا ایمان لانا ہی حضورﷺ کے نزدیک ان کی تمام سعی اور مشقتوں کا اجر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اجر کی مخلوق سے توقع نہیں تھی، نہ مطالبہ تھا۔ بلکہ برابر قولاً

وفعلاً یہ بتلایا جاتا رہا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اگر دل میں بدلے کی خواہش ہو تو صرف زبان سے استغنا کا اظہار کچھ اثر نہیں رکھتا۔

(۲) توکّل علی اللّٰہ، اللّٰہ ہی کو ہر چیز کا خالق و کارساز سمجھنا۔

(۳) اللّٰہ تعالیٰ کی مرضیات پر صبر اور شکر سے راضی رہنا۔ بندوں کے اچھے، برے کاموں سے اس کا واقف ہونا کافی ہے اگر ہمیں خبر بھی ہو تو نہ ہم کسی کو سزا دے سکتے ہیں، نہ بدلہ دے سکتے ہیں اور نہ بخش سکتے ہیں۔

یہاں سے خود رائی کی بھی نفی ہوگئی۔ نہ معلوم ہم سے کیا کیا اعمال ایسے سرزد ہوتے ہیں جو اللّٰہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

''حی لا یموت'' کے معنی ہیں کہ کسی وقت بھی وہ کسی بندے سے غافل نہیں ہے اور یہ بڑے شکر کی بات ہے کہ ہم جس کے لیے سختیاں برداشت کر رہے ہیں وہ کسی لمحے بھی ہم سے غافل نہیں ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے (جو ایک قسم کی ہلکی نیند ہے) نہ نیند آتی ہے (جو موت کے مشابہ ہے)۔

ان آیتوں میں صفتِ رحمت کی بے انتہا جلوہ گری ہے۔ آیت ۵۸ میں ایک طرح کا وعدہ غفران و بخشش پوشیدہ ہے۔ ان کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ گناہ معاف فرمادیں گے بلکہ ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی بھی قیامت کے دن فرمائیں گے۔ دنیا میں بھی بہت سے گناہوں کی بلکہ اکثر گناہوں کی پردہ پوشی فرماتے رہتے ہیں اور آخرت میں بھی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ یہ ان کی صفتِ رحمٰن کا ایک پہلو ہے۔ اور اپنے اس نام کو اللّٰہ تعالیٰ اسمِ ذات کے طور پر استعمال کرتے ہوئے آیت ۶۰ میں کفار کی شناخت بیان فرماتے ہیں کہ وہ رحمٰن کو سجدہ نہیں کرتے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۝ (سورۃ الفرقان، آیت ۶۲)

اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل ونعم مذکور ہوئے) اس شخص کے (سمجھنے کے) لیے ہیں جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے ''لمن اراد ان یذکر'' کا ترجمہ فرمایا ہے، ''اس شخص کے (سمجھنے کے) لیے (ہیں) جو سمجھنا چاہے۔'' اور مسائل السلوک میں فرمایا ہے کہ ''یہ نظیر ہے قبض و بسط کی کہ حکمت تذکر و تشکر کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہوتی رہتی ہے جیسا اہلِ سلوک اس حکمت کو سمجھتے ہیں۔''

احقر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تذکر میں سمجھنا، یاد کرنا، ذکر کرنا سب کچھ آ گیا۔ محبوب کو یاد کرنے کا اصل وقت رات کا وقت ہے۔ دن بھر کے کاموں سے جب فرصت ہوتی ہے تو محبوب کی یاد آتی ہے۔ لہٰذا محبوبِ حقیقی کو بھی یاد کرنے کا خصوصی وقت رات ہی کا ہے۔ گرچہ دن کو بھی مخلوق کی طرف متوجہ رہنے کے باوجود ایک سچا مومن عبادت ہی میں مشغول رہتا ہے لیکن یہ توجہ خالق کی طرف بالواسطہ ہوتی ہے۔ سوائے نماز، تلاوت اور دیگر معمولات کے اوقات کے۔ برخلاف اس کے دن میں بے شمار ایسے واقعات ہوتے ہیں جن میں انسان کی آزمائش ہوتی رہتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا نہیں اور بے شمار واقعات ایسے ہوتے ہیں جو شکر کا داعیہ اپنے اندر لیے ہوئے ہوتے ہیں، مثلاً کسی کام کا حسبِ خواہ ہوجانا، وقت پر کھانا مل جانا وغیرہ۔ اس طرح ایک مومن کی راتیں ذکر میں اور دن شکر میں گزرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ (سورۃ الفرقان، آیت، ۶۸)

اور جو کہ اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص

(کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اُس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا۔

لایدعون... الاخر میں تمام عبادات و عقائد آگئے کیوں کہ توحید کو دین میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ حضور ﷺ سے کئی احادیث شریفہ اس مضمون کی منقول ہیں کہ جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دیا جنت میں داخل ہوگیا۔ دوسرے فقرے میں تمام ایسے گناہ سے بچنے کا حکم اشارتاً آگیا جنھیں ہر زمانے میں سب لوگ برا سمجھتے آئے ہیں یعنی کسی سے کسی کو ایذا پہنچنا۔ ایسے جرائم جن میں دوسرے فریق کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ تیسرے فقرے میں ایسے تمام گناہ اشارتاً آگئے جن میں فریقِ ثانی کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ جسے لادینی معاشرے میں قابلِ تعذیر نہیں سمجھا جاتا۔ اس ضمن میں زنا سب سے اشد ہے۔ معلوم ہوا کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن میں بظاہر کسی کا نقصان نہیں ہوتا اور فریقین راضی ہوتے ہیں پھر بھی وہ باتیں حرام ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں ایسی مضرات شامل ہوتی ہیں جن کا انھیں علم نہیں ہوتا، مثلاً زنا میں بہت سی معاشرتی خرابیاں ہوتی ہیں جن کا احساس اب غیراسلامی معاشرے میں بھی ہوتا جارہا ہے۔

۞

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ ط وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاO (سورۃ الفرقان، آیت،۷۰)

مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کرلے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

تبدیلی سیاست بالحسنات کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی شخص کسی فحش کام کی طرف پیش قدمی کرے اور اسے توبہ کی توفیق ہوجائے اور وہ اس فحش کام سے بچ جائے تو اس کے نامۂ اعمال میں نیکی لکھی جائے گی۔ یا اسی طرح ایک بزرگ کو شیطان تہجد یا فجر کے وقت سلانے میں کامیاب ہوگیا تو انھوں نے ایسی توبہ کی کہ ان کے درجات بہت بلند ہوگئے جس کے بعد شیطان انھیں نماز کے وقت اٹھانے لگا۔ اس طرح ان کے ایک نماز قضا ہوجانے کو اللہ تعالیٰ نے حسنات سے بدل دیا۔ ایک اور شکل اس کی یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں اتنے نقائص ہوتے ہیں کہ وہ دربارِ الٰہی میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتے لیکن ہم اس کے بعد اپنی کوتاہی پر نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان ہی کو حسنات کے طور پر قبول فرما لیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَۃَ بِمَا صَبَرُوۡا وَیُلَقَّوۡنَ فِیۡھَا تَحِیَّۃً وَّ سَلٰمًاO (سورۃ الفرقان، آیت ۷۵)

ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالا خانے ملیں گے بوجہ ان کے (دین و طاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقا کی دعا اور سلام (ملے گا)۔

یہاں صبر سے صبر عن المعاصی مراد معلوم ہوتا ہے مثلاً صبر عن والزور واللغو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِO (سورۃ الشعرا، آیت ۱۲)

انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں۔

معلوم ہوا کہ اس بات کی خواہش کہ لوگ میری تکذیب نہ کریں بلکہ تصدیق کریں فطری خواہش ہے جیسا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ایک حدیث شریف میں دعا بھی ہے۔ الیک رب فحببنی و فی نفس لک فذللنی و فی اعین الناس فعظمنی۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ○ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ○ (سورۃ الشعراء، آیت، ۴۱، ۴۲)

پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی پیشی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آگئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ اور انعام ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ ہاں اور (مزید برآں) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہوجاؤ گے۔

کامیاب ہونے پر آقا سے اجر طلب کیا جاتا ہے اور آقا کی طرف سے مقرب ہونے کا اعلان سب سے بڑا اجر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی کریمی ہے کہ صرف کوشش اور وہ بھی ناتمام کوشش پر اجر کی طلب کو منع نہیں فرمایا بلکہ اس کے مقبول ہونے کا اعلان فرمایا اور مرتے دم تک کوشش کرتے رہنے پر خواہ اس میں کامیابی ہو (ظاہری طور پر) یا نہ ہو مقرب ہونے کا اعلان فرمایا۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ○ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ○ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ○ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ

اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ O(سورۃ الشعرا، آیت، ۷۵۔ ۷۷)

ان لوگوں نے کہا کہ (ان کی عبادت کرنے کی یہ وجہ تو) نہیں بلکہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ ابراہیم(علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تم نے ان کو (غور سے) دیکھا بھی جن کی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمھارے پرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (اور تمھارے لیے) باعثِ ضرر ہیں مگر ہاں رب العالمین۔

جن چیزوں کی یا شیاطین کی مشرکین پرستش کرتے تھے ان سبھوں سے دشمنی کا برملا اعلان حضرت ابراہیم علیہ وعلٰی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور صرف اللّٰہ تعالٰی کو اپنا دوست فرمایا۔ ہمارے لیے ان کا یہ اسوۂ حسنہ قابلِ تقلید ہے۔ یہ بات قرآن شریف میں تصریحاً بھی ایک جگہ موجود ہے۔ لہٰذا جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں اللّٰہ تعالٰی کے علاوہ خواہ وہ پتھر ہوں، خواہ انسان، خواہ کوئی اور چیز وہ سب تمھارے حقیقی دشمن ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں وہ بھی تمھارے دشمن ہیں کیوں کہ جو لوگ کسی کی پرستش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ایک ملت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِO وَ اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَO وَ اَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ O ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ O اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَO (سورۃ الشعرا، آیت، ۶۳۔ ۶۷)

پھر ہم نے موسیٰ(علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو چنانچہ (انھوں نے اس پر عصا مارا جس سے) وہ دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ اتنا (بڑا) تھا جیسا بڑا پہاڑ اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس موقعے کے قریب پہنچا دیا

اور (انجامِ قصہ یہ ہوا کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کے ساتھ والوں کو سب کو بچا لیا پھر دوسروں کو غرق کردیا (اور) اس واقعے میں بھی بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) انؔ (کفار) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اگر کوئی شخص موسیٰ علیہ السلام کی نقل میں سمندر پر ڈنڈا مار کر اس کے پھٹنے کا منتظر رہے یا ایک صحابیؓ کی نقل میں بسم اللّٰہ الذی لایضر... الخ پڑھ کر زہر پی لے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام نے وحی کے اتباع میں ایسا کیا تھا اسی طرح خضر علیہ السلام نے الہام کے اتباع میں اور خدا کے حکم سے بعض باتیں ایسی کی تھیں جو جائز نہیں تھیں۔ بغیر خدا کے حکم کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ گرچہ اللّٰہ تعالیٰ ہر چیز کے خواص اور اس کی ماہیت بدل دینے پر قادر ہیں لیکن ایسا کب ہوگا یہ کسی کو معلوم نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو یہ سوچنے کا حق ہے کہ شاید اس وقت ایسا ہوجائے بلکہ عام قوانینِ قدرت کا یقین ہونا چاہیے کہ سمندر میں ڈوبنے سے آدمی مر جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان باتوں میں اللّٰہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نشانیاں ہوتی ہیں پھر بھی اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور جو مومن ہیں وہ بغیر ان نشانیوں کے ظاہر ہوئے بھی اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ اللّٰہ تعالیٰ جب چاہیں چیزوں کی تاثیرات کو بدل سکتے ہیں اور جب ایسی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں تو ان کا ایمان تازہ اور قوی تر ہوجاتا ہے۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ O (سورۃ الشعراء، آیت۸۰)

اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں (جس کے بعد شفا ہوجاتی ہے) تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

کب شفا ہوگی۔ کس دوا سے شفا ہوگی یا بغیر کسی دوا اور علاج کے شفا ہوگی یہ تو معلوم نہیں ہے مگر اس بات کا پکا یقین ہونا ضروری ہے کہ جب بھی شفا ہوگی

اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہوگی۔ اگر یہ معلوم ہی ہوجاتا کہ کب اور کیسے شفا ہوگی تو پھر ساری دوڑ دھوپ اور پریشانی ختم ہوجاتی اور نہ توکّل کا اجر ہوتا نہ صبر کا۔ اس لیے دوڑ دھوپ کرتے رہنا، بیمار ہوتو علاج کرنا ضروری ہے لیکن ساتھ ساتھ اللہ پر توکّل کرنا اور دعا کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی بار دعا مانگنے کے بعد اس کا اثر ظاہر ہوجاتا ہے کبھی عرصۂ دراز تک دعا مانگتے رہنے کے بعد اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں ہی منظور ہوتا ہے کہ بندہ ابھی اور گڑگڑاتا رہے۔ اس لیے دعا مانگنے کے بعد اس کی قبولیت کے اثرات کے ظاہر ہونے میں تعجیل نہیں کرنی چاہیے۔ نہ معلوم حضرت ایوب علیہ السلام کتنے دن بیمار رہے اس کے بعد ان کو شفا ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحیدِ خالص پر پہنچنے سے پہلے چاند، سورج وغیرہ کے بارے میں سوچتے رہے کہ شاید یہ ہی ہمارا رب ہے (ایک تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سب اپنی قوم پر حجت تمام کرنے کے لیے کرتے رہے)۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے نہ معلوم کتنے دن اولاد کے لیے دعا کی ہوگی لیکن بڑھاپے تک دعا کرتے رہے اور اس کے بعد دعا کی قبولیت کا مژدہ ان کو سنایا گیا۔

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ○ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ○ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ○ (سورۃ الشعراء، آیت، ۸۷۔۸۹)

اور جس روز سب زندہ ہوکر اٹھیں گے اس روز مجھ کو رسوا نہ کرنا اُس دن میں کہ (نجات کے لیے) نہ مال کام آوے اور نہ اولاد مگر ہاں (اس کی نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک دل لے کر آوے گا۔

تمام تسبیح و اوراد وظائف کی غرض و غایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قلبِ سلیم کے ساتھ حاضری نصیب ہو۔ ذکر اللہ سے قلب کی صفائی اور غیر اللہ کی محبت کی نفی کرتے رہنا چاہیے۔ جب قلب کی جلا ہوجاتی ہے تو اس کا اثر انسان کے اعمال پر

مرتب ہونا لازمی ہے۔ اور جب ایسے انسان کو موت آئے گی تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایمان ہی پر موت آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے پاس قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوگا۔ انسان کی پوری زندگی اپنے قلب کی صلاحیت کو درست کرنے میں اور درست رکھنے میں صرف ہوجانی چاہیے۔ بسا اوقات ایک مرض قلب سے نجات پانے میں ساری عمر کی محنت لگ جاتی ہے، جن کے قلوب نورِ نبوت کے فیضان سے درست ہوگئے ان کو بھی ساری عمر اس کی حفاظت کی تربیت دی گئی اور مختلف طریقوں سے اس کی اہمیت بتائی گئی مثلاً الا وھی القلب۔ التقویٰ ھھنا۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ O (سورۃ الشعراء، آیت، ۱۱۱)

وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے حالانکہ رذیل لوگ تمھارے ساتھ ہو لیے ہیں۔

یہ خطاب نوح علیہ السلام سے ان کی قوم کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی پیروی میں عام طور سے پہل ان ہی لوگوں نے کی ہے جن کو رذیل سمجھا جاتا ہے کیوں کہ برے معاشرے میں اچھے آدمیوں کا مغلوب ہونا فطری بات ہے۔اسی طرح مجددین کی پیروی کا حال ہے۔

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وما کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَO وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُO (سورۃ الشعراء، آیت، ۱۲۱، ۱۲۲)

اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے بے شک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے۔

یہ آیاتِ کریمہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر کے بعد ہیں۔ اور ان ہی الفاظ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصوں کے بعد وارد ہیں اور تقریباً انھی الفاظ میں حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے قصوں کے بعد وارد ہیں۔ اس سے ایمان کی عظیم الشان نعمت ہونا ظاہر ہے۔ اس کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اور اللہ تعالیٰ اتنے غالب ہیں کہ وہ جس کو چاہیں اس کو ایمان عطا فرما دیتے ہیں اور ایسے رحیم ہیں کہ بلا استحقاق اپنے انعامات عطا فرماتے رہتے ہیں۔

فعقروھا فاصبحوا ندمینO فاخذھم العذاب ؕ ان فی ذلک لاٰیۃ ؕ وما کان اکثرھم مؤمنینO وان ربک لھو العزیز الرحیمO (سورۃ الشعراء، آیت، ۱۵۷۔ ۱۵۹)

سو انھوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا پھر (جب آثارِ عذاب کے نمودار ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے پھر (آخر) عذاب نے ان کو آ لیا۔ بے شک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

قوموں اور افراد کی زندگی میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی بات (گناہ یا غلطی) سرزد ہوجاتی ہے جس کا بعد میں ازالہ ممکن نہیں ہوتا (یعنی ناقابلِ تلافی ہوتا ہے) اور اس کے بعد ندامت کام نہیں آتی۔ چنانچہ یہاں حضرت صالح کی قوم کا وہی حشر ہوا کہ نادم ہونے کے باوجود عذاب ان پر آ کر رہا کیوں کہ یہ ایسا گناہ تھا جس نے ان کی نافرمانی اور کفر پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ جو گناہ چھوٹے بھی سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی بعض مرتبہ مبتلا ہوجانے کے بعد ان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اور گناہِ کبیرہ قتل، زنا وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے لیکن کب ایسا ہوتا ہے کہ اس

گناہ کی سزا پھر مل کر ہی رہتی ہے، یہ معلوم نہیں ہے۔ بعض مرتبہ دنیاوی امور میں بھی انسان سے ایسی غلطی سرزد ہوجاتی ہے کہ پھر اس کے بعد غلطیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس سے نکلنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ہر کام میں آدمی کو عقل سے کام لینا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اس سے کوئی دینی یا دنیوی ضرب پہنچنے کا امکان نہیں ہے۔ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ لا حول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُO عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَO بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍO (سورۃ الشعرا، آیت، ۱۹۳، ۱۹۴)

اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔

معلوم ہوا کہ ڈرانا حضور ﷺ کا خاص کام تھا لہٰذا مسلمانوں کو ہر وقت آخرت کے خوف سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَO لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَO (سورۃ الشعرا، آیت، ۲۰۰، ۲۰۱)

ہم نے اسی طرح (شدت و اصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو نافرمانوں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے۔

یہ بات اس لیے بتائی گئی ہے تاکہ حزن نہ ہو کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائے۔ ورنہ سارے کے سارے لوگ جن سے ایمان لانے کو کہا

جارہا تھا وہ اس کے مصداق نہیں تھے۔ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کے قلب پر اللہ تعالیٰ نے واقعی مہر لگا دی ہے۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ (سورۃ الشعراء، آیت، ۲۱۵)

اور ان لوگوں کے ساتھ (تو مشفقانہ) فروتنی سے پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہوکر آپ کی راہ پر چلیں۔

ابد الاباد تک یہ حکم امت کے لیے ہوگیا کہ جس کو بھی ہم دیکھیں کہ رسول ﷺ کا اتباع کرتا ہے اس کے لیے بازو جھکا دیں، بلکہ تمام مومنوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا ضروری ہے۔

طٰسٓ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ۝ ھُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَھُمۡ اَعۡمَالَھُمۡ فَھُمۡ یَعۡمَھُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَھُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ھُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ۝ وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ۝ (سورۃ النمل، آیت، ۱۔۶)

طس، یہ آیتیں (جو آپ پر نازل کی جاتی) ہیں قرآن کی (ہیں) اور ایک واضح کتاب کی یہ (آیتیں) ایمان والوں کے لیے (موجب) ہدایت اور مژدہ سنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر (پورا) یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان

کے اعمال (بد) ان کی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے اس جہلِ مرکب میں حق سے دور) بھٹکتے پھرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے (مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارے میں ہیں (کہ کبھی نجات نہ ہوگی) اور آپ کو بالیقین ایک بڑے حکمت والے، علم والے کی جانب سے قرآن دیا جارہا ہے (لہٰذا آپ ان کے انکار سے غمگین نہ ہوجیے)۔

ان چھ آیاتِ کریمہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ کتاب مومنوں کو ہدایت فراہم کرتی ہے اور خوش خبری سناتی ہے۔ سب سے پہلے تو مومنوں کی نشانیاں بتائی گئی ہیں کہ وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں (یعنی جانی و مالی عبادات کرتے ہیں) اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اصول بتا دیا گیا کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہم ان کے اعمال کو ان کے سامنے مزین کردیتے ہیں، پس وہ بھٹکتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے ہی اعمال کو اچھا سمجھتے رہتے ہیں اور خدا کے مقرر کردہ قانونِ جزا و سزا کو جو آخرت میں ہوگا اس پر یقین نہیں کرتے وہ اپنے ہی تجربات سے اصول مقرر کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کو بدلتے رہتے ہیں، اپنے تجربات اور اپنی معلومات کی روشنی میں۔ جب آخرت میں جواب دہی کا تصور ہی نہیں ہے تو پھر اپنے ہی اعمال اچھے معلوم ہوں گے اور اپنے کو خدا کی ہدایت کا محتاج نہیں سمجھیں گے تو ایسوں کو کیسے ہدایت ملے گی۔ اس اصول سے جو آیت نمبر۴ میں بتایا گیا ہے، مومنوں کے درجات متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر تم اپنے اعمال سے مطمئن ہو، اگر تم اپنی کوتاہیوں پر توبہ اور آہ و زاری نہیں کرتے اور تم کو تمھارے اعمال اچھے معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ کیسے ہی ہوں تو سمجھ لو کہ تمھارا ایمان بہت کم زور ہوگیا ہے۔ ایمان مثل محبت کے ہے جب یہ بڑھتا نہیں تو گھٹتا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے Love is like a tide, when it does not increase,

it decreases. ۔ محبت جوار بھاٹے کی طرح ہے جب یہ بڑھتا نہیں تو گھٹتا ہے۔ اسی طرح اعمالِ صالحہ کے درجات ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔

يٰمُوْسٰىٓ اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۃ النمل، آیت، ۹)

اے موسیٰ (علیہ السلام) بات یہ ہے کہ میں (جو بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا۔

اب تو یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ آواز کے لیے ہونٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مناسب صوتی ارتعاش کے ذریعے آواز کسی آلے سے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح بولنے والے کا نظر آنا ضروری نہیں ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورۃ النمل، آیت، ۱۰، ۱۱)

اور (اے موسیٰ) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو سو جب انھوں نے اُس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ ڈرو نہیں اور ہمارے حضور میں پیغمبر نہیں ڈرا کرتے، ہاں مگر جس سے کوئی قصور (یعنی لغزش سرزد ہوجائے) پھر بڑائی (ہوجانے کے) بعد بجائے اس کے نیک کام کرلے (یعنی توبہ کرلے) تو میں مغفرت والا رحمت والا ہوں۔

ہوسکتا ہے موسیٰ علیہ السلام کا ڈرنا اس وجہ سے جو کہ وہ ابتدائے عمر میں ایک غلطی کرچکے تھے (جس کی وہ تلافی بھی کرچکے تھے) تو ان کی پوری تسلی اللہ تعالیٰ نے

فرما دی۔ اگلی آیت میں اپنی غفران و رحمت کا ایک عام اصول بیان فرما دیا کہ ظلم کے بعد نیکی کرنے سے وہ ظلم معاف ہوجائے گا جو پہلے کیا تھا۔ یہاں تک کہ توبہ کرنے سے حقوق العباد بھی معاف ہوجاتے ہیں اگر اس کی تلافی (مثلاً صاحبِ حق کو قصاص دینا یا اس سے معافی مانگنا) اپنے اختیار سے باہر ہو۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌO وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ط فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَO (سورۃ النمل، آیت ۱۳، ۱۴)

غرض ان لوگوں کے پاس جب ہمارے دیے ہوئے) معجزے پہنچے جو نہایت واضح (تھے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے اور (غضب تو یہ تھا کہ) ظلم اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہوگئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا، سو دیکھیے کیسا (برا) انجام ہوا ان مفسدوں کا۔

معجزہ اور سحر میں یہ فرق ہے کہ دل میں یقین ہوجاتا ہے کہ واقعی یہ معجزہ ہے خواہ زبان سے اس کو سحر کہتے رہیں جو ظالموں اور متکبروں کا شیوہ ہے کہ جسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں اس کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔

دوسرا فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ معجزے کا مقابلہ کرنے سے اس فن کے ماہرین عاجز ہوتے ہیں۔ جیسے بڑے بڑے زبان دان اور شاعر قرآن شریف کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مقابلے میں کوئی سورت پیش نہیں کرسکتے۔ اور کسی نے کچھ پیش بھی کیا تو اسی کے معاصرین اور ماہرینِ فن نے جو مسلمان بھی نہیں تھے انھوں نے اس کا مذاق اڑایا۔

تیسرا فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی زندگی لوگوں کے سامنے ہوتی ہے اور ہر انصاف پسند اس کی گواہی دیتا ہے کہ ایسا پاک باز اور دیانت دار شخص جھوٹا نہیں

ہوسکتا۔ جادوگر کی زندگی اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو جادوگر تو نہیں ہیں لیکن ان سے خوارق صادر ہوتے رہتے ہیں لیکن اس ناچیز کے خیال میں ایسے لوگ نبوت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ جیسے بعض کافروں سے مریض کو اچھا کردینے کے واقعات منسوب ہیں لیکن ان کافروں نے کبھی اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ النمل، آیت، ۱۵)

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو (شریعت اور ملک داری کا) علم عطا فرمایا اور ان دونوں نے (اپنے شکر کے لیے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔

معلوم ہوتا ہے حکومتِ الٰہیہ کی اہلیت کا اصل معیار علم ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بادشاہت کے سلسلے میں علم اور جسم دونوں کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے علم اور جسم کی مثال سونے اور سہاگے کی ہے۔ علم سونا ہے اور جسم سہاگا۔ دونوں ساتھ ہوں تو سونے پر سہاگا ہے۔ جس طرح حکمت کی اصل خدا کا شکر ہے اسی طرح علم کی اصل خدا کا شکر ہے یہاں سلیمان علیہ السلام کو علم کی جو نعمت ملی تو اس کے ذکر کے ساتھ ان کا قول الحمدللہ ... الخ فرمایا گیا۔ خشیت بھی علم کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ ان یخشی... الخ اور جس طرح محبت اور خشیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح شکر اور خشیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ان دونوں حضرات نے الحمدللہ کہہ کر پہلے ہی عجب اور تکبر سے بچنے کا سامان کرلیا کہ فضیلت اللہ نے دی ہے جس پر شکر واجب ہے اور یہی اصل علم ہے۔ اسی طرح جب چیونٹیوں کی بات حضرت سلیمان علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام نے سنی تو

پھر رب اوزعنی ان اشکر... الخ کہہ کر عجب اور تکبر سے اپنی حفاظت کا اور اپنی سلطنت اور نفضیلت کی بقا کا انتظام کرلیا۔ جب شکر کی حالت دل و دماغ میں رچ بس جائے تو پھر "میں اسے ضرور ذبح کردوں گا" وغیرہ جیسے کلمات کہنا یا سیاستاً سختی کرنا، سزا دینا، یہاں تک کہ اپنی طاقت اور دبدبے کا اعلان کرنا بھی مضر نہیں ہے بلکہ صاحبِ سلطنت کے لیے اور جو لوگ سلطنت کے کام چلانے پر مامور ہیں، ضروری ہے اور باعثِ ثواب بھی۔ اگر وہ لوگ ہر بات میں اپنی عاجزی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے رہیں تو سلطنت کا کام نہ چلے۔ مولانا رومؒ نے ایک جگہ مثنوی میں بھی کہا ہے کہ ایسے مواقع پر ان شاء اللّٰہ نہیں کہنا ہی صواب ہے (چنانچہ بیعت کرتے وقت اگر انسان کہہ دے کہ ان شاء اللّٰہ میں آپ کی اطاعت کروں گا تو بیعت نہیں ہوتی) اور اگر دل میں کسی کے ان شاء اللّٰہ نہ ہو تو وہ زبان سے ہزار بار بھی ان شاء اللّٰہ کہے تو کچھ فائدہ نہیں۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○ (سورۃ النمل، آیت، ۱۶)

اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے اور انھوں نے (اظہارِ شکر کے لیے) کہا کہ اے لوگو ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو (سامان) سلطنت کے متعلق ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں واقعی یہ (اللّٰہ تعالیٰ) کا صاف فضل ہے۔

معلوم ہوا کہ شکر علم بھی ہے اور حکمت بھی، شکر یہ کہ سب چیزوں کو اللّٰہ تعالیٰ کا فضل محض سمجھا۔ ملکۂ سبا کے لیے بھی چونکہ ہدایت مقرر تھی اس لیے اس نے بھی کہا تھا کہ اوتینا العلم... کنا مسلمین۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کبھی کبھی ہر چیز پر دسترس اور حکومت کافروں کو بھی ملی ہے تو یہ دراصل اللّٰہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے بلکہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل اور استدراج اور صرف ظاہری طور پر فضل ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بھی فضل ہے۔ حکمت، حکومت، سلطنت اور وافر رزق کو ساری دنیا فضل سمجھتی ہے اور اس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ وابتغوا من فضل اللہ میں دنیاوی رزق، مال و اسباب شامل ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملے میں واقعی حکومت اور طاقت فضلِ خداوندی تھا۔ کیوں کہ وہ نبی تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اوتینا من کل شیء کہتے انھوں نے منطق طیر جاننے کے علم کا ذکر کیا جو ان کو بطور معجزہ عطا ہوا تھا۔ اور سلطنت وحکومت جیسی ان کو دی گئی تھی وہ بھی ایسی تھی کہ کسی کو نہیں دی گئی اور یہ بھی ان کا معجزہ تھا۔

سب سے اچھی یہ توجیہہ سمجھ میں آئی کہ اگر انسان ظاہری مال و اسباب و قوت و شوکت کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھ کر شکر ادا کرتا رہے تو وہ واقعی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے (جیسا یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کی باتوں سے اور ان کی دعا رب اوزعنی... الخ سے ظاہر ہے۔ اور اگر انسان اس کو اپنے علم یا اپنی عقل مندی کا ثمرہ سمجھے تو یہ اس کے لیے استدراج ہے۔ جیسا کہ باغ والے نے کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا یہ کبھی ختم ہوں گی اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کو اپنے کہے کی سزا مل گئی۔ اس طرح کا استدراج اکثر کافروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ باغ والے کا کفر اس کے اس قول سے ظاہر ہوتا تھا کہ... اگر قیامت ہوئی بھی تب بھی میں عیش سے رہوں گا۔ اور اس کے ساتھی نے جواب دیا تھا کہ ''کیا تو نے انکار کیا اس کا جس نے تجھے پیدا کیا...''

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ (سورۃ النمل، آیت، ۱۷، ۱۸)

اور سلیمان کے لیے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے مسخر نہیں ہوتے)

اور (پھرتے بھی اس کثرت سے تھے) کہ ان کو (چلنے کے وقت روکا جاتا تھا یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چینوٹیوں سے) کہا کہ چیونٹیو! اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو کہیں تم کو سلیمان اور اُن کا لشکر بے خبری میں نہ کچل ڈالیں۔

جن کو اللہ تعالیٰ نے حکومت و ثروت دی ہے ان کو خصوصیت سے چاہیے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھیں کہیں وہ یا ان کے گروہ کے لوگ کسی کو لاعلمی میں نقصان نہ پہنچادیں عام طور سے بھی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کے لیے باریک بینی اور دور اندیشی کی ضرورت ہے۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (سورۃ النمل، آیت، ۱۹)

سو سلیمان اس کی بات سے مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ میرے رب مجھ کو اس پر مداومت دیجیے کہ آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور (اس پر بھی مداوت دیجیے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجے کے) نیک بندوں میں داخل رکھیے۔

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی قدس سرہٗ نے یہ دعا نقل کر کے فرمایا...''ایسے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جن سے آپ راضی ہوں... ہر عمل (جس کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں) عملِ صالح نہیں ہے۔ عملِ صالح وہی ہے جو خدا کی رضا کا موجب ہے۔''

چونکہ یہاں نعمت کا لفظ ہے اس لیے اس سے سب سے بڑی نعمت یعنی ایمان

مراد معلوم ہوتی ہے جیسا تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہما میں ہے۔ ''(التی انعمت علی)... علی بالتوحید (وعلی والدی) بالتوحید۔'' مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ ''نعمتوں'' سے فرمایا ہے کیوں کہ اکثر واحد کے صیغے سے جمع کا صیغہ بھی مراد ہوتا ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ باپ دادا سے مسلمان ہونا بھی ایک خاص فضیلت کی بات ہے اور باپ دادا سے رئیس ہونا بھی فضیلت ہے۔ جیسا کہ مشاہدے میں آتا ہے کہ جو شخص باپ دادا سے صاحبِ حیثیت ہو اس کے عادات و خصائل ایک نو دولتیے کے عادات و خصائل سے مختلف ہوتے ہیں۔

شکر دراصل حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی کا دوسرا نام ہے۔ چونکہ ہر نعمت کے سامنے ایک حق ہے یعنی جس کو کوئی فضیلت عطا ہوتی ہے کہ اس پر اسی کی مناسبت سے ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے، مثلاً باپ کو بیٹے پر فضیلت ہے تو بیٹے کا بھی باپ پر حق ہے کہ اس کی صحیح تربیت کرے اور اس کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ اسی طرح کسی کو دولت دی گئی تو اس پر غریبوں کا حق ہے۔ ان حقوق کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ادا کرنا شکر ہے۔ اسی لیے جس کو جتنا عطا ہوا اتنا ہی اس پر شکر واجب ہے اور اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کا محتاج ہے اور اتنا ہی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی اور اس سے دعا کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل نعمت وہی ہے جس پر شکر کرنے کی توفیق مل جائے۔ ورنہ جس سے سرکشی بڑھے وہ صرف صورتاً نعمت ہے۔

۹

وتفقد الطیر فقال مالی لآ اری الھدھد ام کان من الغآئبین ○ لاعذبنہ عذابا شدیدا اولااذبحنہ اولیاتینی بسلطن مبین○ (سورۃ النمل، آیت، ۲۰، ۲۱)

اور (ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان نے پرندوں کی حاضری لی تو ہدہد کو نہ دیکھا، فرمانے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب

ہوگیا ہے میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف حجت (اور عذر غیر حاضری کا) میرے سامنے پیش کرے۔

معلوم ہوا کہ اگر دل میں خدا کا خوف ہو اور ان شاء اللہ ہو تو زبان سے اتنے تیقن کے ساتھ کہنا جو بادشاہت کی شان اور مصلحت کے عین مطابق ہے کسی لحاظ سے بھی مذموم نہیں، بلکہ اگر اس وقت سلیمان علیہ السلام اس طرح کہتے کہ اگر خدانخواستہ ہدہد کوئی معقول وجہ نہیں بتلا سکا تو میں ان شاء اللہ العزیز اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا اور کوئی سخت سزا دوں گا تو یہ بات درست نہ ہوتی۔ اس بارے میں مثنوی میں ''جانِ استثنا'' کا ذکر خوب ہے۔ قالب پر (form پر) زیادہ زور دینا مناسب نہیں ہے بلکہ اگر روح (spirit) قائم ہو تو قالب قائم رکھنا فرض یا واجب نہیں۔ اس واقعے کے بیان سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے دل کا حال بھی بتلایا گیا کہ کس طرح ان کا قلب شکر اور اناب سے لبریز تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰنِ ۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ O (سورۃ النمل، آیت، ۳۶)

سو جب وہ فرستادہ سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تحفے پیش کیے تو سلیمان علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس وغیرہ) مال سے میری امداد کرتے ہو سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو مجھ کو دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے ہاں تم ہی اپنے اس ہدیے پر اتراتے ہوگے۔

معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقصد دنیاوی مال و عزت حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ ایک پوری قوم اپنی ملکہ کے ساتھ بت پرستی میں مبتلا تھی، اس کو اس لعنت سے نجات دلانا تھا۔ درحقیقت ملکہ کو مطیع ہوکر بلانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ

ایمان نہ بھی لائی تب بھی اس کی قلمرو میں اسلام کی بالادستی رہنے کی وجہ سے بہتوں کو ہدایت ہوگی۔ اگر مال کا طمع ہوتا تو اس وقت ملکہ کے فرستادہ سے بات چیت ہوجاتی۔ ملکۂ سبا کو بلوانے میں غالباً یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اگر وہ ایمان لائے تو بغیر تلوار کے اعلائے کلمۃ الحق کا کام ہوجائے۔

اس آیتِ کریمہ کے مراقبہ سے طول امل سے بچنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ جو چیزیں تم سمجھتے ہو کہ تمھیں مل جائیں تو اچھا ہو یا مل جاتیں تو اچھا ہوتا تو وہ تمام چیزیں ان چیزوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمھیں دیا ہوا ہے۔ ایک ایمان ہی کی دولت دیکھ لو۔ اسی طرح عافیت کی دولت ہے جسے نہ خریدا جاسکتا ہے نہ کوئی مخلوق کسی مخلوق کو دے سکتی ہے۔ مال و اسباب بھی خدا کے فضل سے ایک سے ایک موجود ہے۔ جیسا حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے بڑے صاحب زادے سے فرمایا تھا جب انھوں نے ایک گاڑی خریدی تھی کہ یہ بہترین گاڑی ہے جو تمھیں مل سکتی تھی۔ اگر ساری دنیا مل کر بھی تمھیں اس سے بہتر گاڑی دینا چاہتی تو نہیں دے سکتی تھی کیوں کہ یہ تمھیں اللہ نے عطا کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا سے بہتر کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی۔

ارْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ (سورۃ النمل، آیت، ۳۷)

تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ بس ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہوسکے گا ہم ان کو وہاں سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ (ہمیشہ کے لیے) ماتحت ہوجاویں گے۔

صاحبانِ حکومت کو ایسا ہی کہنا زیب دیتا ہے۔ کسی طرح کی کم زوری یا تذبذب اس قول میں نہیں ہے۔ مالک سے دل کو باندھے رکھو اور جو تمھارے ماتحت

ہیں یا جن پر تم اپنا رعب طاری کرنا چاہتے ہو ان سے اس طرح بات کرو کہ وہ تمھارے ارادے میں کسی طرح کا تذبذب یا کم زوری نہ پائیں۔ ایسے مواقع پر ان شاء اللہ نہیں کہنا چاہیے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو بات کہو اس کو لفظ بہ لفظ (literally) پورا کرنے کا ارادہ ہو کیوں کہ سیاست اور حکومت میں اقوال سیاق و سباق کے ساتھ مقید سمجھے جاتے ہیں جیسے یہاں پر حضرت سلیمان علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے کہنے کا یہ مقصد تھا کہ اگر ملکۂ سبا یہاں خود سے نہیں آئی تو ہم اس پر فوج کشی کریں گے۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۟ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَ اَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ۝ (سورۃ النمل، آیت ۴۰)

جس کے پاس کتاب کا علم تھا (غرض) اس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کر کھڑا کرسکتا ہوں جب سلیمان علیہ السلام نے اس کو روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہوکر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور (ظاہر ہے کہ) جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے میرا رب غنی ہے کریم ہے۔

اس سے قبل عفریت من الجن کا قول نقل فرمایا گیا تھا کہ ''انی علیہ لقوی امینٌ۔'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی قوت جسمانی قوت سے کہیں زیادہ ہے اور اس کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس کے پاس حیوانی قوت بہت زیادہ ہوتی (مثلاً ایک پہلوان) ایک ایسے عام آدمی کے سامنے

بے بس ہوتا ہے جس کے پاس کوئی ہتھیار ہو یا کوئی صاحبِ حکومت یا وجاہت ہو۔ لہٰذا جہاں قوت کا ذکر ہے بعض معاملات کی اہلیت کے لیے وہاں قوت کا اطلاق عام ہے۔

ملکہ سبا کو مع اس کے تخت کے اپنے سامنے دیکھ کر سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے اور میرے شکر یا ناشکری کا امتحان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فضل خواہ بڑے سے بڑے آدمی پر کیوں نہ ہو آزمائش سے خالی نہیں۔ ہر فضل میں آزمائش پوشیدہ ہے دوسرے معنوں میں فضل بھی بلا ہے لیکن بلائے حسنہ۔ اگر اس کے بعد شکر کی توفیق ہوگئی تو یہ حقیقی نعمت ہے ورنہ صرف صورتاً نعمت ہے۔ اور یہ فضل عام ہے خواہ دولت، ثروت یا وجاہت ہو خواہ اونچا روحانی مقام یا نسبت ہو۔ اسی لیے مقربین ترساں رہتے ہیں۔ والمخلصون علیٰ خطر عظیم۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے: ''ان ربی غنی) عن شکرہ (کریم) متجاوز لمن تاب لایعجل بالعقوبۃ۔''

پہلا ردِعمل ہر واقعے کا اور خصوصاً ان واقعات کا جو ہمارے ساتھ پیش آئے یہی ہونا چاہیے کہ ہم اسے خالق کی طرف سے سمجھیں کیوں کہ ہر واقعے میں ہمارے شکر اور صبر کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر کوئی بات ہمارے دل خواہ ہوگئی تو سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خالقِ حقیقی کا ہم پر فضل ہے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس بات کی تفتیش کہ ایسا کیوں ہوا، ہماری کون سی بات اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی، فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے لیے کسی سبب کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنا عقل مندی ہے یعنی وہ اعمال اختیار کرنا جن پر عادتاً فضل ہوجاتا ہے، مثلاً غلہ حاصل کرنے کے لیے کھیتی کرنا۔ لیکن اس کے فضل کے اسباب تلاش کرنا کہ فلاں پر کیوں ہے اور فلاں پر کیوں نہیں ہے، بیوقوفی ہے۔ البتہ اس میں ہماری آزمائش ہوتی ہے، اس لیے ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح جو واقعہ ہماری مرضی کے خلاف پیش آتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ البتہ اس ناگوار واقعے کے تجزیہ کرنے میں کہ مجھ

ے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی کہ یہ واقعہ ہوگیا، کوئی حرج نہیں ہے۔ یا یہ کہ اگر کسی نے ہم پر زیادتی کی تو کس نے زیادتی کی اور اس کے ساتھ ہمیں کیا معاملہ کرنا چاہیے اور آئندہ کے لیے اس طرح کے واقعات کا سدباب کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ سب سوالات فطری ہیں اور ان کا جواب تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ہر اس طرح کے واقعے پر اپنا ایمان تازہ کرلینا چاہیے کہ ہمیں کوئی ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا بغیر ہمارے خالق کے حکم کے۔ لہٰذا اس مصیبت پر صبر کرنا ہمارا فرض ہے کہ ہمارا ردِعمل اس دائرے کے اندر ہو جو اللّٰہ تعالیٰ نے ہمیں بتا دیا ہے۔ جزع فزع کرنے کی بجائے صبر کے ساتھ اس پریشانی کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اللّٰہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا چاہیے۔ علاج بعد میں کرو گے پہلے اللّٰہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوجاؤ جن کے حکم کے بغیر ایک پتا نہیں ہل سکتا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ النحل، آیت، ۴۱)

اور جن لوگوں نے اللّٰہ کے واسطے اپنا وطن (مکہ) چھوڑ دیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا ثواب بدرجہا بڑا ہے کاش ان (کافروں) کو (بھی) خبر ہوتی۔

یہاں ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کی دنیا میں بھی اچھی زندگی کا وعدہ ہے اور آخرت میں بھی اجر کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی فراغت اور عافیت کی زندگی موجود ہے۔ چنانچہ مہاجرین اوّلین کو ظاہری اور باطنی ہرطرح کی نعمتیں افراط کے ساتھ ملیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت بھی جو مسلمان اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کرکے پاکستان آگئے ان میں سے اکثر کی دنیاوی زندگی بھی بہت

اچھی گزری۔ اور اگر حسنہ کا مطلب وہی لیا جائے جو ربنا اتنا... الخ میں حسنہ کا مطلب ہے تو سبھوں کی زندگی اچھی گزری۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۚ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O (سورة النمل، آیت،۴۴)

بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اس کا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (اس کے اندر گھسنے کے لیے) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اس وقت) سلیمان نے فرمایا کہ یہ تو ایک محل ہے جو شیشوں سے بنایا گیا ہے (اس وقت) بلقیس کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار میں نے (اب تک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں اب سلیمان کے ساتھ (یعنی ان کے طریقے پر) ہوکر رب العالمین پر ایمان لائی۔

ملکۂ سبا کا یہ کہنا کہ اے رب میں نے اپنے اوپر ظلم کیا گزشتہ کفر اور گناہوں سے توبہ تھا۔ اپنے ظلم کا اقرار کرلینا، نادم ہوجانا یہی توبہ ہے۔ زبان سے کہنا کہ میں توبہ کرتا ہوں یا یہ کہ مجھے معاف کردیجیے۔ اپنی جگہ ہے لیکن اصل توبہ تو آدمی اپنے دل میں کرتا ہے اور وہیں اس کی راستی کی اصلاح کا عمل شروع ہوتا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ O اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ O فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ

لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ
اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ
مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ○ (سورۃ النمل، آیت، ۵۴-۵۸)

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو بھیجا تھا جب کہ اُنھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ کیا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ سمجھ دار ہو، کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اور اس کی برائی میں کوئی شبہ نہیں) بلکہ (اس باب میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو سو (اس تقریر کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو تم اپنی بستی سے نکال دو (کیوں کہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔ سو ہم نے (اس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو بچا لیا بجز ان کی بیوی کے کہ اس کو (بوجہ ایمان نہ لانے کے) ہم نے ان ہی لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے اور ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا سو ان لوگوں کا کیا برا مینہ تھا جو ڈرائے گئے تھے۔

فواحشات اور منکرات سے دور رہنا اور ان سے بیزاری کا اعلان کرتے رہنا طہارت کی اصل ہے۔ حضرت لوط علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کا اپنی قوم کی فحش حرکات سے بیزاری کا اعلان اور ان کو اس حرکت کے ترک کرنے کو کہتے رہنا ان کی قوم کو برداشت سے باہر ہوتا ہوا معلوم ہوا اس لیے کہا کہ یہ لوگ بہت زیادہ پاک صاف رہنے والے ہیں ہم لوگوں میں ان کا گزر ہونا ممکن نہیں ہے، اس لیے ان کو نکال باہر کرو۔

یہاں سے اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے نماز کے لیے اور قرآن شریف چھونے کے لیے جس طرح جسمانی طہارت وضو یا غسل سے ضروری ہے، اسی طرح قلبی طہارت توبہ اور انابت سے ضروری ہے گرچہ زبان سے توبہ کے الفاظ ضروری نہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان میں نظامِ اسلام کے قیام کے سلسلے میں آیت ۵۶ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ درخت کی شاخ جس پر ہم آشیانہ بنانا چاہتے ہیں ہمارے

آشیانے کا بوجھ برداشت نہ کر سکے اور ٹوٹ جائے۔

اس معاملے میں ہمیں ان آیاتِ کریمہ سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ باوجودیکہ ایسا معاشرہ ہو جائے جو ہمیں برداشت نہ کر سکے ہمیں نہ خود ناپاکی میں ملوث ہونا چاہیے اور نہ پاکیزگی کی نعمت ترک کرنی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خود وہاں سے ہجرت کر جانے یا نکالے جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ (سورة النمل، آیت، ٦٦)

بلکہ آخرت کے بارے میں (خود) ان کا علم (بالوقوع ہی) نیست ہو گیا بلکہ یہ لوگ اس سے شک میں ہیں بلکہ یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

''بلکہ آخرت کے معاملے میں ان کا علم نیست ہو گیا، بلکہ یہ لوگ اس سے شک میں ہیں، بلکہ اس سے یہ اندھے ہیں۔'' (بیان القرآن) اس سے پہلے عدم تعین علم کا ذکر تھا۔ اس سے بڑھ کر عدمِ علم یعنی خود اس کے وقوع ہی کا علم نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر شک اور اس سے بڑھ کر عمی۔ ''پستی یہ انتقالات ترقی کے ہیں۔'' یعنی ہر گمراہی پہلی گمراہی سے بڑھی ہوئی ہے۔ (ماخوذ از بیان القرآن)

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ۝ (سورة النمل، آیت، ۲۷)

سلیمان علیہ السلام نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھے لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے۔

ماتحتین کو جانچنا اور ان پر یہ اثر ڈالنا کہ ان کی ہر بات مانی نہیں جائے گی

اعلیٰ خلق کے منافی نہیں ہے۔ گرچہ عام حالات میں سوء ظن رکھنا برا ہے مگر اس کے مستثنیات (exceptions) ہیں جس طرح غیبت کے مستثنیات ہیں جن میں سے بہت سے احادیثِ نبویہ میں موجود ہیں۔ سیاست ملکیہ کے مصالح کے اعتبار سے اس طرح کی بات محمود ہے۔ جس طرح اپنا رعب و دبدبہ دوسرے فریق پر ڈالنا ان حالات میں جن حالات میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کے فرستادوں کو دیا تھا، محدود ہے۔ گرچہ بظاہر یہ بات تعلّی کی تھی جو تواضع کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ متعارف اخلاق اور چیز ہے اور اصل اخلاق اور چیز ہے۔ جس طرح مکارہ اخلاق اور مکارمِ اخلاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہر جگہ اس طرح کا اخلاق یا تواضع برتنا جسے عام طور سے اخلاق اور تواضع سمجھا جاتا ہے محمود نہیں ہے، مثلاً اگر حاکم کہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں میں تمھاری کیا گرفت کروں میں خود ہی بہت گنہگار ہوں۔ اسی طرح جنگ کے معاملے میں مدِمقابل سے کہنا کہ اللّٰہ نے چاہا تو ہم تم پر غالب رہیں گے ورنہ ہم اپنی قسمت پر صابر رہیں گے۔ دنیا کا کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو اس طرح کی بات کہنا یا سوچنا سخت نادانی کی بات ہوگی۔ ایسے مواقع پر عزم و یقین ہی کے اظہار کی ضرورت ہے۔ آدمی جس عہدے پر مامور ہو اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے الا یہ کہ کوئی کام صریحاً گناہ ہو۔

اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ O (سورۃ النمل، آیت، ۸۰)

آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً) جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں۔

مردے تو سن ہی نہیں سکتے۔ جو لوگ زندہ بھی ہیں اور بہرے ہیں وہ بھی سننے سے معذور ہیں خصوصاً جو منھ پھیر کر بھاگنے لگیں ان کو تو سنانا ناممکن ہے۔ یہی حال

کفار کا ہے۔ اگر وہ بھاگتے نہیں اور بہرے ہونے کے باوجود ان کا منہ سامنے ہوتا تو شاید انھیں آپ اشارے کنائے سے بھی کچھ بتلا سکتے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ O(سورۃ النمل، آیت، ۸۸)

اور تو (جن) پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے (اور) ان کو خیال کر رہا ہے کہ یہ (اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑے پھریں گے یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب افعال کی پوری خبر ہے۔

جب پہاڑوں کا یہ حال ہے تو جو لوگ اپنی کرسی مضبوط سمجھتے ہیں، خدا سے غافل ہیں، وہ کتنی جہالت میں ہیں!

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O(سورۃ النمل، آیت، ۹۰)

اور جو شخص بدی (یعنی کفر و شرک) لاوے گا تو وہ لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دیے جاویں گے (اور ان سے کہا جاوے گا کہ) تم کو ان ہی عملوں کی سزا دی جا رہی ہے جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔

جو لوگ اپنے عمل پر نازاں ہیں ان کے لیے یہ آیت لرزا دینے والی ہے۔ ہمارے اعمال اس قابل کہاں ہیں کہ اس عظیم دربار میں پیش کیے جاسکیں جب کہ بڑے

بڑے مقربین بھی اس دربار میں پیشی سے ترساں ہیں۔ اگر مومنوں کو بھی ان کے اعمال کا بدلہ اس طرح دیا جاتا جس طرح کافروں کو دیا جائے گا تو کوئی بھی جنت میں نہ جاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مومنوں کو اپنے فضل سے جنت میں داخل فرمائیں گے اور ان کو نیک اعمال کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے جو صرف ٹھیک ٹھیک بدلے کی ترازو میں ہوتا۔ ایک حدیث شریف میں بھی تشریح ہے کہ کوئی بھی محض اپنے اعمال کے بدلے میں جنت میں نہیں جائے گا۔ یہاں پر بھی جو حسنات لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پہنچے گا (جس کی پہلی شرط ایمان ہو) اس کو بدلہ دینے کے بارے میں جو آیتِ کریمہ ہے وہ اس دعوے سے بہت مختلف ہے جو گناہ لے کر اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچیں گے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَ هُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ○ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ○ (سورۃ القصص، آیت،۴۔۶)

فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا (اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا، واقعی وہ بڑا مفسد تھا (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دنیوی و دینی) احسان کریں اور (وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں) پیشوا بنا دیں اور (دنیا میں) ان کو (ملک کا) مالک بنائیں اور (مالک ہونے کے ساتھ) اُن کو

زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل) کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔

آیت ۴ میں فرعون کی حکمتِ عملی بیان فرمائی گئی اور آیات ۵ اور ۶ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کا ذکر فرمایا، ممکن ہے کہ فرعون کی حکمتِ عملی ایک گروہ کو کمزور اور دوسرے کو سرکردہ بنا کر رکھنا ایک ایسی بات ہو جو اور بھی بہت سے بادشاہوں نے اپنائی ہوئی (حکمت کا لفظ یہاں کھٹکتا ہے کیوں کہ یہ بات اصل حکمت یعنی خدا کے شکر سے بہت ہی دور تھی) یا ممکن ہے کہ فرعون ہی نے یہ پالیسی ایجاد کی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے جو اپنے ارادے کا ذکر فرمایا ہے کمزوروں کو تمکین فی الارض (یعنی زمین پر غلبہ) عطا فرمانے کا اور سرکشوں کی سرکوبی کا تو یہ کم زوری کے صبر کا صلہ دینا تھا جس کا ذکر دوسری جگہ ہے اور فرعون اور ہامان وغیرہ کو ان کی سرکشی کی سزا دینے کا بھی ذریعہ تھا۔ گرچہ فرعون بڑا جابر اور طاقتور حکمران تھا مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تھا کہ کم زوروں کو اس کا وارث بنا دیں اور فرعون و ہامان اور ان کی افواج کو وہ روزِ سیاہ دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔ ان آیاتِ کریمہ سے مندرجہ ذیل باتوں کا اشارہ ملتا ہے۔

(۱) فرعون نے اپنی حکومت میں لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے بنا دیے پھر ان میں سے ایک کو مغلوب رکھا۔ آج بھی بہت سی حاکم قومیں فرعون کی پیروی کرتی ہیں۔ اور بہت سے لیڈران اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے قوم میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔ انھیں فرعون کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

(۲) یہ بات بذاتِ خود بھی فساد ہے اور فرعون مفسدوں میں سے تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی خواہش اپنی حکومت قائم رکھنے کی تھی جس کے لیے اس نے زمین میں یہ فساد پھیلایا۔

(۳) شاید یہ فساد کا مادہ اس لیے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ فرعون کو لوگوں پر

چڑھ آنے کی طویل مدت دی گئی تھی۔ اس کے برعکس جن کو حکومت دی گئی اور وہ اس کو اپنے علو اور برتری کا ذریعہ بنانے کی بجائے اس کو اللہ کی امانت سمجھتے رہے وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ قوم میں تفرقہ نہ ہو۔

(۴) جو لوگ آج طاقتور ہیں ان کو گزشتہ واقعات یاد رکھنے چاہییں اور سمجھنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ طاقت میں نہیں رہیں گے۔

(۵) بظاہر بڑے قابل لوگوں سے بھی ایسی غلطی ہوجاتی ہے جو بالآخر ان کو لے ڈوبتی ہے، مثلاً یہاں فرعون اور اس کے حامیوں کی غلطی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں ہوتی رہی۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ۝ (سورۃ القصص، آیت، ۸)

تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی مع صندوق کے) اٹھا لیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے دشمن اور غم کا باعث بنیں بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارے میں) بہت چوکے۔

فرعون کے گھر والوں نے (اس کی اجازت سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا جو ان کی بڑی غلطی تھی کیوں کہ بالاخر یہ ان کی تباہی کا باعث بنا۔ یہاں آلِ فرعون کی غلطی کو فرعون و ہامان اور ان کی افواج کی غلطی بتائی گئی ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ سربراہِ مملکت کی غلطی صرف اس واحد فرد کی غلطی نہیں ہوتی بلکہ اس کے مشیروں، قریبی ساتھیوں (ہامان) اور اس کے لوگوں کی (قومھما) غلطی ہوتی ہے۔ اگر سربراہ کوئی غلط کام کرے تو اس کے ساتھیوں کا کام ہے کہ اس کو بتائیں ورنہ وہ سب مبتلائے عقوبت ہوجائیں گے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ (سورۃ القصص، آیت ۱۴)

اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ و عقلیہ سے) درست ہوگئے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا اور ہم نیکوکاروں کو یونہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی عملِ صالح سے فیضانِ علم میں ترقی ہوتی ہے)۔

ہوسکتا ہے کہ یہاں نبوت کے علاوہ اور علوم کا ذکر ہو اور موسیٰ علیہ السلام محسنین میں سے تھے باوجودیکہ ان سے نادانستگی میں ایک قتل ہوگیا تھا کیوں کہ انھوں نے توبہ کی یہ کہہ کر کہ آئندہ میں مجرموں کی پشت پناہی نہیں کروں گا (خواہ وہ میرے قبیلے ہی کا کیوں نہ ہو) اور بعد کی زندگی بھی تقویٰ کے ساتھ اور اللّٰہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ گزری۔

وَدَخَلَ عَلَی الْمَدِیْنَةَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَکَزَهٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ○
(سورۃ القصص، آیت ۱۵)

اور موسیٰ (علیہ السلام) شہر میں (یعنی مصر میں کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سو رہے) تھے تو انھوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا ایک تو ان کی برادری میں کا تھا اور دوسرا مخالفین میں سے تھا سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابلے میں جو اُن کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی تو موسیٰ نے اس کو (ایک) گھونسا مارا سو اس کا کام ہی تمام کردیا۔ موسیٰ کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی بے شک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے (غلطی میں ڈال دیتا ہے)۔

یہ واقعہ نبوت ملنے سے بہت پہلے کا ہے۔ آیت ۱۳ میں جس نعمت کا ذکر ہے وہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار کے بعد ملی اور اس کا ذکر ان کے بچپن کے ذکر کے بعد ہی مناسب تھا۔ اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم یا قبیلے کے کسی فرد کی پکار پر لبیک کہنا ایک فطری بات ہے جس پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور اس پر اقربا پروری کا الزام نہیں لگ سکتا۔ البتہ اگر اس میں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوجائے تو یہ شیطان کا کام ہے اور قابلِ ملامت ہے۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ○ (سورۃ القصص، آیت ۲۴)

پس (یہ سن کر) موسیٰ نے ان کے لیے پانی کھینچ کر ان کے جانوروں کو پانی پلایا پھر (وہاں سے) ہٹ کر سائے میں جا بیٹھے پھر (جنابِ باری میں) دعا کی کہ اے میرے پروردگار (اس وقت) جو نعمت آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا (سخت) حاجت مند ہوں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے: ''... اے میرے پروردگار (اس وقت) جو نعمت آپ مجھ کو بھیج دیں اس کا (سخت) حاجت مند ہوں۔''

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس میں اپنے ایک خادم سے جو حکومت کے کوئی عہدے دار تھے، فرمایا کہ دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد یہ دعا کرلیا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعا کی برکت سے دنیا اور آخرت کی کیا کیا چیزیں نہیں ملیں یہاں تک کہ پیغمبری مل گئی۔ اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ خدمتِ خلق کا کتنا بڑا صلہ ملتا ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصے سے ظاہر ہوتا ہے۔

واقعی اگر کسی کو کوئی عہدہ یا منصب ملے تو دراصل اس کو خدمتِ خلق کی ذمہ داری ملتی ہے اور وہ اپنے دائرۂ اختیار میں محض اللّٰہ کی رضا کی خاطر مخلوقِ خدا کی خدمت کرتا رہے اور اسے اللّٰہ تعالیٰ کی توفیق اور نعمت سمجھتا رہے اور اللّٰہ تعالیٰ سے مزید نعمت مانگنے کے لیے جھولی پھیلاتا رہے تو اسے ان شاء اللّٰہ تعالیٰ بہت سی دنیوی اور دینی نعمتیں ملتی رہیں گی۔

قَالَتۡ اِحۡدٰهُمَا يٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡهُ‌ؗ اِنَّ خَيۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِىُّ الۡاَمِيۡنُ۝ (سورۃ القصص، آیت، ۲۶)

(پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان آپ ان کو نوکر رکھ لیجیے کیوں کہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو۔

یہاں قوت اور امانت کا ذکر ہے کہ کسی کو اجرت پر رکھنے کے لیے یہ دو خوبیاں ضروری ہیں اور یوسف علیہ السلام نے جب بادشاہ سے کہا کہ مجھے خزانوں کا مالک بنادو تو اپنی جن دو خاص صلاحیتوں کا ذکر فرمایا وہ حفیظ اور علیم ہونا کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف طرح کے کاموں کے لیے مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بکریاں چرانے کے لیے یا ایسے کاموں کے لیے جن میں جسمانی قوت کی ضرورت ہے ان کے لیے ''قوی'' ہونا ضروری ہے اور سلطنت کی معاشیات چلانے کے لیے ''علم'' کی ضرورت ہے۔ البتہ ''امانت'' کی صفت دونوں میں مشترک ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی امانت لفظ ''حفیظ'' سے ظاہر ہے کیوں کہ جو خائن ہوگا وہ دوسروں کے اموال کی حفاظت کیا کرے گا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امانت ان لڑکیوں نے دیکھ لی تھی جن کے لیے انھوں نے پانی بھر دیا تھا۔

قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ ہٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ○

(سورۃ القصص، آیت، ۲۷)

وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو تمھارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو پھر اگر تم دس سال پورے کرو تو یہ تمھاری طرف سے (احسان) ہے اور میں (اس معاملے میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (اور) تم مجھ کو ان شاء اللّٰہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے ''صالحین'' کا ترجمہ ''خوش معاملہ'' فرمایا ہے جو سیاق و سباق کے لحاظ سے بہت اچھا ترجمہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوش معاملگی دین کا جزو ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡہُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ○

(سورۃ القصص، آیت، ۳۳)

انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کردیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ (کہیں اوّل ہی وہلہ میں) وہ لوگ مجھ کو قتل کردیں۔

یہ خوف فطری ہے اور قابلِ مواخذہ نہیں ہے۔ اسی طرح جھٹلائے جانے کا خوف بھی فطری ہے اور وہ بھی مضر نہیں ہے جب کہ دونوں حالات میں اللّٰہ کی طرف آدمی رجوع کرے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَO وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَO فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَO (سورۃ القصص، آیت، ۳۸۔۴۰)

اور (دلائلِ موسویہ دیکھ کرسن کر) فرعون کہنے لگا کہ اے اہلِ دربار مجھ کو تو تمھارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا تو اے ہامان تم ہمارے لیے مٹی (کی اینٹیں بنوا کران) کو آگ میں (پزاوہ لگا کر) پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعوے میں کہ میرے سوا کوئی اور خدا ہے) موسیٰ (علیہ السلام) کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور فرعون اور اس کے تابعین نے ناحق دنیا میں سر اٹھا رکھا تھا اور یوں سمجھ رہے تھے کہ ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (تکبر کی سزا میں) اس کو اور اس کے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کردیا) سو دیکھیے ظالموں کا کیا انجام ہوا (اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کا ظہور ہوگیا)۔

نافرمانی اور تکبر کی لازمی سزا ہلاکت ہے۔ طغیان اور استکبار کی آخری سرحد پر جب فرعون اور اس کے لوگ پہنچ گئے اور اپنی موت کو قطعی طور پر بھول گئے تو غرق کردیے گئے۔ ظالموں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ لیکن یہ سزا کب ہوگی؟ کس طرح ہوگی؟ ظلم کی کس حد تک پہنچ کر ہوگی؟ اور تکبر کی کس سرحد تک پہنچنے کا ان کو موقع دیا جائے گا؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ کون کس وقت پکڑا جائے گا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ

تَظٰهَرَا ۪ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ○ (سورۃ القصص، آیت، ۴۸)
سو جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امرِ حق پہنچا (تو اس میں شبہ نکالنے کے لیے یوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی کیا جو کتاب موسیٰ کو ملی تھی اس کے قبل یہ لوگ اس کے منکر نہیں ہوئے یہ لوگ تو یوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو بھی نہیں مانتے۔

گرچہ بہت زمانہ گزر چکا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیکن جنھوں نے انکار کیا کئی معجزات کے باوجود اور جنھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کا انکار کیا، دونوں میں ایک صفت مشترک تھی یعنی کافر ہونا اور اسی لیے ان کو جواب دیا گیا کہ کیا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا انکار نہیں کیا جو بہت سے معجزات لے کر بھیجے گئے تھے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے الکفر ملۃ واحدہ۔ جس طرح اسلام قبول کرنے والے ملتِ واحدہ ہیں جن کا نام ''مسلمین'' ہے۔ بنیادی انسانی جبلتیں وہی رہتی ہیں اور ان کا مختلف گروہوں میں ویسے ہی ہے ظہور ہوتا ہے جیسا ہزاروں سال پہلے تھا۔

اس آیت سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ حضور ﷺ کو معجزات نہیں دیے گئے بلکہ جو معجزات کے طالب تھے ان کو جواب دیا گیا۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ○ (سورۃ القصص، آیت، ۶۱)
بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جس کو ہم نے دنیوی زندگی کا چند روزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں سے ہوگا جو گرفتار کر کے لائے جاویں گے۔

دونوں گروہوں کی دنیاوی زندگی خواہ کسی طرح کی گزر رہی ہو جب آخرت میں ایک کو اچھائی ملنے کا اور دوسرے کو رسوائی ملنے کا پکا وعدہ ہے تو یقیناً پہلے ہی گروہ کو فوقیت ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (سورۃ القصص، آیت، ۷۸)

قارون (یہ سن کر) کہنے لگا کہ مجھ کو تو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے کیا اس (قارون) نے اخبار متواترہ سے) یہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے گزشتہ امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی) ان کا (اس سے) زیادہ تھا اور اہلِ جرم سے ان کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا۔

یہ جواب قارون نے ان لوگوں کو دیا تھا جنھوں نے اس سے کہا تھا کہ تم بھی اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے۔ جواب میں اس نے یہ کہا کہ یہ اس علم کی وجہ سے ملا ہے جو میرے پاس ہے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخل اور کفر میں گہرا ربط ہے)۔ اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ اس سے زیادہ علم رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا ان کے جرموں کی وجہ سے کیوں کہ جس کو قارون علم سمجھتا تھا وہ دراصل علم تھا ہی نہیں بلکہ اکتسابِ معاش کا ذریعہ تھا۔ علم دراصل وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پتا چلتا ہو اور جو اس کے عجائباتِ قدرت دیکھ کر اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرے اور جو علم صرف کسبِ معاش کا ذریعہ ہو وہ صرف صورتاً علم ہے۔ حقیقی علم

انسان کے حقیقی درجات یعنی اللہ تعالیٰ سے قرب کے درجات بڑھاتا ہے اور نقلی علم انسان کے دنیوی درجات بڑھاتا ہے اور یہ اصلی اور نقلی کا فرق کچھ علم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، مثلاً آدمی ہونا ایک تو صورتاً ہے کہ سب آدمی آدمی ہیں دوسرے حقیقتاً جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یا

آشنا شو از مقامِ آدمی

آدمیت احترامِ آدمی

اسی طرح عقل ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں کتنا بڑا عقل مند ہے تو کیا اس کو وہ عقل ہے جسے ہم عقل کہتے ہیں؟ ایک عقل وہ ہے جو انسانوں اور بہت سے جانوروں میں مشترک ہے۔ ایک عقل وہ ہے جس سے انسان جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے اور ایک عقل وہ ہے جس سے انسان اپنی مستقل عافیت کا سامان کرتا ہے کہ تھوڑے سے عیش کے بدلے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں نہ ڈالا جائے۔

اس سے پہلے آیت ۷۷ میں ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور مفسدوں میں سے تھا۔ اس کے علم کی نفی تو اسی بات سے ہوگئی کہ وہ فساد پھیلاتا تھا۔ پھر اس کا جہلِ مرکب میں ہونا اس سے واضح ہوگیا کہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس علم نہیں تھا بلکہ صرف قوت اور مال تھا اور اس سے زیادہ قوت اور مال کے مالک وہ لوگ تھے جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

فخرج علی قومہٖ فِی زِینتِہٖ ط قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحیٰوۃَ الدُّنیا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ لا اِنَّہٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍO وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج وَلَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَO (سورۃ القصص، آیت، ۷۹، ۸۰)

پھر (ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اس کی برادری میں) دنیا کے طالب تھے (گو مومن ہوں) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا ہی صاحبِ نصیب ہے اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے ارے تمھارا ناس ہو اللّٰہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص وطمع سے) صبر کرنے والے ہیں۔

دنیاوی زیب و زینت میں دوسروں کے ہم پلہ ہونا اور ان سے بڑھ جانے کی خواہش ایمان کے فقدان یا کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح یہ خواہش اور تمنا ہے کہ کاش ہمارے ملک میں بھی دنیاوی زیب و زینت کی فراوانی ویسی ہی ہو جیسے امریکا اور جاپان میں ہے۔ ''ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش'' آنے کی شدید خواہش قوم کے دل سے ایمان کی روشنی مدہم ہوجانے کی نشانی ہے اور مسلمانوں کے لیے تنزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ مسلمانوں نے مادی ترقی بھی اس زمانے میں کی ہے جب ان کے دلوں میں دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، جب مسلمانوں کا سفیر ایرانی قالین کو تلوار سے الٹتا جاتا تھا۔

ان آیاتِ کریمہ میں دنیا چاہنے والوں کی حرص کا اور جن کو صحیح علم دیا گیا ہے ان کی آخرت پر نظر رکھنے کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ:

(۱) قوت اور دولت میں اور علم میں ایسا تعلق نہیں ہے کہ زیادہ قوت والے کو زیادہ علم ہو یا زیادہ علم والے کو زیادہ قوت ہو۔

(۲) جس کی نظر دنیا ہی پر ہے وہ جاہل ہے۔

(۳) اہلِ علم کی نظر ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتوں پر ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ ایسے واقعات ہوتے ہیں (جیسے قارون کے ساتھ ہوا) کہ طالبینِ دنیا پر بھی اپنی غلطی واضح ہوجاتی ہے۔

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ O (سورۃ القصص، آیت، ۸۳)
یہ عالمِ آخرت ہم انھی لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللّٰہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے... ''جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا...'' نیز مسائل السلوک میں فرمایا، ''آخرت سے جس طرح عمل بالمعاصی مانع ہے اور فساد سے یہی مراد ہے اسی طرح کبر بھی اس سے مانع ہے اور علو سے یہی مراد ہے۔''

اور طریقت میں تو اپنے آپ کو مٹا دینا اور سرے کی طرح راہِ حق میں اور رضائے حق کے سامنے پس جانا وصول کی شرط ہے۔

ظلم اور فساد کی دو وجوہات ہیں یا تو حبِ جاہ ہوتی ہے کہ لوگ مجھے بڑا سمجھیں یا حبِ مال ہوتا ہے کہ میرے پاس بہت مال جمع ہوجائے اور اس میں اکثر دوسروں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے اور لڑائی جھگڑا بھی۔ یہ دونوں باتیں ''علو'' اور ''فساد'' میں آجاتی ہیں۔ فساد کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی کا نفس اتنا خبیث ہو کہ اسے فساد ہی پھیلانے میں مزہ آتا ہو:

نیشِ عقرب نہ از پے کیں است

اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے اور جو نعمتیں اسے حاصل ہیں ان کو اللّٰہ تعالیٰ کی عطا بلا استحقاق نہیں سمجھتا ہے وہ بھی جنت سے دور ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۣ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ؕ لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ O (سورۃ القصص، آیت، ۸۸)

اور (جس طرح اب تک آپ شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا اس کے سوا کوئی معبود نہیں (اس لیے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے، اسی کی حکومت ہے (جس کا ظہورِ کامل قیامت میں ہے) اور اسی کے پاس سب کو جانا ہے۔

ایک درجے میں ان لوگوں کے لیے بھی فنا نہیں جو ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یعنی فانی فی اللہ ہوگئے۔

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

احسب النَاسُ انْ یُتْرکُوْٓا انْ یَقُوْلُوْٓا امنَا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ○ ولَقَدْ فتنَا الَذِیْنَ مِنْ قبْلِھِمْ فَلَیَعْلمنَ اللّٰہُ الَذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلمنَ الْکٰذِبِیْنَ○ (سورۃ العنکبوت، آیت ۲،۳)

(بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جاویں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جاوے گا اور ہم تو (ایسے واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہوگزرے ہیں، سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعوے میں) سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔

فتنے تو آنے لازمی ہیں اور آتے ہی رہتے ہیں۔ چھوٹے فتنے ہوں یا بڑے لوگوں کا ہر وقت امتحان ہوتا رہتا ہے کہ کون مومن ہے کون کافر یعنی کون اپنے ایمان میں سچا ہے کون جھوٹا۔ اور اگر قربِ قیامت سے متعلق احادیثِ شریفہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اور قیامت قریب آتی جائے گی فتنوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھیں۔

ان فتنوں میں ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ حلال و حرام کی اس قدر آمیزش ہمارے معاشرے میں ہے کہ ہم نے بہت سی حلال چیزوں کو عملاً حرام کر رکھا ہے اور اس پر دل سے اور زبان سے ملامت کرتے ہیں اور بہت سی حرام چیزوں کو عملاً حلال کر رکھا ہے اور ان کو دل سے بھی برا نہیں سمجھتے۔ فاستغفراللہ۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ○

(سورۃ العنکبوت، آیت، ۶)

اور جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لیے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں۔

مجاہدہ تہذیبِ نفس کے لیے کیا جاتا ہے اور مجاہدے میں تکلیف و مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ تہذیب اپنے ہی نفس کی ہوتی ہے لہٰذا مجاہدہ تمام تر اپنے ہی لیے ہوا اور تہذیبِ نفس سے دونوں جہان کی راحت اور سلامتی ملتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ط وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ط اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ○

(سورۃ العنکبوت، آیت، ۱۰)

اور بعضے آدمی ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہِ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ جاتے ہیں جیسے خدا کا عذاب اور اگر (کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رب کی طرف سے آپہنچتی ہے تو (اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین وعقیدہ میں) تمھارے ساتھ تھے کیا، اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دلوں کی باتیں معلوم نہیں ہیں۔

یہ آیت تو دراصل منافقوں کے بارے میں ہے کہ کبھی اِس طرف جاتے ہیں کبھی اُس طرف لیکن اس میں ان مسلمانوں کے ایمان کی کم زوری کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ان کافروں سے بہتر ہوتے تو کیوں لوگوں سے اس درجہ مغلوب ہوتے اور کیوں اتنے افلاس و تنگ دستی میں رہتے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے ذریعے سے آزماتے رہتے ہیں کبھی ایک کو عروج ہے کبھی دوسرے کو۔ ایک لحاظ سے مسلمانوں کی موجودہ معاشی پستی ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہے لیکن دوسرے لحاظ سے اس میں ان کے ایمان کی آزمائش ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (سورۃ العنکبوت، آیت ۱۲)

اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ پر چلو اور (قیامت میں) تمھارے گناہ ہمارے ذمہ حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرّہ بھی نہیں لے سکتے، یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں۔

اس طرح کی باتیں کہ تم فلاں کام کرلو گناہ میرے سر ہوگا، کبھی سرزد نہیں ہوتیں۔ یہ ڈینگ اور لاف زنی تو وہی کرتا ہے جسے آخرت کی سزا کا کچھ علم نہیں ہے بلکہ اس کو ایک سرسری چیز سمجھتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ

بَعْضُکُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ O

(سورۃ العنکبوت، آیت، ۲۵)

اور ابراہیم (علیہ السلام) نے وعظ میں یہ بھی فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے بس یہ تمھارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے پھر قیامت میں (تمھارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہوجاوے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یعنی بت پرستی کو کون عقل مند جائز رکھ سکتا ہے۔ بت پرست بھی دل میں جانتے ہیں کہ یہ نہایت مہمل حرکت ہے۔ مگر شیرازۂ قومی کو جمع رکھنے کے لیے ایک مذہب ٹھیرا لیا ہے کہ اس کے نام پر تمام قوم متحدہ و متفق رہے جیسا کہ آج کل ہم یورپ کی عیسائی قوموں کا حال دیکھتے ہیں۔''

جن لوگوں کے مفاد مشترک ہوتے ہیں ان کی دوستی کافی مضبوط ہوتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مضبوط مشترک معبود کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ کسی نظامِ حیات آئیڈیالوجی کے مضبوط پرستار ہوتے ہیں ان کی دوستی بھی بہت مضبوط ہوتی ہے اور اسی پر ان کا پورا معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ جس طرح ہندوؤں کی برہمن سوسائٹی تھی۔ اس سے نچلی سطح پر کسی انسان کی بلا چون و چرا اطاعت کرنے والے ایک معاشرہ بن جاتے ہیں جیسے فرعون کی قوم۔

یہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو کبھی فلاح نہیں ہوسکتی ہے جب تک وہ خدا کی رسّی کو مضبوط نہ پکڑ لیں۔ اسلام ہی وہ واحد قوت ہے جو مسلمانوں کو متحد رکھ سکتی ہے۔ دوسرے خداؤں پر مسلمانوں کا ایمان مضبوط ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ اگر خدانخواستہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں اور کوئی اور خدا بنالیں، مثلاً قومیت یا زبان تب آپس میں مضبوط اتحاد قائم ہوسکتا ہے جس کی کوشش کمال اتا ترک اور اس کے ساتھیوں نے

کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ ترکی سے اسلام ختم نہیں ہوسکا۔ غالبًا اس کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے کو نام کا مسلمان رکھا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○
(سورۃ العنکبوت، آیت، ۲۷)

اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلے) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی (بڑے درجے کے) نیک بندوں میں ہوں گے۔

نیک اعمال کا صلہ دنیا میں ملنا آخرت میں ملنے کے منافی نہیں ہے اور نہ کمال کے منافی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (سورۃ العنکبوت، آیت، ۴۸)

اور آپ اس کتاب سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے۔

گرچہ اس حال میں بھی شبہ کرنے والے مبطل ہی ''ہوتے ہیں کیوں کہ اعجازِ قرآنی پھر بھی دلالت علی النبوۃ کے لیے کافی تھا۔'' (کذا فی بیان القرآن) یہ معجزہ بہرحال اپنی جگہ پر ہے۔ ذوقاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ جو تمام مخلوقات کے

سردار ہیں اور اعلیٰ درجے کے معلمین میں پہلے نمبر پر ہیں، ان کی شانِ ارفع سے یہ بات بعید تھی کہ وہ کسی اور کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (سورۃ العنکبوت، آیت، ۵۸، ۵۹)

اور جولوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکّل کیا کرتے تھے۔

جس طرح کا بھی کام ہو دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے: (۱) صبر کی اور (۲) توکّل کی۔ اگر غیرمسلم کا بھی کوئی کام ہو تو اس کو صبر کرنے کی اور اپنے پروردگار پر یا جس کو بھی اپنا معبود سمجھتا ہو، اس پر بھروسے کی ضرورت ہے۔

یہاں صبر عن المعاصی علی الطاعات اور عند المصیبۃ والقتال سب کو عام ہے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کریں گے اچھا ہی کریں گے۔ صبر اور توکّل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، مثلاً کسی چیز کی خواہش ہوئی مگر اس کا جائز طریقے سے حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا صبر کیا اور سوچا کہ اللّٰہ تعالیٰ اس سے بہتر چیز عطا فرمائیں گے۔ اگر ایسا کیا تو ان شاء اللّٰہ تعالیٰ جلد یا بدیر اس کو اس صبر کا بہترین بدلہ مل جائے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ O (سورۃ العنکبوت، آیت ۶۳)

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک پڑی تھی تر و تازہ کردیا تو وہ لوگ بھی یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے، آپ کہیے کہ الحمدللہ بلکہ ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ دل کو زندہ کرتے ہیں۔ ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ الحمدللہ دل اور زبان سے کہتے رہنے سے دل پر انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے اور دل زندہ ہوجاتا ہے۔

الٓمّٓ O غُلِبَتِ الرُّوْمُ O فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ O فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ط لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ط وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ O بِنَصْرِ اللّٰهِ ط يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ O وَعْدَ اللّٰهِ ط لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O (سورۃ الروم، آیت ۱-۶)

الم، اہلِ روم ایک قریب کے موقعے میں مغلوب ہوگئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لے کر نو سال تک کے اندر اندر غالب آجاویں گے پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا اور پیچھے بھی اور اس روز مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے، وہ جس کو چاہے غالب کردیتا ہے اور وہ زبردست ہے رحیم ہے اس نے وعدہ فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

قوموں کا عروج و زوال اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی

مصلحت سے کبھی مسلمانوں کی مخالف قوتوں کو غلبہ عطا فرماتے ہیں پھر بعد میں ان کے موافقین کو۔ اس عروج و زوال کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی پر مبنی نہیں کہا جاسکتا۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ (سورۃ الروم، آیت، ۷، ۸)

یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں کیا انھوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعادِ معین کے لیے پیدا کیا ہے اور بہت سے آدمی اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں۔

مومن کو ظاہری چمک دمک سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ اگلی آیت سے یہ پتا چلتا ہے کہ جو لوگ ظاہر سے مرعوب ہوجاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں غور وفکر نہیں کرتے اور مثال سے بے فکر ہیں کیوں کہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔

جو غیر مومن ہیں اور دنیاوی طور پر عاقل سمجھے جاتے ہیں وہ بھی حیاتِ دنیوی کی صرف ظاہری باتیں جانتے ہیں اور دنیاوی زندگی میں بھی یہ نہیں جانتے کہ پسِ پردہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کے گناہ کسی طرح ان کا دنیاوی سکون برباد کر رہے ہیں اور کس طرح ان کا قوم معاشرتی اور معاشی بدحالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جو دنیاوی ترقی ہو رہی ہے وہ بھی دراصل ترقی ہے یا نہیں؟ اگر اس کا کبھی کبھی ادراک ان کو ہوا بھی ہے تو بہت سرسری اور اس کا علاج ان کے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ خالقِ کائنات کی دی

ہوئی ہدایت سے محروم ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے تجربے اور اپنی عقل سے کوئی علاج کیا بھی تو چند برسوں کے بعد پتا چلا کہ یہ علاج نہیں تھا۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ○ (سورۃ الروم، آیت ۲۲)

اور اسی کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کا بنانا ہے اور تمھارے لب و لہجے اور رنگوں کا الگ الگ ہونا ہے اس میں دانش مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اور یہ اختلافات باعثِ نزاع نہیں ہوسکتے کیوں کہ مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔ اگر گورے کو کالے پر فوقیت عقلاً بھی درست ہوتی تو سب ایک دوسرے سے لڑتے رہتے کیوں کہ پھر زبان کے فرق سے بھی آدمی کی پوزیشن میں فرق آجاتا۔

ومِنْ اٰیٰتِہٖ منامُكُمْ بالَّیْلِ وَالنَّھارِ وابتِغآؤُكُم مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذلک لاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○ (سورۃ الروم، آیت ۲۳)

اور اسی کی نشانیوں میں سے تمھارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اسی کی روزی کو تمھارا تلاش کرنا ہے اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔

آیت ۲۰ تا ۲۵ ہر آیت ''ومن اٰیٰتہٖ'' سے شروع ہوتی ہے۔ ہر آیت ایک ایسی شان کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ابھی تک انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر ہے اور قیامت تک انسان کے ارادہ و اختیار سے باہر رہے گی۔ قیامت تک انسان ان باتوں

کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے بلاشرکتِ غیرے محتاج رہے گا۔ مٹی سے چلتے پھرتے انسان کا بنانا، مرد عورت کا بنانا اور ان دونوں کے درمیان فطری الفت اور محبت پیدا کرنا، آسمانوں کی تخلیق اور زبان اور رنگ کا اختلاف، نیند آجانا، رزق کی تلاش میں دوڑ دھوپ کی طاقت۔ بارش ہونا اور آسمان زمین کا قائم رہنا اور باوجود اتنے ڈیم بنانے، نہر بنانے کے باوجود انسان کا بادل اور بجلی دیکھ کر اب بھی خوف وطمع کے درمیان رہنا۔ یہ سب اس کی لاچارگی کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنوعی آب پاشی کے سارے کرشمے کافور ہوجاتے ہیں اگر چند سالوں تک بارش نہ ہو۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الروم، آیت، ۳۰)

سو تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہیے پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تمام انعامات گنوانے کے بعد اللہ تعالیٰ دینِ حنیف کی طرف بلاتے ہیں جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے، یعنی جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں سب سے فائدہ اٹھانا، مخلوقات کے سامنے سر نہ جھکانا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے کو عاجز سمجھنا اور اس سے مانگتے رہنا اور امید رکھنا۔ یہ انسانی فطرت ہے جو کبھی بھی نہیں بدلے گی۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O

(سورۃ الروم، آیت، ۳۸)

پھر قرابت دار کو اس کا حق دیا کر اور مسکین اور مسافر کو بھی یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللّٰہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

کئی باتیں یہاں سے معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ ان لوگوں کے حقوق ہیں اور اگر ان کو دیا تو کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر نہ دیتے تو ظلم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ دینا خدا کی رضا کے لیے ہے تو ان کے لیے خیر ہے۔ تیسرے یہ کہ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اس بات کی مزید توثیق اگلی آیت میں ہے جو ربا کے متعلق ہے کہ ایسا مال جو اللّٰہ کے نزدیک نہیں بڑھتا جو روپے سے روپے کمانے کے لیے (یعنی سود پر) دیا جائے بلکہ جو اللّٰہ کے لیے دیا جائے اس کا اجر کئی گنا زیادہ ہے۔ اس سے اگلی آیت میں اللّٰہ تعالیٰ کی وحدانیت (پیدا کرنے میں، رزق دینے میں، موت دینے میں اور دوبارہ زندہ کرنے میں) کا استحضار کرایا جارہا ہے تا کہ اس کی رضا کے لیے اقربا اور مساکین کا حق خوش دلی سے ادا ہوسکے۔ اور اس سے اگلی آیت ظھر الفساد... الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو دنیا میں فساد پھیل جائے گا۔

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ O (سورۃ الروم، آیت، ۳۹)

اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجاوے تو یہ اللّٰہ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ دو گے جس

سے اللہ کی رضاطلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے پاس
بڑھاتے رہیں گے۔

مال کا خرچ فائدہ اٹھانے کے لیے جو کیا جاتا ہے اس کی تین شکلیں ہیں:
(۱) اس امید پر مال دینا کہ وہ دوسروں کے مال میں مل کر بڑھ جائے، یعنی تجارت کوئی اور کر رہا ہے، رسک یعنی خطرہ کوئی اور لے رہا ہے اور تجارت سے مال میں صرف اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ یہی سود پر روپیہ دینا ہے۔ اس سے یقیناً یہاں تجارتی سود مراد ہے کیوں کہ اگر قرض گھر کا خرچ چلانے کے لیے دیا جائے ہو تو دوسرے کے مال میں مل کر بڑھنے کی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ (۲) روپیہ تجارت میں یا زراعت میں لگانا (۳) روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا جس کے سرِفہرست زکوٰۃ ہے تاکہ آخرت میں فائدہ ہو۔ اس آیتِ کریمہ میں (۱) کے متعلق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یعنی درحقیقت نہیں بڑھتا انفرادی طور پر بعض لوگوں کی آمدنی بڑھ جاتی ہے لیکن اس کا وبال جو آخرت میں ہوگا اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور اجتماعی طور پر ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے۔ تو ظاہری طور پر بھی مال کچھ نہیں بڑھا۔ موجودہ ''ترقی یافتہ'' اور ''ترقی پذیر'' ممالک کے معاشرے پر سود کے نقصانات کا بار بار مشاہدہ ہوچکا ہے، مثلاً جب بینک اپنے سود کی شرح میں اضافہ کرتے ہیں تو تھوڑے ہی دنوں میں قیمتوں میں زیادتی ہوجاتی ہے اور افراطِ زر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ بعض ممالک میں قیمتوں میں اضافہ اور اس کی وجہ سے شرحِ سود میں اضافہ اور پھر اس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافے کا ایسا چکر آجاتا ہے کہ اس سے نکلنا محال معلوم ہوتا ہے، مثلاً گزشتہ کئی سالوں سے ترکی میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

بالکل اس کا الٹا حال (۳) کا ہے۔ زکوٰۃ اگر صحیح طور سے ادا کی جائے تو اس سے معاشرے میں فلاح و بہبود آتی ہے۔ ضرورت کی چیزوں پر خرچ بڑھ جاتا ہے جس کے اثر سے ان کی پیداوار میں لوگ اضافہ کرتے ہیں۔ معاشرے میں ایسے لوگوں کی

تعداد بڑھتی ہے جو تھوڑی سی خارجی امداد سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور معاشرے پر بوجھ بنے رہنے کی بجائے اس کی پیداوار اور آمدنی میں اضافہ کرنے والے بن جاتے ہیں۔ طبقاتی کش مکش میں کمی آتی ہے۔ زکوٰۃ دینے والوں کے دل سے مال کی محبت کم ہوتی ہے اور اکثر وبیش تر ان کے مال میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ سب اس شکل میں ہے کہ اس سے اللہ کی رضا طلب کی جائے۔ اگر کسی اور مقصد سے زکوٰۃ کے نظام کو اپنایا جائے تو بسا اوقات وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا اور آخرت میں تو کچھ بھی بدلہ ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا ہے۔ آخرت میں زکوٰۃ دینے والوں کو اصل میں کئی گنا منافع ضرور ہی ملے گا۔

غرض (۲) کے لیے مال خرچ کرنے کا یہاں ذکر نہیں ہے۔

یہاں جو ''اللہ کے نزدیک'' فرمایا گیا ہے اس کا مطلب ہے ''درحقیقت'' جو نتیجہ بالآخر نکلے گا، (In the ultimate analysis) برخلاف ظاہری نتیجے کے جیسے وہ میٹھا شربت جس میں ہلکا زہر ملا ہوا ہو کہ بالآخر اس کا نتیجہ موت یا شدید بیماری کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ نتیجۂ اجل برخلاف نتیجۂ عاجل۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ O (سورۃ الروم، آیت، ۴۱)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ باز آجاویں۔

یہ بات متحضر رکھنا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے اور اسی میں خیر ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا استحضار کہ جو بھی پریشانی یا تکلیف ہمیں پہنچتی ہے وہ ہمارے ہی ہاتھ کی لائی ہوئی ہے دونوں کا بیک وقت استحضار بہت

مشکل کام ہے۔ برائی کو اپنی طرف منسوب کرنا کہ یہ ہمارے کسی گناہ یا غفلت کی سزا ہے اور اچھائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ محض اس کا فضل ہے اور ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ ہے اس کا بھی استحضار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ بار بار ایسا کرتے رہنے سے اور بار بار اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچتے رہنے سے اس کی عادت ہوجاتی ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنے کا ایک نسخہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ سمجھے کہ یہ سزا ہمارے عمل پر مرتب فرمائی ہے تاکہ ہم توبہ کریں (اور یہ ایک موقع اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی رضا حاصل کرنے کا ملا)۔ بحمد اللہ اُس آیتِ کریمہ سے اس آیتِ کریمہ کی تصدیق ہوگئی کہ زمین میں جو فساد پھیل گیا ہے وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائیں شاید کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی طرف آئیں۔

ہر برے عمل کی سزا دنیا میں نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ اس کا اثر قلب پر سیاہی کی شکل میں ہوتا ہے اور بعض دفعہ معاف بھی ہوجاتی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِھِمْ فَجَآءُوْھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

(سورۃ الروم، آیت، ۴۷)

اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر ان کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل لے کر آئے سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکبِ جرائم ہوئے تھے اور اہلِ ایمان کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا۔

انتقام دشمنوں سے دوستوں کی نصرت ہے۔ گرچہ ہمیشہ فوراً انتقام نہیں لیا گیا۔ کبھی کبھی بہت ڈھیل دی گئی اور پے در پے رسول ﷺ بھیجے گئے اور بہت سے شہید کیے گئے۔ اگر فوراً انتقام لے لیا جاتا تو وہ قوم ہی نیست و نابود ہوچکی ہوتی۔ اور کبھی فوراً

انتقام لے لیا جاتا ہے جیسا اصحابِ اخدود کے ساتھ ہوا لیکن مومنوں کی مدد ہمیشہ ہوتی رہی، خواہ انتقام کی شکل میں خواہ کسی اور شکل میں۔

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(سورۃ الروم، آیت، ۵۰)

سو رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے کچھ شک نہیں کہ وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اس سے قبل والی دو آیات میں بارش کا ذکر تھا جس سے زمین زندہ ہوتی ہے اور اسی زندہ کرنے کو رحمت کہا گیا ہے۔ اس سے ایک تو موت کے بعد زندگی کا ثبوت ملتا ہے جو اس آیت میں درج ہے۔ دوسرے اشارہ اس بات کی طرف ملتا ہے کہ موت کے بعد زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کیوں کہ دنیا کا کارخانہ ہی اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ ہر شخص کو پوری جزا اس کے اچھے برے اعمال کی نہیں مل سکتی۔ اگر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہیں ہوتی تو مومنین صالحین کے لیے یہ بڑی حوصلہ شکن بات ہوتی۔ واقعی اگر دوسری زندگی نہیں ہوتی تو دنیا میں اتنا فتنہ و فساد رہتا کہ زندگی اجیرن ہوجاتی۔

مومنین کے لیے تو آخرت کی زندگی نعمت اور رحمت ہے ہی، مشرکوں کو جہنم میں بھیجنا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ واسعہ اور اس کی حکمت پر مبنی ہے جس کا کئی جگہ ذکر سورۂ رحمٰن میں ملتا ہے۔

الٓمّٓ ۝ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ۝ ھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّلْمُحْسِنِیْنَ۝الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ (سورۂ لقمان، آیت، ۱۔۵)

الم، یہ آیتیں ایک پُرحکمت کتاب کی ہیں جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیک کاروں کے لیے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں یہ لوگ اپنے رب کے سیدھے راستے پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے ہر وقت عبدیت کا رشتہ استوار کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اس رشتے کی وجہ سے جو ان پر بندوں کا حق بنتا ہے اس کو ادا کرتے رہتے ہیں اور اپنے معاملات میں ہر وقت آخرت کی جزا و سزا کا خیال رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کامیابی یقینی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ۝ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۝ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ ۚ حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّ فِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ۝ (سورۂ لقمان، آیت، ۱۲۔ ۱۹)

اور ہم نے لقمان کو دانش مندی عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا بے شک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق

تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

شیخ الہندؒ نے حکمت کا ترجمہ عقل مندی کیا ہے اور ان اشکرللّٰہ کا ترجمہ کیا ہے ''حق مان اللہ کا۔'' کسی کا حق ماننے کے بعد ہم خود بخود اس کے شکر گزار ہوتے ہیں دراصل حق ماننا ہی شکر گزاری ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے جو نصیحتیں اپنے بیٹے کو کیں وہ یہ تھیں:

(۱) شرک مت کرو کیوں کہ شرک تمام ناشکری کی جڑ ہے۔

(۲) والدین کا شکر ادا کرنا ضروری ہے کیوں کہ واسطے کا شکر ادا کرنا منعم ہی کا شکر ہے۔

(۳) اتبع سبیل... شکر انابت کو مقتضی ہے تو تم سے پہلے جو منیب ہیں ان کی پیروی کرنا شکر ہے۔

(۴) تا (۷) نماز، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور صبر۔

(۸) لا تصعر خدک، (۹) لاتمش فی الارض مرحا

(۱۰) واقصد فی مشیک (۱۱) واغضض من صوتک

یہ چاروں باتیں تکبر کی ہیں جن سے دور رہنے کو فرمایا ہے کیوں کہ تکبر شکر کا الٹا ہے جو شکر کرے گا اور نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے گا وہ ان باتوں سے یقیناً دور رہے گا۔

شکر قلب کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ اعضا و جوارح سے شکر ادا ہوتا ہے لیکن زبان اور قلب سے بھی آدمی شکر ادا کرتے رہنے کی عادت ڈال لے تو عمل سے بھی شکر ادا کرنے کی توفیق ہوجاتی ہے۔

سبحان اللہ، اللہ تعالیٰ کتنے شکور ہیں کہ ادھر حضرت لقمان علیہ السلام اپنے

لڑکے کو شکر ادا کرنے کی تلقین اور شرک (جو شکر کا الٹا ہے اس) سے بچنے کی تلقین کر رہے ہیں اور ادھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو والدین کا شکر ادا کرنے کا حکم فرما رہے ہیں۔

جس طرح فطرتِ سلیمہ کا تقاضا توحید ہے اسی طرح فطرتِ سلیمہ کا تقاضا فشکر ہے۔ اور حضرت لقمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ بڑی حکمت کی بات سکھائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور جو شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے۔ شکر سے آخرت کے علاوہ دنیا میں جو انسان کو فائدے پہنچتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید نعمتیں پہنچتی ہیں کیوں کہ اس کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کے بعد زندگی کی کوئی صعوبت مصیبت نہیں رہتی۔

از محبت تلخہا شیریں شود

(۳) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔

(۴) قناعت کی لذت ملتی ہے جو بھی عطا ہوتا ہے اس میں ایک خاص لذت ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے کفرانِ نعمت کرنے والے کو اچھی سے اچھی نعمت بھی معمولی معلوم ہوتی ہے۔ اور بہت کچھ ملنے پر بھی زیادہ کی ہوس ہوتی ہے۔

(۵) زندگی پُر عافیت ہوجاتی ہے۔

(۶) شکر ادا کرنے والے سے گناہ بہت کم صادر ہوتے ہیں خصوصاً تکبر، حسد، حرص و ہوس، اسراف اور بخل وغیرہ جیسے مہلک امراض سے نجات رہتی ہے۔

آیت ۱۴ میں تصریح ہے کہ واسطہ فی النعمۃ کا شکر بھی۔ (ماخوذ از افاضات الیومیہ)

مثل شکر منعم کے مطلوب ہے۔ (مسائل السلوک)

وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ
فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ
اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O

(سورۂ لقمان، آیت، ۱۵)

اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھیرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو تو ان کا کچھ کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

اس آیتِ کریمہ میں والدین کے ساتھ نیک سلوک کے حدود بتائے گئے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ایک اصولی بات بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا اتباع کرو جو ہمارا مطیع ہو۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضورﷺ سے بڑھ کر تو کوئی تھا نہیں، تو آپﷺ کو حکم ہوا اتباعِ وحی کا اور صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر حضورﷺ ہیں اس لیے انھیں حکم ہوا کہ حضورﷺ کا اتباع کریں۔ فاتبعونی یحببکم اللہ ... پھر علما کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آکر عوام کو حکم ہے علما کے اتباع کا۔ چنانچہ حکم ہے واتبع سبیل من اناب الی۔“

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَکُمْ مِّنْ
اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ O وَاِذَا غَشِیَهُمْ
مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی
الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ
کَفُوْرٍ O (سورۂ لقمان، آیت، ۳۱،۳۲)

اے مخاطب کیا تجھ کو یہ (دلیل توحید کی) معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے تاکہ تم کو اپنی نشانیاں دکھلائے اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک ایسے شخص کے لیے جو صابر و شاکر ہو اور جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے سو بعضے تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیتوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بدعہد اور ناشکر ہیں۔

تفسیرِ ابنِ عباسؓ میں ہے (صبار) علی الطاعۃ (شکور) اللہ۔

صبر طاعت پر استقامت کو کہتے ہیں اور اس راہ میں جتنی مشکلات اور شدائد پیش آئیں ان کو خوشی خوشی جھیل لینا ہی صبار کی نشانی ہے جو یقیناً شکور بھی ہوگا کیوں کہ محبت کے دو پہلو ہیں جلال و جمال۔ ایک صبر کا متقاضی ہوتا ہے دوسرا شکر کا۔

صبار اور شکور ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ اسی طرح کفور اور ختار میں ایک خاص رشتہ ہے صبار کے بالمقابل ختار تھے (اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ''قول کے جھوٹے'' کیا ہے) اور شکور کے بالمقابل کفور ہے۔

آیت ۳۲ سے معلوم ہوا کہ شکر گزاروں کو ''مقتصد'' کہا گیا ہے، یعنی شکر گزاری کی کوئی حد نہیں ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

شکر ہی ایسی نعمت ہے جو موت کے بعد بھی ملتی رہے گی۔ اور صحیح معنوں میں شکر گزار بندہ بننے کے لیے بہت زیادہ صبر کرنے کی ضرورت ہے۔ صبر عن المعاصی اور صبر علی الطاعۃ کا تو ہر وقت مطالبہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ صبر فی الباسا والضراء کا بھی موقع آتا رہتا ہے۔ اگر آدمی ان تمام معاملات میں صبر پر قائم رہے تو یہی شکر ہے۔ یوں تو ہر صفتِ حمیدہ دوسری صفتِ حمیدہ سے کسی نہ کسی درجے میں منسلک ہے کیوں کہ یہ شجرۂ طیبہ کے پھل ہیں لیکن ان تمام صفات میں شکر کا مقام سب سے بلند معلوم ہوتا ہے اس لیے سورۃ الفاتحہ الحمد سے شروع ہوتی ہے۔ اور اسی آیت میں شکر کے بالمقابل کفر کا لفظ

ہے گویا شکر ایمان ہی کا دوسرا نام ہے۔ نیز شکر سے محبت پیدا ہوتی ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے الا لا ایمان لمن لا محبۃ لہ۔

ان آیاتِ کریمہ میں کشتی کے سفر اور امواجِ حوادث میں گھر جانے والے دو گروہوں کا ذکر ہے، ایک گروہ صابرین و شاکرین کا ہے دوسرا جھوٹوں اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کا ہے جو یہ بھول جاتے ہیں کہ جب وہ گرداب میں تھے تو کتنی دعا اس سے نکلنے کی مانگ رہے تھے۔ شکر گزار لوگ عین عالمِ ابتلا میں دعا بھی کرتے ہیں اس سے نکلنے کی اور مصیبت کو من جانب اللہ سمجھ کر صبر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر حال میں اپنے کو اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں گھرا ہوا دیکھ کر شکر بھی کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ○

(سورۃ لقمان، آیت، ۳۳)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کردے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے سو تم کو دنیاوی زندگانی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ تم کو دھوکا باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈالے۔

اور یہ جو آیا ہے کہ بعض حالات میں اولاد اپنے والدین کو بخشوائے گی مثلاً حافظ لڑکے کے والدین۔ یہ سب ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ثمرات ہیں۔ بچے کو قرآن شریف حفظ کرانا والدین کا عملِ صالحہ اور صدقۂ جاریہ ہے تو گویا ان کو اس کا فائدہ ہوگا۔ محض صلبی رشتے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍO
(سورۃ السجدہ، آیت، ۷)
جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔

آیت دال ہے اس پر کہ مخلوق فی حد ذاتہٖ حسن ہے حتیٰ کہ صفت کبر و بخل بھی جب اپنے محل میں استعمال کیے جائیں۔ کما قیل:

بسا امساک کز انفاق بہ
مال حق را جز بہ امر حق مدہ

وقیل التکبر مع المتکبر عبادۃ۔ اور خرد سوء استعمال کے سبب ہے۔ البتہ مکسوب بعضے قبیح محض ہیں جیسے کفر و معاصی۔ (مسائل السلوک)

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَO فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ج جَزَآءً م بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَO (سورۃ السجدہ، آیت، ۱۶، ۱۷)
ان کے پہلو خواب گاہوں سے علاحدہ ہوتے ہیں اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانۂ غیب میں موجود ہے یہ ان کو ان کے اعمال کا صلہ ملا ہے۔

اس سے پہلے ذکر تھا کہ مومنین اپنے رب کے سامنے کس طرح سجدے میں گر پڑتے ہیں اور ذکر ہے ان مشاغل کا کہ رات بھر ان کے پہلو بستر سے نہیں لگتے اور اپنے رب کو خوف و طمع سے پکارتے رہتے ہیں۔ یہ خوف اپنے رب کی ناراضگی کا خوف ہے۔ اور یہ طمع اپنے رب کی خوشنودی کی طمع ہے اور ان دونوں کا جمع ہوجانا محبت

کی علامت ہے۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا گویا اپنے محبوب کی خدمت میں چھوٹے تحائف پیش کرنا جن کی ویسے تو کوئی قیمت نہیں لیکن محبت کی وہاں قدر ہے۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اس کے لیے بہت سی نعمتیں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں وہ ایسی ہیں جنھیں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا اور اعلیٰ ترین جزا محبوب کا دیدار ہے۔ وہ محبوب ایسا ہے کہ نور اس کا پردہ ہے۔ حجابہ نور۔ کتنی محبوبیت ہے اس وعدے میں!

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ O (سورۃ السجدہ، آیت، ۱۸)

تو کیا جو شخص مومن ہوگیا وہ اس شخص جیسا ہوجاوے گا جو بے حکم ہو، وہ آپس میں برابر نہیں ہوسکتے۔

یہ اور اس کے بعد کی آیتیں بھی اسی محبوبیت کا اظہار ہیں۔ بھلا وہ جو دن رات اس کی محبت میں مبتلا ہیں وہ ان کے برابر ہیں جو اسے بھلائے ہوئے ہیں؟

تتجافی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ O (سورۃ السجدہ، آیت، ۱۶)

ان کے پہلو خواب گاہوں سے علاحدہ ہوتے ہیں اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔

یہ انھیں مومنین محبین کے لیے ہے۔ اس سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ ڈاکٹر عبدالحیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑا اچھا نسخہ بتایا ہے کہ اگر رات کو آنکھ کھل جائے اور

کچھ اور کرنے کی ہمت نہ ہو تو اٹھ کر بیٹھ جایئے اور تین مرتبہ کہہ لیجیے استغفر اللہ، استغفراللہ، استغفراللہ اور پھر سو جایئے تو آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوجائے گا جن کے متعلق فرمایا گیا ہے تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع... یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔ ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ اگر آپ نے تین مرتبہ بھی یہ کہہ دیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے اس منادی (جس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتے سے ندا دلواتے ہیں کہ ہے کوئی ہم سے مانگنے والا جسے ہم دیں، ہے کوئی اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والا جس کے ہم گناہ معاف کریں اس) کی آواز پر لبیک کہا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ (سورۃ الاحزاب، آیت ۴)

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور تمھاری ان بیبیوں کو جن سے تم ظہار کرلیتے ہو تمھاری ماں نہیں بنا دیا اور تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارا (سچ مچ کا) بیٹا نہیں بنا دیا یہ صرف تمھارے منھ سے کہنے کی بات ہے اور اللہ حق بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے آخری ٹکڑے سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ سچی بات خود ہدایت کرتی ہے صحیح راستے کی طرف۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاۗءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا

تعملُوْنَ بَصِیْرًاO اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ
وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ
الظُّنُوْنَاO (سورۃ الاحزاب، آیت، ۹، ۱۰)

اے ایمان والو اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج بھیجی جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھی اور اللہ تمھارے اعمال کو دیکھتے تھے جب کہ وہ لوگ تم پر آ چڑھے تھے اوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منھ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔

ظن کے مختلف درجات ہیں۔ ادنیٰ درجہ سرسری خیال کا ہے جو دماغ میں غیر اختیاری طور پر آ جاتا ہے جس میں یقین کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا جس طرح کافروں کا قول ہے ان نظن ... بمستیقنین اور ظن کا یہ درجہ بالکل مضر نہیں، بلکہ بعض مواقع پر اس کو صریح ایمان کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے سورۂ یوسف میں جو ظنوا... کذبوا آیا ہے اس میں کچھ اشکال نہیں۔ کیوں کہ ایسے موقع پر جب کلیجا منھ کو آتا ہو اس طرح کا خیال گزرنا یا وسوسہ آنا ایمان کے منافی نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی منکرین بعث کے... الاظنا... بمستیقنین کے بارے میں فرمایا ہے کہ ظاہر ہے ان کو اس کا احتمال بھی نہیں تھا چہ جائے کہ احتمالِ راجح، بلکہ وہ اس کو اپنے زعم میں علمِ صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا۔ بس ثابت ہوا کہ اصطلاحِ قرآن میں ظن عام ہے امورِ باطلہ کو بھی۔ (معارفِ حکیم الامت، صفحہ ۱۷۰)

اَشِحَّةً عَلَیْکُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ
تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ

الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۱۹)

تمھارے حق میں بخیلی لیے ہوئے سو جب خوف پیش آتا ہے تو ان کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو پھر جب وہ خوف دور ہوجاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں مال پر حرص لیے ہوئے یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو ان کے تمام اعمال اللہ نے بیکار کر رکھے ہیں اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے۔

خوف کا ایک درجہ طبعی ہے۔ البتہ حد سے گزر جانا کفر اور نفاق کی نشانی ہے جو لوگ طبعی خوف پر قابو پا گئے اور صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹے، مثلاً جہاد میں خوف کے باوجود کفار سے لڑتے رہے، ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس سے مغلوب ہوگئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ان پر ملامت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہی ڈنڈے کے اژدھا بن جانے سے ڈر جانا ثابت کرتا ہے کہ طبعی خوف کمالِ ایمان کے منافی نہیں۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ؗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝

(سورۃ الاحزاب، آیت،۲۲)

اور جب ایمان داروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ و رسول (ﷺ) نے خبر دی تھی اور اللہ و رسول (ﷺ) نے سچ فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان اور اطاعت میں اور ترقی ہوگئی۔

یہ آیت مومنین کے اصل ردِعمل کو بتاتی ہے۔ قدرتی عوامل اور ان پر اعصاب

کا غیر اختیاری عمل مومنوں اور کافروں پر یکساں ہوتا ہے۔ اختیاری ردِعمل میں فرق ہوتا ہے۔ مومنوں کا جب کافروں کی فوج سے مقابلہ ہوتا ہے تو ان کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے کہ یہی ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ برعکس کافروں کے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب موت آ پہنچی۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(سورۃ الاحزاب، آیت،۲۳)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

یہ وہی عشق ہے جو قتال فی سبیل اللہ پر آمادہ کرتا ہے پھر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے کہ وہ قتل کریں یا خود قتل ہوجائیں۔

مومنوں سے جو عہد لیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ جب دشمن بالمقابل ہو تو پیٹھ پھیر کر نہ بھاگیں ''لایولون الادبار'' جو اس سورت میں آیت ۱۵ میں ہے۔ تو جو شہید ہوئے وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے اور جو بچ گئے یا جنھیں ابھی تک جہاد میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا ہے، وہ انتظار میں ہیں کہ کب اس کا موقع آئے اور وہ جان دے کر سرخرو ہوں۔ اور لشکرِ اسلام کی بے بضاعتی یا کفار کی زبردست فوج اور ساز و سامان کی فراوانی دیکھ کر ان کے ارادے میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اس آیتِ کریمہ میں سچے لوگوں کی جو پہچان ہے وہ واضح ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی تیاری اور اس کا انتظار ایمان کی نشانیوں میں سے ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں جھوٹوں کی سزا سنائی گئی ہے۔

لِّیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا O وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا ؕ وَکَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ قَوِیًّا عَزِیْزًا O وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا O وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَهُمْ وَدِیَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا O (سورۃ الاحزاب، آیت،۲۴۔ ۲۷)

یہ واقعہ اس لیے ہوا تاکہ اللّٰہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے بے شک اللّٰہ غفور رحیم ہے اور اللّٰہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصے میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی کچھ مراد بھی پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللّٰہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے آپ ہی کافی ہوگیا اور اللّٰہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے اور جن اہلِ کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمھارا رعب بٹھا دیا بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کرلیا اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور (ایسی زمین کا بھی) جس پر تم نے قدم نہیں رکھا اور اللّٰہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

یہاں سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ توبہ میں جن تین صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ اجمعین کا ذکر ہے اور پھر آگے کونوا مع الصادقین کا حکم ہے تو ان تین بزرگوں کو بھی جنھوں نے سچی توبہ کرلی۔ اللّٰہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے صادقین میں شامل فرما لیا یعنی ان لوگوں نے جنھوں نے واقعی جہاد میں شرکت کی۔

آیت ۲۴ سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ اللّٰہ تعالیٰ اگر چاہیں تو منافقوں کو بھی بخش دیں گے۔ اسی سورۂ کریمہ کی آخری آیت میں مشرکوں پر عذاب سے پہلے منافقوں پر عذاب کا ذکر ہے، بلکہ غالباً یہاں یہ مراد ہے کہ اگر اللّٰہ چاہے گا تو ان کو

توبہ کی توفیق عطا فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں توبہ کی توفیق عطا فرما دیں۔

آیت ۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے کفی اللہ المومنین القتال فرما کر مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اور آیت ۶ میں فتح کی خوش خبری سنائی جارہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۲۸، ۲۹)

اے نبی (ﷺ) آپ اپنی بیبیوں سے فرما دیجیے کہ تم اگر دنیوی زندگی (کا عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال و متاع (دنیوی) دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسولوں کو اور عالم آخرت کو تو تم سے نیک کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

ان دو آیتوں میں بھی تصریحاً دو باتوں میں سے ایک بات کا اختیار دیا گیا ہے۔ alternatives حیات الدنیا چاہنا یا حیاۃ الآخرۃ چاہنا۔ آخرت کے ساتھ اللہ اور رسول کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کو اختیار کرنا اور آخرت کو اختیار کرنا ایک ہی چیز ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ اور رسول ﷺ کو بھی چاہا جائے اور حیاتِ دنیا بھی چاہی جائے۔ جیسا آیت ۲۳ میں تصریحاً ذکر ہے۔ (من قضی نحبہ...) البتہ دنیا کا حاصل ہوجانا جب کہ یہ مقصود نہ ہو مومنوں کے لیے بھی ثابت ہے جیسا آیات ۲۵ تا ۲۷ سے ظاہر ہے۔ اجر ان کا اللہ کی رضا ہے اور دنیا اللہ تعالیٰ کا مزید فضل ہے جو ان کو مل گئی تھی۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْہَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَہَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِہِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْہُنَّ وَطَرًا ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا ۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۳۷)

اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بی بی (زینبؓ) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور خدا سے ڈر اور آپ اپنے دل میں وہ (بات بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں (کے طعن) سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے سزا وار ہے پھر جب زیدؓ کا اس سے جی بھر گیا ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیبیوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے، جب وہ (منھ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی۔

حضورﷺ کی شان میں ارشادِ باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے... ''مگر ساتھ ہی خیال تھا طعنِ عوام کا۔'' اس ناچیز کے خیال میں یہ خیال بھی شفقت علی الناس کی وجہ سے تھا کہ کہیں شیطان انھیں اس بہانے گمراہ نہ کردے اور اگر مسلمانوں میں سے کسی کے دل میں اعتراض ہوتا تو ہوسکتا ہے یہ بالآخر اس کی ہلاکت کا باعث بن جاتا۔ اگر اس خیال سے کوئی بھی اللہ کا مقرب بندہ کہتا کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو تو اجر کا مستحق ہوتا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح منظور تھا جس کی ایک بڑی مصلحت بیان فرما دی اس لیے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ محترمہ کو طلاق دے دی۔ غالبًا یہ تکوینی بات حضورﷺ کو پہلے ہی بتا دی گئی تھی جس کو آپﷺ نے لوگوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔ اور یہ بات اس وقت تک پوشیدہ رہی جب

تک تشریعی طور پر حضور ﷺ کو نکاح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہ بات کہ حضور ﷺ نے اس تکوینی بات کو لوگوں کے ڈر سے بیان نہیں کیا جیسا عام طور سے لوگ دوسروں کے طعن سے ڈرتے ہیں، اگلی آیتِ کریمہ سے ثابت ہوتی ہے جس میں اللّٰہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللّٰہ کی رسالت کی ذمہ داری ادا کرنے والے ہیں وہ اللّٰہ سے ڈرتے ہیں اور اللّٰہ کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرتے... ولا یخشون احدا الا اللّٰہ۔

اس آیت میں یہ طرزِ تخاطب اس لیے اختیار فرمایا گیا کہ اللّٰہ تعالیٰ نے بعض مرتبہ حضور ﷺ کو بہت زیادہ نرمی اور شفقت سے روکنا چاہتے تھے کیوں کہ آپ ﷺ قیامت تک کے لیے مطاع بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس طرح کی نرمی کی پیروی لوگوں کے لیے لازم ہوجاتی جس کی وجہ سے کئی مصالح فوت ہوجاتے۔ چنانچہ اللّٰہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جن کو حضور ﷺ کھانے پر بلاتے تھے اور وہ کھانے کے بعد دیر تک بات چیت کرتے رہتے تھے جس سے حضور ﷺ کو اذیت پہنچتی تھی (گو معمولی سی) ان کو اس بات سے منع فرمایا... ان ذلکم کان یؤذی النبی فیستحی منکم واللّٰہ لا یستحی من الحق... اس طرزِ تخاطب سے قرآن شریف کا منزل من اللّٰہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ ط سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ط وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۳۸، ۳۹)

اور ان پیغمبر ﷺ کے لیے جو بات (تکویناً یا تشریعاً) خدا تعالیٰ نے مقرر کردی تھی اس میں ان پر کوئی الزام نہیں، اللّٰہ تعالیٰ نے ان (پیغمبروں) کے حق میں (بھی) یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہوگزرے ہیں اور اللّٰہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے یہ سب (پیغمبرانِ گزشتہ) ایسے تھے کہ

اللہ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور (اس باب میں) اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

تبلیغِ دین علما پر خصوصاً اور مسلمانوں پر بطور فرضِ کفایہ واجب ہے اور جو لوگ تبلیغِ رسالت کا فرض ادا کریں ان کے لیے یہ خصوصیت اپنے اندر پیدا کرنا ضروری ہے جو یہاں بیان فرمائی گئی یعنی وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ اور آیت ۳۸ جو حرج کا لفظ ہے وہ غالبًا اس لیے ہے کہ خواہ معاشرے میں کوئی چیز کتنی ہی معیوب سمجھی جاتی ہو اگر خدا کا حکم اس کے کرنے میں ادا ہوتا ہے تو معاشرے کی بالکل پروا نہیں کی جائے گی (عربوں میں لے پالک کی مطلقہ سے نکاح کرنا بہت برا سمجھا جاتا تھا) اور تقریباً ہر زمانے میں معاشرے کے عائد کردہ قیود میں اور دین کے حدود میں کہیں نہ کہیں تضاد رہا ہے، مثلاً دو تین شادیاں کرنا یا مطلقہ یا بیوہ کا نکاح کرنا ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے میں برا سمجھا جاتا تھا اور اب بھی معیوب سمجھا جاتا ہے تو جو معاشرے سے ڈر گیا اس کے ایمان میں کم زوری آ گئی۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۝ (سورۃ الاحزاب، آیت ۴۰)
محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک تو اس بات کی پیشین گوئی ہے کہ حضور ﷺ کسی مرد کے والد نہیں ہوں گے۔ یعنی حضور ﷺ کا نسب فلاں ابن فلاں ابن فلاں کے طریقے پر نہیں چلے گا۔ جس طرح معروف نسب نامے چلتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی پیشین گوئی ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ان دونوں باتوں سے یہ

اشارہ ملتا ہے کہ ایک مسلمان کا تعلق دوسرے مسلمان سے رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہے حسبی اور نسبی تعلقات دوسرے درجے پر ہیں اور چونکہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اس لیے قیامت تک اس واسطے سے مسلمان آپس میں جڑے ہوئے رہیں گے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًاO تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا کَرِیْمًاO (سورۃ الاحزاب، آیت ۴۳، ۴۴)

وہ ایسا (رحیم) ہے کہ وہ (خود بھی) اور اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں تاکہ حق تعالیٰ تم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آوے اور اللہ تعالیٰ مومنین پر بہت مہربان ہے وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ السلام علیکم اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عمدہ صلہ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی مومنوں پر بے انتہا رحمت کا ذکر ہے۔ اگر غور کرکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ تم پر بہت ہی مہربان ہیں۔ خواہ تم کتنے ہی گناہوں میں ملوث ہو جب تک مالک نے ایمان سلامت رکھا ہے، سمجھ لو کہ وہ تم پر رحیم ہی ہیں جو کچھ معاملہ تمھارے ساتھ فرما رہے ہیں، رحمت ہی کا معاملہ فرما رہے ہیں۔ ان کا معاملہ تمھارے ساتھ خواہ انعام دینے کا ہے، خواہ ویسے ہی خوشی کرنے کا ہے، خواہ گناہ پر کم سزا دے کر معاف کردینے کا ہے، خواہ کسی بڑی مصیبت کو ٹالنے کا ہے، خواہ تنبیہ کرنے کا ہے، خواہ درجات بلند کرنے کا ہے، خواہ اپنی محبت آزمانے کا ہے اور اس کی رحمت سب سے زیادہ اس دن ظاہر ہوگی جس دن تم اس سے ملو گے۔

مسلمانوں پر ایمان عطا ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور اس کے نام کا وظیفہ جپنا واجب ہے کیوں کہ مومن پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار خاص نعمتیں ہیں

جن میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ چند آیاتِ کریمہ یاایھا الذین امنوا اذکروا اللّٰہ (آیت۴۱) سے شروع ہوتی ہیں اور بان لھم من اللّٰہ فضلا کبیر (آیت ۴۷) پر ختم ہوتی ہیں۔

تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَ تُـْٔوِیۡۤ اِلَیۡکَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکَ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَ لَا یَحۡزَنَّ وَیَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ کُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ۝ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ وَلَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَکَ حُسۡنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ رَّقِیۡبًا ۝

(سورۃ الاحزاب، آیت، ۵۱،۵۲)

ان میں سے آپ جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے سے دور رکھیں اور جس کو چاہیں (اور) جب تک چاہیں اپنے نزدیک رکھیں اور جن کو دور کر رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ اُن کو دے دیں گے اُس پر سب کی سب راضی رہیں گی اور خدا تعالیٰ کو تم لوگوں کے دلوں کی سب باتیں معلوم ہیں اور (اللّٰہ تعالیٰ یہی کیا) سب کچھ جاننے والا ہے بردبار ہے ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیبیوں کی جگہ دوسری بیبیاں کرلیں اگرچہ آپ کو ان (دوسریوں) کا حسن اچھا معلوم ہو مگر جو آپ کی مملوکہ ہو اور اللّٰہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت اور آثار و مصالح کا پورا نگران ہے۔

آیت ۵۱ سے یہ اصول پتا چلتا ہے کہ جب کسی نعمت کو اپنا حق نہیں سمجھا جائے گا تو جو کچھ بھی مل جائے گا اس سے بڑی خوشی ہوگی۔ اس میں قناعت کا عام سبق بھی ہے کہ جب کسی سے کچھ ملنے کی توقع نہ ہو تو قناعت خود بخود حاصل ہوجاتی ہے اور

خاص تعلیم بھی ہے شکر کی۔ یہی راز ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں کنویں کے پاس سائے میں بیٹھ گئے تو کسی طرف سے کسی اعانت یا پذیرائی کی توقع نہیں تھی اور پانی بھی بھرا تھا تو دو عورتوں کے لیے جو خود بے چاریاں وہاں پر سے مردوں کے ہٹنے کا انتظار کر رہی تھیں تو اس کے بدلے کی تو کوئی توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بس صرف ایک در سے ملنے کی امید تھی تو عرض کیا رب انی لما... الخ اور پھر جو ظاہری و باطنی نعمتیں ملتی گئیں اس کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ میں اس طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے کہ کھانا بھی آقا کی عنایت ہے اور اس پر بھی اپنا ذرّہ برابر استحقاق نہیں۔ اگر آدمی کو اس بات کا استحضار ہوجائے تو پھر ہمیشہ اطمینان ہوجائے۔

آیت ۵۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوب صورتی کی بنا پر کسی عورت سے شادی کرنا بھی جائز ہے۔ ان دو آیات میں سرورِ کائنات سے متعلق خصوصی احکام ہیں۔ ایک تو مساوات کی پابندی کا نہ ہونا دوسرے یہ کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اور شادی کی ممانعت۔ آیت ۵۳ میں ازدواجِ مطہرات کی دل جوئی عجیب طریقے سے کی گئی ہے ایک طرف تو ان کی آپس کے مساوات کے حق سے محرومی ہے دوسری طرف ان کو طلاق دے کر یا ان کے ہوتے ہوئے کسی اور سے نکاح کی ممانعت۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۵۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر پر اے ایمان والوتم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔

حضور نبیِ اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر درود

بھیجتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں اور (۴) ہمارے تو عین رافت و رحمت ہی ہیں۔

ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ ''صلوٰۃ'' تحفۂ محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نبیِ کریم ﷺ سے اور مومنین سے محبت ہے۔ اسی طرح مومنوں کو اللہ تعالیٰ سے اور نبیِ کریم ﷺ سے محبت ہے اور حضور ﷺ کو مومنوں سے محبت ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کو اور مومنوں کو جو محبت اللہ تعالیٰ سے ہے اس کا اظہار نماز سے ہوتا ہے۔ اور مومنوں کو حضور ﷺ سے محبت ہے اس کا اظہار ان کی طرف سے درود و سلام کی شکل میں ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں کیوں کہ کسی اور طرح سے جزا دینے سے قاصر ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر اپنی رحمت نازل کرتے رہتے ہیں۔

درود شریف میں ایک بڑی بات یہ بھی ہے کہ صلوٰۃ و سلام کا بحرِ بے کراں تو اللہ تعالیٰ سے بہہ ہی رہا ہے ہم بھی صلوٰۃ و سلام بھیج کر اس میں شامل ہوجاتے ہیں اور اس طرح اس رحمت کے دریا میں ہم بھی بہنے لگتے ہیں۔ صرف زبان سے پابندی کرکے ہم اس میں شامل ہوجاتے ہیں اور عمل سے سنت کی پابندی کرکے شامل ہوں تو بہت جلدی اس بہاؤ میں شامل ہوجاتے ہیں۔ دوسرا پہلو حضور ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا باطنی اور تکوینی ہے جو بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام مخلوق پر ہے اس کا مرکزی نقطہ اور ایک درجہ ہیں اس کا سبب حضور ﷺ کا وجودِ مسعود ہے۔ جب حضور ﷺ کے ادنیٰ غلاموں کی یہ صفت ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے آسمان سے پانی برستا ہے اور چرندوں کو روزی ملتی ہے تو حضور ﷺ تو ان سبھوں کے سردار ہیں اور جو کچھ بھی دوسرے صلحا کو ملا ہے وہ ان ہی کے طفیل میں اور ان کی ہی پیروی سے ملا ہے بلکہ یہ سب طفیل در طفیل ہیں۔

یہ آیتِ کریمہ حضور ﷺ کی شانِ محبوبیت کو ظاہر کرتی ہے کہ خود بھی اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پر رحمتِ خاصہ بھیج رہے ہیں اور اپنے فرشتوں کو بھی اس میں شامل کر رہے ہیں کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ پر درود بھیجیں (یعنی رحمتِ خاصہ

بھیجنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کما فی تفسیر بیان القرآن) اور مومنوں کو بھی حکم دے رہے ہیں کہ وہ بھی فرشتوں کے ساتھ مل کر درود و سلام حضور محبوب نبی کریم ﷺ پر بھیجیں۔

یہ آیتِ کریمہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے کہ صلوٰۃ و سلام کی دعوت دے کر ان کو ایک انتہائی منزل اور پاکیزہ جماعت میں شامل فرما لیا۔ درود و سلام پڑھتے ہی ایک مسلمان اس جماعت میں شامل ہوجاتا ہے جو فرشتوں کی جماعت ہے اور وہ ابھی اس حالت میں جب وہ انتہائی قرب کے مقام میں ہوتے ہیں۔ تو کیا اس جماعت میں شامل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ مومن کو گناہوں سے پاک فرما دیتے ہیں، تو گویا یہ گناہوں کی معافی کا ایک عام اعلان ہے (یہ مضمون نہایت وضاحت سے حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غریب خانے پر بیان فرمایا تھا) و حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا فرمایا تھا کہ درود شریف کامل استغفار ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب فرشتے حضور ﷺ کے پاس درود شریف کا ہدیہ امتیوں کی طرف سے لے جاتے ہیں تو حضور ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ ہدیہ کن لوگوں کی طرف سے ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کی امت کے عباد و زہاد اور برگزیدہ لوگوں کی طرف سے ہے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ ان کے درجات میں ترقی عطا فرمائیں۔'' پھر دوسرا ہدیہ پیش کیا جاتا ہے پھر حضور ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ کن لوگوں کی طرف سے ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ حضور ﷺ یہ آپ کی امت کے گنہگار لوگوں کی طرف سے ہے جو اچھے عمل بھی کرتے ہیں اور برے عمل بھی کرتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بخش دیں۔'' اس لیے (بزرگوں کا قول ہے کہ) درود شریف کامل استغفار ہے۔ اسی طرح حاجت مندوں کا ہدیہ درود شریف پیش ہوتا ہے اور حضور ﷺ حاجت روائی کے لیے دعا فرماتے ہیں تو درود شریف تمام امور کو کافی ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ایک صحابی کے استفسار پر کہ اگر کچھ درود شریف کا حصہ بڑھا

لوں تو کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا تھا کہ اور بڑھا لو تو اچھا ہے۔ بار بار استفسار پر بار بار فرمایا ۱/۳ سے ۱/۲ اور ۲/۳ اور پھر پورا وظیفہ صرف درود شریف کو بنا لینے کے بارے میں فرمایا، ''یہ تو تمھارے تمام امور کو کافی ہو جائے گا۔'' او کما قال ﷺ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۵۷)

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

محبوبیت کی شان کا اظہار ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ ایک ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو کون ستا سکتا ہے۔ مقصود تو صرف یہ کہنا ہے کہ جو لوگ رسول ﷺ کو ایذا دیتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ آیت ۵۶ میں جو رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کو فرمایا گیا یہ اسی کا تتمہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا۝ یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۝ (سورۃ الاحزاب، آیت، ۷۰، ۷۱)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو اللہ تعالیٰ (اس کے صلے میں) تمھارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کردے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا سو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ''... اور راستی کی بات کہو۔'' اور

تفسیر میں فرمایا، ''جس میں عدل اور اعتدال سے تجاوز نہ ہو۔'' یعنی گفتگو میں صرف یہ خیال نہ ہو کہ جو بات کہی جائے وہ سچی بات ہو بلکہ یہ بھی کہ عدل و اعتدال کے اندر ہو۔ یہ ''قولِ سدید'' کی تعریف ہے، مثلاً غیبت حرام ہے۔ گرچہ بات سچی ہے لیکن قولِ سدید کی تعریف میں نہیں آتی۔ اس طرح مطلب یہ کہ نہ صرف بات سچی ہو بلکہ منشائے قول بھی درست ہو۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدھی بات کہنے کو عملِ صالح میں خاص دخل ہے۔ اگر آدمی صرف سچ بولنے کی عادت ڈال لے تو رفتہ رفتہ اس کے تمام اعمال درست ہو جائیں۔

اور ساتھ ساتھ گناہ بخش دیے جانے کی بشارت بھی ہے۔ بشرطے کہ سیدھی بات کا منبع تقویٰ ہو، زورِ طبیعت یا اور کوئی چیز نہ ہو۔ اس بات کی مؤید ایک روایت ہے۔ کہ حضورﷺ سے ایک صحابی رضی اللہ علیہ نے درخواست کی کہ مجھ سے فلاں فلاں گناہ سرزد ہوتے ہیں (جن میں جھوٹ بولنا بھی تھا)، ان میں سے میں کوئی ایک گناہ چھوڑ سکتا ہوں جو آپ فرمائیں تو حضورﷺ نے ان سے فرمایا جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ چنانچہ انھوں نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا اور صرف اس بات پر سختی سے عمل کرنے کی وجہ سے ان کے دوسرے دو گناہ بھی چھوٹ گئے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی قدس اللہ سرہٗ کو میں نے خواب میں دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ صحیح بات عقل کی ہونی چاہیے جو مفید ہو، یعنی بات ایسی ہونی چاہیے جو:

(۱) سچی ہو جھوٹی نہ ہو۔

(۲) عقل کی بات ہو بے عقلی کی نہ ہو۔ (مثلاً چغلی کھانا بے عقلی کی بات ہے کیوں کہ گناہ ہے اور اس سے آپس میں رنجش بڑھتی ہے جس سے کہنے والے کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔)

(۳) ضروری ہو غیر ضروری نہ ہو۔ (یعنی مفید ہو، مضر بالا یعنی نہ ہو)

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا O لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًاO (سورۃ الاحزاب، آیت ۷۲،۷۳)

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سو انھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمے لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے، انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات کو سزا دے گا اور مومنین و مومنات پر توجہ (و رحمت) فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''یتوب'' کا ترجمہ ''متوجہ ہو'' کیا ہے اور مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ نے ''معاف کرے'' کیا ہے۔ دونوں ایک ہی بات ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ جب توجہ فرماتے ہیں تو رحمت اور عفو ہی کی نظر فرماتے ہیں۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ علما کہتے ہیں کہ یہ امانت ''اختیار'' تھا اور صوفیا کہتے ہیں کہ یہ ''محبت'' تھی۔ دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح ہے کہ انسان میں محبت کا عنصر رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے ''اختیار'' کی امانت اٹھا لی۔ بھلا کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ امانت کیا چیز ہوگی؟ کتنی عظیم الشان ہوگی؟ خالقِ ارض و سماوات جس کے ایک کن کہنے سے کروڑ ہا مخلوق پیدا ہوتی رہتی ہے، اس کے اختیار کا، اس کی قدرت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ وہ خالقِ خیر ہے اور خالق شر ہے۔ وہ عظیم و برتر خداوندِ عالم اپنی ایک امانت اپنی مخلوق کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ وہ امانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا ''اختیار'' ہے جو بلاتشبیہ اس کے اختیار کا ایک پرتو ہے کسی طرح یہ امانت دی جانی تھی یہ اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جو بھی امانت اٹھائے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرنا ہوگا

اور پھر بلا کم و کاست اس کو لوٹا دینا ہوگا۔ اس عظیم الشان امانت کے اٹھانے کا کس کو یارا تھا۔ چنانچہ سب اس کو اٹھانے کے خیال ہی سے لرزنے لگے اور اس کو لینے سے انکار کردیا۔ اس عالم میں محبت کا مارا انسان بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ محبوبِ حقیقی کوئی چیز دینا چاہتا ہے اور کوئی اس کو لینے کو تیار نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انسان نے محبت کے جوش میں اس امانت کو اٹھا لیا:

یاتن بہ رضائے درست می باید داد
یا قطعِ نظر زیار می باید کرد
(سرمد)

یا بقول ہمارے حضرت قدس اللہ سرہٗ کے:

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ ان کو یاد آجاتا ہوں میں

انسان کے خمیر میں ظلم اور جہل تو تھا ہی، محبت کے جوش میں نہ ذمہ داری کے بوجھ کا احساس رہا نہ اپنے نفع نقصان کا خیال:

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آبد اندافتیم

ارے اس نادان نے کیا کیا؟ جہل اور نادانی کی وجہ سے محبت کے جوش میں بڑا ظلم کیا اپنے اوپر۔ اب ادھر دیکھیے کہ محبوب کی طرف سے کیا معاملہ ہوتا ہے۔ محبوب نے دیکھا کہ اس نادان نے میری محبت میں آکر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا اور اپنے کو بڑی آزمائش میں ڈال دیا کہ جس سے جانبر ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تو محبوب نے فرمایا کچھ پروا نہیں یہ ظلوماً جھولاً ہے تو میں غفورا رحیما ہوں۔ میں اس کی ہر ہر قدم پر مدد کروں گا۔ میں اس کی لغزشوں پر قلمِ عفو پھیرتا رہوں گا۔ میں اس کو آزمائشوں سے ثابت و سالم نکالوں گا۔ البتہ جو منافق ہیں یا مشرک ہیں یعنی دنیا میں پہنچ کر انھوں نے میری فرماں برداری سے انکار کردیا ان کو ضروری سزا ملے گی خواہ عورت ہوں خواہ مرد جن کے دل میری محبت سے خالی ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبیِ کریم ﷺ

نے تین بار فرمایا الا لا ایمان لمن لامحبۃ لہ۔ (اوکما قال)

اس کے برعکس مومنوں کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ ان کو اچھا بدلہ دوں گا یا فلاں فلاں نعمتیں دوں گا بلکہ فرمایا کہ اللّٰہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ فرمائے گا۔ بس یہی ایک وعدہ ہے جس کی وجہ سے محبِّ صادق جان قربان کردینے کو تیار ہوجاتا ہے (یہاں حضرت تھانویؒ کا ایک ''روح در جمادات'' دیکھنے کے قابل ہے) یہ محبت جو انسان کو روزِ ازل سے عطا ہوئی ہے اس کی حفاظت اور اس پر شکر بہت ضروری ہے ورنہ اگر محبت سے دل خالی ہوگیا تو منافقین یا مشرکین میں شمار ہوگا اور پھر عذاب سے کوئی مفر نہیں۔ محبت ایسی چیز ہے جو صورت سے جھلکتی ہے اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا آخری درجہ پرستش اور عبادت ہے اور پہلا قدم فرماں برادری کا عزم ہے۔

یہاں چند باتیں توجہ طلب ہیں:

(۱) ایک طالب علمانہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی مخلوق میں انکار کا مادہ ہی نہیں ہے پھر انھوں نے انکار کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ امانت قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کا اختیار تھوڑی دیر کے لیے دے دیا گیا ہو۔

(۲) ظلم اور جہل انسان کی سرشت میں ہے۔ ہماری نسبت سے یہ خصائل کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں جب ان کی نسبت مخلوق ہونے کے لحاظ سے اللّٰہ تعالیٰ کی طرف کی جائے گی تو ان میں حسن وخوبی ہی نظر آئے گی۔ ان کی خلقت میں ہزاروں مصلحتیں ہوں گی جن میں صرف ایک کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اگر انسان میں یہ خصائل نہیں ہوتے تو وہ امانت کیسے اٹھاتا۔ چنانچہ ملائکہ کو جب یہ بات بتلائی گئی کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جارہی ہے اور اس کو خلافت فی الارض کی ذمہ داری دی جانے والی ہے تو وہ تعجب سے بول اٹھے اتجعل فیھا من یفسد فیھا... پھر جب آدم علیہ السلام کو چیزوں کے نام سکھائے گئے جو فرشتوں کو نہیں سکھائے گئے تھے تو انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں تو وہی معلوم ہے جو آپ نے بتلا دیا۔ پھر آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہونے سے دنیا میں بھیجے جانے تک کے واقعات سے فرشتوں کو کچھ واقفیت ہوئی کہ تکوینی مصلحت

کیا تھی۔ اور آدم علیہ السلام کو بھی اپنی خلقی کم زوریوں کا علم ہوگیا جس کی وجہ سے رجوع الی اللّٰہ کا داعیہ بہت قوی ہوگیا۔

(۳) ظلم اور جہل کسی نہ کسی درجے میں محبت کے لیے ضروری عناصر ہیں۔ قدیم یونانی فلسفی بھی جانتے تھے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور محبت انسان کا خاص امتیاز ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

(۴) انسان کے ارتقا کے لیے چیزوں کی ماہیت جاننے کا تقاضا (spirit of enquity) ضروری ہے۔جہل کا علاج سوال ہے اور سوال انسان کی فطرت میں ہے تو لازمی بات ہے کہ جہل بھی اس کی فطرت میں ہو۔

(۵) ظلم اور جہل کی وجہ سے جو نقصانات ہوتے ہیں اس کی تلافی ایمان سے ہوتی ہے کیوں کہ مومن پر اللّٰہ تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں تو وہ توبہ کرتا ہے پھر اللّٰہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتے ہیں اور نقصان کی تلافی فرما دیتے ہیں خواہ فوراً ہی خواہ کچھ دیر بعد۔

(۶) محبت دراصل ایمان ہی کا دوسرا نام ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے لیے رسول اللّٰہ ﷺ کی پیروی ضروری ہے جیسا اللّٰہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔قل ان کنتم... فاتبعونی...

اس کے لیے اہلِ محبت کی صحبت اکسیر کا حکم رکھتی ہے کیوں کہ محبت ایک سے دوسرے کو لگنے والی متعدی بیماری ہے۔ ایسے لوگوں کی صحبت میں محبوب کا ہی کا ہر وقت ذکر ہوتا رہتا ہے اور جس کو ہر وقت یاد کیا جائے اس سے محبت بڑھتی ہے اس راہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کو برداشت کرنے کا طریقہ آجاتا ہے۔

(۷) حضور ﷺ نے اس کے لیے خاص خاص دعائیں سکھلائی ہیں مثلاً:
اللھم ارزقنی حبک... الخ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ○ (سورۃ السبا، آیت ۷)

اور یہ کافر (آپس میں) کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایسا آدمی بتائیں جو کہ تم کو یہ عجیب خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت کو) ضرور تم ایک نئے جنم میں آؤ گے۔

اس کے قبل کی سورت میں دَعْ اذاھم کا حکم تھا۔ یہاں ایک ایذاء قومی کا ذکر ہے جو طبعاً باعثِ ایذا تو تھا لیکن یہ استہزا تبلیغ کا ایک اہم سبب بن گیا کہ لوگ جوق درجوق آنے لگے کہ دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا کنویں میں ڈالا جانا تمکین فی الارض کا سبب بن گیا۔ واللہ غالب علیٰ امرہ۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○ (سورۃ السبا، آیت ۱۹)

سو وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے اور (علاوہ اس ناشکری کے) انھوں نے (اور بھی نافرمانیاں کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کیا سو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا بے شک اس (قصہ) میں ہر صابروشاکر (مومن) کے لیے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر تھا جو آلِ داود پر تھیں جنھوں نے شکر کیا تو نعمتیں برقرار رہیں اور آخرت کی نعمت تو موجود تھی ہی۔ اس طرح سبا کے لوگوں پر نعمتیں تھیں لیکن انھوں نے کفر کیا اور ناشکری کی تو وہ نعمت چھن گئی۔ یہاں پر صبار کے بعد شکور کا ذکر ہے اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۳ صبارٍ شکور آیا ہے۔ اس

کی ایک بہت اچھی توجیہہ ظفر احمد انجینئر صاحب مرحوم نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھ بھیجی تھی اور حضرتؒ نے لکھا تھا ''ماشاء اللہ خوب نکتہ ہے''۔ ظفر احمد صاحب نے ایک کھانے پر اس کا ذکر فرمایا کہ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہتر بڑی نعمت ہے تو جب بندہ مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اس نعمت پر بھی شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، پھر وہ شکر کرتا ہے تو وہ اور مزید نعمتوں کا حق دار بن جاتا ہے۔

یہاں دو عذابوں کا ذکر فرمایا، ایک نعمتوں کے چھن جانے کا جو ان کے اعراض یعنی کفر کی وجہ سے آیا۔ دوسرا جو ان کے اس قول کی وجہ سے ''رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ'' اور دونوں باتیں ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حلال اور طیب رزق پر راضی رہنا بھی ایک طرح کا صبر ہے جو شکر کی ایک قسم ہے اور حلال کو چھوڑ کر حرام کی خواہش کرنا نعمتوں سے اعراض کرنا ہے جس کی سرحد کفر سے ملتی ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَیْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِیْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ○ (سورۃ السبا، آیت ۲۰)

اور واقعی ابلیس نے ان لوگوں کے بارے میں اپنا گمان صحیح پایا کہ یہ سب اُسی کی راہ پر ہو لیے مگر ایمان والوں کا گروہ اور ابلیس کا ان لوگوں پر (جو) تسلط (بطور اغوا ہے) بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں کہ ہم کو (ظاہری طور پر ان لوگوں کو جو کہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے (الگ کر کے) معلوم کرنا ہے جو اس کی طرف سے شک میں ہیں اور آپ کا رب ہر چیز کا نگران ہے۔

یہاں فریقاً من المومنین سے مراد مومنون کا ایک گروہ نہیں ہے بلکہ تمام مومنین مراد ہیں یعنی ایمان داروں کا گروہ (جیسا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا)

فاتبعوہ سے اتباعِ وحی مراد ہے جو کافروں یا منافقوں نے اختیار کیا ہے۔ مومن اگر کبھی شیطان کے فریب میں آ بھی جاتا ہے تو بعد میں اسے تنبیہہ سمجھتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ برخلاف ان کے جن کو آخرت پر یقین نہیں ہے جیسا من ھو منھافی شک سے ظاہر ہے۔ وہ لوگ ایسے ہیں جن پر شیطان کا پورا تسلط ہو جاتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ○ (سورۂ سبا آیت ۲۲)

آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا (دخیل خدائی) سمجھ رہے ہو ان کو پکارو وہ ذرّہ برابر اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں میں نہ زمین میں اور نہ ان کی ان دونوں (کے پیدا کرنے) میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا (کسی کام میں) مددگار ہے۔

من دون اللہ میں بت اور پتھر اور انسانی یا جناتی یا فرضی دیوی یا دیوتا سب شامل ہیں۔ ان کی بے بسی اور بے کسی تو ظاہر ہے اور جو لوگ انھیں پکارتے ہیں وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں۔ پھر بھی ان کی طرف مافوق الفطرت طاقت منسوب کرتے ہیں۔ اگر من دون اللہ میں تمام مخلوقات کو بھی شامل کر لیا جائے تب بھی ان کی کوئی حقیقی اور اپنی طاقت نہیں ہے سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت رکھتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (سورۃ السبا، آیت ۳۳)

اور (اس کے جواب میں) یہ کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ (ہم زبردستی کو مانع) نہیں (کہتے) بلکہ تمھاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا جب تم ہم کو فرمائش کرتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک قرار دیں اور وہ لوگ (اپنی اس) پشیمانی کو (ایک دوسرے سے) مخفی رکھیں گے جب کہ عذاب دیکھیں گے اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے جیسا کرتے تھے ویسا ہی تو بھرا۔

ایک ندامت عذاب دیکھنے کے بعد یہ بھی ہو گی کہ کاش ہم دنیا میں اپنے بڑوں کا (یعنی ظالم حاکموں کا یا بددیانت لیڈروں کا) غیظ وغضب برداشت کر لیتے اور ان کی بات نہ مانتے تو ان کی بات نہ ماننے سے جو تکلیف پہنچتی وہ اس عذاب سے کہیں کم تر ہوتی بلکہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتی جو آج ہمارا مقدر بن رہا ہے۔ اعاذنا اللہ منھا۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالاً وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ O قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ O وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ O قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ط وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ O (سورۃ السبا، آیت ۳۵ تا ۳۹)

اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہم کو کبھی عذاب نہ ہو گا کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے

اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے لیکن اکثر لوگ (اس سے) واقف نہیں اور تمھارے اموال اور اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے (یعنی مؤثر وعلت قرب کی بھی نہیں) مگر ہاں جو ایمان لاوے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سببِ قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لیے ان کے (نیک) عمل کا دونا صلہ ہے اور وہ (بہشت کے) بالاخانوں میں چین سے (بیٹھے) ہوں گے اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے ابطال کی) کوشش کر رہے ہیں (نبی علیہ السلام کو) ہرانے کے لیے ایسے لوگ عذاب میں لائے جاویں گے۔ آپ (مومنین سے) فرما دیجیے کہ میرا رب بندوں میں سے جس چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی سے دیتا ہے اور جو چیز تم (مواقع حکمِ الٰہی میں) خرچ کرو گے سو وہ (یعنی اللّٰہ تعالیٰ) اس کا عوض دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

مال واولاد کی کثرت پر مقبولیت عنداللّٰہ کا دارومدار نہیں ہو سکتا یہ بات تو واضح ہے ہی۔ معلوم ہوتا ہے یہاں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ جب اللّٰہ تعالیٰ چاہے گا تمھارے رزق میں تنگی کر دے گا اور یہ جو تمھیں رزق ملا ہے یہ تمھارے علم عقل کی وجہ سے نہیں ملا ہے اور نہ کسی عمل کے استحقاق کی بنا پر ملا ہے بلکہ کسی کو بھی استحقاقاً رزق میں وسعت نہیں دی گئی۔ یہاں نیک اعمال اور فراخیِ رزق اور برے اعمال اور رزق کی تنگی میں جو رشتہ ہے اس کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتلانا ہے کہ اصل سبب اللّٰہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی مصلحت ہے۔

دوسری جگہ اسی بات کو دُہرایا گیا ہے تاکہ مومنوں کا ایمان اللّٰہ تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل ہو جائے اور اس کے بعد جو فرمایا وما انفقتم... اس کو ہم دل وجان سے مان لیں۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال کا لوٹا دیا جانا دنیا میں ہوتا ہے۔ اصل اجر آخرت میں ہے۔ چنانچہ ہزاروں اشخاص کا مشاہدہ ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے دنیا میں بھی مال میں کمی نہیں آتی۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اھْتَدَیْتُ فَبِمَا
یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ط اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌO (سورہ سبا ۵۰)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر (مثلاً وفرضاً) میں گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی پر وبال ہو گی اور اگر میں راہ (راست) پر ہوں تو یہ بدولت اس قرآن کے ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے وہ سب کچھ سنتا (اور) بہت نزدیک ہے۔

واقعی اگر انسان کو چھوڑ دیا جاتا کہ وہ کوشش کر کے اپنے رب تک پہنچنے کا صحیح راستہ اختیار کرے جس میں فرد، معاشرہ اور انسانیت کے لیے دنیا اور آخرت کی راحت ہو تو سیکڑوں کوشش کرنے والوں میں شاید ہی ایک دو شخص اس میں کامیاب ہوتے اور اب تو بحمداللہ ایسا ہے کہ جو شخص بھی وحی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، وہ پہنچ جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِکَ لَهَا ۚ وَمَا یُمْسِکْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ ۢ بَعْدِهٖ ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُO (سورۃ الفاطر، آیت ۲)

اللہ جو رحمت (بارش وغیرہ) لوگوں کے لیے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے سو اس کے (بند کرنے کے) بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں۔ اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو چیزیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرمائی ہیں، مثلاً ہوا، پانی، اناج، کپڑے، معدنیات وغیرہ ان میں اضافہ اور کمی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوسکتی ہے لہٰذا یہ کہنا کہ آبادی اتنی بڑھ جائے گی تو کھانا کہاں سے آئے گا، درست نہیں ہے۔ معیشت کی ضروریات کی چیزیں (Economic Resources) ہمارے

پاس جو ہیں وہ محدود ہوسکتی ہیں لیکن اللّٰہ تعالیٰ کے پاس ان کے لامحدود خزانے ہیں، مثلاً کھانے پینے کی اشیا جو ہمیں محدود مقدار میں نظر آتی ہیں اس کے مقابلے میں جو اشیاءسمندر میں ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں ان کی مقدار لامحدود ہے۔ اسی طرح انرجی (Energy) جو ہمارے پاس سورج یا دوسرے ذرائع سے آسمان سے پہنچتی ہے وہ اتنی لامحدود ہے کہ صرف نظامِ شمسی میں انرجی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ط هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ O (سورۂ فاطر ۳)

اے لوگو! تم پر جو اللّٰہ کے احسانات ہیں ان کو یاد کرو (شکر کرو اور غور کرو کہ) کیا اللّٰہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان و زمین سے رزق پہنچاتا ہو، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ سو تم (شرک کر کے) کہاں اُلٹے جا رہے ہو۔

گندم کے ایک دانے کے بننے میں آسمان وزمین کی کتنی مخلوقات کی محنت شامل ہے اس پر غور کرنے سے اللّٰہ تعالیٰ کی نعمتوں کا پتا چلتا ہے۔ زمین سے تو خوشہ اُگتا ہی ہے ہزاروں غیرمرئی مخلوق (unicrobes) اس پر کام کرتے ہیں۔ آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے جس پر تمام نہری، بارانی اور سیلابی زراعت کا انحصار ہے۔ اگر بارش نہ ہوتو نہریں اور پانی کے ذخائر سوکھ جائیں۔ سورج سے دھوپ ملتی ہے، لہٰذا جو گندم کا ایک دانہ عطا کرنے والا ہے اس کے لیے آسمانوں اور زمین کا فرمانروا ہونا ضروری ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کرنے سے توحید کا عقیدہ راسخ ہوتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ۝ (سورۃ الفاطر، آیت ۷)

(پس) جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے (معاصی کی) بخشش اور (ایمان پر) بڑا اجر ہے۔

معلوم ہوا کہ دشمن کے ساتھ دشمن ہی جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس کے مشورے کا اتباع نہیں کرنا چاہیے اور اپنا دفاع کرتے رہنا چاہیے۔

دشمن سمجھنا یہ ہے کہ جیسے ہی یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بات شیطان کی طرف سے ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ ہم ایسا کریں ویسے ہی اس سے رک جانا چاہیے۔ یہ نہیں ایک بار ایسا کر لیں پھر نہیں کریں گے اور شیطان ہم کو کس کس طرح سے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کی طرف قرآن شریف میں بھی واضح اشارے موجود ہیں (اور تھوڑے سے تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بات شیطان کی طرف سے ہے یا نہیں) مثلاً شراب اور جوئے کو شیطان کا عمل بتلایا۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ شیطان اس کے ذریعے تمھارے درمیان تفرقہ اور رنجش ڈالنا چاہتا ہے یعنی اس کا اصل مقصد مسلمانوں کو آپس میں لڑانا ہے تو جو بات آپس کے تفرقہ اندازی کی ہو اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اس طرح ایک جگہ فرمایا کہ شیطان تمھارے درمیان آپس میں دشمنی ڈالتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ شیطان کہتا ہے کہ (اگر تم اللّٰہ کی راہ میں خرچ کرو گے) تو غریب ہو جاؤ گے۔ ایک جگہ فرمایا کہ وہ تم سے فحش کام کرانا چاہتا ہے لہٰذا ان تمام باتوں سے بچنا ضروری ہے۔ خواہ تھوڑی دیر کے لیے وہ بات مفید یا لذیذ کیوں نہ معلوم ہو لیکن کچھ ہی دنوں بعد پتا چل جاتا ہے کہ وہ بات کتنی مضر یا تلخ تھی۔

ایک مشکل اس وقت ہوتی ہے جب کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی دشمنی پر اُتر آئے لیکن اس وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس سے دشمنی کے افعال

شیطان کرا رہا ہے لہٰذا اس کی حرکات کا مقابلہ کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے اور اس کی ہدایت کے لیے دعا کرتے رہنا ضروری ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ط اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ط وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَيَبُوْرُ O (سورۃ الفاطر، آیت ۱۰)

جو شخص عزت حاصل کرنا چاہے تو تمام تر عزت خدا ہی کے لیے ہے۔ اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہے اور جو لوگ (اس کے خلاف) بُری بُری تدبیریں کر رہے ہیں اُن کو سخت عذاب ہو گا اور ان لوگوں کا یہ مکر نیست و نابود ہو جائے گا۔

ہجرت کو فوراً بعد ہی یہ بات مشرکوں پر بھی واضح ہو چکی تھی کہ عزت دینا اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ دوسری جگہ جو فرمایا گیا ہے کہ عزت اللہ اور رسول ﷺ اور مومنوں کے لیے ہے وہ بھی اسی حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لیے ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کر لینے سے حب جاہ اور عجب اور کبر سے نجات مل جاتی ہے اور تعلق مع اللہ کو قوی کرنے کے لیے یہ مراقبہ بہت مفید ہے کہ ہم نے جو بھی اچھی بات کی (اس میں کلمہ طیبہ بھی شامل ہے) یا اچھا عمل کیا وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ گیا، اب وہ مالک ہمیں جو بھی بھلائی نازل فرمائیں (یعنی فراخیِ رزق یا عزت وجاہ یا پورے کا پورا آخرت میں ذخیرہ) وہ ان کی مرضی سے اور ان کی طرف سے۔خیر نازل ہو گا اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی ان اعمال کو کوئی ہم سے چھین سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝
(سورۃ الفاطر، آیت ۱۵)
اے لوگو! تم (بھی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) خوبیوں والا ہے۔

فقیر ہونے کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جو کچھ بھی انسانوں کو دیا گیا ہے وہ ایک اندازے کے مطابق دیا گیا ہے (بقدرِ معلوم) اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کا لامحدود خزانہ ہے جو اس کی مصلحت کے مطابق نازل ہوتا رہتا ہے جیسے سورج کی روشنی اور بارش۔ پھر اپنی ذات میں بھی انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ اگر نئے خلیے (Cells) پیدا نہ ہوتے رہیں اور پرانے خلیے خارج نہ ہوتے رہیں تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہر طرح کے خیر اور بھلائی کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں خواہ ہمیں اس محتاجی کا علم ہو خواہ نہ ہو۔ ایک نوبل انعام یافتہ سائنس دان نے اشفاق احمد (ادیب اور مصنف) سے کہا تھا کہ ہم اپنی طرف سے پوری تیاری کر لیتے ہیں اور کشکول لیے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے درویشوں کی طرح ناچتے رہتے ہیں، ہمارا کام یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کشکول میں اللہ تعالیٰ دے دیں اس سے صحیح طور سے فائدہ اٹھائیں۔ جو خیر اور جو نعمت ہمارے پاس یا کسی اور کے پاس ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہے۔

خیر اور نعمت بھی کئی طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ جو خیر ہی خیر ہے مثلاً ایمان، عصمت، ایمانداری، انفاق لوجہ اللہ وغیرہ۔ ایک وہ ہے جو اس سے کم تر درجہ کا خیر ہے۔ مثلاً مال، اسباب، عزت، وجاہت، یہ من وجہہ خیر ہے اور من وجہہ آزمائش ہے۔ ایک وہ ہے جو صرف صورتاً خیر ہے اور حقیقتاً پریشانی کا سبب ہے، مثلاً کافروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیاوی نعمتیں ملنا، لیکن جو بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہی کی طرف سے ہے۔

جب ہم دعا کریں رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر تو ہمیں ذہن میں خیر کی

اعلیٰ قسم کو بھی رکھنا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب یہ دعا کی تو اُنھیں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا خیر عطا ہوا۔ امن اور عافیت ملی سر چھپانے کو گھر ملا۔ اچھی حیادار اور شریف النفس بیوی ملی اور انھیں ایک شفیق اور تجربہ کار بزرگ کی صحبت اور تربیت کے چند سال ملے اور یہ تربیت بھی ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے ضروری تھی جو ان کو سونپی جانے والی تھی، چنانچہ ان کے چند سال مدین میں قیام کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب کوہ طور پر وہ ان سے ہم کلام ہوا اور اس کے بعد فرمایا ثم جئت علیٰ قدر یٰموسیٰ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ط اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ
وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ O (سورۃ الفاطر، آیت ۲۲)
اور زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے
اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں۔

بہرے پن کی انتہا اور کفر کی اس سرحد کو ظاہر کرنے کے لیے یہ تشبیہ دی گئی ہے جو وہ نقطہ ہے جس سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ یہاں اس بحث سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ مردے سنتے ہیں یا نہیں یا شہید قبر میں زندہ رہتے ہیں یا نہیں۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ مردے سنتے نہیں ہیں اور اگر بعض حالات میں بعض اشخاص مرنے کے بعد سنتے بھی ہیں، مثلاً السلام علیکم کی آواز تو ان کا یہ سننا یقیناً اس معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس معنی میں یہاں مذکور ہے۔ یہاں ''سننا'' کا مطلب نصیحت حاصل کرنا ہے اور یہ بات کہ اللہ جس کو سناتا چاہتا ہے سنتا ہے ویسی ہے ہے جیسی یہ بات کہ اللہ جس کی آنکھیں کھولنا چاہے کھول دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ ○ لِیُوَفِّیَھُمْ اُجُوْرَھُمْ وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ط اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ○ (سورۃ الفاطر، آیت۲۹،۳۰)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت (مع العمل) کرتے رہتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں پوشیدہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی تاکہ ان کو ان کی اُجرتیں (بھی) پوری (پوری) دیں اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں۔ بے شک وہ بڑے بخشنے والے قدردان ہیں۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم کسی چیز کے بدلے کوئی چیز خریدیں اور وہ چیز جو ہم نے بیچی ہے وہ بھی ہمارے پاس رہ جائے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ اجر تو پورا ملتا ہے یعنی آخرت میں پورا ثواب اور دنیا میں بھی جس مال میں سے خرچ کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ زائد عطا فرماتے ہیں اپنے فضل سے اور آخرت میں بھی اس فضل کا مظاہرہ ہوگا، بدلے سے اضعافاً مضاعفاً عطا کر کے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ج فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا ط وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ م بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ ط اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ○ (سورۃ الفاطر، آیت ۲۷، ۲۸)

(اے مخاطب) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس کے ذریعے سے مختلف رنگوں کے پھل نکالے اور (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں (بعضے) سفید اور (بعضے) سرخ کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں اور (بعضے نہ سفید نہ سرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ۔ اور

اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں۔ (اور) خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔

رنگوں کا فرق بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے اور سفید، سرخ، رنگ برنگے اور کالے پتھروں میں خوب صورتی ہے اور کالے پتھر کو سفید پتھر پر کوئی فوقیت نہیں ہے صرف رنگ کی وجہ سے، اس طرح آدمیوں کے مختلف رنگ اور مختلف زبانوں میں خوب صورتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خلافیت کی نشانی ہے کہ کس طرح ان اختلافات کے باوجود سبھوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ وہ سب انسان ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ نِ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ج لَايَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَايَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ O (سورۃ الفاطر، آیت ۳۴، ۳۵)

اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے (رنج و) غم دور کر دیا۔ بے شک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا قدر دان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اُتارا، جہاں ہم کو نہ کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفسیر میں ہے۔

اللہ تعالیٰ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی قبول فرما کر بدلہ دیتے ہیں جن میں ایک بدلہ فی الفور مل جاتا ہے، یہ ہے کہ اس سے بڑی نیکی کی توفیق ہو جاتی ہے لیکن ہم سے بہت سے ایسے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں جو بڑی بڑی نیکیوں کو بھی برباد کر دیتے ہیں جیسے زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے یا آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے اور جتنے بڑے درجے کا آدمی ہوتا

ہے اتنے ہی بڑے کاموں کی اس سے توقع ہوتی ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی بخشش نہ ہو تو نیکیوں کا پلہ کبھی بھی بھاری نہ ہو، لہٰذا آدمی خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل کے دارالمقاۃ میں نہیں جائے گا جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے استفسار پر فرمایا کہ میں بھی جنت میں نہیں جاؤں گا (اپنے اعمال کی وجہ سے (اوکما قال)

اِنَّمَا تُنْذِرُمَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ○ (سورۃ یٰسین، آیت ۱۱)

پس آپ تو صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور خدا سے بے دیکھے ڈرے سو آپ اس کو مغفرت اور عمدہ عوض کی خوشخبری سنا دیجیے۔

دو باتیں غور کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ذکر اور اذکار اس کو فائدہ دیتے ہیں جس میں ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو اور جس کا دل بالکل ہی پتھر ہو گیا ہو اور اس میں قبول کی صلاحیت نہ ہو مثل جمارۃ وغیرہ اس کے لیے بے کار ہے الا یہ کہ اس پر اہتمامِ محبت ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ مشیت کے ساتھ اپنی صفت ''رحمٰن'' کا ذکر فرمایا بادشاہ، قہار یا منتقم ہونے کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ خشیت یا خوف ایسی ہے جیسی کسی کریم کا ڈر ہو یا بہت بڑے مہربان کی ناراضگی کا ڈر ہو۔ اس ڈر میں اور محبت میں اتنا امتزاج ہے کہ دونوں کا فرق کرنا ناممکن ہے۔

ومالی لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (سورہ یٰسین، آیت ۲۲)

اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اُس معبود کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا اور تم سب کو اُسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

معلوم ہوا کہ ایسے شخص کی اتباع کرنا چاہیے جو کسی بھی شکل میں اجر کا طالب نہ ہو اور خود بھی ہدایت یافتہ ہو۔ اگر کسی شخص میں اخلاص اور سچی خیرخواہی نہ ہو تو اس کی باتوں کے ماننے میں خطرہ ہے کہ کہیں وہ ذاتی مفاد میں یہ بات نہ کہہ رہا ہو اگر خود ہدایت یافتہ نہ ہو تو اخلاص کس کام کا۔ جو خود گمراہ ہو وہ دوسرے کو کیا راہ دکھائے گا؟

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○ (سورہ یٰسین، آیت ۳۵)

تا کہ لوگ باغ کے پھلوں میں سے کھائیں اور اس (پھل اور غلّہ) کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، سو کیا شکر نہیں کرتے۔

شکر یہاں جس پس منظر میں بیان کیا گیا ہے اس سے ایمان اور عبادت لفظ ''شکر'' میں شامل معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائی ہیں تمھارے فائدے کے لیے تو تم شکر کیوں نہیں بجا لاتے یعنی کفر سے توبہ کر کے ایمان کیوں نہیں لاتے اور جب ایمان لائیں گے تو رسول ﷺ کے اتباع کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکر کے اظہار کی اعلیٰ ترین کیفیت نماز ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا افلا اکون عبداً مشکوراً۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ نماز میں بھی دعاؤں کو فرض وواجب ومستحب کر دیا۔ سورۂ فاتحہ جو تمام تر دعا ہے وہ ہر رکعت کا لازمی جزو بنا دی گئی۔ حالانکہ جب ہم کسی کا شکر ادا کرتے ہیں تو اس کی تعریف اور توصیف ہی کرتے ہیں۔ مزید مانگنے کا تصور بھی نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مزید مانگنے سے نہیں روکا بلکہ اس کا حکم فرمایا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس مزید مانگنے کو بھی شکر (یعنی نماز) کا جزو بنا دیا۔ فَلَہُ الحمد ولہ الشکر

فَالْیَوْمَ لَاتُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَاکُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○

(سورہ یٰسین، آیت ۵۴)

پھر اس دن کسی شخص پر ذرا ظلم نہ ہو گا اور تم کو بس انھی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دُگنا اور ایک جگہ سات سو گنا ثواب کا ذکر ہے اور یہاں صرف یہ ہے کہ جو تم کرو گے اس کا بدلہ تمھیں ملے گا۔ ایک نظر یہ متضاد باتیں نظر آتی ہیں مگر دراصل ان میں کوئی تضاد نہیں۔ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ انسان کو اس کے برے اعمال کا ایک ہی بدلہ ملے گا یعنی اس کے برابر۔ جیسا دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ جو گناہ لے کر آئے گا فلا یجزی الامثلھا۔ یہ قانون عدل وانصاف کا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نفی نہیں ہوتی۔ مومنوں کے لیے دوسرا قانون ہے عفو اور رحمت کا اور ان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی پر بھروسا ہوتا ہے اپنے اعمال پر یا اپنے حسبی نسبی تعلقات پر نہیں کیوں کہ اعمالِ صالحہ کا صدور بھی بغیر اس کی رحمت کے ناممکن ہے جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں اپنے نفس کی برأت کا اظہار نہیں کرتا کیوں کہ نفس تو برائی کے لیے ورغلاتا ہی رہتا ہے ساتھ ہی فرمایا الامارحم ربی۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہیں دُگنے کا کہیں دس گنا کا کہیں اضعافا مضاعفۃ کا ذکر کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کریم کے زیادہ دینے کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ کہ کس کو کتنا بڑھا کر دیا جائے وہی کر سکتا ہے جو نیتوں، دل کی گہرائیوں اور انسان کی مجبوریوں سے واقف ہو۔ اس کی مصلحت تو ہر کام میں ہے لیکن اپنی رحمت کی اس نے کوئی حد نہیں رکھی ہے۔

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ○ (سورہ یٰسین، آیت ۶۱)

اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھا رستہ ہے۔

اس سے قبل ارشاد فرمایا تھا... لاتعبدوا الشیطٰن اور اس کے بعد ارشاد ہے ولقد اضل منکن جبلاً کثیرا... معلوم ہوا کہ اللہ کی عبادت صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور شیطان کی عبادت ٹیڑھے راستے پر چلنا ہے اور گمراہی ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ کسی کی عبادت ایک درجے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جائے کیوں کہ انسان کسی کی پیروی کر کے اس کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے جب یہ راضی کرنے کی کوشش بڑھ جاتی ہے تو وہ عشق ہوتا ہے اور جب اور بڑھ جاتی ہے تو وہ پرستش یعنی عبادت ہو جاتی ہے۔

اِلَّا عِبادَ اللهِ الْمُخْلَصِیْنَ O (سورۃ الصفت، آیت ۴۰)

ہاں مگر جو اللہ کے خاص کیے ہوئے بندے ہیں۔

یہاں بھی یہی بات ہے کہ جو کرو گے اس کا بدلہ ملے گا سوائے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے کیوں کہ اگر ان کو صرف ان کے اعمال ہی کا بدلہ ملتا تو اتنی بڑی نعمت نہیں ملتی۔ البتہ مزید اکرام اور احسان کے طور پر کہہ دیا جائے گا کہ یہ تمھارے نیک اعمال کا بدلہ ہے۔

فنظر نظرۃً فی النُّجُوْمِ O فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ O فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ O فراغ اِلٰٓی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ O مَالَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ O فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ O فَاَقْبَلُوْٓا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ O قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ O وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ O قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْیَانًا فَاَلْقُوْهُ فِی الْجَحِیْمِ O فَاَرَادُوْا

بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ○ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ز سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ (سورۃ الصفت، آیت ۸۸ تا ۱۱۰)

سو ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں۔ غرض وہ لوگ ان کو چھوڑ کر چلے گئے تو ان کے بتوں میں جا گھسے اور کہنے لگے کہ کیا تم کھاتے نہیں ہو، تم کو کیا ہوا تم تو بولتے بھی نہیں ہو پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے، سو وہ لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود تراشتے ہو حالانکہ تم کو اور تمھاری ان بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ایک آتش خانہ تعمیر کرو اور ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو۔ غرض ان لوگوں نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ لڑائی کرنی چاہی تھی سو ہم نے انھی کو نیچا دکھایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ میں تو اپنے رب! کی طرف چلا جاتا ہوں وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دے گا۔ اے میرے رب! مجھ کو ایک نیک فرزند دے۔ سو ہم نے اُن کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامرِالٰہی) ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ وہ بولے کہ اباجان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ (بلاتامل) کیجیے ان شاء اللہ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے۔ غرض دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لیے) کروٹ پر لٹایا اور (چاہتے تھے کہ

گلا کاٹ ڈالیں، اُس وقت) ہم نے اُن کو آواز دی کہ اے ابراہیم (علیہ السلام)
(شاباش ہے) تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (وہ وقت بھی عجیب تھا)۔
ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان۔
اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں
میں یہ بات ان کے لیے رہنے دی کہ ابراہیم (علیہ السلام) پر سلام ہو۔ ہم مخلصین
کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیم علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے دو واقعات بتائے گئے ہیں۔ ایک تو ان کا اپنے والد کو نصیحت کرنا کہ شرک چھوڑ دیں اور دوسرا واقعہ اپنے بیٹے کی قربانی کا۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اس طرح گزری کہ وہ اپنے رب کے دربار میں قلبِ سلیم لیے ہوئے حاضر ہیں اور جو حکم ہوتا ہے اور جو اشارہ ہوتا ہے اسے پامردی کے ساتھ اور پورے اخلاص کے ساتھ بجا لاتے ہیں۔ گویا آخرت کا نقشہ دنیا ہی میں کھنچ رہا تھا اور اسی کو احسان کے ساتھ تعبیر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری پوری تندہی اور اخلاص کے ساتھ اس طرح ہو کہ گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

الصفٰت ۹۶

شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے ''اور جو تم بناتے ہو۔'' یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خطاب تھا بت پرستوں سے کہ تم بھی خدا کی مخلوق ہو اور یہ بت جنھیں تم بناتے ہو یہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ اگرچہ عملاً تم اس کے بنانے میں مبتلا ہو مگر تخلیق میں تمھارا کچھ حصہ نہیں۔

اگرچہ مخاطب بت پرست ہیں لیکن اصول عام بیان کیا جا رہا ہے۔ عمل کی ذمہ داری ہم پر ہے لیکن ہمارے جملہ اعمال خدا ہی کے مخلوق ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلبِ سلیم کا یہ ثمر تھا کہ مشرکوں کو یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک منٹ کے لیے بھی اپنی قوم کو سزائے جہنم سے مامون نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہاں سمجھنے کی یہ ہے کہ ان کے کہنے کے جواب میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب خدا ہی ہمارے اعمال کا

خالق ہے تو ہمارا کیا قصور ہے؟ نعوذ باللہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا یہ اثر تھا اور ان کے کہنے کا ایسا انداز تھا کہ لوگ سمجھ گئے کہ یہ تکوینی امر کی بابت فرما رہے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قائل کی شخصیت کا اثر سننے والوں پر پڑتا ہے۔ بعض واعظین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی باتوں سے لوگوں کے قلوب میں اعتراضات ابھرتے ہیں اور بعض ناصحین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی بات سنتے ہی لوگوں کے دلوں سے اعتراضات محو ہو جاتے ہیں۔

حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ نے ایک دفعہ فرمایا کہ لوگوں کی شکایت چھوڑیے۔ یہ ہو رہا ہے وہ ہو رہا ہے، یہ خرابی ہے، یہ برائی ہے، یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ قربِ قیامت جیسے جیسے بڑھتا جائے گا فتنہ، فساد، برائیاں بڑھتی ہی جائیں گی۔ بس اپنا رشتہ اللہ تعالیٰ سے قائم کر لیجیے۔ اللہ سے پناہ مانگیے۔ ہر واقعہ جو ہو رہا ہے ہر لمحہ جو گزر رہا ہے اس کا ہم سے کچھ مطالبہ ہے (کبھی صبر کا مطالبہ ہے، کبھی شکر کا، کبھی پناہ مانگنے کا، بس یہ دیکھتے رہیے کہ اس وقت کا جو ہم سے مطالبہ ہے وہ ہم ادا کر رہے ہیں یا نہیں)۔

جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اگر دنیا سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سب کچھ بہت اچھا ہو رہا ہے۔ قادرِ مطلق کے پلان کے مطابق اور اس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس عظیم پس منظر (context) میں دیکھیے تو مومنوں کی تکلیف ان کی پستی بہت عارضی چیز نظر آئے گی کیوں کہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ لاغلبن انا ورسلی۔ جب آخری سین سے پردہ اٹھے گا تو الحمدللہ رب العلمین ہی زبان سے نکلے گا اور اگر واقعاتِ و تغیراتِ زمانہ کو subjectively دیکھا جائے تو ہر واقعہ ہم سے کسی نہ کسی امرِواجبہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ شکر کا یا صبر کا یا استغفار کا یا استعانت کا۔

دوسروں کی شکایت کرنے میں ایک تو فوری خرابی یہ ہے کہ توجہ خالق کی طرف ہونے کے بجائے مخلوق کی طرف ہوتی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اکثر غیبت یا بے فائدہ بات ہوتی ہے جس سے اصلاح کی توقع بہت کم ہے اور زمانے کی شکایت کرنے کی ویسے ہی ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے کہ زمانے کو برا مت کہو، میں زمانہ ہوں۔

اوکما قال یعنی جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے حکم سے ہو رہا ہے، تم اپنی فکر کرو کہ تمھارا تعلق ہم سے درست ہے یا نہیں، قوی ہے یا ضعیف ہے، تم صبر کرتے ہو یا لوگوں سے شکایت کرتے پھرتے ہو، ہماری طرف متوجہ ہو یا ہم سے بے پروا ہو۔

الصفت ۱۰۳ تا ۱۱۰

حضرت تھانویؒ نے یہاں محسنین کا ترجمہ مخلصین سے کیا ہے۔ بندے کی طرف سے احسان یہی ہے کہ اپنے آقا کا حکم خلوصِ نیت اور جانفشانی سے بجا لائے۔

یہاں صلہ دنیا بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے عوض ایک ذبحِ عظیم بھیجا گیا اور اس طرح ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی اور اس کو آنے والوں کے لیے باقی رکھنا مزید عزت افزائی ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس طرح جزا دیتے ہیں کہ مخلصوں کو بڑی سے بڑی آزمائش میں ثابت قدم رکھتے ہیں، اس صبر پر وہ شکر ادا کرتے ہیں تو مزید انعامات ان کو ملتے ہیں پھر اس پر شکر کرتے ہیں تو اور بھی انعامات ملتے ہیں۔ اضعافاً مضاعفاً۔ ایک حدیث شریف اس مفہوم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوٹی سی نیکی کو قبول فرمالیتے ہیں اور اس کو بڑھاتے رہتے ہیں یہاں تک وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تاکید فرمائی ہے کہ ہر عملِ صالح کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھ کر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے۔ خصوصاً ہمارے شیخ ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی نور اللہ مرقدہٗ بار بار اعمالِ صالحہ کو اللہ تعالیٰ کے انعامات سمجھ کر ان پر شکر ادا کرتے رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ چاہے اس میں کتنا ہی نقص کیوں نہ ہو۔ توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور نقص ہماری طرف سے جس کا تدارک استغفار سے ہو جاتا ہے۔ ان آیاتِ کریمہ سے اس بارے میں واضح ہدایات ملتی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کی تعمیل کی توفیق عطا فرمائی اور پھر تین احسانات کا ذکر فرمایا۔ فدیہ۔ اس رسم کو باقی رکھنا، ان پر سلامتی کا ہونا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس طرح محسنوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (سورۃ الصفت، آیت ۱۱۱)
بے شک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت الیاس علیہم وعلیٰ نبینا افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے ذکر کے ساتھ... کذلک تجزی المحسنین آیا اور اس کے بعد یہ آیت ہے۔ معلوم ہوا کہ ''احسان'' دراصل عبدِمومن ہی کا ایک مقام ہے اور اعلیٰ ترین مقام ہے اور کسی نہ کسی درجے میں ہر مسلمان مومن بھی ہے اور عبد بھی اور کسی نہ کسی درجے میں اس پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بطور جزائے اعمالِ صالحہ ہر وقت ہوتے رہتے ہیں اور بلا سبب فضل کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ○ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ○ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ○ (سورۃ الصفت، آیت ۱۶۷ تا ۱۶۹)
اور یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت (کی کتاب) پہلے لوگوں کے (کتابوں کے) طور پر آتی تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے۔

انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر ہمارے پاس اگلے لوگوں کی طرح کتاب ہوتی تو ہم بھی نیک ہو جاتے یعنی کتاب کی ہدایت سے نیک اعمال کرتے (یہ مکالمہ قیامت کے دن کا ہے جب اچھے، برے کا پورا پورا فیصلہ ہو جائے گا) بلکہ انھوں نے یہ کہا (یعنی یہ کہیں گے) کہ اگر ہمارے پاس بھی اگلوں جیسے کتاب ہوتی تو ہم بھی اللہ تعالیٰ کے چنیدہ بندوں میں ہو جاتے۔ اس طرزِ تکلم سے عمل میں اور جزا میں جو مضبوط رشتہ ہے وہ ظاہر ہوتا ہے یعنی اگلوں جیسی کتاب ہوتی تو ہم بھی نیک کام کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرتے یعنی ہم بھی مخلصین میں سے دنیا میں ہوتے اور آج ہمارا بھی شمار مخلصین یعنی چنندہ بندوں میں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اپنے اختیاری اعمال

سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کو محض اپنے فضل سے مخلصین میں سے بنا ہی لیتے ہیں پھر اگر وہ کبھی کبھی کوئی ناپسندیدہ کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ جیسے یوسف علیہ السلام کی خواہش نفسانی ہو چلی تھی مگر وہ بچائے گئے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ (سورۃ الصفت، آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳)

اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لیے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے کہ بے شک وہی غالب کیے جاویں گے اور (ہمارا تو قاعدہ عام ہے کہ) ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

اس سے قبل چند مشہور انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر تھا۔ ان کو دنیا میں بھی غالب کیا گیا اور ان کے مخالفین پر عذاب آیا۔ البتہ بعض انبیائے کرام علیہم السلام ایسے بھی گزرے ہیں جن کو شہید کیا گیا حالانکہ یہ وعدہ عام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں فوراً ہی دوسرے نبی بھیج دیے گئے ہوں اور بالآخر اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو گیا اور ان کے دشمن مغلوب وفاسد ہو گئے۔ اگر فوج کے چند اعلیٰ افسر اور چند سپاہی شہید ہو جائیں اور بالآخر اسی فوج کو فتح نصیب ہو تو یہ بات جندنا لھم الغالبون کے منافی نہیں ہو گی۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ○ (سورہ ص، آیت ۲)

بلکہ (خود) یہ کفار (ہی) تعصب اور (حق کی) مخالفت میں ہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کیا ''غرور میں اور مقابلے میں''۔ یعنی اپنی بڑائی جتانے کی فکر میں ہیں جیسے فرعون نے ہامان سے کہا تھا کہ سیڑھی لاؤ میں بھی تو ذرا دیکھوں کہ موسیٰؑ کا خدا کیسا ہے۔

اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَۃِ رَبِّکَ الْعَزِیْزِ الْوَھَّابِ ○ (سورہ ص، آیت ۹)

کیا ان لوگوں کے پاس آپ کے پروردگار زبردست فیاض کی رحمت کے خزانے ہیں (جس میں نبوت بھی داخل ہے)۔

ہم گناہ گاروں کے لیے اس آیتِ کریمہ میں بڑی دلدہی کا سامان ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت لٹاتا رہتا ہے۔ وہ غالب ہے اور اس پر قادر ہے کہ جس کو چاہے دے۔ اگر عاصیوں پر بلاسبب اور بلااستحقاق اپنی رحمت کی بارش کرے تو زاہدوں کو بولنے کا یارا نہیں کیوں کہ وہ بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے اور زاہدوں کا حصہ کاٹ کر عاصیوں کو نہیں دیتا۔ اگر ہمارے یا کسی اور مخلوق کے اختیار میں اللہ کی رحمت کے خزانے ہوتے تو وہ کبھی بھی اس طرح نہ لٹاتا۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَاالْاَیْدِ ۚ اِنَّہٗ اَوَّابٌ ○ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ○ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً ؕ کُلٌّ لَّہٗ اَوَّابٌ ○ (سورہ ص، آیت ۱۷ تا ۱۹)

آپ ان لوگوں کے اقوال پر صبر کیجیے اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کیجیے جو بڑی قوت اور ہمت والے تھے اور (خدا کی طرف) رجوع ہونے والے تھے۔ ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کیا کریں اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی جو (تسبیح کے وقت ان کے پاس) جمع ہو جاتے تھے سب ان کی (تسبیح کی) وجہ سے مشغولِ ذکر رہتے۔

وہاب کے سامنے بندے کو جھکنا ہی زیبا ہے اور اسی ادبیت کے صلے میں حضرت داوٗد علیہ السلام کو پہاڑ پر قدرت دے دی اور پرندوں پر حکومت دے دی۔ جب بندہ خدا کے سامنے مؤدّب ہو گیا یعنی اس کا پورا فرمانبردار ہو گیا تو ساری چیزیں اس کی فرمانبردار ہو گئیں۔ اگرچہ یہاں ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم نہیں کیا گیا ہے لیکن اشارتاً قوی رشتہ معلوم ہوتا ہے جیسا بہت سے بزرگوں نے صراحتاً کہا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ۩ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۝ (سورہ ص، آیت ۲۴، ۲۵)

داوٗد (علیہ السلام) نے کہا یہ جو تیری دنبی اپنی دنبیوں میں لانے کی درخواست کرتا ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شرکا (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ داوٗد (علیہ السلام) کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے سو انھوں نے اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے۔ سو ہم نے ان کو وہ (امر) معاف کر دیا۔ اور ہمارے یہاں ان کے لیے (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی) نیک انجامی ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ امتحان یہ تھا کہ فریقِ مقدمہ کی گستاخی درگستاخی کو کمالِ نورِ نبوت کی وجہ سے کمالِ صبر و تحمل کے ساتھ معاف فرما دیتے ہیں اور عدل کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں یا مقدمے کو ملتوی کر کے دوسرا مقدمہ (گستاخی) کا قائم کر دیتے ہیں اور تل برابر کمال صبر کی کمی جو ان کے اعلیٰ مرتبے کے لحاظ سے (جس کا مدلول

آیت نمبر ۷۰ میں ہے) ہوئی تھی وہ یہ تھا کہ ایک ہی جلسے میں بعدِ فیصلہ مظلوم کے حق میں گفتگو فرمائی۔

قطعِ نظر اس کے کہ کمال میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا نہیں یہ واقعہ بذاتِ خود ایک آزمائش تھا اور ہر آزمائش کے موقع پر تضرع اور استغفار ضروری ہے۔ فتنہ یا آزمائش میں مبتلا ہونا یا تو اس اصول کے تحت ہوتا ہے کہ لوگوں کا صدق وکذب ظاہر ہو جائے یا کسی گناہ یا غلطی پر تنبیہہ کے لیے ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں تضرع واستغفار ضروری ہے ایک تو یہ کہ نہ معلوم ہم سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہو جو اس فتنے کا سبب بنی ہو۔ دوسرے یہ کہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کسی بھی آزمائش میں پورا اترنا محال ہے اور توبہ سے اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ استغفار تکبر کا قاطع ہے اور اپنی کوتاہی اور اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا اعتراف ہے اور آزمائش میں پورا اترنے کے بعد بھی تضرع واستغفار ضروری ہے یعنی اپنی کوتاہی اور اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا اعتراف ضروری ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ فعل ہمیشہ کے لیے قابلِ اتباع ہے۔ اس دربار میں اصل بخشش تو یہی توبہ کی اور رجوع الی اللہ کی توفیق ہے۔

یہاں ایک اصولی بات بتائی گئی ہے کہ اکثر شریک دار ایک دوسرے پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ شراکت کی چیز سے حتی الوسع بچنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مومن صالح اس سے بری ہیں لہٰذا شراکت اگر کی جائے صالحوں کے ساتھ کی جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مومنین صالحین کے معاملات بھی درست ہونا چاہییں۔ اگر معاملات صحیح نہ ہوں تو ایسا شخص صالح نہیں ہو سکتا تو جو نماز پڑھ کر روزہ رکھ کر معاملات میں لوگوں سے دھوکا کریں یا زیادتی کریں تو ان کے ایمان اور تقویٰ میں کوئی بنیادی خرابی معلوم ہوتی ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ○ (سورہ ص، آیت ۲۶)

اے داوٗدؑ ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا (اگر ایسا کرو گے تو) وہ خدا کے رستے سے تم کو بھٹکا دے گی جو لوگ خدا کے رستے سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہو گا۔ اس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھولے رہے۔

سارے فساد کی جڑ اتباعِ ہویٰ ہے اور سارے تصوف کا نچوڑ نہی النفس عن ھوائی نفس کو خواہشات سے روکنا ہی اصل مجاہدہ ہے جس سے حقوق کی ادائیگی سہل ہو جاتی ہے۔ ایسی خواہشات کی تکمیل سے اپنے آپ کو روکنا جن پر عمل کرنا عقل کے خلاف ہو یعنی خواہ وہ بات دینی یا دنیوی لحاظ سے مضر ہو خواہ لایعنی ہو۔ لہٰذا ہر خواہش پورا کرنے سے پہلے ایک منٹ کے لیے یہ سوچ لینا چاہیے کہ شرعاً یہ کام جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو پھر یہ سوچنا چاہیے کہ اس سے کوئی فائدہ ہے یا نہیں۔ بغیر کسی بندش اور روک ٹوک کے خواہشات کی پیروی بالآخر اضلال عن سبیل اللہ پر منتج ہوتی ہے اور اس کا اصل سبب یومِ حساب کو بھول جانا ہے کیوں کہ اگر انسان اس دن کو نہ بھولے جس دن لمحہ لمحہ، وقت اور ذرّہ ذرّہ اعمال کا حساب ہو گا تو آدمی ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں مصروف رہے اور اس سے نہ گناہ سرزد ہو نہ کوئی لغو کام۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ○ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ○ (سورہ ص، آیت ۴۵، ۴۶)

اور ہمارے بندوں ابراہیم (علیہ السلام) اور اسحٰق (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کو یاد کیجیے جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے ہم نے اُن کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ یادِ آخرت کی ہے۔

چونکہ اتباعِ ھویٰ کا سبب نسیان یوم الحساب ہے اس لیے جن لوگوں کو اللّٰہ تعالیٰ نے آخرت کی یاد کے لیے چن لیا تھا وہ سراسر قابل اتباع تھے کیوں کہ سرتا پا ہدایت یافتہ تھے اور چونکہ حقیقت کو پہچاننا ہی اصل عقل مندی ہے اس لیے یہ عقل ودانش کے بادشاہ ہوئے اور چونکہ تمام قوتوں کا استعمال صحیح یا غلط عقل ہی پر منحصر ہے اس لیے ان کا اولی الایدی والابصار فرمایا گیا۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَیَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (سورة الزمر، آیت ۹)

بھلا جو شخص اوقاتِ شب میں سجدہ وقیام (یعنی نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو، آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی اُمید کر رہا ہو، آپ کہیے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں، وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہلِ عقل (سلیم) ہیں۔

مومن کا قلب رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان رہتا ہے۔ آخرت کا ڈر بھی اور اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی۔ ظاہر ہے کہ تمام اعمال کا دارومدار قلب ہی پر ہے اور مومنین کے قلب کی یہ حالت صحیح علم کی وجہ سے ہے اس لیے ان کا الذین یعلمون کی صفت سے موصوف فرمایا گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہیں جن کو آخرت کا صحیح علم نہیں ہے۔ اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوف اور امید ساتھ ساتھ چلتے ہیں جس

درجے کا خوف ہوگا اس درجے کی امید ہوگی۔ البتہ بادیٔ النظر میں کبھی خوف زیادہ معلوم ہوتا ہے کبھی رِجا۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (سورۃ الزمر، آیت ۱۰)

آپ (مومنین کو میری طرف سے) کہیے کہ اے میرے ایمان والے بندو! تم اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو، جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیک صلہ ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ اس دنیا میں نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے اچھا صلہ ہے آخرت میں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی اچھا صلہ ہے۔ اس صورت میں حسنہ کے معنی ہوں گے پاکیزگی، طہارت، اطمینانِ قلب اور حقیقی راحت (برخلاف عرفی راحت)۔ اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال دنیا میں بھی ان کو وافر رزق دیا جائے گا، لیکن اس کی کوئی میعاد مقرر نہیں ہے۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ○ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○ (سورۃ الزمر، آیت ۱۴، ۱۵)

آپ کہہ دیجیے کہ میں تو اللہ ہی کی عبادت اس طرح کرتا ہوں کہ اپنی عبادت کو اسی کے لیے خاص رکھتا ہوں سو خدا کو چھوڑ کر تمھارا دل جس چیز کو چاہے

اس کی عبادت کرو آپ (یہ بھی) کہہ دیجیے کہ پورے زیاں کار وہی لوگ ہیں
جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے قیامت کے روز خسارے میں پڑے،
یاد رکھو کہ صریح خسارہ یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اگر عبادت کرنی ہے تو اخلاص کے ساتھ کرنی ہے ورنہ پھر جس کی چاہو عبادت کرلو اور اصل خسارے کا پتا تو آخرت میں چلے گا۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً رَّجُلاً فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَمًا لِّرَجُلٍ ط هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلاً ط اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ج بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ O اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ O ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ O (سورة الزمر، آیت ۲۹ تا ۳۱)

اللہ تعالیٰ نے (موحد و مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص (غلام) ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضد اضدی بھی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے (تو) کیا دونوں کی حالت یکساں (ہوسکتی) ہے، الحمدللہ بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں۔ آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے (اس وقت عملی فیصلہ ہو جائے گا)۔

اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ کچھ خدا کی بھی بات رکھیں، کچھ اپنے کی بھی اور کچھ معاشرے کی بھی تو بات نہیں بنتی۔ وہی ایک غلام اور کئی آقا۔ کشاکش میں ترقی کیا ہو اور اخلاص کا بہترین نسخہ موت کو یاد رکھنا ہے کہ تم بھی مر جاؤ گے اور یہ سارے بھی مر جائیں گے پھر اپنے رب کے سامنے جمع ہو کر جھگڑا کرو گے۔ وہ کہے گا اس نے مجھے گمراہ کیا، وہ کہے گا اس نے مجھے گمراہ کیا۔

جو مثال یہاں غلام اور آقا کی بیان فرمائی گئی ہے وہ صرف اشارتاً ہے۔ یہ

نہیں فرمایا گیا کہ اللہ اور بندے کی بھی ایسی ہی مثال ہے بلکہ اس مثال سے خود ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ الحمدللہ۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ ھَادٍ ۝ وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّاتَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ بِضُرٍّ ھَلْ ھُنَّ کٰشِفٰتُ ضُرِّہٖٓ اَوْاَرَادَنِیْ بِرَحْمَۃٍ ھَلْ ھُنَّ مُمْسِکٰتُ رَحْمَتِہٖ ؕ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ ؕ عَلَیْہِ یَتَوَکَّلُ الْمُتَوَکِّلُوْنَ ۝ (سورۃ الزمر، آیت ۳۶ تا ۳۸)

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ خاص محمد(ﷺ کی حفاظت) کے لیے کافی نہیں اور یہ لوگ آپ کو ان (جھوٹے معبودوں) سے ڈراتے ہیں جو خدا کے سوا (تجویز کر رکھے) ہیں اور جس کو خدا گمراہ کرے اس کا کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کا کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا خدا تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے؟ اور اگر (آپ) ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ آپ (ان سے) کہیے کہ بھلا پھر یہ تو بتلاؤ کہ خدا کے سوا تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف دور کر سکتے ہیں یا اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے، کیا یہ معبود اس کی عنایت کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیجیے کہ (اس سے ثابت ہو گیا کہ) میرے لیے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم براری کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی دھمکی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اکثر تو یہ خالی خولی دھمکی ہوتی ہے اور اگر واقعی اس کا ارادہ نقصان پہنچانے کا بھی ہو تو کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یعنی جس خدا کو

راضی کرنے کے لیے تم کسی بڑے آدمی کو ناراض کر رہے ہو تو اللّٰہ تعالیٰ تمھاری مدد کرنے کے لیے کافی ہے، تم دیکھتے رہنا کہ کیسی مدد ہوتی ہے صرف صبر کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بھی جان لینے کی ضرورت ہے کہ جو لوگ تمھیں اللّٰہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے ڈراتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اللّٰہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا ہے اور جنھیں اللّٰہ تعالیٰ گمراہ کر دیں انھیں کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور جس کو اللّٰہ ہدایت دے دے اس کو کون گمراہ کر سکتا ہے؟ اس کی ہدایت اٹل ہے، وہ غالب ہے اور جو اس کے بندے کو گمراہ کرنا چاہے یا نقصان پہنچائے اس سے بدلہ لے سکتا ہے۔ یہ توکّل ہے اور جو خالقِ ارض وسماوات ہے اسی پر توکل زیبا ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (سورۃ الزمر، آیت ۶۰)

اور آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنھوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا، کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟

یہاں پر دو باتوں کا اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ تکبر کی ایسی بھی بہت سی شکلیں ہیں کہ پہنچانی نہیں جاتیں۔ جس طرح بہت سے مکذبین مسکین وذلیل بھی ہوں گے تو کبر اور ذلت ومسکنت کا جمع ہونا ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ تکبر اور ایمان کا ایک ساتھ جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔ اگلی آیت میں جن کی نجات کا ذکر ہے وہ لوگ رسول ﷺ کی تکذیب سے بچنے والے اور اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے والے ہیں اور آیت ۶۶ میں جو فرمایا ہے کہ اللّٰہ کی عبادت کرو اور شکرگزاروں میں سے ہو جاؤ اس سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ شکر کرنے والا کبر سے دور رہتا ہے۔

قِيۡلَ ادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ فَبِئۡسَ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ○ وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا وَقَالَ لَهُمۡ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِيۡنَ○ (سورۃ الزمر، آیت ۷۲،۷۳)

(پھر ان سے) کہا جائے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو (اور) ہمیشہ اس میں رہا کرو، غرض (خدا کے احکام سے) تکبر کرنے والوں کو بُرا ٹھکانا ہے اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کیے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے) اور وہاں محافظ (فرشتے) ان سے کہیں گے السلام علیکم، تم مزے میں رہے سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔

یہاں ''متکبرین'' اور ''کافرین'' ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے ترجمہ فرمایا ہے ''غرض (خدا کے احکام سے) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے''۔ جیسا کہ شیطان مردود نے کبر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس سے اچھا ہوں اور جیسا کہ بہت سے رؤسائے قریش کے ایمان نہ لانے کا سبب کبر اور عار تھا۔

اَلَّذِيۡنَ يَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَهٗ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَىۡءٍ رَّحۡمَةً وَّعِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِيۡلَكَ وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ○ رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۨ الَّتِىۡ وَعَدۡتَّهُمۡ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ○ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۷ تا ۹)

جو فرشتے کہ عرشِ الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں
وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور
ایمان والوں کے لیے (اس طرح) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے
پروردگار آپ کی رحمت (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔ سو ان لوگوں کو
بخش دیجیے جنھوں نے (شرک وکفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستے پر
چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے، اے ہمارے پروردگار اور ان
ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جن کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کر
یجیے اور ان کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق
ہی مومن) ہوں ان کو بھی داخل کر دیجیے۔ بلاشک آپ زبردست حکمت
والے ہیں اور ان کو (قیامت کے دن ہر طرح کی) تکالیف سے بچائیے اور
آپ جس کو اس دن کی تکالیف سے بچا لیں تو اس پر آپ نے (بہت)
بانی فرمائی اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

فرشتے ایمان لانے والوں کے لیے دُعا کرتے ہیں کہ ''اے اللہ! جن لوگوں نے توبہ کی اور آپ کی راہ پر چلے ان کو بخش دیجیے...'' معلوم ہوا کہ مومنوں سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ گناہ نہ کریں ورنہ فرشتے ان کے لیے استغفار کیوں کرتے، بلکہ یہ مطالبہ ہے کہ جب گناہ ہو جائے تو توبہ کر لیں۔ ایمان لانے کا لازمی اثر یہ ہے کہ نافرمانی ہو جانے پر ندامت ہو اور اس کے بعد سیدھی راہ پر چلنا بھی میسر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر کے بعد پھر غفلت ہو جائے لیکن ندامت کے بعد نیکی کی ضرور توفیق ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لیے تابوا کے بعد واتبعوا سبیلا ہو۔

آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں کا بھی ایک دین ہوتا ہے یعنی وہ شرک ہی کو صحیح دین سمجھتے ہیں۔

هُوَ الَّذِىْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًاؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۱۳)

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے اور (وہی ہے جو) آسمان سے تمھارے لیے رزق پہنچاتا ہے اور صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے جو (خدا کی طرف) رجوع (کرنے کا ارادہ) کرتا ہے۔

اگرچہ ابھی تک بڑھتی ہوئی آبادی سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ اتنی آبادی ہو جائے گی تو لوگ کھائیں گے کہاں سے، لیکن ہزاروں سال کے تجربے سے یہی بات ثابت ہو چکی ہے کہ عالمی سطح پر اتنی خوراک ہمیشہ موجود رہی ہے کہ دنیا کی پوری آبادی سیر ہو کر کھا لے۔ البتہ تقسیمِ دولت اس طرح ہوتی رہی ہے کہ ایک خطے کے لوگوں کو دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا اور دوسرے خطے کے لوگوں کے پاس اتنا ہوتا ہے کہ وہ بے دریغ رزق ضائع کرتے ہیں یا اناج کے اُگانے پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ آسمان سے رزق اتارتے ہیں۔ اس بات پر اب لادین سائنس دانوں کا بھی اتفاق ہے کہ سورج کی شعاعوں میں جو خلا سے غیر مرئی شعاعیں زمین پر آتی ہیں ان میں بھی رزق (food values) ہوتا ہے۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ○ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ○ (سورۃ المومن، آیت ۱۴، ۱۵)

سو تم لوگ خدا کو خالص اعتقاد کر کے پکارو، گو کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو وہ رفیع الدرجات ہے، وہ عرش کا مالک ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ (وہ صاحبِ وحی لوگوں کو) اجتماع کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے۔

معلوم ہوا کہ اگر عبادت خالص اللّٰہ تعالیٰ ہی کی کی جائے تو کافروں کی ناگواری کے لیے تیار رہنا چاہیے کیوں کہ خالص عبادت پوری زندگی پر حاوی ہے جس میں ایک

دوسرے کے ساتھ معاملات، لین دین، رہنے سہنے کا طریقہ سب شامل ہے جو ہر قوم کا جدا جدا ہوتا ہے چاہے اس قومیت کی بنیاد جغرافیائی ہو یا لسانی ہو، یا بہت دنوں تک ایک حکومت کے ماتحت رہنا ہو یا نسلی (racial) ہو یا جیسے ایامِ جاہلیت میں تھا کہ ایک قبیلے کے لوگ ایک بت کو پوجنے پر متفق ہو جاتے تھے۔ ایسی شکل میں مومنوں اور کافروں کے درمیان چپقلش رہنا یا قتال ہوتے رہنا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ دین پوری زندگی کو حاوی ہے۔ ورنہ اگر دین صرف نماز روزے کا نام ہوتا تو کافروں کی ناگواری کا سوال ہی نہیں تھا اور اگر دینِ خالص کا حکم نہیں ہوتا بلکہ کچھ لین دین کا معاملہ ہوتا تو جھگڑا بھی نہیں ہوتا اور نہ پھر دینِ حق کو غلبہ ہوتا۔ اس سے صاف اور واضح ہے کہ لیظھرہ علی الدین کلہ کا اظہار قیامت تک ہوتا رہے گا۔ ایک تو اس کا اظہار فتحِ مکہ کے دن ہو گیا۔ دوسرے یہ بات اس دن بھی واضح ہو گئی اور ہمیشہ واضح رہی ہے کہ اسلام ہی ایک دین ہے جو پوری زندگی کو حاوی ہے اور اس میں کوئی سمجھوتا (compromise) نہیں ہے۔

جس اخلاص کا یہاں ذکر فرمایا گیا اس کا ذکر اس سے پہلی سورت میں بھی تھا۔ کافروں کی طرف سے بے پروائی کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی ناراضگی کی پروا نہ کی جائے جو اس کو پسند نہیں کرتا ہو کہ صرف اللّٰہ کا حکم مانا جائے۔ دنیاوی عزوجاہ کی خواہش بھی ایسے لوگوں کو ناخوش کرنے سے مانع ہوتی ہے اس لیے یہاں اللّٰہ تعالیٰ کی صفت رفیع الدرجات کا ذکر کیا گیا کہ وہ جسے چاہے عزت بخشے اور اس کی دلیل کے طور پر ذی العرش فرمایا گیا۔ جو درجہ آج بھی عمرفاروق رضی اللہ عنہ کو نہ صرف مسلمانوں کے نزدیک حاصل ہے بلکہ کافروں اور مشرکوں کے نزدیک بھی حاصل ہے وہ قیصرِروم یا فراعنۂ مصر کو حاصل نہیں ہے اور قیامت کے دن جب پوچھا جائے گا کہ آج کے دن کس کی حکومت ہے تو ہر شخص دیکھ لے گا کہ وہ دن خدا ہی کی حکومت کا دن ہے۔ اللّٰہ الواحد القہار، تو پھر اس چند روزہ زندگی اور عارضی عزت کے لیے کافروں کی خوشنودی کی فکر میں رہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ O (سورة المؤمن، آیت ۱۹)
وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان (باتوں) کو بھی جو سینوں میں پوشیدہ ہیں۔

اعمال میں لطیف ترین اعمال جن پر کسی اور کو کبھی کبھی اطلاع ہو سکتی ہے وہ آنکھ کی خیانت ہے اور اس سے بھی لطیف تر عمل دل کے اعمال ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ہی کو اطلاع ہو سکتی ہے۔ اس لیے ایک فاحشہ عورت کی بخشش اپنا دوپٹہ تر کر کے پیاسے کتے کو پلانے پر ہو گئی۔ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس نے کس جذبے اور کس نیت سے یہ کام کیا تھا جس کا اتنا بڑا اجر ملا۔ کبھی اس کے برعکس بھی ہوا جیسے بلی کو مار ڈالنے والی عورت کے ساتھ ہوا۔ اللہ ہی کو علم ہے کہ کس کے دل میں کیا ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ O (سورة المؤمن، آیت ۲۷)
اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب یہ بات سنی تو) کہا کہ میں اپنے اور تمھارے (یعنی سب کے) پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر خر دماغ شخص (کے شر) سے جو روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا۔

یہاں بھی آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے کو اور متکبر کو ایک ساتھ رکھا گیا۔ اگرچہ یہ قول خاص فرعون سے متعلق ہو سکتا ہے جو متکبر بھی تھا اور منکرِ آخرت بھی۔ لیکن دونوں میں ایک خاص رشتہ ہے کیوں کہ منکرِ آخرت کو اس کے اعمال خواہ کتنے ہی برے ہوں، اچھے کر کے دکھائے جاتے ہیں اور یہی بات کبر کی جڑ ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ ؕ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰہِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۳۵)

جو بلا کسی سند کے کہ ان کے پاس موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں اس (کج بحثی) سے خداتعالیٰ کو بھی بڑی نفرت ہے اور مومنین کو بھی اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور جابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ متکبرین، جابرین کا راہِ حق سے بھٹک جانا یقینی ہے۔ کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ ہی مہر لگا دیں تو ہدایت کیسے مل سکتی ہے اور اس سے یہ بات بھی حل ہوگئی کہ ایسے ایسے بظاہر عقل مند لوگ کیسے کافر اور مرتد ہو جاتے ہیں اور یہاں سے اس حدیثِ نبوی ﷺ کی بھی تائید ہوگئی کہ جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰھَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ○ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ کَاذِبًا ؕ وَکَذٰلِکَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا کَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۳۶، ۳۷)

اور فرعون نے کہا، اے ہامان میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں پھر (وہاں جا کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھو بھالوں اور میں تو موسیٰ (علیہ السلام) کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کی (اور) بدکرداریاں (بھی) اُس کو مستحسن معلوم ہوئی تھیں اور (سیدھے) رستوں سے رک گیا اور فرعون کی (ہر) تدبیر غارت ہی گئی۔

صدعن السبیل سے صاف ظاہر ہے کہ وہ روک دیا گیا تھا سیدھے راستے سے

اور اس کا سبب وہی تھا جس کا اوپر ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر متکبر جبار کے قلب پر مہر لگا دیتے ہیں۔

تَدۡعُوۡنَنِیۡ لِاَکۡفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشۡرِکَ بِهٖ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ ۫ وَّاَنَا اَدۡعُوۡکُمۡ اِلَی الۡعَزِیۡزِ الۡغَفَّارِ ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۴۲)

(یعنی) تم مجھ کو اس بات کی طرف بلاتے ہو کہ میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا ساجھی بناؤں جس (کے ساجھی ہونے) کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں اور میں تم کو خدائے زبردست خطا بخش کی طرف بلاتا ہوں۔

یہاں استدلال کا ایک لاجواب انداز ہے کہ تم کہتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ اس کو شریک کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے اور میں تمھیں ایک اللہ غالب بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں۔ فطری بات یہ ہے کہ اگر اللہ کو مانا جائے تو اسے تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ماننا پڑے گا۔

یہاں الذی امن سے وہی اشخاص مراد ہیں جن کا ذکر پہلے تھا کہ وہ ایمان کو چھپاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض حالات میں اپنے ایمان کو چھپانا جائز ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰهُمۡ ۙ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا هُمۡ بِبَالِغِیۡهِ ۚ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ○ (سورۃ المؤمن، آیت ۵۶)

(اور) جو لوگ بلا کسی سند کے کہ ان کے پاس موجود ہو خدائی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں ان کے دلوں میں بڑائی (ہی بڑائی) ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں سو آپ اللہ کی پناہ مانگتے رہیے بے شک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔

چونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں اس لیے ان سے پناہ مانگنے کا حکم ہے، ایک تو ان متکبرین کے شر کی وجہ سے جس کا ذکر آیت کے آخری ٹکڑے میں اشارتاً ہے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ کہیں ہم بھی خدانخواستہ ان جیسے نہ ہو جائیں جس طرح کسی معذور کو دیکھ کر دعا مانگنے کی ہدایت ہے کہ خدا کا شکر ہے اس نے ہمیں اس سے محفوظ رکھا۔

اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ قرآن شریف کی آیات کو نئے نئے معانی پہنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اب چودہ سو سال بعد یہ حکم ناقابلِ عمل ہو گیا ہے وہ بھی کبر ہی کی وجہ سے کرتے ہیں اور ان کے شر سے بھی پناہ مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ظاہری وباطنی شر سے اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رکھیں۔(آمین)

هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ (سورۃ المؤمن، آیت ۶۵)

وہی (ازلی ابدی) زندہ (رہنے والا) ہے، اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں سوتم (سب) خالص اعتقاد کر کے اُس کو پکارا کرو، تمام خوبیاں اُسی اللہ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہان کا۔

وہ زندہ ہے، ہر وقت تمھیں دیکھ رہا ہے، تمھاری باتیں سنتا ہے، تمھاری دُعائیں قبول کرتا ہے۔ اس نے اپنی حاکمیت سے استعفیٰ نہیں دیا، نہ کسی کو اس نے اپنا وزیر بنایا ہے کہ تمھیں کسی اور کو پکارنے کی ضرورت پڑے۔ تم سے صرف اتنا مطالبہ ہے کہ تم یکسو ہو کر اخلاص سے اس کی عبادت کرو اور یہ مطالبہ فطرت کے مطابق بھی ہے اور آسان بھی ہے۔ اگر کئی خداؤں کی طرف رجوع کرنا ہوتا تو ان کے متضاد مطالبے ہو سکتے تھے جن کو پورا کرنا بہت دشوار ہوتا کہ کس کو خوش کریں کس کو ناخوش۔ اب تو بس

صرف ایک ہی کو خوش کرنا ہے، ایک ہی کی عبادت کرنی ہے۔ تمام امور صرف ایک اس کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا یہ بہت بڑے شکر کی بات نہیں ہے؟ الحمدللہ رب العلمین۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَO (سورۃ المؤمن، آیت ۶۰)

اور تمھارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا جو لوگ (صرف) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

حدیث شریف میں دعا کی جو فضیلتیں آئی ہیں (الدعا --- العبادۃ) اور بزرگوں نے جو دعا کو عین عبدیت کہا ہے، واقعی دعا ایسی ہی چیز ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کتنی رحمت اور کتنی شفقت سے ہم سے خطاب فرما رہے ہیں، مجھ کو پکارو میں تمھیں جواب دوں گا، مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ نے جمعہ ۸؍ مارچ ۱۹۸۵ء کی مجلس میں دعا کی فضیلت بڑی تفصیل سے بتائی تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے، ''دعا مانگنے کے بعد آدمی محروم نہیں رہ سکتا۔'' دعا مانگنے سے خلش جاتی رہتی ہے، دل سے دعا مانگنے کے بعد جو بھی کرو گے اس میں خیر ہی ہو گا۔ اللہ میاں سے باتیں کرنے کی عادت ڈالو۔''

اس آیتِ کریمہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دعا کبر کا علاج ہے کیوں کہ یہاں دعا مانگنے کا حکم ہے اور مستکبرین کے لیے جہنم کا وعدہ ہے... یستکبرون عن عبادتی... معلوم ہوا کہ دعا عبادت ہے۔ ذوقاً اور وجداناً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض دعائیں جو بظاہر قبول نہیں ہوتیں وہ قبول تو ہوتی ہیں لیکن اسے دوسروں کی نظر سے پوشیدہ کر دیا جاتا ہے تاکہ دعا مانگنے والا ان کے شر سے محفوظ رہے اور کبھی خود اس کی نظر سے بھی چھپا دیا جاتا

ہے اور بعض مرتبہ ان مصلحتوں کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ ہی کا معاملہ ہیں عمل اور ردِعمل کا قانون تو جاری رہنے دیا جاتا ہے لیکن دعا مانگنے والے کو عافیت دے دی جاتی ہے، مثلاً بدپرہیزی سے دست آنے لگے۔ توبہ کی، دعا کی، دست تو نہیں رکے لیکن اب وہ حقیقتاً بیماری نہیں رہی بلکہ بہت سی بیماریوں کے لیے دفاع (preventive cure) ہو گیا۔

یا اور کوئی فائدہ ہو گیا جس کا علم فوری طور پر نہیں ہو سکا۔ صورتاً تکلیف اور حقیقتاً راحت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سیکریٹری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا یا تھانے داری سے لائن حاضر کر دیا گیا تو لوگ تو سمجھ رہے ہیں کہ اس پر بڑی مصیبت آ گئی لیکن وہ خدا کا شکر ادا کر رہا ہے کہ بہت سے جھنجھٹوں سے نجات ملی۔

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دعا کی قبولیت کی شرائط میں سے ہے کہ قلب حاضر ہو، قلب لاہِ کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے ان سے توبہ کر لی جائے، پھر دعا مانگی جائے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًاؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْفَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَایَشْكُرُوْنَ○ (سورۃ المومن، آیت ۶۱)

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے (نفع کے) لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو (دیکھنے کے لیے) روشن بنایا بے شک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا ہی فضل ہے لیکن اکثر آدمی (ان نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے۔

سکون حاصل کرنے میں شکر کا بڑا دخل ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وانعامات کو یاد کرنا شکر کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور ایک فضل خود رات کا آنا ہے کہ جو لمحہ آتا ہے

آرام کرنے کے لیے غنیمت ہے اور اسی طرح دن کا آنا ہے کہ جو لمحہ آتا ہے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کے لیے غنیمت ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (سورۃ حٰم السجدۃ، آیت ۶،۷)

آپ فرما دیجیے کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں، مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اس (معبودِ برحق) کی طرف سیدھ باندھ لو اور اس سے معافی مانگو اور ایسے مشرکوں کے لیے بڑی خرابی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں۔

انسان کو اگر اپنی عقل پر تنہا چھوڑ دیا جاتا کہ وہ خدا تک اپنی عقل سے پہنچے تو اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن ہو جاتا، لہٰذا وقتاً فوقتاً اس کو یاد دلانے کے لیے کہ اس کا کوئی اللہ ہے، وحی آتی رہی۔ اب وحی کی روشنی میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کائنات کا کوئی رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کے احکامات کی بجاآوری ایک فطری بات ہے۔ لیکن چونکہ انسان کی فطرت میں نسیان ہے لہٰذا اس کو بار بار یاد دلاتے رہنا ہے کہ اس کو صراطِ مستقیم پر رہنے کی ضرورت ہے، فاستقیموا الیہ اور چونکہ لغزش سرزد ہو جانا بھی فطری امر ہے لہٰذا حکم ہے واستغفروہ۔ استغفار سے استقامت کی تکمیل اور ایمان کی حفاظت ہوتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی اتنی رحمتوں کے باوجود (شروع سورت ہی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہے) جو شخص اس کی اطاعت سے انکار کرے اس کے لیے واقعی بہت بڑی خرابی ہے۔ اسی انکار کی ایک شق زکوٰۃ نہ دینا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَO نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَO نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍO (سورۃ حٰمٓ السجدۃ، آیت ۳۰ تا ۳۲)

جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جاتا تھا اور ہم تمھارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمھارے لیے اس (جنت) میں جس چیز کو تمھارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمھارے لیے اس میں جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے۔

آیت ۳۰ میں بھی جنت کا وعدہ ہے اور سورۃ النازعات میں من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ کے لیے بھی جنت کا وعدہ ہے۔ ایک جگہ استقامت پر دوسری جگہ اپنے کو خواہشات سے روکنے پر۔ معلوم ہوا کہ دونوں صفات ایک ہی ہیں اور منفی اور مثبت اعمال کی تقسیم محض فرضی ہے۔

ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب مومن مرنے لگے گا کیوں کہ ''فاستقاموا'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری زندگی اس پر قائم رہے۔ مرنے کے وقت فرشتے تسلی اور خوش خبری دیں گے کہ آئندہ آنے والی زندگی سے خوف زدہ نہ ہو۔ ہم تمھارے ساتھ قبر میں بھی ہیں اور حشر میں بھی رہیں گے۔ ہم تمھارے حساب کتاب میں آسانی کر دیں گے اور اگر دنیا میں تمھیں بظاہر کامیابی نہیں ہوئی اس پر کچھ افسوس نہ کرو۔ تمھاری استقامت ہی تمھاری اصلی کامیابی تھی اور تمام کوششوں کا نتیجہ جنت کی صورت میں تمھیں مل جائے گا۔ چاہے فی الحال شہادت کی صورت میں یا تمام گناہ معاف کر دیے جانے کی صورت میں یا نیکیوں کا پلہ بھاری ہونے کی صورت میں۔ یا

فی الحال تھوڑی عقوبت سہہ لینے کے بعد جنت تو تمہاری ہے ہی۔ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق رہے تھے اور آخرت میں بھی رہیں گے۔ دنیا میں جو تم ثابت قدم رہے تو ہماری ہی مدد سے تو ثابت قدم رہے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ گفتگو مرتے وقت ہوگی اور قبر میں ہوگی اور بعث کے وقت ہوگی اور دنیا میں رفیق رہنے کی مثال نیکیوں کا حوادث میں قائم رکھنا اور صبر وسکینہ ملائکہ ہی کا فیض ہے، پس وہ حسبِ حدیث قرین رہتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ ○ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنۡ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ‌ؕ وَالظّٰلِمُوۡنَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ○ اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ‌ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الۡوَلِىُّ وَهُوَ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى‌ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○ (سورۃ الشوریٰ، آیت ۷ تا ۹)

اور ہم نے اسی طرح آپ پر (یہ) قرآنِ عربی وحی کے ذریعے سے نازل کیا ہے تاکہ آپ (سب سے پہلے) مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے آس پاس ہیں ان کو ڈرائیں اور جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں (داخل) ہوگا اور ایک دوزخ میں ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو ایک ہی طریقے کا بنا دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور (ان) ظالموں کا (قیامت کے روز) کوئی حامی مددگار نہیں۔ کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں۔ سو اللہ ہی کارساز ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ایک فریق کا جنت میں جانا اور ایک فریق کا جہنم میں جانا تو طے ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل ہے، وہ جس کو چاہیں اپنی رحمت میں داخل فرما لیں یعنی

اس فریق میں بنا دیں جو جنت میں جائے گا اور ظالموں کے لیے کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ جہنم میں جائیں گے اور شرک چونکہ ظلمِ عظیم ہے اس لیے مشرک جہنم میں جائیں گے۔

حکمِ تکوینی میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے اور اس میں ان گنت مصالح ہیں۔ پوشیدہ بھی ہیں اور چند ایسے بھی جو ظاہر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا کہ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے تو اس کی رحمت کے جو امیدوار ہیں ان کو اچھی امید ہی رکھنی چاہیے اور جو اس سے بے پروا ہو گئے انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ رحمت سے محرومی کے مستحق ہو گئے اور جو اس کے بجائے کسی اور کو اپنا دوست اور مددگار سمجھے تو اس کا کون مددگار ہو سکتا ہے۔

ایک سوال بعض لوگ کرتے ہیں کہ پھر کیوں محنت مشقت کی جائے اس کا جواب اشارتاً آیت ۹ میں ہے کہ پھر کیا اور کوئی دروازہ ہے جہاں جاؤ گے اور جنھوں نے کوئی اور معبود ڈھونڈ لیا ہے جس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں تو کیا وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ اللہ ہی کے دستِ قدرت میں سب کچھ ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ جب یہ باتیں اظہر من الشمس ہیں تو خواہ ہماری تقدیر میں کچھ بھی لکھ دیا گیا ہو ہم اس کا دروازہ چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتے کیوں کہ اس کے دروازے کے سوا کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔

بخشش اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور عذاب گویا رحمت کو روک لینا ہے۔ بادشاہ جس کو جتنا چاہے دے اور جسے نہ چاہے نہ دے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور اس نے اپنی رحمت کی بے پایاں وسعت کا اعلان بھی فرمایا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جو اس کی رحمت کی امید کرے گا وہ اس میں داخل ہو جائے گا۔ پھر بھی جو ظالم کسی اور کو دوست بنائے اس کا کوئی والی اور ناصر ہو سکتا ہے؟

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا
وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ط لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ O (سورۃ الشوریٰ، آیت ۱۱)

وہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس نے تمھارے لیے تمھاری جنس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) چارپایوں کے جوڑے بنائے (اور) اس کے (جوڑے ملانے کے) ذریعے سے تمھاری نسل چلاتا رہتا ہے، کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے۔

نہ صرف اس کی ذات یکتا و بے مثال ہے، صفات میں بھی اس کی رحمت بے مثال ہے اور وہ خالق بھی بے مثال ہے جو چیزیں اس نے پیدا فرمائی ہیں ان میں سے کسی چھوٹی سے چھوی چیز کی طرح کی کوئی چیز تمام مخلوقات مل کر بھی چاہیں تو نہیں بنا سکتے بلکہ کسی بھی مخلوق کا پورا علم کسی کو نہیں ہے۔ اس کی صفات علم وحکمت وعمل وغیرہ میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ الحمدللہ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط اَللّٰهُ
يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ O (سورۃ الشوریٰ، آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے ہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی

ہے جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔ اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔

اب تشریحی حکم ہے اور پھر اسی بات کا اثبات ہے جو آیت ۸ میں کہی گئی تھی کہ اپنے لیے جس کو چاہے چن لے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے۔ دوست کی طرف آئینہ کا رخ جو کرے اور اسے دوست کے نزدیک قابل قبول بنانے میں جو لگا رہے اس پر درست کی تجلی جمالی وجلالی کا عکس پڑے گا۔ پہلے ٹکڑے سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار مقصود ہے کہ وہ جس کو چاہے ہدایت دے اور دوسرے ٹکڑے سے عادت اللہ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے اور یہ مشاہدے کی بات ہے۔

اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ہُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ۝

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۱۹)

اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر مہربان ہے جس کو (جس قدر) چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہ قوت والا زبردست ہے۔

کس کو کیوں بے شمار رزق عطا کرتا ہے اور کس کو ناپ تول کر دیتا ہے اس کا تو علم اسی کو ہے۔ ظاہری طور پر رزق میں کمی نظر آتی ہو یا کوئی اور پریشانی لاحق ہو تو اس کی ایک مصلحت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس پریشانی کی وجہ سے بندہ اپنے گناہوں پر نادم ہو اور تضرع کرے اور اگر وہ پریشانی کسی گناہ کی وجہ سے نہ ہو اور صرف آزمائش ہو تب بھی تضرع سے اس آزمائش میں کامیابی ہوتی ہے، لہٰذا ہر حال میں تضرع نافع ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْلَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (سورة الشوریٰ، آیت ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

دنیا کا ارادہ کرنا یا دنیا چاہنا اور دنیا کا حاصل کرنا یا حاصل ہو جانا الگ الگ چیزیں ہیں۔ جہاں تک چاہنے کا تعلق ہے، وہاں دو واضح الگ الگ راستے ہیں دنیا چاہنا اور آخرت چاہنا، یعنی مطمعِ نظر بنانا۔ البتہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے اور لوگوں میں مل جل کر رہنے کے لیے بعض اسبابِ معیشت اور اسبابِ راحت ضروری ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا مباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے، مثلاً مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے جہاد کا حکم ہے اور فتح ونصرت کا وعدہ بھی ہے (یعنی بالآخر)۔

دوسری بات جس کا اشارہ اس آیتِ کریمہ سے ملتا ہے یہ ہے کہ جس نے آخرت کا ارادہ کیا اس کے لیے آخرت میں زیادہ بدلہ یعنی بہتر بدلہ ملنے کا وعدہ ہے اور دنیا ملنے کی مطلق نفی نہیں کی گئی ہے۔ برخلاف دنیا کا ارادہ کرنے والوں کے جن کے لیے آخرت میں بدلہ ملنے کی مطلق نفی کی گئی ہے کیوں کہ ان کو آخرت پر یقین ہی نہیں ہے۔ اور آخرت کا ارادہ کرنا یہ ہے کہ اگر آخرت کے شمار برابر میں نقصان سے دنیا کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہو پھر بھی آدمی آخرت اختیار کرے اور دنیا کا فائدہ چھوڑ دے تو وہ آخرت کا ارادہ کرنے والوں میں ہوگا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے کمالِ رحمت سے انسانی کمزوری کی وجہ سے اضطراراً دنیا کی طرف متوجہ ہونے سے درگزر فرمایا ہے جب تک اس پر عمل نہ ہو۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ○ (سورۃ الشوریٰ، آیت ۲۷)

اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لیے روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے لیکن جتنا رزق چاہتا ہے انداز (مناسب) سے (ہر ایک کے لیے) اتارتا ہے، وہ اپنے بندوں (کے مصالح) کو جاننے والا (اور ان کا حال) دیکھنے والا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ ایک خاص مقدار میں ہے۔ بے حساب نہیں ہے اور آخرت ہی میں نہ ختم ہونے والی دولتیں ہیں مومنین کے لیے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ○ (سورۃ الشوریٰ، آیت ۲۸)

اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے نااُمید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور وہ (سب کا) کارساز قابلِ حمد ہے۔

نااُمیدی کے بعد بارش اور مرض کے بعد صحت بے انتہا خوشی کا باعث ہوتے ہیں ورنہ آدمی ہمیشہ اچھا رہے تو صحت کی کیا قدر ہو۔

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ○ (سورۃ الشوریٰ، آیت ۳۰)

اور تم کو (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

روحانی اور جسمانی امراض اور مصیبتوں میں انسان کا اپنا قصور بھی ہوتا ہے مگر چونکہ عفوِکثیر پر کارخانۂ قدرت کا مدار ہے اس لیے جہاں مصیبت میں انسان پڑ جاتا ہے سوچنے لگتا ہے کہ پہلے بھی یہ گناہ کیا تھا اس کا اثر کیوں نہیں ہوا، یا یہ کہ بہت سے لوگ اس طرح کا بلکہ اس سے زیادہ گناہ کرتے ہیں ان پر یہ افتاد کیوں نہیں پڑی، مجھ ہی کو یہ کس بات کی سزا ملی؟ اس کا جواب یعفوعن کثیر میں ہے اور کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ دوسرے کو معافی کیوں ملی۔ اس طرح بدپرہیزی سے جسمانی امراض پیدا ہوتے ہیں لیکن ہزاروں بدپرہیزوں کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا اور بے شمار لوگ بدپرہیزیاں کرتے رہتے ہیں لیکن فطرت کے قانون کے مطابق جوعفو کا قانون ہے ان کے اثرات دور ہوتے رہتے ہیں اور وہ بیمار نہیں پڑتے۔ قدرتی مدافعتِ جسمانی اثر سمجھ کر ہم بھول جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی اللّٰہ تعالیٰ کے لامتناہی عفو کا کرشمہ ہے۔

اس عفو کا کوئی قانون مقرر نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ کی مصلحت کون جان سکتا ہے۔ لہٰذا مصیبت میں اپنے اعمال کا جائزہ لے کر استغفار کرنا چاہیے اور دوسروں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اس پر نظر نہیں کرنی چاہیے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ مصیبت اپنے کیے کا بدلہ ہے اور دین اور دنیا دونوں کو عام ہے یعنی اپنی بے وقوفی کا یا اپنی جہالت کا نقصان دنیاوی معاملات میں بھی ہوتا ہے۔

قال اولو جئتک بشیءٍ مبینٍO (سورۃ الشعرا، آیت ۳۰)

موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کر دوں تب بھی (نہ مانے گا)؟

وورث سلیمٰنُ داوٗد وقال یاَیُّھَاالنّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّیرِ وَاُوْتِینا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ط اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُO (سورۃ النمل، آیت ۱۶)

اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے) قائم مقام سلیمان (علیہ السلام)

ہوئے اور انھوں نے (اظہارِ شکر کے لیے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو (سامانِ سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں واقعی یہ (اللہ تعالیٰ) کا صاف فضل ہے۔

وَلَوۡ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَہُمۡ بِالۡخَیۡرِ لَقُضِیَ اِلَیۡہِمۡ اَجَلُہُمۡ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ○

(سورۃ الیونس، آیت ۱۱)

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کے جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدے کے لیے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا سو (اس لیے) ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلاعذاب چند روز) چھوڑ رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

ان تینوں آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادت اللہ ایسی جاری ہے کہ انسانوں کو ان کے گناہوں کا بدلہ عام طور سے فوراً نہیں مل جاتا، بلکہ یا تو معاف ہو جاتا ہے (نمبر۳) ایک وقتِ مقررہ پر ملتا ہے۔ (نمبر۱، نمبر۲)

عمل اور ردِعمل کا قاعدہ ہر جگہ جاری ہے یہاں تک کہ بعض دفعہ آدمی کوئی نیک کام کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا نقصان ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو غلطی آج ہوئی ہے اس کی سزا آج ہی مل جائے۔ ہوسکتا ہے وہ معاف ہوگئی ہو یا ہو سکتا ہے کہ وہ نامۂ اعمال میں درج کر دی گئی ہو اور اس کا بدلہ دنیا میں کسی اور مقررہ وقت پر مل جائے یا آخرت میں اس کی سزا ملے یا دونوں جگہ سزا ملے (نعوذباللہ من جمیع سخطہ) جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے ''اصلاح النفس'' میں فرمایا: ''صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو جو شخص روزانہ ڈکیتی ڈالتا ہو اگرچہ مہینے تک بچا رہے تو تعجب ہونا چاہیے اور پکڑا جائے تو کچھ تعجب نہیں۔ ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جو گناہ ہم روزانہ کرتے ہیں ان پر پکڑ نہیں ہوگی، خدا تعالیٰ ان سے تو ناراض نہیں ہوئے وہ تو معاف ہو گئے۔ اس وجہ سے جب مصیبت کے وقت فکر کرتے ہیں تو نئے گناہوں

کو دیکھتے ہیں حالانکہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر آج گناہ کیا تو آج ہی اس کی سزا بھی مل جائے۔" (مثلاً مٹھائی زیادہ کھانے کی وجہ سے پھوڑے پھنسیاں اسی روز نہیں نکلتیں)۔ یعنی گناہ اور اس کی سزا میں جو اسباب وعلل کا رشتہ ہے اس کا پتا یا تو اسی وقت چل جاتا ہے کہ ہوشیاری سے گاڑی نہیں چلائی تو ٹکر ہوگئی یا بعد میں پتا چلتا ہے کہ ماضی میں فلاں گناہ کیا تھا جس کی یہ سزا ملی اور کبھی کبھی بالکل پتا نہیں چلتا۔ خصوصاً جب اپنے احتساب کی عادت نہ ہو اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی وہ اعمالِ تقرب نہیں کرتا جو اسے کرنا چاہییں اور قرب کے ایک خاص درجے تک پہنچنا اس کا مقدر ہو چکا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کسی مصیبت میں گرفتار کر دیتے ہیں جس پر وہ صبر کرتا ہے تو اسے وہ درجہ مل جاتا ہے۔

ایک اور وجہ سے بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کی محبت کا امتحان لیا جاتا ہے۔ یہ بھی اپنے ہی ہاتھ کی کمائی ہوتی ہے۔ جیسے آدمی اپنی پس ماندہ رقم سود پر بینک میں نہ رکھے اور اس کی وجہ سے تنگ دستی میں مبتلا ہو، یا ایمان داری کی وجہ سے لوگ اس کی جان کے پیچھے پڑ جائیں تو یہ بھی اس کے ہاتھ کی کمائی ہے اور خدا کی محبت کا نام لے تو ایسی مصیبت صرف ظاہری مصیبت ہوتی ہے جو دوسرے لوگوں کو نظر آتی ہے اور خود وہ شخص مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ O اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَهْرِهٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ O (سورۃ الشوریٰ، آیت ۳۲،۳۳)

اور من جملہ اس کی نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھیرا دے تو وہ (بحری جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جاویں بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر (یعنی مومن) کے لیے۔

یہ جو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم ہے کہ ہر خوشی کے موقع پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف نظر کی جائے اور چپکے سے دل ہی دل میں شکر ادا کر لیا جائے اور ہر ناگواری کے موقعے پر بھی اللہ ہی کی طرف نظر کی جائے اور صبر کیا جائے کہ یہ ہمارے مالک ہی کی طرف سے ہے اور اس میں ہمارے لیے خیر ہی ہے۔ اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو آدمی کسی کو سزا نہ دے نہ کسی سے بدلہ لے تو یہ تو ایک طرح کی جمود والی زندگی ہو جائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر واقعے پر عملی ردِعمل تو انسان کی فطرت ہے تو جب تک اللہ تعالیٰ سے قوی رشتہ نہ جوڑ لیا جائے اس وقت تک یہ عام انسان کا ردِعمل ہو گا اور اللہ تعالیٰ سے رشتہ مضبوط ہو جانے پر یہ مومن کا ردِعمل ہو گا اور باعثِ اجر ہو گا۔

نیز یہ بات بھی جاننے کی ہے کہ شکر اور صبر دونوں نہایت مثبت باتیں ہیں۔ ایک شاکر کی زندگی عملاً شکر کی زندگی ہے جیسے فرمایا گیا اعلموا ال داؤد شکرا۔ اس طرح صبر کرنا اور دوسرے کو معاف کر دینا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جیسا اس سورۃ کی آیت نمبر ۴۳ میں فرمایا گیا ہے کہ جو صبر کرے اور معاف کر دے فان ذالک من عزم الامور۔

''صبار'' اور ''شکورا'' ایک ساتھ لایا گیا ہے۔ پوری طرح شکر کرنے والا آدمی وہی ہو سکتا ہے جو بہت صبر کرنے والا ہو۔ حضرت عارفیؒ نے جیسا کہ فرمایا، ''حد یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی تکلیف یا پریشانی لاحق ہو جائے تو اس کے تدارک سے پہلے اس پر نظر کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر استحقاق کے گردوپیش میں کتنی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں جو تقویتِ قلب کا باعث ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو اس پریشانی اور تکلیف کی کیا حالت ہوتی۔''

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ O (سورۃ الشوریٰ، آیت ۴۳)

اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے یہ البتہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

معاف کرنا اس وقت ہوتا ہے جب آدمی بدلہ لینے پر قادر ہو اور اگر بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو معاف کرنا یہ ہے کہ دل میں کینہ نہ ہو کہ اگر کبھی موقع ملا تو میں اس کو نقصان پہنچاؤں گا۔

یہ سمجھ کر صبر کرنا چاہیے کہ جو ابھی اذیت مجھے پہنچی ہے وہ میرے لیے پہلے سے مقدر تھی تو اس پر واویلا کیسا۔ لیکن اس کی وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بے چارے اذیت پہنچانے والے کا کیا قصور، کیوں کہ ایسا سوچنا فطرت کے بھی خلاف ہے اور حقیقت کے بھی۔ اگر اس سے بدلہ لے لے تو یہ رجوع الیٰ اللّٰہ کے خلاف نہیں ہوگا لیکن اللّٰہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی معاف کر دے تو یہ اور اچھی بات ہے اور یہ عزم الامور میں سے ہے۔

یا یہ سمجھ کر صبر کرنا چاہیے کہ جو اذیت مجھے پہنچی ہے میرے مالک ہی کی مشیت سے پہنچی ہے خواہ میرے کسی گناہ پر تنبیہ ہے، خواہ امتحان ہے، خواہ رفعِ درجات کے لیے ہے۔ ایسا سمجھنے والے کو اذیت پہنچانے والے سے بدلہ لینے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ یہ بھی عزم الامور میں سے ہے۔ اس طرح صبر پر عمل پیرا ہونے سے جذبۂ شکر کی بھی تربیت ہوتی ہے۔

❁

اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَO (سورۃ الزخرف، آیت ۳)
کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ (اے عرب) تم (آسانی سے) سمجھ لو۔

ہمارے لیے بھی اس کا عربی ہی میں نازل ہونا مفید ہے۔ لہٰذا ایک لحاظ سے عربی جاننا سبھوں کے لیے ہے۔

❁

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاۤءًۢ بِقَدَرٍۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًاۚ
كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ O (سورۃ الزخرف، آیت ۱۱)
اور جس نے آسمان سے پانی ایک انداز سے برسایا۔ پھر ہم نے اُس سے
خشک زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کیا اسی طرح تم (بھی اپنی قبروں
سے) نکالے جاؤ گے۔

پہلا ماجرا (process) چونکہ روز نظروں کے سامنے ہوتا رہتا ہے اس لیے اس میں کوئی تعجب نہیں ہوتا حالانکہ مردہ زمین کا زندہ ہونا پھر مٹی سے سبزیاں، اناج وغیرہ بننا پھر اس سے خون بننا اور نطفہ بننا پھر اس سے آدمی بننا یہ روزمرہ کی بات ہے جو اپنی جگہ پر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے کم تعجب خیز نہیں ہے۔ جب اس پر تعجب نہیں کرتے ہو تو خدا کے وعدے پر یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر کیوں تعجب کرتے ہو اور کیوں اس کا انکار کرتے ہو۔

یہی حال نعمتوں کا ہے کہ جو بڑی بڑی نعمتیں ہر وقت بادشاہ اور گدا سب کو ملتی رہتی ہیں ان کی اہمیت دل میں نہیں آتی۔ البتہ نعمت چھن جانے پر اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر اس کی قدر جاننے کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍۗ
اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ O اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ
مُسْتَمْسِكُوْنَ O بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى
اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ O (سورۃ الزخرف، آیت ۲۰ تا ۲۲)
اور وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ
کرتے۔ ان کو اس کی کچھ تحقیق نہیں۔ محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں۔ کیا
ہم نے ان کو اس قرآن سے پہلے کوئی کتاب دے رکھی ہے کہ یہ اس سے

استدلال کرتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں۔

یہاں کافروں کے استدلال کو ان ہی کے قول سے بے بنیاد ثابت کیا گیا ہے جس طرح اس سے اوپر کی آیت واذا بشر... فی الخصام غیرمبین سے ان کو احمق ثابت کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی منشا کا علم ان کو کس طرح ہوا؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم اور غیب کا علم جس میں تقدیر بھی شامل ہے، وحی کے سوا ناممکن ہے۔ تو کیا ان کے پاس پہلے سے کوئی کتاب (اللہ کی) ہے جس سے وہ یہ کہتے ہیں اور اگر وہ واقعی ایسا سمجھتے ہیں تو پھر یہ کیسے کہتے ہیں کہ جو ہم باپ دادا کو کرتے دیکھتے آئے ہیں وہی کریں گے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجبورِ محض نہیں سمجھتے صرف اللہ پر ایمان لانے اور شرک چھوڑنے میں اپنے آپ کو مجبورِ محض کہتے ہیں۔ انھوں نے صرف تقدیر کا نام سن رکھا ہے ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ کس طرح تقدیر بھی برحق ہے اور انسان کی ذمہ داری اور جزا و سزا بھی برحق ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کی کنہ کا علم کسی کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی پوری حقیقت جانتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایمان دیا ہے وہ ان دونوں باتوں کو بدیہی طور پر جانتے ہیں اور احکامِ الٰہی کی پیروی دل وجان سے کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں سے بھی بہت سے بے عمل تقدیر کا بہانہ بناتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍO اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَO

(سورۃ الزخرف، آیت ۳۱، ۳۲)

وہ کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلامِ الٰہی ہے تو) ان دونوں بستیوں (مکہ اور طائف کے رہنے والوں)

میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں دنیوی زندگی میں (تو) ان کو روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور آپ کے رب کی رحمت بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں۔

یہاں سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس کو بھی جو مل رہا ہے ان ہی کی مشیت سے مل رہا ہے، لہٰذا کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ قرآن کسی ''بڑے آدمی'' پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ جب معیشتِ دنیوی کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تو اس سے اوپر کی بات اور بھی انسانی دسترس سے بالا و برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور اس کا ارادہ ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔

دنیوی معیشت کی تقسیم بلکہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہو رہا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ جب انسانوں کے اعمال اور احوال کا جائزہ لیا جائے گا تو اگر کوئی شخص ڈاکا ڈال کر امیر ہوا ہو تو برسرِاقتدار لوگوں پر یہ واجب ہو گا کہ اس سے مال چھین کر جن کے اموال لوٹے گئے ہوں ان کو واپس کر دیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے پر نظر کی جائے گی تو جو کچھ ہو رہا ہے سب کا خالق اس کو ماننا واجب ہو گا اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب ہماری آزمائش کے لیے ہے کہ دیکھیں ہم ایسے موقعے پر کیا کرتے ہیں۔ قضائے الٰہی سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا اور اس کی طرف رجوع کرنا سب پر واجب ہے۔ البتہ جن پر عمل کرنے اور انصاف کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے ان پر ظلم اور برائی کو روکنا حسبِ استطاعت واجب ہے اور جن پر ظلم ہو، انھیں اس کا بدلہ لے لینا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں حاکم بنا دیں اور جس کو چاہیں محکوم بنا دیں۔ اس کی قدرتِ کاملہ پس پردہ کام کرتی رہتی ہے اور عام طور سے ظاہرہ اسباب کا سلسلہ ہر وقت

لگا رہتا ہے۔ لہٰذا ہر واقعے پر دو طرح کا ردِعمل ہونا چاہیے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف نظر کر کے خالق ہونے کی حیثیت سے اللّٰہ لقکم وماتعلمون۔ دوسرے انسانوں کی طرف فاعل ہونے کی حیثیت سے۔ ان دونوں باتوں کو جمع کرنا ممکن معلوم نہیں ہوتا لیکن عقلاً ممکن ہے کیوں کہ مصیبت کو اور ظلم کو دور کرنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس طرح اپنا حق حاصل کرنا، ترقی اور خوشحالی کے لیے دوڑ دھوپ کرنا یہ سب فطری تقاضے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے، یااللہ ! یہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ ہی کے حکم سے ہو رہا ہے، یااللّٰہ ! آپ ہی اس مصیبت کو دور کر سکتے ہیں ہم آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، یااللّٰہ ! آپ اس مصیبت کو دور فرما دیجیے، یااللّٰہ ! آپ اس مشکل کو حل فرما دیجیے اور اس کے بعد ظلم یا مصیبت کے انسداد کی طرف متوجہ ہوا جائے، تو یہ عین ایمان کے تقاضے کے مطابق ہو گا۔ مصیبت کو اللّٰہ کے حکم سے سمجھ کر مصیبت سے راضی رہنا واجب نہیں ہے بلکہ اللّٰہ سے راضی رہنا واجب ہے اور اللّٰہ ہی کے حکم سے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا عین فطری امر ہے جو کبھی واجب ہے اور کبھی مستحب ہے۔ قلب میں ان دونوں ردِعمل کا جمع ہو جانا ایمان ہی کی بدولت ہے۔

ولَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَO وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَO وَزُخْرُفًاؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَاؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَO (سورة الزخرف، آیت ۳۳ تا ۳۵)

اور اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جاویں

گے تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے لیے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور (نیز) زینے بھی جن پر سے چڑھا (اترا) کرتے اور ان کے گھروں کو کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی اور یہ سب (سازوسامان) کچھ بھی نہیں صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (پھر فنا آخر فنا) اور آخرت آپ کے رب کے ہاں خدا ترسوں کے لیے ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مراد اور تمنا اور ان کا مطمعِ نظر صرف آخرت ہونا چاہیے۔ دنیا کی طرف تو ضرورتاً متوجہ ہونا ہی پڑے گا چونکہ انسان کو بہت سی چیزوں کا محتاج بنایا گیا ہے اور اس کی فطرت میں خواہشات رکھی گئی ہیں اور جیسا اس آیتِ کریمہ میں ہے کہ اگر سارے کفار کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دی جاتیں تو یہ بات متوقع تھی کہ سب ہی ایک طرح کے ہو جاتے لٰہذا اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس امتحان میں نہیں ڈالا۔ لیکن دنیا سے زیادہ حاصل کرنے کی تمنا، یہ خواہش کرنا کہ کاش ہم بھی اس عیش وعشرت کے ساتھ رہتے جیسے کفارہ رہے ہیں، یہ سب باتیں بہت مہلک ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ کی مشیت میں کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ کی حکم براری اصل مقصدِ حیات ہے اور وہ ہمیں ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جو ہمارے اختیار میں ہو گا اور اگر ہم ایسا کرتے رہے تو آخرت متقیوں کے لیے ہے۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌO
وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَO
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ نَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ
فَبِئْسَ الْقَرِيْنُO وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ
مُشْتَرِكُوْنَO (سورۃ الزخرف، آیت ۳۶ تا ۳۹)

اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن) سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ ان کو راہِ حق سے روکتا رہتا ہے اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ (راست) پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آئے گا تو (اس شیطان سے) کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان میں (دنیا میں) مشرق و مغرب کے برابر فاصلہ ہوتا کہ (تُو تو) بُرا ساتھی تھا اور (ان سے کہا جائے گا کہ) جب کہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو آج یہ بات تمھارے کام نہ آئے گی کہ تم (اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ''یعش'' کا ترجمہ ''آنکھیں چرانا'' کہا ہے۔ واقعی جو آنکھیں چرائے ہدایت سے اس کا ساتھی شیطان ہوتا ہے خواہ جن ہو، خواہ آدمی، جیسا حضرت شاہ صاحب نے تفسیر کی ہے۔ دنیا میں بھیج دینا، پھر علم دے کر بھیجنا، پھر رسول بھیجنا، یہ سب آزمائش ہے کہ کون رحمٰن کی یاد میں رہتا ہے اور کون ایسے مہربان مالک اور آقا کو بھول بیٹھتا ہے۔

یہ بات کہ جب سارے ہی برے ہیں تو ہم کیوں اچھے رہیں، نہایت بے وقوفی کی بات ہے کیوں کہ جہنم میں جانے والے کو یہ بات کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی کہ سب لوگ عذاب میں اکٹھے ہیں، نہ ہی اس سے کوئی تسلی ہو سکتی ہے۔ اسلام بیک وقت اتنا انفرادی مذہب ہے کہ اگر ساری دنیا بھی کافر ہو جائے اور ایک مومن رہ جائے تو اس کو ایمان ہی پر ثابت قدم رہنا ہے۔ جیسا کہ آیت نمبر ۴۴ آیت نمبر ۴۳ فاستمسک.... الیک سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنا اجتماعی مذہب ہے کہ پوری امت کے ایک فرد کو بھی تکلیف پہنچتی ہے تو پوری امت پر وہ شاق ہے۔ جس کی مثال حدیث شریف میں جسدِ واحد سے دی گئی ہے۔

فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ۝ اَوۡ نُرِيَنَّكَ الَّذِىۡ
وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَيۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ۝ فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِىۡۤ اُوۡحِىَ
اِلَيۡكَ‌ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ
وَلِقَوۡمِكَ‌ ۚ وَسَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ ۝ (سورۃ الزخرف، آیت ۴۱ تا ۴۴)

پھر اگر ہم (دنیا سے) آپ کو اٹھالیں تو بھی ہم ان سے بدلہ لینے والے ہیں یا اگر ان سے جو ہم نے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے وہ آپ کو (بھی) دکھلا دیں تب بھی (کچھ بعید نہیں کیوں کہ) ہم کو ان پر ہر طرح کی قدرت ہے۔ تو آپ اس قرآن پر قائم رہیے جو آپ پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا ہے، آپ بے شک سیدھے راستے پر ہیں اور قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے بے شک بڑے شرف کی چیز ہے اور عنقریب تم سب پوچھے جاؤ گے۔

یہاں سے بھی اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہو رہا ہے اور وہ ہر وقت، ہر آن پوری قدرت رکھتے ہیں کہ کافروں اور نافرمانوں کو مبتلائے حزن و ملال کر دیں۔ لیکن ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ اپنے نافرمان بندوں کو کب سزا دیں گے یا دنیا میں بالکل ہی چھوڑ دیں گے۔ اگرچہ فطری طور پر ہماری پریشانی کیا ہے اور ہمیں کفار و مشرکین سے جہاد کا بھی حکم ہے، لیکن ایک حد سے زیادہ پریشانی مذموم ہے۔ ہمیں تو اس کا حکم ہے کہ جو کتاب ہمارے رسولِ اکرم ﷺ پر نازل ہوئی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑے رہیں کیوں کہ عنقریب (قیامت کے دن) ہم سے اسی کا سوال ہو گا کہ کس حد تک ہم اس کتاب پر قائم رہے۔ (ظاہرہ) کامیابی ہوئی یا نہیں، جہاد میں غالب ہوئے یا مغلوب، اس کا سوال نہیں ہو گا۔

وَنَادٰى فِرۡعَوۡنُ فِىۡ قَوۡمِهٖ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡرَ
وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِىۡ‌ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ اَمۡ اَنَا خَيۡرٌ
مِّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ مَهِيۡنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيۡنُ ۝ فَلَوۡلَاۤ اُلۡقِىَ عَلَيۡهِ

اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْجَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ O فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ O فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ O (سورۃ الزخرف، آیت ۵۱ تا ۵۵)

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی یہ بات کہی کہ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے (محل کے) پائیں میں بہ رہی ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے جو کہ کم قدر ہے اور قوتِ بیانیہ بھی نہیں رکھتا۔ تو اس کے سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے یا فرشتے اس کے جِلو میں پرّا باندھ کر آئے ہوتے۔ غرض اس نے (ایسی باتیں کر کر کے) اپنی قوم کو مغلوب کر دیا اور وہ اس کے کہنے میں آ گئے۔ وہ لوگ (کچھ پہلے سے بھی) شرارت کے بھرے تھے پھر جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو ڈبو دیا۔

ان آیاتِ کریمہ سے بہت سے اشارات ملتے ہیں:

۱۔ زمانۂ قدیم میں بھی کفار امارت اور غربت کو حق اور باطل کا معیار سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اب عملاً بہت سے مسلمان بھی مادی ترقی یافتہ اقوام کی باتوں کو قابلِ تقلید سمجھنے لگے ہیں، مثلاً بینک کاری، بیمہ، عورتوں کا مردوں کے ساتھ کام کرنا، جنسی آزادی ان سب باتوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔

۲۔ آیت ۵۵ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی قوم نے تکذیبِ موسیٰ علیہ السلام میں اس لیے اس کی اطاعت کی کہ وہ خود ہی فاسق تھے۔ فرعون کی تحریک اور قیادت نے ان کو کفر کی اس عمیق گہرائی تک پہنچا دیا جہاں سے نکلنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اسی طرح ہم آج بھی اس شخص کی قیادت کو قبول کر لیتے ہیں جو ہمیں وہی کام کرنے کو کہتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنی خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر لیں تو فاسقوں کی اطاعت نہ کریں اور نہ ان کی باتوں میں آئیں۔

۳۔ ''اسفونا'' کا لفظ ہمارے فہم کے مطابق فرمایا گیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں۔ جب قومِ فرعون کی حالت اس حد تک پہنچ گئی کہ چرند پرند عاجز آ گئے

اور فرشتے بھی تعجب کرنے لگے کہ ان کو اب کتنی ڈھیل دی جائے گی اور اس قوم کی نسل سے صالح اولاد کا پیدا ہونا بھی بعیدازقیاس وامکان ہو گیا اور کمزوروں پر ظلم کی انتہا ہو گئی تب اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام لے لیا۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ (سورۃ الزخرف، آیت ۶۳)

اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) معجزے لے کر آئے تو انھوں نے (لوگوں سے) کہا کہ میں تمھارے پاس سمجھ کی باتیں لے کر آیا ہوں اور تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کر دوں تو تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔

تمام انبیائے کرام علیہم وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کا یہ متفقہ ارشاد رہا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈر ہی اطاعتِ رسول کی بنیاد ہے۔ اگر اطاعتِ رسول کا مقصد کچھ اور ہے تو وہ صحیح اطاعت نہیں ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِىْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ○ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ○

(سورۃ الزخرف، آیت ۷۳ تا ۷۵)

(اور) تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے کھا رہے ہو۔ بے شک نافرمان (یعنی کافر) لوگ عذابِ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ (عذاب) ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے۔

کتنے کرم کے یہ الفاظ ہیں: جنت میں تو ہم ان شاء اللّٰہ تعالیٰ ان کے کرم ہی سے پہنچیں گے لیکن جو ٹوٹی پھوٹی کوشش ہم سے ہوئی ہوگی اس کی قدردانی کے لیے اور ہمارے عزت افزائی کے لیے بما کنتم تعملون فرمایا جائے گا۔ اوّل تو ہمارے اعمال اکثر نقائص سے پُر ہیں دوسرے یہ اعمال بھی ان ہی کی توفیق سے انجام ہوتے ہیں۔ وہاں ان ہی کو اضعافاً مضاعفاً کرتے ہوئے اور اپنی رحمت میں لپیٹے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچا دیں گے۔ ورنہ ہماری تمام عمر کی نیکی قیامت کے ہولناک دن میں ایک پیالہ پانی کے عوض بک جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

آیت ۷۴ کفار کے بارے میں ہے جو اصل مجرمین ہیں۔ جو مومن عاصی ہیں وہ اللّٰہ تعالیٰ کی حاکمیت کو مانتے ہیں۔ مسلمانوں کو جہنم میں ہمیشگی کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ بعض اکابر نے فرمایا ہے کہ گناہ گار مسلمانوں کے لیے الگ جہنم ہو گا۔ ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ نزولِ وحی کے زمانے میں ایمان اس درجہ کا تھا کہ نیکیوں کا سرزد ہونا اور گناہ سے بچنا لابدی تھا۔ شاذ و نادر ہی گناہ سرزد ہوتے تھے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جرائم اور طغیان کی وجہ سے ہمیشہ ایمان چھن جانے کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے ان سے بچنا بہت ضروری ہے۔

آیت ۷۵ میں جو جہنم میں جانے والوں کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے وہاں وہ محض ان کے گناہوں کا بدلہ ہے۔ ان کو اضعافاً مضاعفاً نہیں کیا جائے گا۔

فضلاً مِّنْ رَّبِّکَ ؕ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُO (سورۃ الدخان، آیت ۵۷)

یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔

جنت کی تمام نعمتیں اور جنت میں لے جانے والے تمام اعمال اور ہر طرح کی

برتری کو اگر ایک جملے کے ایک حصے میں کہا جائے تو فضلا من ربک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ سے فضل مانگنے کا حکم ہے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ الجاثیہ، آیت ۱۹)

یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہلِ تقویٰ کا۔

جن لوگوں سے تم نفع یا ضرر کی امید رکھتے ہو وہ خدا سے تمھیں کچھ بھی بچا نہیں سکتے۔ یہ مسلمہ امر ہے اور ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہ بھی مسلمہ بات ہے اور اللہ متقین کا دوست ہے۔ یہ بھی یقینی بات ہے۔ پھر تم کیوں کسی کو خوش کرنے کے لیے یا کسی کے ضرر سے بچنے کے لیے راہِ راست سے ہٹتے ہو؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (سورۃ الجاثیہ، آیت ۲۱)

یہ لوگ جو بُرے بُرے کام کرتے ہیں کیا خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنھوں نے ایمان اور عملِ صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے، یہ بُرا حکم لگاتے ہیں۔

یہ سوال غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر تھوڑا سا بھی لوگ غور کریں تو مومنوں کی زندگی، فاسقوں، فاجروں کی زندگی سے بہت مختلف ہے اور موت بھی دونوں

کی مختلف ہے۔ مومن کی زندگی سارے عالم کے لیے باعثِ رحمت ہے اور اس کی موت اس کے لیے انعام لینے کا دروازہ کھولتی ہے۔ برخلاف کافر اور بدکار کی زندگی کے کہ وہ دوسرں کے لیے اذیت ہے اور خود اس کے لیے سکون سے خالی ہے اور اس کی موت اس کے لیے سزا کا دروازہ کھولتی ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○

(سورۃ الجاثیہ، آیت ۲۲ تا ۲۴)

اور اللّٰہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے گا۔ سو کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہشِ نفسانی کو بنا رکھا ہے اور خدائے تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے اور خدائے تعالیٰ نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے، کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔ اور (بعث کے منکر) یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیوی حیات کے اور کوئی حیات نہیں ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانے (کی گردش) سے موت آجاتی ہے اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں۔

خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتے کرتے آدمی اس جگہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ ہر وہ قدم جو اپنی خواہشات کے اتباع میں پڑتا ہے

اور خدا کے حکم کے خلاف ہوتا ہے، ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ خواہ تمھیں معاف کر دیا جائے لیکن تم اپنے چاروں طرف کیوں برائی کا گھیرا بناتے جاؤ؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی معمولی سا گناہ اونٹ کی پشت پر آ کر کنکر کی مانند ہو۔

درحقیقت جس حالت کا یہاں بیان فرمایا گیا ہے وہ صرف کافروں کے متعلق ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کیوں کہ ضعیف ایمان رکھنے والا شخص بھی کسی نہ کسی درجے میں نفس کی مخالفت کرتا ہے اور وہ اپنے نفس کا پورا غلام نہیں ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (سورۃ الاحقاف، آیت ۱۳،۱۴)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللّٰہ ہے پھر مستقیم رہے، ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے یہ لوگ اہلِ جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے بعوض ان کاموں کے جو کہ وہ کرتے تھے۔

دوسری آیت پہلی آیت کی دلیل بھی ہے اور وضاحت بھی، یعنی ایسے لوگوں کو جو ایمان پر جم گئے، اعمال کے ضائع ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے اور انجامِ کار کوئی حزن نہیں ہوگا۔ یہ برخلاف ان کے جو کافر رہے اور جو بھی عیش وعشرت انھیں ملی اس میں مبتلا رہے اور انجامِ کارابدالآباد تک اس غم میں اور افسوس میں رہیں گے کہ کاش ہمیں دوبارہ زندگی مل جائے تو ہم کفر کے کام نہ کریں۔ مسلمانوں کو دنیا میں بھی بمقابلہ غیر مسلموں کے کوئی حزن نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنے نیک اعمال کا کسی سے بدلہ نہیں چاہتے۔

ذرا غور تو کریں کہ اللّٰہ تعالیٰ کی کائنات میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ ذرّہ بے مقدار سے بھی کم، نہ ہونے کے برابر۔ اس کے باوجود اللّٰہ تعالیٰ ہماری ایسی کارسازی فرماتے ہیں کہ گویا سب کچھ ہمارے ہی لیے ہو رہا ہے۔ یااللّٰہ میں ہوں اور آپ ہیں۔

ربوبیت کا کمال ہے کہ تمام عالم کے بھی رب ہیں اور ہمارے بھی اور تمام امورِ محض ان کے ہاتھ میں ہیں۔ نہ ان کا کوئی شریک ہے نہ کوئی وزیر۔ وہ تمام قوتوں کے مالک ہیں۔ ان پر بھروسا کرنے کے بعد اور کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی۔ ان اللّٰہ ... المتین۔

ان کا برتاؤ ہمارے ساتھ یعنی تمام عالم کے ساتھ اور ان میں سے خصوصیت کے ساتھ اپنے اوپر ایمان رکھنے والوں کے ساتھ اور بالخصوص اپنے حبیب پاک ﷺ کے اُمتیوں کے ساتھ اتنی رحمت کا ہے کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ ان کا جو بھی حکم ہو گا ہمارے لیے مفید ہی ہو گا۔ جب اللّٰہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اس طرح احساس انسان کو ہو گا اور یہ بات اس کے دل میں اتر جائے گی کہ اللّٰہ اس کے رب ہیں اور وہ اس پر استقامت اختیار کر لے گا اور ان کی حکم براری میں لگا رہے گا تو پھر اس پر کوئی غم اور کوئی خوف نہیں ہو گا۔ الا یہ کہ وقتی طور پر طبعی اضطرار ہو گا۔ خواہ اس پر کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ ہو۔ ایک بہت بڑی خوش خبری اس کے لیے یہ ہے کہ وہ جنت میں ضرور جائے گا اور جب مستقبل اتنا خوش آئند ہو تو دنیا میں جو بھی ہو وہ بہت زیادہ قابلِ التفات نہیں ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْھُمْ اَحْسَنَ مَاعَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِھِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ۝ (سورۃ الاحقاف، آیت ۱۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے کاموں کو قبول کر لیں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے اس طور پر کہ یہ اہلِ جنت میں سے ہوں گے اس وعدۂ صادقہ کی وجہ سے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

اللّٰہ تعالیٰ نے جو ہمیں بعض دعاؤں کے بعد انک لا تخلف المیعاد کہنے کو سکھایا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا وعدہ تو بالکل سچا ہے کہ قیامت میں مومنوں کو یہ یہ کچھ انعامات ملیں گے تو ہمیں آپ اپنے اس وعدے کا مصداق بنائیے۔ اے اللّٰہ آپ

کا شکر ہے کہ اس وقت تو آپ نے ہمیں ان میں شامل کیا ہے اور ہماری دعا بھی اسی ایمان کی وجہ سے ہے تو ہماری دعا یہ ہے کہ ہمیں مرتے دم تک ایمان پر قائم رکھیے تاکہ قیامت کے دن ہم آپ کے اس وعدے کے مصداق ہوسکیں جو آپ نے ہم مومنین سے کیا ہے۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚۛ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (سورۃ الاحقاف، آیت ۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا ہے) یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے اے میرے پروردگار! مجھ کو اس پر مداومت دیجیے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے لیے صلاحیت پیدا کر دیجیے، میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں۔

یہاں ماں باپ دونوں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے لیکن مشقت میں صرف ماں کا ذکر ہے تو ماں کی یہ مشقتیں تکمیل ثمرہ کے لیے باپ کی محتاج ہیں کیوں کہ وجود میں آنے کے لیے ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہے اور پرورش میں نفقہ باپ

کے ذمے ہے اور نگہداشت میں دونوں شریک ہیں۔

چالیس سال کے ذکر کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی اس وقت صاحبِ اولاد ہوتا ہے اور اولاد کی فرمانبرداری اور اس کے صالح ہونے کی دعا کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کو یہ بھی دعا کرنی چاہیے کہ اللّٰہ تعالیٰ اس کو بھی توفیق دیں کہ وہ اپنے والدین کی فرمانبرداری کرے اور نعمتوں کا شکر ادا کرے جو اللّٰہ تعالیٰ نے اس پر کی ہیں اور اس کے والدین پر کی ہیں۔ خود اس کا وجود اللّٰہ تعالیٰ کی نعمت اس کے والدین پر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نعمتیں ہیں جو والدین سے اولاد کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں، مثلاً نسبی شرافت، مال و جائیداد وغیرہ۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَاۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ۝ (سورۃ الاحقاف، آیت ۲۰)

اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے کہ تم اپنے لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے اور ان کو خوب برت چکے سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔

حضرت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن میں فرمایا ’’استکبار سے مراد استکبار عن الایمان ہے کہ عذاب خلود اس کے خواص سے ہے۔‘‘ ’’بغیرالحق قید واقعی ہے کیوں کہ مخلوق سے صدور تکبر کا ہمیشہ بغیرالحق ہی ہوگا۔‘‘

مولانا شبیراحمدؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں’’ کافر کے کسی نیک کام میں ایمان کی روح نہیں ہوتی محض صورت ڈھانچا نیکی کا ہوتا ہے۔ ایسی فانی نیکیوں کا اجر بھی فانی ہے جو اسی زندگی میں مال، اولاد، حکومت، تندرستی، عزت وشہرت وغیرہ کی شکل میں مل جاتا ہے

اس کو فرمایا کہ تم اپنی تمام نیکیوں کے مزے دنیا میں لے چکے...''

ایک خیال یہ بھی گزر سکتا ہے کہ کسی مومن کی زندگی تنعم اور عافیت میں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں گزری ہو تو کیا خدانخواستہ آخرت میں اس کو بھی کہہ دیا جائے گا کہ تم اپنی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی لے چکے؟ لیکن یہ خیال غلط ہے کیوں کہ اگر مومن ہو گا تو نعمتوں کا شکر ادا کر دے گا اور شکر ادا کرنے کے بدلے میں اسے مزید نعمتیں ملیں گی۔ لٰہذا جیسا کہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت کافروں ہی کے بارے میں ہے۔ اگر کوئی مسلمان کبر میں مبتلا ہے تو وہ گناہِ کبیرہ میں مبتلا ہے لیکن اس کے لیے خلود فی النار نہیں ہے جو استکبار عن الایمان کا خاصّہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مومن کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ اپنی تمام خواہشات وسائل رہنے کے باوجود دنیا ہی میں پوری کر لے۔ بہت سی خواہشات میں جنھیں آخرت کے لیے اٹھا رکھنا پڑتا ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کسی مومن کو دن رات مرغ پلاؤ ہی کھلائیں مگر وہ اس زمرے میں شامل نہیں ہو سکتا کیوں کہ کسی نہ کسی درجے میں اسے تقویٰ ضرور حاصل ہو گا اور وہ کئی باتوں سے تقویٰ کی وجہ سے رک جائے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے کافر دنیاوی عیش وتنعم سے بھی محروم رہیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا رہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دنیا میں بہت سے رفاہی کام کیے ہوں لیکن ان کو ساری نیکیوں کا بدلہ دنیا میں بھی نہیں ملتا اور آخرت میں بھی نہیں ملے گا تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ساری نیکیاں بھی کسی وجہ سے ضائع ہو گئی ہوں، جیسے مسلمانوں کو بھی نیکیاں بہت سے گناہوں سے، مثلاً حسد وغیرہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْہُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِھِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۝ (سورۃ الاحقاف، آیت ۲۹)

اور جب کہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آ پہنچے، کہنے لگے کہ خاموش رہو پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے۔

قرآن شریف سنتے وقت جس طرح خاموش رہنا ضروری ہے اسی طرح سنتے وقت یا پڑھتے وقت دل کا حاضر رکھنا اور دوسرے خیالات سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ جنوں نے خاموش رہنے کو اس لیے کہا تھا کہ پوری توجہ کے ساتھ سن سکیں اور پھر اس کو اپنی قوم تک پہنچا سکیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ O

(سورہ محمدؐ، آیت ۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور وہ اس سب پر ایمان لائے جو محمد (ﷺ) پر نازل کیا گیا ہے اور وہ ان کے رب کے پاس سے امرِ واقعی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہ ان پر سے اتار دے گا اور ان کی حالت درست رکھے گا۔

اگر یہ کتاب کسی اور ذریعے سے نازل ہوتی تب بھی اس کا اتباع ضروری تھا کیوں کہ یہ حق بات تھی۔ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونا اور بھی اس کو مؤکد کر دیتا ہے کیوں کہ سب ہی کے نزدیک قابلِ اتباع سمجھے جاتے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد کفار دشمن ہو گئے کیوں کہ آپ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے سیکڑوں سال کی بنائی ہوئی سوسائٹی اور ہزاروں سال کے مزعومات منہدم ہو رہے تھے۔

ذوقی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صرف رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آنا

بھی سیات کو مٹا دینے کا باعث ہوتا ہے اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے سے دنیا کے کام بھی سدھر جاتے ہیں۔ برائیوں کا مٹایا جانا کئی صورتوں سے ہو سکتا ہے، مثلاً عملِ صالح کے ذریعے (ان یذھبن) یا توبہ کے ذریعے یا دنیاوی مصائب کے ذریعے یا آخرت میں کچھ سزا مل جانے کے ذریعے یا بلاکسی سبب کے محض فضلِ خداوندی سے اور جو مشہور حدیث شریف ہے کہ شفاعتی لکبائر امتی۔ ہر امتی اس کے معنی بھی ذوقاً یہی معلوم ہوتے ہیں کہ ''میری شفاعت ہر اس شخص کے لیے ہے جو مجھ پر صرف ایمان لے آیا''۔ کیوں کہ نیکوکاروں کی بھی نجات حضور ﷺ کی شفاعت ہی سے ہو گی اور گناہ گاروں کی بھی، خواہ چھوٹے گناہ کرنے والے ہوں خواہ بڑے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝

(سورۂ محمدؐ، آیت ۳)

یہ اسی وجہ سے کہ کافر تو غلط راستے پر چلے اور اہلِ ایمان صحیح راستے پر چلے جو ان کے رب کی طرف سے ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کے لیے ان کے حالات بیان فرماتے ہیں۔

انسان کی فطرت میں نقل اور اتباع ہے جو بچے کی حرکات دیکھنے ہی سے پتا چل جاتا ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کسی کی تقلید نہیں کرتے اپنا راستہ آپ متعین کرتے ہیں ان کے بھی ۹۹ فیصد اعمال کسی نہ کسی کی تقلید میں سرزد ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو کافر ہیں وہ بھی اپنے بڑوں کا اتباع کرتے ہیں یا نفس یا شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَامَوْلٰی لَھُمْ O
(سورۂ محمدؐ، آیت ۱۱)
یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں۔

یہ بات تو سب ہی کو معلوم ہے کہ بغیر کسی کی بندگی کے کسی قوم کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکتی۔ بت پرستوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ تم آپس میں محبت پیدا کرنے کے لیے اور اپنی شیرازہ بندی کے لیے بتوں کی پرستش کرتے ہو۔ کسی کا بندہ ہو کر رہنا یعنی کسی کی خوشی اور ناخوشی کو اپنے مفادات پر ترجیح دینا اجتماعی زندگی کے لیے ناگزیر ہے لیکن یہ بات مومنوں ہی کو معلوم ہے کہ دراصل معبود تو وہی ہے جس نے سب ہی کو پیدا کیا اس کے علاوہ جتنے معبود ان لوگوں نے بنائے ہوئے ہیں وہ ان کی اپنی اختراع اور اپنی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے جب بڑے امتحان کا وقت آتا ہے تو معبودانِ باطل ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جو صرف اللہ ہی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں، قولاً اور فعلاً۔ لہٰذا ایسی قوم کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا کیوں کہ کسی اور قوم کا درحقیقت کوئی حامی و مددگار نہیں ہے۔ اس سے پہلے کی آیتوں (نمبر ۷، ۸) میں اہلِ ایمان اور کفار کا مقابلہ ہے اور مومنوں کو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے قدم جہاد فی سبیل اللہ میں جمائے رکھے گا اور کافروں کے اعمال سب رائگاں ہیں اور آیت نمبر ۱۰ میں اگلی قوموں کی تباہی کا ذکر ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰکُمْ O (سورۂ محمدؐ، آیت ۱۹)
تو آپ اس کا یقین رکھیے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابلِ عبادت نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سب مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی خبر رکھتا ہے۔

یہاں استغفار کے حکم سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ حضور نبیِ کریم ﷺ جب اپنے ساتھ مومنین کو شامل کریں گے تو ان کی مغفرت کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔

۲۔ جس طرح درجات قریب لامتناہی ہیں اسی طرح استغفار کی بھی ہمیشہ ضرورت ہے۔

۳۔ جب حضور ﷺ کو استغفار کا حکم ہے تو ہما وشما کیا چیز ہیں۔

۴۔ ہمیں بھی آپ ﷺ کے اتباع میں اپنے اور تمام مسلمان بھائی بہنوں کے لیے استغفار کرنا ضروری ہے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم پر ایک دوسرے کی خیرخواہی فرض ہے اور اس سے زیادہ کیا خیرخواہی ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اگر ایک گناہ میں ملوث ہے تو دوسرے نہی عن المنکر کے ذمہ دار ہیں (البتہ حدود و شرائط کی پابندی ضروری ہے)

تیسرے یہ کہ گناہ سے دل پر سیاہی آتی ہے جو روشنی کی دشمن ہے۔ اگر گناہ معاف نہ ہو اور مزید گناہ سرزد ہوں تو یہ سیاہی پھیلتی رہے گی اور ہماری آپس کی دوستی دشمنی میں بدل جائے گی لہٰذا دوسرے بھائیوں کی اصلاح کی فکر اور ان کے گناہوں کے معاف ہونے کی دعا کرتے رہنا ضروری ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ اٰمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِينَ فِيْ قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝

(سورۂ محمدؐ، آیت ۲۰)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہ نازل ہوئی سو جس وقت کوئی صاف صاف (مضمون) کی سورت نازل ہوتی

ہے اور (انفاق سے) اس میں جہاد کا بھی ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری (انفاق) ہے آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ سو (اصل یہ ہے کہ) عنقریب ان کی کم بختی آنے والی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ''مومنین'' کا لفظ ان تمام لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہوں یعنی مسلم معاشرے کا ایک حصہ ہوں خواہ ان میں کمزور ایمان والے ہوں، خواہ منافق ہی کیوں نہ ہوں۔ واللّٰہ اعلم

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّہُمْ وَاَعْمٰٓی اَبْصَارَہُمْ ۝ (سورۂ محمدؐ، آیت ۲۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

قرآن شریف پر تدبر اسی وقت ممکن ہے جب پوری توجہ سے اس کو پڑھا یا سنا جائے۔ لہٰذا اگر قرآن شریف کی تلاوت کے وقت دماغ اِدھراُدھر بھٹکتا رہے تو یہ بہت خطرناک بات ہے کیوں کہ قرآن شریف میں اکثر دماغ اور قلب کے ایک ہی معنی لیے گئے ہیں۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِہُوْا مَانَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِسْرَارَہُمْ ۝ (سورۂ محمدؐ، آیت ۲۶)

یہ اس سبب سے ہوا کہ لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اُتارے

ہوئے احکام کو ناپسند کرتے ہیں یہ کہا کہ بعض باتوں میں ہم تمھارا کہنا مان لیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے خفیہ باتیں کرنے کو خوب جانتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ کفار ومنافقین کا کسی معاملے میں مسلمانوں کے خلاف ساتھ دیتے ہیں وہ سب آیت نمبر۲۳ کے مطابق مرتد ہیں۔ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے، انھیں برا اور اندھا بنا دیا ہے اور قرآن سمجھنے کی صلاحیت ان میں مفقود ہوگئی ہے (جیسا آیت۲۴ سے ظاہر)۔فہم کا سلب ہوجانا ان کی سزائے عاملہ ہے اور آخرت میں جہنم کی سزا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ O (سورۂ محمدؐ، آیت ۲۸)

یہ اس سبب سے کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اسی پر چلے اور اس کی رضا سے نفرت کیا کیے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے سب اعمال کالعدم کر دیے۔

اتباع اور جدوجہد تو فطری بات ہے خواہ رسول کی ہو خواہ شیاطین کی اور شیاطین کی پیروی یا کفارومنافقین کا مسلمانوں کے مقابلے میں ساتھ دینا ایسا ہے کہ گویا اس کو اللہ کی رضا ناپسند ہے۔ متذکرالبالا سزائیں ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔

وَلَوْنَشَآءُ لَاَرَیْنٰکَھُمْ فَلَعَرَفْتَھُمْ بِسِیْمٰھُمْ ط وَلَتَعْرِفَنَّھُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط وَاللہُ یَعْلَمُ اَعْمَالَکُمْ O وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰھِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ لا وَنَبْلُوَا اَخْبَارَکُمْ O (سورۂ محمدؐ، آیت ۳۰، ۳۱)

اور ہم اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتا بتا دیتے سو آپ ان کو حلیے سے پہچان لیتے اور آپ ان کو طرزِ کلام سے ضرور پہچان لیں گے اور اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے اور ہم ضرور تم سب کی آزمائش کریں گے تا کہ ہم ان لوگوں کو معلوم کر لیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تا کہ تمھاری حالتوں کی جانچ کر لیں۔

انسان چہرے سے اور پیشانی سے پہچانا جاتا ہے مگر جو زیادہ مکروفریب میں مشاق ہیں وہ بات کے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ چاہے اعمال مومنوں جیسے ہی سرزد ہو رہے ہوں۔ اللہ ہی کو اعمال کی حقیقتوں کا علم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت اسی میں تھی کہ منافقوں کو علی الاعلان ظاہر نہ کیا جائے یہاں تک کہ آزمائش کے وقت ان کا نفاق خود ہی ظاہر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہی ہے۔ مخلوق کو معلوم ہو جانے کے لیے آزمائشیں ہیں۔

اِنْ يَسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ۝ (سورۂ محمدؐ، آیت ۳۷)

اگر تم سے تمھارے مال طلب کرے پھر انتہا درجے تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اللہ تعالیٰ تمھاری ناگواری ظاہر کر دے۔

اشارتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی قوم ایمان اور تقویٰ اختیار کرے تو اگرچہ لوگ خدا کی راہ میں بے دریغ خرچ کریں گے لیکن اس کی وجہ سے اس قوم کے مال میں کوئی کمی نہیں آئے گی (انفرادی طور پر بھی خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی۔ اجتماعی طور پر تو یہ بات بدیہی ہے کہ ایک کے پاس سے روپیہ دوسرے کے پاس چلا جانے سے قوم کا سرمایہ جوں کا توں رہتا ہے) لہٰذا اگر سود ختم کر

دیا جائے تو اس سے معاشی ترقی میں کوئی کمی نہیں آئے گی خواہ موجودہ ماہرینِ معاشیات کچھ بھی کہتے رہیں۔

یہ بھی اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی لوگوں کے مال پر قبضہ کرنے کا حکومت کو اختیار نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایمان اور تقویٰ میں انفاق فی سبیل اللّٰہ شامل ہے۔ جیسا کہ آیت ۳۸ میں ہے لیکن انفاق سے مال برباد نہیں ہوتا۔ برخلاف بعض مشرکوں کے عقیدے کے کہ وہ جان یا مال کو تلف کر کے اپنے دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں جس کو ہندوستان میں ''بلی دان'' کہتے ہیں۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۝ (سورۃ الفتح، آیت ۱)
بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔

صلح حدیبیہ کی شرائط کا مسلمانوں کے مفادات اور خودداری کے خلاف معلوم ہونا بادی النظر میں ہے جیسا ابتدا میں حضرت عمرؓ نے سمجھا لیکن بعد میں ان کے نورِ ایمان نے ان کی یہ بات سمجھا دی جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پہلے ہی سے اپنے ایمان کی روشنی میں معلوم تھی کہ اس میں بے شمار فائدے ہیں اور پھر یہ ان دونوں حضرات کے اعلیٰ درجۂ ایمان کا اثر تھا کہ ان کی نظر ایک باریک ترین بات پر پڑی اور صرف ان باریک باتوں پر نہیں پڑی جن کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ وہ باریک ترین بات یہ تھی کہ اس صلح میں فائدہ ہی فائدہ ہے کیوں کہ یہ صلح حضورﷺ نے کی ہے۔

یہ بات کسی نہ کسی درجے میں ہر مسلمان کو معلوم ہے اور جو ایمان میں قوی ہیں ان کو ہر وقت اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ہر وہ بات جو حضورﷺ نے کی جس کا آپؐ نے امر فرمایا اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ یہ بات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے

لیے موٹی بات تھی جس کی طرف بڑے بڑے عقلا کی نظر نہیں گئی (یہی حال پل صراط کا ہے جو بال سے زیادہ باریک ہے لیکن صدیقین اس پر سے ایسے گزر جائیں گے جیسے وہ کشادہ شاہراہ ہو)۔

صلحِ حدیبیہ سے حضور ﷺ نے مسلمانوں کو بہت بڑی فتح (Diplomatic Victory) دلوائی۔

۱۔ پہلی دفعہ کفار نے مسلمانوں کو من حیث القوم تسلیم کیا کہ اگرچہ یہ کمزور لوگ ہیں مگر ان کی بھی کوئی حیثیت ہے اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ پہلی دفعہ کفار نے تسلیم کیا کہ ان کے علاوہ دوسروں کو بھی زمین پر رہنے کا حق ہے خواہ وہ ان کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں۔

۳۔ شرائط آپس کی گفت وشنید سے طے ہوئے۔ اس طرح نہیں ہوئیں جیسے کوئی فاتح قوم اپنی مفتوح قوم کو شرائط لکھواتی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے کعبۃ اللّٰہ کی زیارت کرنے اور ان کے حج وعمرہ کرنے کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ ان کے علاوہ بہت سے فوائد اہلِ سیرت نے لکھے ہیں، مثلاً اس کے بعد مکہ مکرمہ سے جو مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس پہنچے اس کو واپس مکہ بھیج دینے سے اشاعتِ اسلام میں بے انتہا مدد ملی۔

یہ صلح ایمان کی فتح تھی دوسرے جذبات کے اوپر، مثلاً بہت سے لوگوں کی خودداری کو ٹھیس پہنچی ہو گی مگر انھوں نے اب جذبات کو ایمان پر قربان کر دیا۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ○ (سورۃ الفتح، آیت ۱۵)

جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمھارے ساتھ چلیں، وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو بدل ڈالیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے خداتعالیٰ نے پہلے سے یوں ہی فرما دیا ہے تو وہ لوگ کہیں گے بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں۔

خدا کے حکم کے آگے کسی کی تنقید یا دلدہی کی قطعاً پروا نہیں کرنی چاہیے اور نہ ان کی تنقید کے جواب دینے کی ضرورت ہے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (سورۃ الفتح، آیت ۲۲)

اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا اور نہ مددگار۔

اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت کے مطابق جنگوں کو ملتوی بھی کر دیتے ہیں لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اگر وہ جنگ (کافروں سے) ہوتی تو کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ

الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَاللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (سورۃ الفتح، آیت ۲۹)

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں، کبھی سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں، ان کے آثار بوجہِ تاثیرِ سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں اور انجیل میں ان کا یہ وصف ہے کہ جیسی کھیتی اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تاکہ ان سے کافروں کو جلا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں، مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

یہ نہیں سمجھایا کہ جو ان میں سے ایمان اور نیک عمل والے ہوں گے ان کو اجرِ عظیم ملے گا بلکہ یہ وعدہ ان تمام لوگوں کے لیے ہے جن کا یہاں ذکر ہوا اور جن کی تعریف تورات اور انجیل میں آئی ہے۔ یہ ایک اسلوبِ بیان ہے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اسبابِ دنیویہ کا اختیار کرنا توکّل کے منافی نہیں ہے اسی طرح رکوع اور سجدے کے ذریعے اللہ کا فضل تلاش کرنا یعنی ایک درجے میں ترکِ اسباب بھی محمود ہے۔

یہاں رحمآء کا لفظ اشدا کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے یعنی مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر بہت شفیق ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان میں فرمایا ہے کہ وہ مومنوں پر رحیم ہیں اور اپنے نبی ﷺ کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ مومنوں پر بہت مہربان اور رحیم ہیں۔

غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ جب شفقت غالب ہوگئی تو عجب اور کبر غائب ہو جائے گا جس طرح باپ اپنے بیٹے کو اپنے سے چھوٹا تو سمجھتا ہے لیکن اس کے

ساتھ تکبر کا خیال اس کو کبھی نہیں آتا، بلکہ چھوٹے بچے کو باپ سمجھتا ہے کہ یہ بڑا ہو کر بڑا آدمی بنے گا اور اگر اپنے قریبی عزیز میں اسے کوئی خرابی نظر آتی ہے تو وہ اسے دور کرنا چاہتا ہے۔ اپنے محبوب میں برائی دیکھنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ کفار کو مسلمانوں سے حسد ہے۔ لہٰذا یہ صفت مسلمانوں میں نہیں ہونی چاہیے۔

- یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌO یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَO (سورۃ الحجرات، آیت ۱،۲)

  اے ایمان والو اللہ اور رسول (ﷺ) (کی اجازت) سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ (تمھارے سب اقوال کو) سننے والا اور (تمھارے سب افعال کو) جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

حضرت تھانویؒ نے پہلی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: ”جب تک قرائن قویہ یا تصریح سے اذن گفتگو کا نہ ہو، گفتگو مت کیا کرو، یہ اللہ اور رسول ﷺ کی عظمت کا حق ہے اور دوسری آیت تو صریحاً حضور ﷺ کے حقِ عظمت کے بارے میں ہے اور ان آیاتِ کریمہ میں آپ ﷺ سے گفتگو کا ادب سکھایا گیا ہے اور بے ادبی کی سزا حبطِ اعمال بتائی گئی ہے اور اس کے ساتھ بڑے ڈر کی بات یہ ہے کہ اس کا اکثر پتا بھی نہیں چلتا۔ جیسا کہ لاتشعرون سے ظاہر ہے۔

اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں تھوڑی سی بھی بے ادبی اور لاپروائی بہت بڑے نقصان کا باعث ہے۔ تو نماز میں جو ہم اللہ تعالیٰ کے حقِ عظمت کی ادائیگی میں اس قدر لاپروائی برتتے ہیں اور حضور نبیِ کریم ﷺ کے حق کی ادائیگی میں جو بے پروائی ہم سے ہوتی ہے کہ آپ پر درود وسلام بھیج رہے ہیں اور دل کہیں اور ہے اس پر اگر گرفت ہو جائے تو کتنے خسران کا باعث ہو۔ اسی لیے نماز کے بعد اپنی کوتاہی پر دل سے نادم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ نماز کے بعد تین مرتبہ استغفراللہ پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت ہے۔

کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے تو وہی اچھے ہیں جو نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ کم سے کم ان سے یہ بے ادبیاں تو سرزد نہیں ہوتیں لیکن تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا علاج نماز چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ نماز پڑھتے رہنا اور اس کے بعد استغفار کرتے رہنا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ایک آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ واعظ کو بے عمل ہونا جائز نہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○ (سورۃ الحجرات، آیت ۱۰)

مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

امراللہ سے مراد یہ ہے کہ جو بات عدل وانصاف کی ان دونوں فریقوں کے درمیان مسلمانوں نے طے کرا دی تھیں اس کی طرف واپس آ جائیں۔

يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط وَاتَّقُوااللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌO (سورۃ الحجرات، آیت ۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغ مت لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

سوءظن سے بہت بچنے کی ضرورت ہے کیوں کہ بقول ایک بزرگ کے سوءظن کے لیے ثبوتِ قطعی کی ضرورت ہے حسنِ ظن کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

غیبت کا زنا سے اشد ہونا تو حدیث شریف سے ثابت ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں غیبت کی حقیقت بتلائی گئی ہے جس سے اس کا فطرتِ سلیمہ کے بالکل خلاف ہونا واضح ہوتا ہے۔ غیبت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنے بھائی کو قتل کر دے اور پھر اس کے مردہ جسم کا گوشت کھائے، کیوں کہ غیبت کرنے والا اس شخص کی عزت وآبرو یا اچھی شہرت کو قتل کرتا ہے یعنی ایسے لوگوں کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اس ذریعے سے اپنی عزت یا شہرت بڑھانے کی کوشش کرتا ہے کہ زید تو بہت خراب ہے، مجھ میں یہ خرابی نہیں ہے، لہٰذا میں اچھا ہوں۔ اگر آدمی غور کرے تو ہر غیبت کے پیچھے یہ بات ہوتی ہے کہ دوسرے کی عزت یا شہرت کی پامالی سے اپنی عزت یا شہرت بڑھانا مقصود ہوتا ہے (اگرچہ دوسروں سے بڑا بننے کی خواہش انسان میں ہے لیکن یہ اسفل سافلین والی بات ہے۔

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (سورۃ الحجرات، آیت ۱۴)

یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجیے کہ تم ایمان تو نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم مخالفت (چھوڑ کر) مطیع ہو گئے اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللّٰہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا کہنا مان لو تو اللّٰہ تعالیٰ تمھارے اعمال میں سے ذرا بھی کمی نہ کرے گا بے شک اللّٰہ غفور رحیم ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے عام استنباط یہ کیا جاتا ہے کہ ہر کوئی مسلمان نہیں ہے حالانکہ یہاں مراد ان لوگوں سے ہے جنھوں نے اسلام اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لیے قبول کیا تھا جیسا کہ ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ یہ بنی اسد کی شان میں نازل ہوا جو قحط میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسلام لے آئی تھی تاکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی خوشحالی میں شریک ہوں اور دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے (ولکن قولاً اسلمنا "اے استسلمنا من السیف والسبی"۔ حقیقت میں جو بھی مسلمان ہو وہ مومن ہے خواہ کسی درجے کا بھی ایمان اس کے دل میں ہو۔

یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡکَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ ۚ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ہَدٰىکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ (سورۃ الحجرات، آیت ۱۷)

یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو بلکہ اللّٰہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم سچے ہو۔

من جملہ بے شمار احسانات کے جو صرف اس ایک احسان میں مضمر ہیں، یہ بھی

ہے کہ اپنی صحت کی دیکھ بھال کو بھی لازمی کر دیا اور اسے اپنے قرب اور رضا کا ذریعہ بنا دیا۔ جیسا کہ حضور شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے لنفسک علیک حق اور اس طرح اپنے اہل وعیال کی دیکھ بھال کو اپنی رضا کا واسطہ بنا دیا بلکہ اگر غور کیا جائے تو شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ پورا دین اس میں سمو دیا کہ اپنی، اپنے اہل وعیال، اپنے متعلقین اور اپنے ہم نشینوں کی خیرخواہی کی جائے جیسا قوانفسکم واھلیکم نارا سے اور حدیث شریف الدین النصیحہ کی مثال سے ظاہر ہے۔

دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن بندے کو اپنی ذات سے ایک خاص تعلق عطا فرمایا ہے جو مومنوں کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے بلکہ کسی شخص کو کسی اور سے نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ذلک بان اللّٰہ مولی الذین امنوا وان الکافرین لامولےٰ لھم

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ O (سورۂ ق، آیت ۱۶)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ۔

بسا اوقات ہمیں خود اپنی خواہشات کا علم نہیں ہوتا اور ہمارے دلوں میں متضاد خواہشیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور وسوسے آتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کو ان سب کی خبر ہے اور ہم سے زیادہ خبر ہے۔

هٰذَا مَاتُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ O مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ O (سورۂ ق، آیت ۳۲، ۳۳)

یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لیے ہے
جو رجوع ہونے والا پابندی کرنے والا ہو۔ جو شخص خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہو
اور رجوع ہونے والا دل لے کر آئے گا۔

مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے حفیظ کا ترجمہ کیا ہے "نگاہ رکھنے والے احکام خدا کے"۔ اور مولانا تھانویؒ نے ترجمہ کیا ہے "پابندی کرنے والا"۔ حضرت شیخ الہند نے ترجمہ کیا ہے کہ خدا کے یاد رکھنے سے، مولانا شبیر احمدؒ نے تفسیر میں حفاظت کرنے سے مراد اپنی حفاظت کرنا گناہوں سے ہے۔ اپنی حفاظت کرنا گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رہنے کے نتیجے میں ہو۔ اگلی آیتِ کریمہ سے قلب کی حفاظت اور قلب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قلب کی حفاظت اصل چیز ہے۔ اگر قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی رہے تو اعضا وجوارح سے گناہ اگر کبھی تقاضائے بشری میں سرزد ہو جائے تو انسان فوراً توبہ کر لیتا ہے اور گناہ کا اثر اس کے نامۂ اعمال سے بھی محو ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر سے بھی۔ مرتے دم تک اسی کوشش میں رہتا ہے تاکہ مرنے کے بعد آدمی اللہ تعالیٰ کے پاس قلبِ منیب کے ساتھ حاضر ہو۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْاَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌO (سورۂ ق، آیت ۳۷)
اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو۔

جس کو دل عطا کیا گیا ہے (جو وہبی اور غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے) اس کے لیے بھی یاد دہانی ہے اور جو کان لگا کر سنے اور جسمانی اور دماغی طور پر حاضر رہے (جو اختیاری ہے) اس کے لیے بھی۔ اگر قلب کی صلاحیت بگڑ چکی ہو تو اس کے لیے یہ

بہترین نسخہ ہے کہ پوری توجہ سے سنے (اس میں اللہ اور رسول ﷺ کی باتیں خواہ کتاب میں لکھی ہوئی ہوں، خواہ بزرگوں سے سنی ہوئی ہوں سب شامل ہیں)۔ رفتہ رفتہ ایسا شخص بھی صاحبِ دل ہو جاتا ہے اور لطف و اکرامِ الٰہیہ سے سرفراز ہو جاتا ہے اور اس پر خودبخود اسرارومعانی منکشف ہونے لگتے ہیں۔

وَّاِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ O (سورۃ الذٰریت، آیت ٦)

اور (اعمال کی) جزا (وسزا) ضرور ہونے والی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ فرمایا، ''اور بے شک انصاف ہونا ضرور ہے۔'' اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ سارا دین اسی میں ہے کہ انسان انصاف کرتا رہے جس حد تک اس سے ہو سکے اور ہر معاملے میں اس کا خیال رکھے کہ انصاف کے دن یعنی قیامت کے دن انصاف ضرور ہو گا اور ظلم سے بچے، شرک ظلمِ عظیم ہے اور گناہ اپنے اوپر ظلم ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان سے بچنا ضروری ہے۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ O اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمۡ رَبُّهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِكَ مُحۡسِنِیۡنَ O كَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَهۡجَعُوۡنَ O وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ O وَفِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ O (سورۃ الذٰریت، آیت ۱۵ تا ۱۹)

بے شک متقی لوگ بہشتوں میں اور چشموں میں ہوں گے (اور) ان کے رب نے ان کو جو (ثواب) عطا کیا ہوگا وہ اس کو (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے (اور کیوں نہ ہو) وہ لوگ اس کے قبل (دنیا میں) نیکوکار تھے وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیرشب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیرسوالی کا حق تھا۔

سورۃ الِ عمرٰن میں محسنین کی ایک حالت بیان فرمائی گئی ہے کہ جان کی قربانی کا جب وقت آ تا ہے تو وہ خوشی خوشی تیار ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی اور فتح کی دعا کرتے ہیں۔ ان آیاتِ کریمہ میں بعض دوسری خصوصیات کا ذکر ہے۔ جان دینے کا وقت تو کبھی کبھی آ تا ہے لیکن ان کے مالک سے محبت اور وفاداری کے جذبے کا اظہار ان کے روزمرہ کے افعال سے ہوتا ہے کہ وہ رات کو کم سوتے ہیں اور زیادہ وقت عبادت اور مناجات میں گزارتے ہیں پھر بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ اس دربار کے لائق عبادت تو ہو نہیں سکی اس لیے صبح سویرے استغفار کرتے ہیں اور اپنے اموال کو فقرا و مساکین اور ضرورت مندوں پر اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ گویا ان کا حق ہو اور اپنا کچھ احسان نہیں سمجھتے۔

جو لوگ محبت سے عاری ہیں ان کے نزدیک یہی سب باتیں انسانی فطرت کے خلاف ہیں اور رات کو کم سونے کو مضرِ صحت بتلاتے ہیں لیکن جن کے دل محبت سے آشنا ہیں خواہ وہ مجازی ہی محبت کیوں نہ ہو ان کے لیے یہ باتیں بہت فطری ہیں۔ رات کو کم سونا اور دن کو محبوب کو خوش کرنے کے لیے مال وجان کی پروا نہ کرنا ان کے لیے فطری بات ہے۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُوْنَ O (سورۃ الذّٰریت، آیت ۲۲)
اور تمھارا رزق اور جو تم سے (قیامت کے متعلق) وعدہ کیا جاتا ہے (ان سب (کا معین وقت) آسمان میں ہے۔

یہ آیتِ کریمہ حرص، لوٹ کھسوٹ اور دنیاوی تفکراتِ بے جا کی جڑ کاٹتی ہے کہ جب آسمان میں رزق ہے تو زمین والے اس کو چھین نہیں سکتے اور ہم تک پہنچنے سے روک نہیں سکتے۔ آسمان والا بڑا قوی اور قادر ہے۔

اسی طرح یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اگر آبادی اس طرح بڑھتی رہی تو لوگ کہاں سے کھائیں گے۔ اگر اس رزق کا سوکروڑواں حصہ بھی زمین پر اتار دیا جائے جو آسمان میں ہے تو تمام دنیا کے لیے برسا برس تک کے لیے کافی ہو جائے۔ اگر سورج کی توانائی کا ایک ذرّہ بھی ہمیں مل جائے تو توانائی کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہو اگر یہ توانائی غذائی اجناس میں تبدیل ہو جائے تو دنیا کی موجودہ آبادی کئی سو گنا بھی بڑھ جائے تب بھی سب کو کافی ہو جائے، لہٰذا کوئی ایسا طریقہ رزق حاصل کرنے کا نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ انفرادی طور پر بھی رزق کا بالواسطہ اور بلاواسطہ پہنچنا دن رات کا مشاہدہ ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۃ الذّٰریت، آیت ۵۰، ۵۱)

تو تم اللہ ہی کی (توحید کی) طرف دوڑو میں تمھارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا (ہوکر آیا) ہوں اور خدا کے ساتھ کوئی اور معبود مت قرار دو میں تمھارے واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اس سے پہلے کئی آیتوں میں قوم لوط علیہ السلام، فرعون، عاد اور ثمود اور قوم نوح علیہ السلام پر عذاب کا ذکر تھا۔ اس طرح کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے، سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو ہر طرح کے عذاب سے، آفاتِ ارض وسماوی سے اور فتنے سے۔ نفس وشیطان کی مکروفریب، دنیا کی مرغوب چیزوں کے جال، غفلت کے پردے، موت کے بعد کی مصیبتیں، حشرونشر، عذابِ دوزخ وغیرہ سب سے پناہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرنے میں ہے اور سب سے زیادہ ڈرنے کی چیز شرک ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ O (سورۃ الذّٰریت، آیت ۵۶)
اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

اس کا ایک مطلب تو وہی ہے کہ تشریعی طور پر زندگی اس لیے عطا ہوئی ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق یعنی اس کی عبادت میں گزاری جائے۔ ذوقاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہو کہ دیکھو اتنا اختیار ہم نے اس مخلوق کو دیا ہے اس کے باوجود ہماری قدرت دیکھو کہ جو کچھ اس سے سرزد ہو رہا ہے وہ ہمارے ارادے اور اختیار کے ماتحت ہو رہا ہے، یعنی تکوینی طور پر جس طرح درخت، پہاڑ اور دریا ہماری عبادت کر رہے ہیں اسی طرح انسان اور جن بھی ہماریِ مشیت کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ O اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ O (سورۃ الذّٰریت، آیت ۵۷، ۵۸)
میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں۔ اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا، قوت والا نہایت قوت والا ہے۔

تفسیر ابن عباسؓ میں ہے ''یطعمون... وقال علیؓ ابنِ ابی طالب الا ان آمرھم واکلفھم.... کلفھم ان یرزقوا انفسھم..''

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْلَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَاكُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ O فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ O كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ○ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ○ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ○ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ○ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ○ (سورۃ الطّور، آیت ۱۶ تا ۲۸)

پھر خواہ (اس کی) سہار کرنا یا سہار نہ کرنا تمھارے حق میں دونوں برابر ہیں جیسا تم کرتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائے گا۔ متقی لوگ بلاشبہ (بہشت کے) باغوں اور سامانِ عیش میں ہوں گے (اور) ان کو جو چیزیں ان کے پروردگار نے دی ہوں گی اس سے خوش دل ہوں گے اور ان کا پروردگار ان کو عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھے گا۔ خوب کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اپنے عملوں کے بدلے میں تکیہ لگائے ہوئے تختوں پر جو برابر بچھائے ہوئے ہیں اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں (یعنی حوروں) سے بیاہ کر دیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا ہم ان کی اولاد کو بھی (درجے میں) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (فی النار) رہے گا اور ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا ان کو مرغوب ہو روز افزوں دیتے رہیں گے (اور) وہاں آپس میں (بطور خوش طبعی کے) جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے۔ اس میں نہ بک بک لگے گی اور نہ کوئی بے ہودہ بات ہو گی اور ان کے پاس ایسے لڑکے آئیں جائیں گے جو خاص انھی کے لیے ہوں گے گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے۔ یہ بھی کہیں گے کہ (بھائی) ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا میں انجامِ کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچا لیا، ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے۔

آیت ۱۶ مکذیب کے بارے میں نازل ہوئی، ان کے کسی بھی عمل کی جزا خواہ وہ کتنا ہی نیک سمجھا جاتا ہو آخرت میں نہیں مل سکتی کیوں کہ وہ آخرت کے لیے کوئی کام ہی نہیں کرتے تھے۔ جب آخرت پر یقین ہی نہیں تھا تو پھر دنیا میں جو کچھ بدلہ ان کو ملنا تھا، مل گیا۔

آخرت میں ذرّے ذرّے کا حساب ہو گا اور عنایتیں بھی بے شمار ہوں گی۔ لیکن یہ عنایتیں ان ہی کے لیے ہوں گی جو آخرت کے عذاب سے اور حساب کتاب سے ڈرتے ہوں گے۔ جن کا ذکر آیت ۲۸ میں ہے۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍO (سورۃ القمر، آیت ۵۵)
ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

جنتوں اور نہروں کی سیر میں ہمیشہ رہنا بھی بڑی کامیابی ہے لیکن اصل عظمت اہلِ جنت کا مقعدِ صدق (سچائی کی نشست) میں رہنا ہے کیوں کہ وہ دنیا میں ہمیشہ صدق کا اور رسولِ صادق وامین ﷺ کا ساتھ دیتے رہے اور اس سے بڑھ کر ان کی عزت افزائی مالکِ مقتدر کے پاس ہونا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰىO (سورۃ النجم، آیت ۳۲)
وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ، بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے وہ تم کو

(اور تمھارے احوال کو اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (بس) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے، ''تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے (کہ فلاں متقی ہے فلاں نہیں، گو صورتاً افعالِ تقویٰ کے دونوں سے صادر ہوتے ہوں)...صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون کیسا ہے اور کس درجے کا ہے کیوں کہ مدارِ فضیلت تقویٰ پر ہے ظاہری اعمال پر نہیں اور تقویٰ وہی معتبر ہے جو موت تک قائم رہے۔'' (معارف القرآن)

حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ اپنے کو متقی سمجھ کر کام مت کرو، عام آدمی سمجھ کر کام کرو۔ تقویٰ کے حساب سے کام کرو گے تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ بس سیدھے سیدھے عام مسلمانوں کی طرح کام کیے جاؤ۔

شیخ الہندؒ نے فرمایا بخاری وغیرہ کتبِ حدیث میں صاف موجود ہے عن ابنِ عباسؓ قال مارا مارا یتوشیئًا اشہِ باللھدمما قال ابوہریرۃ عن النبی ﷺ ان اللہ کتب علی ابن ادم حظہ من ادرک ذٰلک لامحالۃ فزنی العین النظر وزنی اللسان المنطق والنفس تمنی وتشتھی والفرج یصدق ذٰلک ویکذبہ ظاہر ہے کہ لمم کی اجازت نہیں ہے اور گناہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اسی وقت تک صغیرہ رہتا ہے جب تک اس پر اصرار نہ ہو اور ایسے لوگوں سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے، توبہ کر لیتے ہیں۔

ہمارے اعمال کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ واقف ہیں کیوں کہ وہ اس وقت سے ہمارے رب ہیں جب ہم بطنِ مادر میں اجنہ تھے اور ہم جیسوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنے نفس کی پاکیزگی بیان کریں۔

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝ (سورۃ النجم، آیت ۶۰)
اور ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں ہو۔

اس آیتِ کریمہ سے اشارہ ملتا ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت کے وقت رونا چاہیے، اس طرح کا ایک مضمون ایک حدیث شریف میں بھی مروی ہے۔ اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تلاوت اس کو سننے سے دل نرم پڑ جائے اور دل کی نرمی ہی رقت ہے جو رونے کا ماخذ ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم جیسے گناہ گار، ہیچ در ہیچ کی یہ عزت افزائی کہ کلامِ الٰہی ہماری زبان پر جاری ہے۔

ہزار بار بشیوم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبیست

تیسرے یہ کہ وہ آیات جن میں تعمیلِ حکم اور تقویٰ کا ذکر ہے ان سے بھی قلب کو لرزنا چاہیے کہ کیسے ہم ایسی تعمیل حکم کریں گے جو اس دربار میں مقبول ہو۔

چوتھے یہ کہ جن آیات میں عذاب کا ذکر ہے وہ کثرت سے ہیں اور کسی سزا سے مامون نہیں ہیں جب تک ہمارا خاتمہ ایمان پر نہ ہو جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو ہم تمام وقت روتے ہی رہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اور عالمِ غیب کے ادراک کے درمیان ہزاروں پردے ہیں اور اس کی یہی خلقی جہالت ہے جس کی وجہ وہ ''امانت'' اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا ورنہ جس کو حقیقت معلوم ہے وہ اس کو اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔ اس لیے اکثر عارفین حزن میں زیادہ رہتے ہیں اور حضور نبیِ کریم ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ ''دائم الحزن'' تھے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا
وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ
اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلَى شَيْءٍ نُّكُرٍ۝ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ۝ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ط يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ۝ (سورۃ القمر، آیت ۱ تا ۸)

قیامت نزدیک آ پہنچی اور چاند شق ہو گیا اور یہ لوگ اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر بات کو قرار آ جاتا ہے اور ان لوگوں کے پاس (تم امِ ماضیہ کی بھی) خبریں اتنی پہنچ چکی ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت ہو یعنی اعلیٰ درجے کی دانش مندی (حاصل ہو سکتی) ہے سو خوف دلانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجیے جس دن ایک بلانے والا فرشتہ ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا، ان کی آنکھیں (مارے ذلت کے) جھکی ہوئی ہوں گی (اور) قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے (اور پھر نکل کر) بلانے والے کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہوں گے، کافر کہتے ہوں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کا ایک بنیادی کام لوگوں کو عذابِ آخرت سے ڈرانا تھا اور وہ باتیں بتانی تھیں جو ان کو عذابِ آخرت سے بچا سکتی تھیں۔ سابقہ ادیان کے لوگوں نے آخرت یا دوسری زندگی کے تصور کو اتنا بگاڑ دیا تھا کہ وہ انسان کو نیک کام کرنے اور برائی سے روکنے کا موثر ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔ عیسائیوں نے تو نعوذباللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بزعمِ خود مصلوب ہونے کو سب کی طرف سے کفارہ بنا دیا۔ ہندوؤں نے مرنے کے بعد دوبارہ پھر سہ بارہ اسی طرح کئی بار دنیا میں پیدا ہونے کا تصور اپنایا جسے ''آواگون'' کہتے ہیں۔ بدھ مذہب والے ''نروان'' یعنی نیست و نابود ہو جانے کو کامیابی سمجھنے لگے۔ پیغمبران علیہم السلام نے بتایا کہ اگر سرکشی اور نافرمانی کی تو عذابِ جہنم تیار ہے اور اگر اطاعت کی تو جنت اور رضائے الٰہی حاصل ہوگی۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ O (سورۃ القمر، آیت ۱۰)
تو نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دُعا کی کہ میں درماندہ ہوں سو آپ (ان سے) انتقام لے لیجیے۔

ایک مجلس میں حضرت ڈاکٹر عبدالحی نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ایوب اور نوح علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعائیں دینی معاملات میں مغلوبیت کے لیے بھی اکسیر ہیں، مثلاً معاشرے سے مجبور ہیں کیا کریں؟ پارٹیوں میں تو جانا ہی پڑتا ہے۔ اولاد بات نہیں مانتی کیا کریں؟ شادی کی دعوت میں عورتوں کے لیے الگ انتظام ہم کرنا تو چاہتے تھے مگر بیٹے نے نہیں مانا۔ اگر ان مجبوریوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے رہیں اور گڑگڑا کر دعا مانگتے رہیں مغلوبیت سے نجات کے لیے تو ان شاء اللہ تعالیٰ نجات ہو جائے گی۔

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ O (سورۃ القمر، آیت ۵۵)
ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

اَلرَّحْمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ O عَلَّمَهُ الْبَيَانَ O
(سورۃ الرحمٰن، آیت ۱ تا ۴)
رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔

سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی لامتناہی رحمت کا ذکر ہے جو ہر شے کو محیط ہے۔ اس کے بعد قرآن شریف سکھلانے کی نعمت کا ذکر ہے۔ اس نعمت میں ایمان بھی شامل ہے اور ہدایت بھی۔ یہ نعمت وجود کی نعمت سے کہیں زیادہ نعمت ہے کیوں کہ اگر ایمان اور ہدایت نصیب نہ ہو تو ہمارا وجود ہمارے لیے آخرت میں جہنم میں لے جانے کا پیش خیمہ ہے اور دنیا میں حیاتِ طیبہ سے محرومی ہے۔

اس کے بعد نطق کی نعمت کا ذکر ہے۔ انسان کی قوتِ گویائی اس کی تخلیقی اور فکری صلاحیت کی نشاندہی کرتی ہے جس سے وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے کیوں کہ دوسرے حیوانات زبان اور وہ بھی مختلف زبانیں ایجاد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس ایک نعمت میں کئی نعمتیں شامل ہیں، مثلاً قوتِ سامعہ کا عطا ہونا کیوں کہ بہرا آدمی گونگا ہوتا ہے، عقل کی سلامتی جس کے بغیر بیان غیرمربوط اور قابلِ فہم نہیں رہتا وغیرہ۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ (سورۃ الرحمٰن، آیت ۱۹، ۲۰)

اسی نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے ہیں (اور) ان دونوں کے درمیان میں ایک حجاب ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو جس طرح یہ دو دریا ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے الگ ہیں اسی طرح نیکی اور برائی کی سرحد ہے اور جس کو border cells کہا جاتا ہے، اس کا وجود نہیں ہے۔ کوئی کام بھی آدمی کا ایسا نہیں ہوتا جو نہ اچھا ہو نہ برا۔ دونوں قوتوں کے درمیان چوڑی سرحد نہیں ہے۔ یہی مثال پل صراط کی ہے جو اقلیدس کے خط کی مانند ہے جس کی چوڑائی نہیں ہے۔ (Geometrical Line)

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ (سورۃ الرحمٰن، آیت ۶۰)

بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور بھی کچھ ہوسکتا ہے؟

بندے کی طرف سے احسان یہ ہے کہ خوب جی لگا کر کام کرے ایسے کہ جیسے

آ قا اس کو دیکھ رہا ہو اور بندہ چاہ رہا ہو کہ وہ ایسا بہترین کام کرے کہ آ قا اس سے خوش ہو جائے۔ جیسے دو غلام برتن صاف کر رہے ہوں۔ ایک تو جلدی جلدی کام ختم کرے کہ برتن گندہ معلوم نہ ہو اور دوسرا خوب محنت سے برتن مانجھے یعنی رگڑ رگڑ کر صاف کرے جس کو دیکھ کر آ قا خوش ہو جائے اور آ قا کی طرف سے احسان یہ ہے کہ جن نوازشوں کا بندے کو وہم وگمان بھی نہ ہو ان سے اس کو نوازے۔

برتن مانجھنے کی مثال دل کو مصفیٰ کرنے کی ہے کہ اپنے دل کو ایسا صاف کر لو جیسے آئینہ ہو۔ اس کے لیے کسی ماہر کی زیرِنگرانی بہت مشق کرنے کی ضرورت ہے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ (سورۃ الواقعہ، آیت ۱۳،۱۴)
ان کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے۔

پیغمبروں کا درجہ دوسروں سے کہیں زیادہ اونچا ہے اور جو ان کے ساتھی رہے ان کا درجہ غیر صحابہ سے کہیں زیادہ اونچا ہے اور حضور ﷺ سب سے آخری پیغمبر تھے اور آپ ﷺ کے صحابہ ؓ کے بعد یہ دور اوّلین کا ختم ہو گیا۔ یہ خداتعالیٰ کا انعام ہے کہ بعد میں آنے والوں میں سے بھی چند کو ان میں شامل فرما لیا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ (سورۃ الواقعہ، آیت ۲۵)
(اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ کوئی بے ہودہ بات۔

معلوم ہوا کہ لغو باتیں اور گناہ کی باتیں سننا بھی قلبِ سلیم رکھنے والے کو ناگوار ہے اور یہ جو ہمیں ایسی باتوں سے گرانی نہیں ہوتی تو یہ قلبِ سلیم اور فہمِ سلیم کی کمی

سے ہے جہاں قلبِ سلیم سے اُن لوگوں کا قلب مراد ہے جو مزکیٰ ہو چکے ہوں ورنہ عام آدمی میں تو فرشتوں والی خصوصیات بھی ہوتی ہیں اور اسفل السافلین کی بھی۔

اوّلین کا زمانہ کہاں پر ختم ہو گا اور آخرین کا کہاں سے شروع ہو گا اس کا صحیح تعین تو معلوم نہیں لیکن جیسا کہ احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا مقربوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّاتُمْنُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ○ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ○ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ وَنُنْشِئَکُمْ فِیْ مَا لَاتَعْلَمُوْنَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَۃَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَاتَذَکَّرُوْنَ ○ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ (سورۃ الواقعہ، آیت ۵۸ تا ۶۴)

اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔ ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے اور اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری جگہ اور تم جیسے (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے ہی نہیں اور تم کو اوّل پیدائش کا علم حاصل ہے پھر تم کیوں نہیں سمجھتے، اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں۔

ان آیات میں خدا کی قدرت کے چند نمونے بتائے گئے ہیں۔ ان نشانیوں میں پہلے بھی جو عبرت تھی آج بھی وہی عبرت ہے۔ انسان کی خلقت میں کسی کو دخل نہیں نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ کون سا ابتدائی جرثومہ (Spermatazoa) پروان چڑھے گا جو لاکھوں کروڑوں میں سے ایک ہو گا۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی کسی سائنس دان کو اس پر قدرت نہیں کہ کون سا انسانی جرثومہ پروان چڑھے گا۔ اسی طرح کھیتی باڑی میں

کروڑ چھوٹی چھوٹی غیر مرئی مخلوق مٹی کو گندم کے پودے کی غذا بناتے رہتے ہیں پھر جب خوشے نکل آتے ہیں تو کبھی کبھی اس طرح کی کوئی اور مخلوق اس کو اندر اندر سے کھا جاتی ہے اور باہر سے پتا بھی نہیں چلتا۔ منکرین بھی اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسی طرح پانی کے نازل کرنے میں نشانی ہے۔ لاکھ ہم مصنوعی بارش کریں، پانی جمع کرنے کے لیے ڈیم بنائیں لیکن جب خزانے سے پانی نازل نہیں ہوتا اور برف باری نہیں ہوتی، دریا، نہریں، ڈیم سب خشک ہو جاتے ہیں۔ آگ کا بھی یہی حال ہے۔ خواہ ہم کسی شکل میں بھی جلائیں آگ کا اصلی سرچشمہ (Source) درخت ہیں۔ انھی درختوں سے کوئلہ بنتا ہے، ان ہی سے پٹرول بنتا ہے اور گیس نکلتی ہے۔ ان سب کا ذکر الگ الگ آیتوں میں فرما کر اللّٰہ کی پاکی بیان کرنے کو فرمایا اور یہ سورۃ بھی اسی جملے ...العظیم پر ختم ہوتی ہے اور خدا کی نشانیاں دیکھ کر خدا کی عظیم قدرت کا احساس اور اس کی نعمتوں پر شکرادا کرنے میں دنیا میں بھی راحت اور لذت ہے اور آخرت میں بھی مومنوں کے لیے راحت ولذت ہو گی اور وہاں کی نعمتوں کو دیکھ کر بے ساختہ وہ الحمدللہ رب العٰلمین کہیں گے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝ (سورۃ الحدید، آیت ۸،۹)

اور تمھارے لیے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللّٰہ پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ رسول (ﷺ) تم کو اس بات کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور خود خدا نے تم سے عہد لیا تھا اگر تم کو ایمان لانا ہو وہ (رحیم) ایسا ہے کہ اپنے بندے (خاص محمد ﷺ) پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے تاکہ وہ تم کو (کفروجہل کی) تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے اور بے شک اللّٰہ تعالٰی تمھارے حال پر بڑا شفیق مہربان ہے۔

سبحان اللہ! ایمان کی طرف بلانے کی اور ایمان پر قائم رکھنے کی کتنی مؤثر بات بیان فرمائی ہے کہ جب رسول ﷺ تمھیں ایمان کی طرف بلا رہے ہیں تو پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے۔ شرافت کا تقاضا ہے چہ جائیکہ جس سے عہد کیا ہے جو انتہائی شریف اور معزز، سچے اور وعدے کی پاسداری کرنے والے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت اس لیے تھی کہ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ اپنی امت کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لائیں چونکہ اللہ تعالیٰ رؤف رحیم ہیں اس لیے انھوں نے رسول بھیجا اور ان کو مومنوں پر رؤف رحیم بنا کر بھیجا۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (سورۃ الحدید، آیت ۱۰)

اور تمھارے لیے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ سب آسمان زمین اخیر میں اللہ ہی کا رہ جائے گا جو لوگ فتحِ مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں وہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے (فتحِ مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

ایمان کے بعد اس کا پہلا تقاضا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہاں ایک مزید داعیہ انفاق کا یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی کے لیے ہے میراث آسمانوں اور زمینوں کی۔

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوۡنُوۡا كَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَكَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۝ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَكُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝

(سورۃ الحدید، آیت ۱۶، ۱۷)

کیا ایمان والوں کے لیے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دینِ حق (منجانب اللّٰہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہودونصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) ان پر زمانہ دراز گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر ان کے دل (خوب ہی) سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان میں کے (آج) کافر ہیں۔ یہ بات جان لو کہ اللّٰہ تعالیٰ زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے۔ ہم نے تم سے اس کے نظائر بیان کر دیے ہیں تا کہ تم سمجھو۔

اگلے لوگوں کی تقلید سے خبردار کیا گیا کہ تم ان جیسے نہ ہو جانا جن پر مدتیں گزر گئیں تو ان کے قلوب سخت ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت گناہ میں اور غفلت میں گزرنے سے قلوب سخت ہو جاتے ہیں۔ پہلے گناہ کو معمولی سمجھ کر اس کا تدارک نہیں کیا جاتا پھر اور بڑا گناہ سرزد ہوتا ہے پھر آدمی اس کے تدارک سے غفلت برتتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل سخت ہو جاتا ہے اور لاعلاج مرض ہو جاتا ہے۔ سوا اس کے کہ اللّٰہ تعالیٰ ہی رحم فرمائیں۔ خشیتِ قلب نہ ہونے کو اہلِ کتاب کی قساوتِ قلب سے تشبیہ دی گئی۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے ترجمے کے حاشیہ میں لکھا ہے ''یعنی وقت آ گیا ہے کہ مومنین کے دل قرآن اور اللّٰہ کی یاد اور اس کے سچے دین کے سامنے جھک جائیں اور نرم ہو کر گڑگڑانے لگیں۔''

آیت ۱۷ میں اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ایک نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ

مردہ دلوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ ''اعلموا'' سخت تنبیہہ ظاہر کرتا ہے۔ کسی سخت سے سخت کافر کو بھی توبہ کی توفیق ہو سکتی ہے اور مومن کو تو حکم ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید نہ ہوں۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ O (سورۃ الحدید، آیت ۱۸)

بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور یہ (صدقہ دینے والے) اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں وہ صدقہ ان کے لیے بڑھا دیا جائے گا اور ان کے لیے اجر پسندیدہ ہے۔

اشارتاً اس آیتِ کریمہ میں قساوت دور کرنے کے لیے ایک اور بات بتائی گئی ہے وہ ہے صدقات اور قرضِ حسنہ دیتے رہنا۔ آیت نمبر ۲۰ میں دنیا کی بے ثباتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کو یاد رکھنے سے آدمی بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے اور غفلت جو قساوت کا سبب ہے، دور ہوتی ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ O سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ O

(سورۃ الحدید، آیت ۲۰، ۲۱)

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلے میں) دنیوی حیات محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں عذابِ شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکے کا اسباب ہے۔ تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ وہ ان لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

یہ پورا رکوع اس مضمون سے متعلق ہے۔ کھیل تماشا، زینت وتفاخر اور دوسرے انسانوں سے خدمت لینا اور دولت اور عیش وعشرت کے سامان پر قبضہ ہونا۔ اس کی مثال جو کھیتی اور بارش سے دی گئی ہے اس سے اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لیے ہی زندگی ہے اور اگر وحی کا نور نہیں ہوتا تو ساری دنیا ان ہی چیزوں کے پیچھے پڑی رہتی۔ دوسرے کفار کے خوش ہونے سے اس لیے مثال دی گئی ہے کہ مومن تو ہر وقت خدا سے ڈرتا رہتا ہے اور اس کے فضل کا امیدوار رہتا ہے اور اسی رکوع میں جو تقدیر کا مسئلہ بتایا گیا ہے وہ اسے فرحِ مذمومیہ سے باز رکھتا ہے۔ تیسرے کفار ہی کے ساتھ یہ معاملہ ہو گا کہ ان کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ مومنوں کے ساتھ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور فضلِ عظیم کی امید ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں مشترک ہے۔

تمام گناہوں کا منبع لعب اور لہو میں مبتلا رہ کر آخرت کو بھول جانا ہے۔ لعب میں غالباً جسمانی لذتیں، مثلاً ملاعبت بالنساء آتی ہیں اور لہو میں دوسری غفلت کی باتیں

(مثلاً جوا) آتی ہیں اور یہ دونوں حبِ دنیا میں شامل ہیں جس کو راس کل خطیۃ فرمایا گیا ہے (حدیث شریف میں) اور اس سے اجتناب اسی وقت ہوسکتا ہے جب عذابِ شدید کا خوف ہو اور فضلِ عظیم کی اُمید ہو۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے گناہوں سے اجتناب فطری بات معلوم ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں لہوولعب تفاخر وغیظ سب موجود ہیں۔ دونوں باتوں میں تطبیق اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ حد سے زیادہ لھوولعب میں انہماک یا تفاخر اسی وقت تک انسان کو محبوب ہے جب تک اس کے نزدیک زندگی صرف دنیاوی زندگی ہو، جس انسان کو یہ حقیقت معلوم ہو کہ بعد کی زندگی لامتناہی ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کی زندگی بہت تھوڑی ہے تو وہ یقیناً ہمیشہ کی زندگی کے لیے ان تمام باتوں سے بچے گا جو ناجائز ہیں۔ اس کے لیے تکبر نہ کرنا ایک فطری بات ہوگی اور ان سے فطرت کا قانون نہیں ٹوٹتا، مثلاً نکاح کرنا اور زنا سے بچنا، سچ بولنا اور جھوٹ سے بچنا، دوسروں پر شفقت کرنا اور ان کی عیب جوئی اور غیبت سے بچنا۔ یہ سب باتیں فطری معلوم ہوں گی۔ یہی فطرتِ سلیمہ کی پہچان ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ (سورۃ الحدید، آیت ۲۲ تا ۲۴)

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ میں) لکھی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (یہ بات) بتلا اس واسطے دی ہے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم

کو عطا فرمائی ہے اس پر اِتراؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو
پسند نہیں کرتا جو ایسے ہیں کہ (حبِ دنیا کی وجہ سے) خود بھی بخل کرتے ہیں
اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہیں اور جو شخص اعراض کرے گا
(دینِ حق سے) تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں سزاوارِ حمد ہیں۔

یہ اس عالم کی بات ہے جہاں ماضی، حال اور مستقبل سب ایک ہیں۔ زمان و مکان کی سرحدوں سے آگے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے وہی ہو رہا ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہو رہا ہے اور جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ فیما کسبت ایدیکم اور یوتی اللّٰہ المومنین اجراً عظیماً بھی ہے۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ پہلی بات اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے، دوسری بات اس عالم کی ہے جہاں ہم رہتے ہیں جہاں زمان ومکان کے قیود ہیں۔ جہاں ماضی، حال اور مستقبل ہے اور ہر جگہ سبب اور اثر (cause & effect) کی مضبوط کڑی نظر آ رہی ہے اور اسی طرح بیان بھی فرمایا گیا ہے کہ فلاں قوم نے ایسا کیا تو ہم نے ان کے ساتھ ایسا کر دیا۔ تم ایسا کرو گے تو اس کا یہ بدلہ ملے گا۔ یہ سب کچھ ہماری اضافت سے ہے اور دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ اللہ کے لیے آسان ہے اور دونوں مشاہدے کی باتیں ہیں۔

مصیبت عام معنی میں بھی ہے اور لغوی معنی میں بھی کہ جو کچھ بھی اچھا یا برا ہو رہا ہے۔ تقدیر کے اس راز کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی مصلحت بھی بیان فرما دی کہ یہ اس لیے ہے کہ تم کسی مصیبت کے آنے سے گھبرا کر مایوس نہ ہو جاؤ کیوں کہ تقدیر کا علم کسی کو نہیں ہے نہ معلوم اس کے بعد کب اچھا وقت تقدیر میں لکھا ہوا ہو۔ اسی طرح نعمت کے ملنے پر اِتراؤ نہیں، یعنی تقدیر کا راز مومن کے دل کو خوف اور رجا کے درمیان رکھنے کے لیے بتایا گیا ہے اور لاتاسو اور لاتفرحوا کا حکم عقلی ممانعت کے ہے ورنہ طبعی گھبراہٹ اور خوشی ایک حد تک فطری بات ہے۔ تقدیر پر ایمان لانا واجب

اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِهِ اللّٰهُ وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ یَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ○ (سورۃ المجادلۃ، آیت ۸)

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا (مگر) پھر (بھی) وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی سرگوشیاں کرتے ہیں اور وہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں آپ کو ایسے لفظ سے سلام کہتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا اور اپنے جی میں (یا اپنے آپس میں) کہتے ہیں کہ (اگر پیغمبر ہیں تو) اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے اس کہنے پر سزا (فوراً) کیوں نہیں دیتا۔ ان کے لیے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ (ضرور) داخل ہوں گے سو وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

کافروں کے لیے دنیا میں عذاب ضروری نہیں۔ جہنم ہی ان کے لیے کافی ہے مگر کبھی کبھی دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے جس طرح لولا۔۔ لعذبهم فی الدنیا۔۔ النار (الحشر ۳) سے ظاہر ہے اور آگے اس سورۂ حشر نمبر ۵ میں فرمایا ماقطعتم ... لیجزی الفسقین۔ دنیا کا عذاب اور دنیا کی رسوائی مصلحتِ خداوندی کے تحت ہے۔ مگر بارہا قوموں پر دنیا میں بھی عذاب آیا ہے اس لیے نافرمانوں کو ڈرتے رہنا چاہیے۔ دنیا کی اہمیت اس عذاب کے بدلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

مَاقَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓی اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ ○ (سورۃ الحشر، آیت ۵)

جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جگہ پر کھڑا رہنے

دیا سو (دونوں باتیں) خدا ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہیں اور تا کہ کافروں کو ذلیل کرے۔

معلوم ہوا کہ فاسقوں کی رسوائی اللّٰہ تعالیٰ چاہتے ہیں لیکن یہاں فاسقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جو کافر تھے اور فسق کے انتہائی درجے تک پہنچے ہوئے تھے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کی ذلت بھی مطلوب ہے اور ان کو ہر معاملے میں مسلمانوں کے برابر رکھنا اور ان کی دولت یا ثروت کی وجہ سے ان کی عزت کرنا مذموم ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ مسلمان مملکت ان کو پناہ نہ دے یا ان کے اور کسی مسلمان کے مابین کوئی معاہدہ ہو تو ان کے ساتھ بے انصافی کرے۔ جزیہ کا حکم اس کی مثال ہے جس کا ترقی یافتہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں لیکن اس سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ آج امریکا کے پاس قوت ہے تو وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ تمام مسلم ممالک ہمیں آقا سمجھیں اور ان کی معیشت ہمارے اختیار میں ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (سورۃ الحشر، آیت ۱۸، ۱۹)

اے ایمان والو! اللّٰہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے اور اللّٰہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللّٰہ تعالیٰ کو تمھارے اعمال کی سب خبر ہے اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنھوں نے اللّٰہ (کے احکام) سے بے پروائی کی۔ سو اللّٰہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں۔

تقویٰ کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی دیکھے کہ اس نے اپنے نفس کے لیے آنے

والی زندگی یعنی کل کے لیے کیا جمع کر رکھا ہے اور تقویٰ کے برعکس عمل اللہ تعالیٰ کو بھول جانا ہے، یعنی تقویٰ ذکر اللہ کے مترادف ہے۔ جو خدا کو یاد رکھے گا وہ متقی ہوگا اور جو اس کو بھول جائے گا وہ فاسق ہوگا اور متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے نفس کی نگہداشت اور خیرخواہی کرے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنے نفس کی خیرخواہی سے غافل کر دیتے ہیں اگرچہ وہ ہمہ تن نفس پروری میں مصروف رہتے ہیں۔ حقیقت میں وہ روز بروز زیادہ خسارے میں پڑتے جاتے ہیں۔ ان کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔ عجب وغرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہشات بڑھتی ہی جاتی ہیں اور کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ بالفرض اگر وہ ساری عمر بھی عیش وعشرت میں گزار دیں اور آخرت کی لامتناہی زندگی میں تکلیف اور عذاب میں مبتلا رہیں تو یہ کون سی نفس کی خیرخواہی ہے اور کون سی عقل مندی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو قومِ لایعقلون کہا گیا ہے کہ خالق کا تو کچھ ڈر نہیں اور مخلوق کا ڈر ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔

نفس کا مزہ اور چیز ہے اور نفس کا فائدہ اور چیز ہے جیسے ایک بچے کو چاقو سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے لیکن اس کا باپ یہ سمجھتا ہے کہ اس سے یہ زخمی ہو سکتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیتا ہے یا ایک بچے کو آگ خوب صورت لگتی ہے اور وہ اس کو چھونا چاہتا ہے لیکن اس کی ماں یہ سمجھتی ہے کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے اس کو وہاں سے ہٹا دیتی ہے۔ نفس کا مزہ تو بہت سی ایسی باتوں میں آتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں، مثلاً مردوں عورتوں کا آزادانہ اختلاط لیکن اللہ تعالیٰ ہی اس کو بتاتے ہیں کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ کیا چیز نفس کے لیے مضر ہے کیا چیز مفید، یہ تجربے سے بھی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ علم ناقص ہے اور مختلف لوگوں کے مختلف تجربات ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے وحی کے ذریعے جو علم پہنچتا ہے وہ حقیقی اور اٹل ہوتا ہے۔

تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور اس کی ہدایت سے بے پروا ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ نفس کے مزے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور نفس کے نفع نقصان کو بھول جاتے ہیں۔ فاعاذنا اللہ من ذلک۔

حضرت تھانویؒ نے ترجمے میں فرمایا، ''یعنی ان کی ایسی عقل ماری گئی کہ خود اپنے نفعِ حقیقی کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا۔'' نفعِ حقیقی آخرت کا نفع ہے جس کا اشارہ اس سے پہلے والی آیت میں ''ماقدمت لغد'' سے ملتا ہے۔ اور کافی حد تک دنیا میں بھی گناہ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ گناہ کی تاثیر ہی یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو نقصان پہنچے خواہ براہِ راست خواہ بالواسطہ کہ زید کے گناہ سے بکر کو نقصان پہنچا پھر اس سے معاشرہ خراب ہوا پھر معاشرے کی خرابی کا اثر زید تک پہنچا۔ آج جو دنیا میں بے چینی، ظلم و تشدد ہے یہ سب لوگوں کے فسق و فجور ہی کا تو نتیجہ ہے۔ جب معاشرے میں ظلم و فساد عام ہو جائے تو ظالم کو مظلوم بنتے دیر نہیں لگتی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(سورۃ الممتحنہ، آیت ۱۲)

اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس (اس غرض سے) آئیں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی (اولاد) لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کر کے) بنالیویں اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجیے اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیا کیجیے بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں بھی ''معروف میں'' اطاعات کا ذکر ہے جن سے غیر معروف بات کا حکم ملنا محال تھا تو کسی اور کے ہاتھ پر

غیر مشروط اطاعت کی بیعت کا کیا سوال ہے۔

اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیعت کا تربیت و اصلاحِ نفس میں بڑا دخل ہے۔ یہاں عورتوں کا ذکر اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمزور مخلوق ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیعت سے ایک خاص تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ان کے لیے خاص طور پر استغفار کرنے کا حکم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ڰ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ (سورۃ الممتحنہ، آیت ۱)

اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو حالانکہ تمھارے پاس جو دینِ حق آ چکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔ رسول (ﷺ) کو اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہربدر کر چکے ہیں، اگر تم میرے رستے پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور (آگے اس پر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہِ راست سے بھٹکے گا۔

غیرتِ ایمانی کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے لوگوں سے دشمنی ہو جو اللہ کے دشمن اور مسلمانوں کے دشمن ہوں۔ جو رسول کو (جھوٹا کہتے تھے اور ان کو) گھر سے نکالا۔ محبت کی بنیاد ایمان ہے اور عداوت کی بھی جیسا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا

کہ میرے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کی دشمنی قائم ہو چکی۔ آج جو معیار دوستی بدل گیا ہے وہ سراسر غیرتِ ایمان کے خلاف ہے۔

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً وَّیَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ۝ لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ۚ یَفۡصِلُ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ۝ (سورۃ الممتحنہ، آیت ۲،۳)

اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو (فوراً اظہارِ عداوت کرنے لگیں اور (وہ اظہارِ عداوت یہ کہ) تم پر برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں (یہ دنیوی اضرار ہے) اور (دینی اضرار یہ کہ) وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم (کافر) ہی ہو جاؤ۔ تمھارے رشتے دار اور اولاد قیامت کے دن تمھارے کام نہ آئیں گے، خدا تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمھارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔

یوم القیامۃ کا ذکر اس لیے کیا گیا تاکہ مومنوں کی سمجھ میں فوراً آ جائے ورنہ وقت پڑنے پر وہ دنیا میں بھی کچھ کام آنے والے نہیں تھے جیسا کہ آیت ۲ میں ہے۔ لیکن جب تک وقت نہ پڑے معلوم نہیں ہوگا اس لیے اگلی آیتِ کریمہ میں قیامت کے دن ان کے کام نہ آنے کا ذکر ہے جو یقینی ہے اور وہ وقت تو آنے ہی والا ہے۔

قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا

بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ O (سورۃ الممتحنہ، آیت ۴)

تمھارے لیے ابراہیم (علیہ السلام) میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان واطاعت میں) ان کے شریکِ حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ لیکن ابراہیم (علیہ السلام) کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی کہ میں تمھارے لیے استغفار ضرور کروں گا اور تمھارے لیے (استغفار سے زیادہ) مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم آپ پر توکّل کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے ترجمہ کیا ہے، ''ہم الگ ہیں تم سے اور ان سے جن کو تم پوجتے ہو... ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ ایک اللہ پر...''

جب تک کفار سے اور کافرانہ نظام اور معاشرے سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا جائے گا اور جب تک اس کا برملا انکار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اسلامی نظام اور معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا، مثلاً جب تک دل سے اس نظام کو باطل نہیں سمجھا جائے گا۔ جہاں روپیہ کسی کے پاس صرف جمع کرا دینے سے یا کسی کو قرض دے دینے سے بڑھتا رہے وہاں بلاسودی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

ایمان کے تقاضوں میں سے ہے کہ غیر مسلموں سے محبت نہ رہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا جائے اور یہ حقیقت ہے، خواہ ہم اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں کہ کفر اور ایمان میں محبت نہیں ہو سکتی۔ دلی تعلق تو صرف اہلِ ایمان کو اہلِ ایمان سے ہو سکتا ہے لیکن لوگ یہ کہنے کو تیار نہیں ہیں اگرچہ بارہا اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ البتہ کچھ ڈھکے چھپے

الفاظ میں بہت سے لوگ اس حقیقت کا اظہار کرتے رہے ہیں، مثلاً اقبال نے کہا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ ہمارے اور تمھارے درمیان دشمنی کھل پڑی ہے، دشمنی کی ابتدا نہیں کی تھی بلکہ ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا جرأت کے ساتھ۔ دشمنی تو کفار نے شروع کر ہی دی تھی۔ آپ ﷺ نے بھی اعلان فرما دیا کہ تم لاکھ کہو کہ ہم تم دوست ہیں ہم تم بھائی بھائی ہیں کچھ تو ہماری بھی بات مان لو، میں تمھیں دوست یا بھائی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ صرف دھوکا ہے اور چال ہے۔ اب تو دوستی اور بھائی چارہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تم بھی اس وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لے آوَ جیسا میں لایا ہوں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (سورۃ الصف، آیت ۲،۳)

اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

لاف زنی ان برائیوں میں سے ہے جن میں عام ابتلا کی وجہ سے انھیں معمولی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہیں۔ اس کے آگے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بتایا جارہا ہے جو صف بستہ ہوکر اس کی راہ میں قتال کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ فرمایا ہے کہ اس سے واعظوں کے بےعمل ہونے کی مذمت مقصود ہے، یعنی واعظ کو بےعمل ہونا جائز نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ بےعمل کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ ایک اور لطیف بات حضرت تھانویؒ نے ''الدعوت الی اللہ'' میں فرمائی ہے کہ ''قول کے اچھے ہونے میں عمل کے اچھے ہونے کو دخل ہے...

مشاہدہ ہے کہ اگر ناصح خود عمل نہ کرے تو اس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا اور جو خود عمل کرے اس کی نصیحت پر عمل ہوتا ہے۔'' تو اگر کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کے کہنے پر عمل کریں تو اس کو خود بھی عمل کرنا چاہیے اور اگر صرف اپنی قابلیت بتانا مقصود ہو ثواب کے بجائے گناہ کمایا۔

وَاِذْقَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (سورۃ الصف، آیت ۵)

اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو، حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمھارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ پھر جب (اس فہمائش پر بھی) وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اور (زیادہ) ٹیڑھا کر دیا اور اللہ تعالیٰ ایسے نافرمانوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا۔

جب وہ مسلسل گناہ اور نافرمانی کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب ٹیڑھے کر دیے۔ اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ قلب میں نیکی کی طرف واپس آنے کی صلاحیت قائم رہتی ہے جب تک کہ ایک عرصہ نافرمانی میں گزر نہ جائے۔ جب تک ایمان قائم ہے اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ آدمی خود کو مسلمان سمجھتا رہے اور ایمان اس کے دل سے رخصت ہو چکا ہو۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ

مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ط فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ O (سورۃ الصف، آیت ٦)

اور (اسی طرح وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب کہ عیسیٰ (علیہ السلام) ابنِ مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے جو پہلے توراۃ (آ چکی) ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔ پھر جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت) کہنے لگے یہ صریح جادو ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا تھا جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو پیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد، یعنی بہت سراہا گیا یا بہت حمد کرنے والا۔ پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو فارقلیط کر دیا بعض عبرانی نسخوں میں نام مبارک احمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔'' (بیان القرآن)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں ہے یسمیٰ احمد الذی لایذم ومحمد الذی یحمد۔ یعنی احمد کے معنی ہیں وہ جس کی تعریف ہی تعریف کی گئی ہو، کوئی برائی نہیں کی گئی ہو۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ O تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ O وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ O (سورۃ الصف، آیت ١٠ تا ١٣)

اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچا لے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (جب ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (بنے) ہوں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔

آیت نمبر۱۰ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مومنوں کو بھی عذاب کا خطرہ ہے جیسا کہ معراج کی حدیث شریف میں فاسق مسلمانوں کو مختلف گناہوں کی وجہ سے عذاب دیے جانے کی تصریح ہے۔ اس سے نجات پانے کے لیے دو باتوں کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایمان لانے کی یعنی ایمان میں پختگی کی اور مال وجان سے جہاد کی۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جتنا ایمان قوی ہوگا اتنا ہی معاصی سے اجتناب ہوگا۔ یہاں مومنوں کو ایمان لانے کے لیے کہا جا رہا ہے یعنی اپنے ایمان کو قوی کرو۔ تجدیدِ ایمان کرتے رہو۔ ایمان کا قوی اور ضعیف ہونا حدیث ذلک اضعف الایمان سے ثابت ہے۔ ایمان میں قوت پیدا کرنے کا ذریعہ مقربین اور ابرار کی صحبت، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار، اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غوروفکر اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے اور جان ومال سے جہاد کا ہر وقت موقع ہے۔

وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝ (سورۃ الجمعہ، آیت ۳)

اور (علاوہ ان موجودین کے) دوسروں کے لیے بھی ان میں سے جو ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔

نہ صرف رسول اللہ ﷺ کا اُمّی ہونا معجزہ تھا بلکہ آپ ﷺ کی قوم کا بھی اُمّی ہونا معجزہ تھا کہ اُمّیین کو اعلیٰ علیین کے مقام پر پہنچا دیے۔ الملک اس کی شان ہے جس کو چاہے بادشاہت دے۔ القدوس ہے ضلال مبین سے نکال کر روشنی میں لانا اور گندگی کو صفائی اور پاکیزگی سے بدل دینا، اس کا معمولی کرشمہ ہے۔ العزیز ہے اپنے ارادے پر غالب ہے اور الحکیم ہے امن قوم کا چننا بھی بہت سی حکمتوں پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس قوم کی حیرت انگیز ترقی آج تک لوگوں کے لیے معجزہ بنی ہوئی ہے۔

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُوالۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ۝

(سورۃ الجمعہ، آیت ۴)

یہ (رسول ﷺ کے ذریعے سے گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا) خدا کا فضل ہے۔ وہ فضل جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس کا فضل بلاسبب ہے جس کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے اور اس کی بخشش لامحدود ہے۔

قابلیت داد او را شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

اور ہونا بھی یہی چاہیے، وہ خدا ہی کیا ہوا جو بے حساب فضل اور بلااستحقاق بخشش نہ کرے۔ آخر وہی خاص امین کیوں چنے گئے؟ محض خدا کی رحمت اور بخشش تھی۔ ڈھونڈنے سے اس کے اسباب بھی مل جاتے ہیں لیکن اسباب کے اسباب اور پھر ان کے اسباب تلاش کرنے کے بعد بالآخر آدمی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ خدا کی مرضی یہی تھی اور خدا کا فضل بلاسبب ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًاؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝ (سورۃ الجمعہ، آیت ۵ تا ۷)

جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی حالت اس گدھے کی سی حالت ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی بُری حالت ہے جنھوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا (جیسے یہود ہیں) اور اللّٰہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیا کرتا (اور اگر یہ لوگ یہ) کہیں کہ ہم باوجود اس حالت کے بھی اللّٰہ کے مقبول ہیں تو آپ (ان سے) کہہ دیجیے کہ اے یہودیو! اگر تمھارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلاشرکتِ غیرے اللّٰہ کے مقبول (محبوب) ہو تو تم (اس کی تصدیق کے لیے) موت کی تمنا کر (کے دکھلا) دو اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو۔ اور وہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللّٰہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی۔

ایک درجے میں آج مسلمانوں کی اکثریت کا یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ شوقِ شہادت سے دل خالی ہیں اور احکاماتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی انفرادی اور اجتماعی طور پر کر رہے ہیں۔ شوقِ شہادت تو کجا موت کے خوف اور دنیا کی محبت یعنی دھن میں ایسے مبتلا ہیں کہ غیرقومیں ہمیں خوان یغما سمجھ کر ایک دوسرے کو دعوت دے رہی ہیں کہ آؤ ان کو کھا جائیں۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًاؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۝
(سورۃ الجمعہ، آیت ۱۱)

اور (بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ) وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کی طرف دوڑنے کے لیے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ جو چیز (از قسم ثواب وقرب) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلے اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے اور اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے۔

تجارت یعنی جس میں نفع کی امید ہو۔ اس میں صنعت وحرفت کے کام بھی شامل ہیں یا کھیل تماشا (مولانا تھانویؒ کا ترجمہ ''مشغول کی چیز کیا ہے'') یہی دو باتیں ہیں جن میں انسان مشغول رہتا ہے یعنی یا تو زندگی کا لطف اٹھانے کے سامان مہیا کرنے میں مبتلا رہتا ہے یا زندگی کا لطف اٹھانے میں۔ اور ان ہی دو باتوں کی وجہ سے وہ نماز سے غافل رہتا ہے۔

اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں خشوع کی کمی بھی یہی ہوتی ہے کہ آدمی نماز میں بھی ان ہی باتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اگر اسے یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر رزق دینے والے ہیں اور جو اللہ کے پاس ہے وہ تمام تجارت اور لہو سے بہتر ہے تو وہ نماز میں زیادہ خشوع کا اہتمام کرے گا اور اصل انعامات تو آخرت کے انعامات ہیں۔ یوں تو تجارت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد ضروری ہے لیکن نماز میں جو خدا کی یاد ہے وہ ہمہ تن مشغولیت ہے۔ اس کی یاد اور اس کے ذکر میں اور اس سے مناجات کرنے میں۔

اذا جآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝

(سورۃ المنافقون، آیت ۱)

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے)

گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول(ﷺ) ہیں اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول(ﷺ) ہیں (اس میں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں۔

جس بات کی وہ گواہی دے رہے ہیں وہ بات تو بالکل سچی ہے لیکن وہ خود پرلے درجے کے جھوٹے ہیں کیوں کہ وہ صرف زبان سے نشھد کہتے ہیں دل سے گواہی نہیں دے رہے ہیں۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○ (سورۃ المنافقون، آیت ۴)

اور جب آپ ان کو دیکھیں تو (شان و شوکت ظاہری کی وجہ سے) ان کے قدوقامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی باتیں سن لیں گویا یہ لکڑیاں ہیں جو (دیوار کے) سہارے لگائی ہوئی (کھڑی) ہیں۔ ہر غل پکار کو (خواہ وہ کسی وجہ سے ہو) اپنے اوپر (پڑنے والی) خیال کرنے لگتے ہیں یہی لوگ (تمھارے پورے) دشمن ہیں، آپ ان سے ہوشیار رہیے۔ خدا ان کو غارت کرے (دین حق سے) کہاں پھرے چلے جاتے ہیں۔

یہی حال بعض لوگوں کا ہے کہ دیکھنے میں بڑے معزز اور بولنے میں ایسے کہ آپ سنتے ہی رہ جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی لوگوں کو حکومت اور سرداری زیب دیتی ہے مگر اندر سے بالکل کھوکھلے کانھم خشب مسندۃ۔

يَقُولُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ المنافقون، آیت ۸)

(اور) یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دے گا اور (یہ کہنا جہلِ محض ہے بلکہ) اللہ کی ہے عزت (بالذات) اور اس کے رسول(ﷺ) کی (بواسطہ تعلق مع اللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ و الرسول کے) لیکن منافقین جانتے نہیں۔

اس آیتِ کریمہ کا نزول ایک ایسے واقعے کے بعد ہوا جس سے خیرالقرون کے مسلمانوں کی دینی غیرت وحمیت کا پتا چلتا ہے۔عبداللہ ابن ابی جب ایک غزوہ میں مہاجرین کے خلاف جو عام طور سے نادار تھے، انصار کو ابھارنا چاہا اور یہ کہا کہ جب ہم مدینے واپس پہنچیں گے تو عزت دار لوگ ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے۔ اس پر اس کے ایک لڑکے اس کو قتل کرنے کے لیے اس پر سوار ہو گئے اور کہا کہ تو ہی ذلیل ہے اور جب تک اس کی زبان سے یہ نہیں کہلوا لیا کہ عزت اللہ اور رسول ﷺ اور مومنوں کے لیے ہے اسے نہیں چھوڑا۔

دراصل ناداروں کو ذلیل سمجھنے والے صرف ظاہری اور ناپائدار باتوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی کے روپے پیسے اور شان وشوکت کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں اس کی اپنی ہیں حالانکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں اور وہ جب چاہیں ان کو چھین لیں۔ اسی طرح لوگ ظاہری سخاوت کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر کوئی کسی پر احسان کرکے اس کو ذلیل سمجھنے لگے تو احسان لینے والا افسوس کرے گا کہ کاش یہ احسان نہیں لیا ہوتا۔ حقیقی طور پر اس شخص میں سخاوت یا اخلاقِ حسنہ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کا زیادہ فرمانبردار اور اس سے زیادہ تعلق رکھنے والا ہو گا۔ اسی لیے مخلوق میں سب سے زیادہ معزز رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی عزت دوست، دشمن، اِنس وجن سب کے دل میں ہے

اور ان ﷺ ہی کے طفیل میں مومنوں کو عزت حاصل ہے۔

اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ بے چارے غریب اور جن پیشوں کو عرفاً کم عزت سمجھا جاتا ہے ان پیشے والے مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں ان کے دل میں ایک طرح کا نفاق ہے۔ ایک مومن کے دل میں ایک عام مسلمان کی عزت کافر بادشاہوں اور روٴسا کی عزت سے زیادہ ہونی چاہیے اور جس معاشرے میں عزت اور ذلت کا معیار ایمان اور تقویٰ پر نہ ہو وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔

❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝ (سورۃ المنافقون، آیت ۹)

اے ایمان والو! تم کو تمھارے مال اور اولاد (مراد اس سے مجموعۂ دنیا ہے) اللہ کی یاد (اور اطاعت) سے (مراد اس سے مجموعۂ دین ہے) غافل نہ کرنے پائے اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف مال واولاد ہی میں پڑ کر آدمی خدا کی یاد سے غافل ہو جائے تو وہ گھاٹے میں ہے، بلکہ کسی بھی کام میں پڑ کر اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جانا گھاٹے کا سبب ہے۔ مال واولاد کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ عادتاً یہی چیزیں اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور کوئی بھی نعمت انسان کو منعم سے غافل کر دے تو یہ نعمت کا قصور نہیں ہے۔

❁

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝ (سورۃ التغابن، آیت ۱۱)

کوئی مصیبت بدون حکمِ خدا کے نہیں آتی اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا
ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر و رضا کی) راہ دکھا دیتا ہے اور اللہ ہر چیز
کو خوب جانتا ہے۔

حضرت عارف باللہ قدس اللہ سرہٗ نے معمولاتِ یومیہ میں فرمایا کہ زندگی میں روزانہ دن رات نہ جانے کتنی ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں جو ہمیں ناگوار اور نفس پر شاق ہوتی ہیں... ہر ایسی بات جو قلبی سکون و عافیت کو درہم برہم کر دینے والی ہوتی ہے صبر آزما ہوتی ہے لیکن چونکہ غیراختیاری ہوتی ہے اس لیے اس کے منجانب اللہ ہونے کا عقیدہ رکھنا واجب ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اس عقیدے کا راز بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی مصیبت بدون حکمِ خدا نہیں آتی ''یہ سمجھ کر ضرور رضا حاصل کرنا چاہیے۔'' لیکن تقاضائے بشری مثل غصہ، انتقام کا جذبہ وگیرہ کے ہوتے ہوئے تفویضی کا یہ مقام کیسے حاصل اور پھر تفویض کے ساتھ ساتھ اس مضرت کے دفعیہ کی طرف کیونکر توجہ ہو اور شر کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ یہ سب باتیں بہت پیچیدہ ہیں۔ مختصراً یہ بات بتا دی گئی ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائے گا اللہ اس کے قلب کو ہدایت دے دے گا جس کی بدولت مصیبت زدہ آدمی تفویض ورضا پر بھی قائم رہے گا اور مصیبت کو دور کرنے میں بھی مثبت کردار ادا کرے گا۔

ہر مصیبت کو اللہ کے حکم سے سمجھ کر مصیبت سے راضی رہنا واجب نہیں ہے بلکہ اللہ سے راضی رہنا واجب ہے اور اس کے بعد اللہ ہی کے حکم سے اس کو راضی کرنے کے لیے اس مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا عین فطری امر ہے جو کبھی مستحب ہے اور کبھی واجب ہے۔ قلب میں ان دونوں ردِعمل کا جمع ہو جانا ایمان ہی کی بدولت ہے۔

دنیاوی معاملات میں جو مصیبتیں آتی ہیں ان میں اکثر پتا چل جاتا ہے کہ ہماری فلاں غلطی کی وجہ سے یہ مصیبت آئی اور اس کا تدارک کرنا ہے۔ بہت سی مصیبتیں

ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں اور اس کا پتا چلانا مشکل ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی بندے کو اِلقا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں گناہ کا ثمرہ ہے اور کبھی کبھی درجات بڑھانے کے لیے مصیبت آتی ہے۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں کہ دیکھیں ہمارا بندہ اپنے ردِعمل کا کس طرح اظہار کرتا ہے تو جو صاحبِ ایمان ہیں وہ مصیبت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور صبروشکر کرتے ہیں کہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہوگا اور تلافی مافات میں لگ جاتے ہیں اور جو مومن نہیں ہیں یا جن کا ایمان بہت کمزور ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ مصیبت ہم ہی پر کیوں آئی، دوسرے بھی تو گناہ میں مبتلا ہیں بلکہ ہم سے زیادہ گناہ گار ہیں، لہٰذا انھیں صبر بھی بہت دیر میں آتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ایک موقع عطا فرمایا تھا اپنے اعمال پر تنبیہ کا، تلافی مافات کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا، وہ کھو دیتے ہیں۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو تم پر مصیبت آتی ہے وہ اس وجہ سے ہے جو تم کماتے ہو یعنی تمھارے اعمال کی وجہ سے تم پر مصیبت آتی ہے اور ایک جگہ ہے کہ جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ ہم نے پہلے سے لکھ رکھا ہے اور یہاں ہے کہ جو مصیبت آتی ہے، وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں جس طرح اشیا کے اثرات ہیں کہ آگ جلائے گی اور پانی بجھائے گا اسی طرح اعمال کے اثرات ہیں۔ ایسا عادتاً ہوتا ہے لیکن یہ تاثیرات مستقل نہیں ہیں اور مشیتِ ایزدی ہر وقت کام کر رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اتنے زبردست خالق ہیں کہ ایک ''کن'' سے بے شمار اسباب پیدا ہوتے ہیں سبب اور مسبب کا لامتناہی سلسلہ ہے اور سب کچھ اتنی جلدی ہو جاتا ہے کہ حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس پورے سلسلے میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ صاحبِ ایمان ہر مصیبت میں پہلے اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے یااللہ! مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کو معاف فرما دیجیے۔ یااللہ! یہ مصیبت آپ ہی کے حکم سے آئی ہے اور آپ ہی اس کو دور فرما سکتے ہیں۔ یااللہ! اب میں کیا کروں؟ اس کے بعد وہ مصیبت کو دور کرنے اور اس کے اسباب تلاش کرنے میں مشغول ہوتا ہے اور جو صاحبِ ایمان نہیں

ہے وہ فوراً مصیبت کی طرف دیکھتا ہے، اف یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔ اب میں کیا کروں؟ صاحب ایمان جو وقت اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کرنے میں لگاتا ہے وہ رفتہ رفتہ جب رجوع کرنے کی عادت ہو جاتی ہے تو کم ہوتا جاتا ہے اور پھر اتنا کم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اتنی دیر میں یعنی مصیبت اور اس کے دور کرنے کے عمل کے درمیان اس نے اللہ تعالیٰ سے مناجات بھی کر لی اور اس طرح وہ مصیبت خواہ اس کے خود ہی کسی عمل یا گناہ کا نتیجہ ہو اس کے لیے باعثِ خیر اور باعثِ ترقیِ درجات بن جاتی ہے۔

جو لوگ اس کے برعکس مصیبت میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے وہ کبھی تو کفر بکنے لگتے ہیں کبھی اس کا ایسا علاج کرتے ہیں جو اس کے بعد دوسری مصیبت لے آتی ہے، مثلاً کوئی سرکاری ملازم تنگ دستی میں صبر کرنے کے بجائے رشوت لینے لگے تو اس کی اخلاقی حالت روز بروز گرنے لگتی ہے اور بہت امیر ہو جانے پر بھی جو رشوت لیتا رہتا ہے یعنی جس کو وہ اپنی مجبوری سمجھ کر لے رہا تھا اب اس میں اس کو مزہ آنے لگتا ہے۔ یہی حال جسم فروش عورتوں کا بھی ہوتا ہے اور ضمیر فروش لوگوں کا بھی۔

اَعاذنا اللّٰہ منھا

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(سورۃ التغابن، آیت ۱۶)

تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام کو) سنو اور مانو اور (بالخصوص مواقع حکم میں) خرچ (بھی) کیا کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔

کہیں ما استطعتم ہے کہیں حق تقاتہ ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ سفر اتنا دشوار ہے کہ جیسے ایک اونچے پہاڑ پر چڑھنا ہے جس میں جگہ جگہ پھسلنے اور کھائی میں گرنے کا احتمال ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رہا دو قدم پر۔ یہ اس لیے کہ تقویٰ کے کسی مقام پر پہنچ کر آدمی کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ چوٹی پر پہنچ گیا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ ہود علیہ السلام نے مجھ کو بوڑھا کر دیا تو کسی اور کے دم مارنے کی کیا مجال ہے۔

اور کوئی بھی شخص یہ سمجھ کر ہمت نہ ہار بیٹھے کہ بڑے بڑے لوگ تباہ ہو چکے ہیں تو ہم کیوں اس پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کریں کیوں کہ یہاں اپنے قدموں سے تھوڑی ہی دور چلنا ہے۔ دو قدم چلے اور یہ چال پسند آ گئی یا بے بضاعتی پر رحم آ گیا یا ویسے ہی علم ورحمت کا سیلاب آ گیا تو ہوا میں اڑا کر اوپر پہنچا دیے جاؤ گے۔ جب رحمت کا معاملہ ہے تو بقول ٹیگور Keep thou my eyes I do not want to see the distant scene. One step enough for me.

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ○ (سورۃ التغابن، آیت ۱۸)

بڑا بُردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا ہے (اور) زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے۔

بعض لوگ ان میں سے تو دشمن ہیں جیسا اس آیتِ شریفہ میں ہے لیکن سب کے سب فتنۃ یعنی وجہِ آزمائش ہیں جیسا ایک دوسری آیتِ کریمہ میں ہے۔ دشمنی خواہ شعوری ہو خواہ تحت الشعوری، لیکن ہر حال میں ذمہ داری فرد کی ہے کہ وہ صحیح راستے پر چلے اور اس کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی بیوی بچوں نے اس کو مجبور کر دیا غلط راستے پر چلنے پر۔ اس بات سے یہاں خبردار کیا گیا ہے، مثلاً مرد اگر سرکاری ملازم ہے اور چاہتا ہے کہ رشوت نہ لے اور بیوی بچے چاہتے ہیں کہ خواہ کسی طرح بھی مرد

روپے حاصل کرے، وہ ان کو کار یا مکان ضرور خرید کردے تو ظاہر ہے بیوی بچے اس کے دشمن ہوئے، خواہ وہ اس سے کتنی ہی محبت کریں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ (سورۃ الطلاق، آیت ۱)

اے پیغمبر (آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ) جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو اور تم عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمھارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیوں کہ سکنی مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے) اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے اور یہ سب خدا کے مقرر کیے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکامِ خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً اس عورت کو گھر سے نکال دیا) اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس (طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل میں) پیدا کردے (مثلاً طلاق پر ندامت ہوتو رجعی میں اس کا تدارک ہوسکتا ہے)۔

اس میں دلالت ہے اس پر کہ جس امر کے سب شقوں میں مصالح مختلف ہوں اس کے قطعی فیصلے میں جلدی نہ کرے۔ اس میں مرید کی سزا اخراج یا قطعِ تعلق سے بھی داخل ہوگئی اور اسی طرح قطع اسباب معیشت یا مفارقت اہلِ وطن بھی داخل ہوگئی۔

(مولانا تھانویؒ، مسائل السلوک)

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ○ (سورۃ الطلاق، آیت ۵)

یہ (جو کچھ مذکورہ ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمھارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص (ان معاملات میں اور دوسرے امور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔

گناہ معاف کرنے کا ذکر پہلے ہے اور اجر میں اضافے کا مژدہ بعد میں ہے۔ اسی طرح اللہ کے حکم براری میں معافی سے بچنا اوّلین ترجیح کا مستحق ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ○ (سورۃ الطلاق، آیت ۷)

وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق (بچے پر) خرچ کرنا چاہیے اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ خداتعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے۔ خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دے گا (گو بقدر ضرورت وحاجت روائی سہی)۔

کئی سورتوں میں عورتوں کے حقوق پر اور طلاق ورجعت وغیرہ کے مسائل پر احکام ہیں ایک حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کے حقوق کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کا کوئی حق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ان کو ادا کرنے پر بہت زور دیا گیا۔ آج کل عورتوں کو بہت آزادی ہے لیکن ان احکامات کی اہمیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی، ان کا جاننا ضروری ہے اور ماننا فرض ہے۔ نیز ان احکامات سے دوسرے احکام بھی نکلتے ہیں، مثلاً عورتیں خواہ کتنی ہی خودمختار ہو جائیں ان

کی کفالت اور حفاظت کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق حقوق العباد ادا کرنے میں مال خرچ کرے یہاں تک کہ جو تنگدست ہوا اس پر بھی اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا ضروری ہے، خصوصاً مطلقہ پر جس سے اب کوئی رشتہ نہیں رہا لیکن خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری (یعنی اگر اولاد ہو تو اس کے باپ کا نام معلوم ہو) کچھ زمانے تک برقرار رہتی ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ کا کوئی حکم آدمی یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتا کہ یہ ہماری استطاعت سے زیادہ ہے کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ کوئی حکم استطاعت سے زیادہ نہیں دیتے۔ اگر کسی حکم کی تعمیل میں دقت پیش آئے تو آدمی صبر سے کام لے اور تعمیلِ حکم کرتا رہے کیوں کہ اللّٰہ تعالیٰ جلد ہی اس دشواری کو دور فرما کر تعمیلِ حکم میں آسانی فرما دیں گے۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝ (سورۃ الطلاق، آیت ۳ تا ۶)

اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللّٰہ پر توکل کرے گا تو اللّٰہ تعالیٰ اس (کی اصلاحِ مہمات) کے لیے کافی ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ اپنا کام (جس طرح چاہے) پورا کر کے رہتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ (اپنے علم میں) مقرر کر رکھا ہے (اوپر عدت کا اجمالاً ذکر تھا) اور (تفصیل یہ کہ) تمھاری (مطلقہ) بیبیوں میں جو

عورتیں (بوجہ زیادتِ سن کے) حیض آنے سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کی عدت کے تعین میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک بوجہِ کم عمر کے) حیض نہیں آیا اور حاملہ عورتوں کی عدت اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر ایک کام میں آسانی کر دے گا۔ یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمھارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص (ان معاملات میں اور دوسرے امور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔ تم ان (مطلقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لیے (اس کے بارے میں)، تکلیف مت پہنچاؤ اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو۔ پھر اگر وہ (مطلقہ) عورتیں (جب پہلے ہی سے بچے والیاں ہوں یا بچہ ہی پیدا ہونے سے ان کی عدت ختم ہوئی ہو) تمھارے لیے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلاویں تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو اور (اجرت کے بارے میں) باہم مناسب طور پر مشورہ کر لیا کرو اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلاوے گی۔

اس سورۃ کریمہ میں نکاح طلاق کے احکام تفصیل کے ساتھ ہیں اور ان احکام کے ساتھ ساتھ بعض اصولی باتیں ایسی بتائی گئی ہیں جو صرف نکاح وطلاق کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ تمام معاملات میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے راستہ نکال دیں گے۔ اس کی بہت روشن مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے کہ نکلنے کے راستے بند تھے، نفس کا تقاضا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی کو ناراض کیا تو نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی لیکن حضرت یوسف علیہ السلام اللہ سے ڈر کر دروازے کی طرف دوڑے تو دروازے کھلتے گئے۔

گرچہ رخنہ نسبت عالم را پدید
خیرہ یوسفؑ وار بھی بایددوید

جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے لوگوں کا تجربہ ہے کہ صرف ذکر اللہ ان کے کھانے پینے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے اور ایسا تو بہت لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ رزق کا ایک دروازہ بند ہوا تو دوسرا کھل گیا۔ ''حضرت ابی ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہی ان کو کافی ہے اور وہ آیت یہ ہے: ومن یتق ۔۔۔ لایحتسب.. (اسوۂ رسول اکرم ﷺ بحوالہ مسند احمد، ابن ماجہ، داری، مشکوٰۃ) تقویٰ کا برعکس معصیت ہے لہٰذا اس میں معصیت سے بچنا اور اطاعت اور اتباعِ رسول اور صبر عن المعاصی صبر علی الاطاعۃ اور صبر علی مااصا بک سب آ گیا اور صبر اور شکر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یجعل لہ مخرجاً (اس کے لیے راستہ نکال دے گا) تمام باتوں کو حاوی ہے جہاں جہاں بھی راستہ بند نظر آئے اور اندھیرا معلوم ہو اور اندیشے اور وساوس کا ہجوم ہے کہ اب کیا ہو گا ہر ایسے مقام پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور وہ راستہ پیدا فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح یرزقہ بھی ہر طرح کے رزق، کھانا، پینا وغیرہ کے لیے عام ہے۔

ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جیسے یوسف علیہ السلام کے خواب کے پورا ہونے کا جب وقت آیا جب ہی پورا ہوا، یعنی اس کی تعبیر سامنے آئی۔ انسان کو کام میں لگا رہنا چاہیے اور صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا انتظار کرتے رہنا چاہیے۔ اس درمیان میں چاہے کتنے ہی مدوجزر آئیں۔

اور اصل مصلحت تو احکام کی یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اس کی تعمیل ضروری ہے چاہے ہمیں مصلحت معلوم ہو چاہے نہ ہو، اس کے ہاں اجر کا وعدہ تو ثابت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (سورۃ الطلاق، آیت ۱۲)

(آگے اللہ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کیا جاتا ہے یعنی) اللہ ایسا ہے جس

نے سات آسمان پیدا کیے اور ان ہی کی طرح زمین بھی (اور) ان سب میں
(اللّٰہ تعالیٰ کے) احکام نازل ہوتے رہتے ہیں (اور یہ اس لیے بتلایا گیا)
کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللّٰہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور اللّٰہ ہر شے کو
(اپنے) احاطۂ علمی میں لیے ہوئے ہے۔

ان تکوینی امور کا راز اس لیے بتا دیا گیا کہ ہم اچھی طرح اللّٰہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کو اور اس کے علم کے ہر چیز پر محیط ہونے کو اچھی طرح جان لیں۔ علم کے درجات ہیں جس طرح ہر صفت کے درجات ہیں تو ان آیتوں میں غور کرنے سے علم کا وہ درجہ حاصل ہوتا ہے جس کے مقابلے میں پہلا درجہ علم کا گویا جہل تھا۔ جس طرح سورۂ تحریم میں ہے ان تتوبا... صغتقلو بکما تو وہاں قلب کی سختی اتنی خفیف تھی جو عام لوگوں میں قابلِ التفات نہیں ہے، لیکن پیغمبر ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں اس درجے کی سختی بھی ناپسندیدہ تھی اور اسی لحاظ سے صغت کا لفظ لایا گیا۔

ایک پہلو اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ ایسے احکاماتِ تکوینی و تشریعی نازل فرماتے رہتے ہیں کہ اس کے علم پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں رہتا تو گویا یہ بھی ایمان کی دعوت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ
اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورۃ التحریم، آیت ۱)

اے نبی (ﷺ) جس چیز کو اللّٰہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے آپ (قسم
کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں
کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور اللّٰہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس میں دلالت ہے کہ کسی کی اتنی رعایت نہ کرے کہ اپنے کو ضررِ دنیوی پہنچنے لگے کہ اس میں دوسرے کے اخلاق بھی خراب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ مسائل

السلوک۔ جب دنیوی ضرر گوارا نہیں تو کسی کی ایسی رعایت کرنی کہ اپنا دینی ضرر بھی ہو
جائے کس طرح گوارا ہوگا۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ○ (سورۃ التحریم، آیت ۲)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے تمھارے قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے
بعد اس کے کفارہ کا طریقہ) مقرر فرما دیا ہے اور اللہ تمھارا کارساز ہے اور وہ
بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

اور اگر کوئی شخص ایسی قسم کھالے، مثلاً حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لے تو اس
پر قسم کا کفارہ دے کر قسم توڑنا واجب ہے۔
یہ حکم حضور ﷺ کو تھا لیکن یہ تعلیم پوری امت کے لیے ہے جیسا کہ جمع کے
صیغے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ
اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ
ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ○ (سورۃ التحریم، آیت ۴)

اے (پیغمبر ﷺ کی) دونوں بیبیو! اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کر لو تو تمھارے
دل مائل ہو رہے ہیں اور اگر (اسی طرح) پیغمبر (ﷺ) کے مقابلے میں تم
دونوں کارروائیں کرتی رہیں تو (یاد رکھو کہ) پیغمبر (ﷺ) کا رفیق اللہ ہے
اور جبریل (علیہ السلام) ہے اور نیک مسلمان ہیں اور (ان کے علاوہ) فرشتے
(آپ کے) مددگار ہیں۔

اگر آپ ان دو امہات المومنٰت کے اعلیٰ معیارِ تقویٰ وصداقت دیکھیں جو امت میں انھیں حاصل ہے اور پھر اس آیتِ کریمہ پر غور کریں تو اللّٰہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شانِ کبریائی آپ پر واضح ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ اللّٰہ تعالیٰ کو جو محبت اپنے رسول پاک سیدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ہے اور جس مقامِ ارفع پر اللّٰہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رکھا ہے اس کا کچھ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب دل میں ذرا سی بھی سختی معلوم ہو فوراً توبہ کرنی چاہیے اور اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ قلب حاضر ہو گا، توبہ کریں گے۔ اگر رونا نہ آئے تو عقلی طور پر خدا سے رو رو کر دعا مانگنی چاہیے اور استغفار کرنا چاہیے اور قلب کی سختی کے درجات سے جیسے سائنس دانوں کی ترازو جو چند بالوں کا وزن بھی بتا دیتی ہے اگر ذرا سا بھی آدمی صراطِ مستقیم سے ہٹے تو اس کو اپنے قلب کی سختی محسوس ہو گی جتنا تقویٰ ہو گا اتنا ہی مختصر ہٹنے کو محسوس کرے گا۔

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ
مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ
اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى
اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ
النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝ (سورۃ التحریم، آیت ۵ تا ۸)

اگر پیغمبر(ﷺ) تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمھارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، فرمانبرداری کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں گی۔ کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں۔ اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (اور سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں جس پر تندخو (اور) مضبوط فرشتے (متعین) ہیں جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے۔ کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجا لاتے ہیں (اور کافروں کو دوزخ میں داخل کرتے وقت ان سے کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج تم عذر (و معذرت) مت کرو کہ (بے سود ہے) بس تم کو تو اسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔ اے ایمان والو! تم اللّٰہ کے آگے سچی توبہ کرو (توبہ کا ثمرہ فرماتے ہیں کہ) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمھارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور یہ اس روز ہوگا) جس دن کہ اللّٰہ تعالیٰ نبی (ﷺ) کو اور جو مسلمان (دین کی رُو سے) ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہو گا (اور) یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لیے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھیے (یعنی راہ میں گل نہ ہو جائے) اور ہماری مغفرت فرما دیجیے، آپ ہر شے پر قادر ہیں۔

موجودہ معاشرے میں ان احکام کی طرف سے بڑی بے توجہی برتی جاتی ہے۔ آیت نمبر۵ اور نمبر۶ سے پتا چلتا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرنا فرض ہے۔ اگر خدانخواستہ بات نہ بنے تو طلاق تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ یہاں بھی دوزخ سے بچنے کی اوّلین اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

آیت نمبر۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کی ہر وقت ضرورت ہے۔ بڑے بڑے عابد وزاہد بہت سی کوتاہیوں میں مبتلا ہیں۔ جو دنیا میں ہر وقت معصیت اور غفلت سے توبہ کرتے رہتے ہیں ایسے ہی لوگ آخرت میں اپنے نور کے اتمام کے لیے اور اپنی

سابقہ کوتاہیوں کی معافی کے لیے (جن کی وجہ سے نور میں کمی آتی ہے) دعاواستغفار کرتے رہیں گے۔ انک علی کل شئی قدیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آخرت دارالجزا ہے دارالعمل نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے درجات میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہر معصیت ظلمت ہے اور اس کا علاج سوائے استغفار کے کچھ نہیں ہے۔

آیت نمبر۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار آخرت میں گناہ کا عذر پیش کریں گے جو قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا ''توبۃ نصوحا'' خالصاً، صادقاً من قلوبکم وھو الندم بالقلب والاستغفار باللسان والاقلاع بالبدن والغمیر علی ان لایعود الیہ ابدا

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے چند خدام سے لاہور میں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سب ہی تکمیل کی تمنا لیے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بے ساختہ یہ آیت ذہن میں آئی اور یہی وجہ ان کے ہر وقت استغفار کرتے رہنے کی ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں مختلف عنوانات سے آیا ہے اور یہی وجہ ان کی مسلسل ترقی کی ہے ورنہ اگر اپنے آپ کو ناقص نہیں سمجھتے تو مزید ترقی مدارج قرب میں بند ہو جاتی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے بھی بار بار یہی فرمایا کہ جس وقت یہ خیال آیا کہ ہم کامل ہیں اسی وقت ساری ترقی بند۔ چنانچہ جنت میں بھی درخواست اور استغفار اصحابِ مقربین اور اصحابِ یمین کی طرف سے ہوتی رہیں گی اور وہاں بھی درجاتِ قرب میں ترقی ہوتی رہے گی جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ الحمدللہ۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝ (سورۃ الملک، آیت ۲)

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے۔

ایک تو اس آیتِ کریمہ کی تفسیر اپنے اندر وسعت لیے ہوئے ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی شان ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا کہ اس مدت میں جس میں آدمی زندہ رہتا ہے اس کی آزمائش ہو کہ دیکھیں تم میں سے کون بہتر کام کرتا ہے یا نیک عمل کرتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر حسنِ عمل کو شکر سے تعبیر کریں تو انسان کی زندگی میں کروڑہا واقعات ایسے ہوتے رہتے ہیں جس میں انسان چاہے تو شکر کرے چاہے تو ناشکری کرے اور ہر واقعے کے خالق اللّٰہ تعالیٰ ہیں اور ہر واقعے میں یہ آزمائش ہو رہی ہے، مثلاً اگر تم سوکھی روٹی چبا رہے ہو تو شکر ادا کر سکتے ہو کہ اللّٰہ تعالیٰ نے تمھیں روٹی کھلائی جس سے اس کے ہزاروں، لاکھوں بندے محروم ہیں۔ ان میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو ناز و نعم میں پلے ہوں گے اور آج فاقہ کر رہے ہیں اور اگر روٹی چبا چبا کر کھاؤ تو بڑی میٹھی لگتی ہے اور نشوونما میں بڑی مدد دیتی ہے اور یہ سوچ کر ناشکری بھی کر سکتے ہو کہ آج گوشت کھانے کو نہ ملا۔ کیا زندگی ہے کہ روکھی روٹی کھا رہے ہیں۔

تخلیق مطلق اور تخلیق موت وحیات اصل میں دونوں ایک ہی چیز ہیں کیوں کہ ہر چیز مخلوق ہے اور ہر مخلوق جو وجود میں آتی ہے اس کے لیے فنا بھی ہے۔ کل شئ ھالک وجھہ۔

قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَ نَا نَذِیْرٌ۬ ۙ فَکَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ ○ (سورۃ الملک، آیت ۹)

وہ کافر کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر) آیا تھا۔ سو (یہ ہماری شامت تھی کہ) ہم نے (اس کو) جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللّٰہ نے (از قبیلِ احکام و کتب) کچھ نازل نہیں کیا (اور) تم بڑی غلطی میں پڑے ہو۔

ایک یہ دلیل بھی بعض کفار کی ہوتی ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہم

پر کتاب نازل کرے۔ حالانکہ یہ دلیل ہے اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ہونے کی جیسا کہ سورۂ رحمٰن کی دوسری آیت میں ہے۔

فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡۢبِهِمۡ ۚ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ ۝ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ كَبِيۡرٌ ۝ (سورۃ الملک، آیت ۱۱،۱۲)

غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہلِ دوزخ پر لعنت ہے۔ بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجرِعظیم (مقرر) ہے۔

سبحان اللہ کتنی فطری اور آسان بات ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ سے نڈر ہوکر زندگی گزارنے والے آخرت میں اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور جو ان کے برعکس دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے اور دنیا ہی میں اپنی تقصیرات کا اعتراف کرتے رہیں گے اور معافی مانگتے رہیں گے ان کے لیے آخرت میں معافی کے ساتھ اجرِکبیر کا بھی وعدہ ہے۔

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِىۡ غُرُوۡرٍ ۝ (سورۃ الملک، آیت ۲۰)

ہاں رحمٰن کے سوا کون ہے کہ وہ تمھارا لشکر بن کر (آفات سے) تمھاری حفاظت کر سکے (اور) کافر (جو اپنے معبودوں کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں) تو کافر نرے دھوکے میں ہیں۔

جب رحمٰن ہی تم کو تمھارے گناہوں کی وجہ سے پکڑنا چاہے تو اس کے خلاف

تمھاری تمام فوج بھی تمھاری مدد نہیں کر سکتی چہ جائے کہ چند پہرے دار اور سپاہی، چونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب چیزوں کے محافظ ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر نہ کوئی کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور جس کی نظر اپنے سازوسامان پر ہو اور اللہ پر نہ ہو وہ دھوکے میں ہے کیوں کہ وقت پڑنے پر سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

قُلْ هُوَالَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط قَلِیْلًا مَّاتَشْكُرُوْنَO (سورۃ الملک، آیت ۲۳)

آپ (ان سے) کہیے کہ وہی (ایسا قادر ومنعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے، (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔

جس طرح سمع اور بصر مسئول عنہ میں اسی طرح افئدۃ یعنی قلب بھی مسئول عنہ ہے اور ان سب چیزوں کا شکر واجب ہے جس کی سب سے پہلی سیڑھی ان کو ناجائز کاموں سے بچانا ہے۔ فحش خیالات، بدظنی، بے صبری وغیرہ سب سے قلب کی حفاظت ضروری ہے۔ حق وباطل میں امتیاز کی کوشش کرنا اور دل سے خدا کا شکر بجا لانا یہ سب قلب کے شکر میں شامل ہے۔

وانَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍO (سورۃ القلم، آیت ۴)

اور بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھما سے اس کی تفسیر میں منقول ہے ”یرضی لرضاہ ویسخط بسخطہ“۔ اس میں اشارہ ہوا تخلق باخلاق اللہ کی طرف کہ کمال اس کا فنا ہے

اور اس کے قبل ماانت۔ بجنون فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ سو اخلاق ایک طرح کا جنون ہے۔" (مولانا تھانویؒ، مسائل السلوک)

فَسَتُبۡصِرُ وَیُبۡصِرُوۡنَ O بِاَیِّکُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ O اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ O فَلَا تُطِعِ الۡمُکَذِّبِیۡنَ O وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَیُدۡهِنُوۡنَ O (سورۃ القلم، آیت ۵ تا ۹)

سو (ان کے مہملات کا غم نہ کیجیے کیوں کہ) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں کس کو جنون تھا۔ آپ کا پروردگار اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ راہ (راست) پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ تو آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا (کبھی) نہ ماننا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ (تبلیغ) میں ڈھیلے ہو جائیں۔

معلوم ہوا کہ اخلاقِ حسنہ اور مداھنت میں بڑا فرق ہے۔ حضور ﷺ اخلاقِ حسنہ پر عمل پیرا تھے جس کی آیت نمبر۴ میں خاص طور پر تعریف کی گئی اور مداھنت سے دور رہنے کا ذکر آیت نمبر۹ میں ہوا۔ قلب جو حضور ﷺ میں تھا اور جس کی ایک اور جگہ تعریف فرمائی گئی ہے خلقِ عظیم کا ایک جزو ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قلب نہ ہوتا تو لوگ متوحش ہو کر یا ڈر کر بھاگ جاتے اور جب لوگ قریب نہیں آتے تو تبلیغ کا فرض کیسے ادا ہوتا، لیکن اس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو دھوکا ہو جائے کہ یہ اتنا نرم دل شخص ہے خوشامد برامد سے ہمارے ساتھ ہو جائے اس لیے وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ یہ شخص تھوڑا سا ہماری طرف جھکے تو ہم بھی اس کی طرف بڑھیں۔

آج کل کی اصطلاح میں اس جھکنے کو جس سے منع کیا گیا ہے بہت خوب صورت ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً تعاون، وسیع النظری، فراخ دلی وغیرہ اور جو نہ جھکے

اسے تنگ نظر، ملا، بنیاد پرست وغیرہ نام دیے جاتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کا جہاں واضح حکم ہو وہاں دو ہی راستے ہیں، حکم براری یا حکم عدولی۔ بیچ کا راستہ کوئی نہیں ہے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ O خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ O (سورۃ القلم، آیت ۴۲،۴۳)

جس دن کہ ساق کی تجلی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف لوگوں کو بلایا جائے گا سو یہ (کافر) لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے (اور) ان کی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) جھکی ہوں گی (اور) ان پر ذلت چھائی ہو گی اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ (دنیا میں) سجدہ کی طرف بلائے جایا کرتے تھے اور وہ صحیح سالم تھے (یعنی اس پر قادر تھے)۔

یہ بھی مثل آیاتِ بالا کے ایک خبر ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ جو دنیا میں سجدہ نہیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو وہ آخرت میں بھی ایسا نہیں کر سکیں گے اور وہاں بلایا جانا ظاہری معنی کو بھی محتمل ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زبانِ حال سے یہ بلایا جانا ہو جیسا حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ اضطراراً سجدہ میں گر جانا چاہیے اور تجلی معلوم ہوتا ہے کہ بہت تھوڑی ہو گی جو آخرت کے حساب سے ہو گی یعنی نہ اس کی کیفیت کا کچھ بھی اندازہ ہو سکتا ہے نہ کمیت کا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ O (سورۃ الحاقہ، آیت ۵۲)

سو (جس کا یہ کلام ہے) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح کیجیے۔

ایک دفعہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہٗ نے اپنے مطب میں اللہ تعالیٰ سے ہماری انفرادی تعلق کے بارے میں دیر تک گفتگو فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے کروڑہا مخلوق کو پیدا فرمایا لیکن ہر ایک اپنی جگہ منفرد ہے۔ درخت کی پتیاں دیکھنے میں بالکل ایک سی ہیں لیکن غور سے دیکھیں تو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے انفرادی ہے۔ ہر شخص کا تعلق جدا ہے۔ آپ کا تقویٰ آپ کا تقویٰ ہے اور میرا تقویٰ میرا تقویٰ ہے۔ کوئی بہت بڑے بزرگ ہیں تو اپنی جگہ پر ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں کہ بارش ہو رہی ہے تو میرے لیے ہو رہی ہے۔ جاپان میں لوگ ایک چیز مل کر بنا رہے ہیں کہ وہ میرے استعمال میں آنی ہے۔ جب رکوع اور سجدہ کر رہے ہیں تو انفرادی صیغے میں کر رہے ہیں لیکن جب دعا کر رہے ہیں تو پھر سب کو شامل کر رہے ہیں۔ وہاں جمع کا صیغہ ہے چونکہ سب کے حقوق ہم پر ہیں۔ رکوع وسجود چونکہ قرب کے مقامات ہیں اس لیے وہاں واحد کا صیغہ تعلیم فرمایا اور قیام اور قعودِ عبدیت کے مظاہر ہیں اس لیے وہاں ایاک نعبد اور السلام علینا کے الفاظ تعلیم فرمائے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا O وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا O (سورۃ المعارج، آیت ۶،۷)
یہ لوگ اس دن کو بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔

انھم سے کافرین مراد ہیں۔ جو قیامت کو بہت دور کی چیز یعنی بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک قیامت آنے والی ہی نہیں ہے۔ فنا زندگی بعدالموت وغیرہ کے تو بہت سے لوگ قائل ہیں لیکن حساب، کتاب، جنت، دوزخ، جس طرح اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے فرمایا ہے وہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ اور

اللہ تعالیٰ قریب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح مومنین جو اللہ کے گروہ میں شامل ہیں وہ قیامت کو قریب سمجھ رہے ہیں کیوں کہ وہ یقینی ہے اور جو یقینی چیز ہے وہ قریب ہی ہے۔ خصوصاً جس کا وقت مقرر ہے وہ لحظہ بہ لحظہ قریب تر ہوتی جا رہی ہے، لہٰذا وہ اس کے لیے تیاری بھی کر رہے ہیں اور قیامت میں جوابدہی کا ان کو ہمہ وقت احساس ہے کیوں کہ علم، انسان کو عمل پر ابھارتا ہے اور کوئی بات صرف معلوم ہو اور اس کا کچھ بھی اثر عمل پر نہ ہو تو ایسا معلوم ہونا نہ معلوم ہونا برابر ہے۔

وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ○ وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُئْوِیْهِ○ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِ○ کَلَّا اِنَّهَا لَظٰی○ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی○ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی ○ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا○ (سورۃ المعارج، آیت ۱۲ تا ۱۹)

اور بیوی کو اور بھائی کو اور کنبے کو جن میں وہ رہتا تھا اور تمام اہلِ زمین کو اپنے فدیہ میں دے دے پھر یہ اس کو (عذاب سے) بچا لے یہ ہرگز نہ ہو گا بلکہ وہ آگ ایسی شعلہ زن ہے جو کھال (تک) اتار دے گی۔ وہ اس شخص کو بلائے گی جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری ہو گی اور (اطاعت سے) بے رخی کی ہو گی اور جمع کیا ہو گا پھر اس کو اٹھا اٹھا رکھا ہو گا انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔

انسان کا کم ہمت ہونا ایک جبلی بات ہے جس کا اثر اعمال پر یہ پہنچتا ہے کہ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب فارغ البالی ہوتی ہے تو حقوقِ ضروریہ ادا کرنے سے بخل کرنے لگتا ہے۔ ایمان انسان کے جبلتی تقاضوں کو حدود کے اندر رکھتا ہے۔ اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ حد سے زیادہ بے چین نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر صبر کرتا ہے۔ خواہ وہ تکلیف اس کے گناہوں کی وجہ سے ہو، خواہ اس کی کسی غلطی کی وجہ سے ہو، خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے محض آزمائش اس کا سبب ہو۔ ہر حال میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ رجوع اِلی اللہ کا لازمی نتیجہ اطمینانِ قلب ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ الابذکر اللہ تطمئن القلوب۔ جب اسے کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کو ان حقوق کی ادائیگی میں صرف کرتا ہے جو منعم نے اس پر عائد کیے ہیں۔

یہاں ''مصلین'' سے مراد ایمان والے ہیں۔ ایمان کا اوّلین تقاضا نماز ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں بھی انسانی کمزوریوں کا ذکر ہے وہاں ایمان والوں کا استثنا کر دیا گیا ہے کیوں کہ ان کا ردِعمل عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی کمزوریوں کا موجود ہونا نقصان دہ نہیں ہے بشرطے کہ اس کے مقتضا پر عمل ایمان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ○ (سورۃ المعارج، آیت ۲۷، ۲۸)

اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں (اور) واقعی ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں (یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے)۔

عبدیت کا لازمی نتیجہ خشیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب ایسا نہیں ہے جس سے نڈر ہوا جائے۔ نڈر تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو آخرت سے غافل ہیں اور جو لوگ عبدیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں وہ اس کے ڈر سے معاصی کے قریب نہیں جاتے اور نماز پڑھ کر اور خیرات کر کے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں وہ ناقابلِ قبول ہوں۔

چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کے قلب سے نماز میں ایسی آواز اٹھتی تھی جو جوش مارتی ہوئی دیگچی سے اٹھتی ہے۔ اگر نماز کی حالت میں بھی خشیت نہ ہو تو یہ بذاتِ خود

بہت ڈرنے کی بات ہے کیوں کہ نماز میں غفلت ایمان کی کمی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
خدا معلوم ایمان ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کتنا ہے۔

وَاللّٰهُ اَنۡبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًاۙ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًاۙ لِّتَسۡلُكُوۡا مِنۡهَا سُبُلًا فِجَاجًا (سورۃ نوح، آیت ۱۷ تا ۲۰)

اور اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لے جائے گا اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آئے گا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمھارے لیے (مثل) فرش بنایا تاکہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو۔

زمین سے انسان کے مختلف اعضاوجوارح کی تخلیق جن جن مرحلوں سے ہو کر گزرتی ہے اور پھر انسان کا مٹی میں مل جانا جس فطری نظام کے تحت ہوتا ہے اس میں انسان کی قدرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہی کے قدرت سے یہ سب کام ہوتے ہیں اور اسی فطری نظر کا ایک حصہ انسان کا دوبارہ زمین سے اٹھایا جانا ہے اور تخلیق اوّل سے دشوارتر تخلیق دوم نہیں ہے۔

اور پھر اس زمین کو ہمارے لیے فرش بنا دیا گیا اور اس میں راستے بنا دیے گئے اللہ کی قدرت سے۔ چونکہ ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں اس لیے اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اگر نظامِ قدرت ایسا نہ ہوتا کہ بارش کے پانی کے لیے راستے بن جائیں اور وہ چشمے اور دریا کی صورت میں ظاہر ہوں اور زمین پر جانداروں کے مسلسل چلنے سے راستے بن جائیں تو راستے بنانا ہمارے بس کی بات نہ ہوتی۔

جس طرح طبعی راستے ہیں اس طرح معنوی راستے بھی ہیں۔ شکر کا راستہ اور کفر کا راستہ اور ہمیں کچھ اختیار دے کر مکلف بنایا گیا ہے۔

مِمَّا خَطِيٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا O (سورۃ نوح، آیت ۲۵)

اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کیے گئے پھر (بعد غرق) دوزخ میں داخل کیے گئے اور خدا کے سوا ان کو کوئی حمایتی میسر نہ ہوئے۔

غرق ہونے کی وجہ قومِ نوح علیہ السلام کی سیاہ کاریاں تھیں جہاں جہاں عذاب کا ذکر ہے وہاں اکثر ان برے اعمال کا ذکر ہے جن پر عذاب آئے اور جو برے اعمال ان کے کفر یا شرک کے پیدا کردہ تھے جس طرح تمام اعمالِ حسنہ جو صرف صورتاً حسنہ نہ ہوں بلکہ حقیقتاً بھی حسنہ ہوں، ایمان ہی کے ثمرات ہیں اسی طرح فسق وفجور، ظلم اور کبر کفر کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی خطاؤں کا ذکر ہے جس کی اصل وجہ رسول کی تکذیب تھی۔

یہ کہنا کہ خدا سے ڈرنا منفی امر ہے یا گناہ نہ کرنا زندگی کا منفی پہلو ہے، غلط ہے۔کوئی بھی فعل ہو خواہ کچھ کرنا ہو جس کو مثبت (Positive) کہا جاتا ہے یا نہ کرنا ہو جس کو منفی (Negative) کہا جاتا ہے، اس میں مثبت اور منفی دونوں پہلو ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ یہ بات لوگوں سے مخفی رکھو اور یہ کہنا کہ یہ بات کسی سے نہ کہو ایک ہی بات ہے۔اسی طرح ''ایمانداری کرو'' اور ''بے ایمانی نہ کرو'' ایک ہی بات ہے۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا O (سورۃ نوح، آیت ۲۶)

اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ۔

ایک دفعہ یہ بھی کر کے دکھا دیا گیا کہ ساری دنیا غرق کر دی گئی پھر بھی خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ ساری دنیا کو تباہ کرنے کا سامان

بھی ہو جائے اور تباہ کر بھی دی جائے پھر بھی چند لوگوں کو اللہ تعالیٰ بچا سکتے ہیں۔ دنیا کو آباد کرنے کے لیے جب ایک جوڑا کافی تھا تو کئی جوڑے بہت کافی ہیں۔

وَّاَنَّا لَانَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَبِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا ۝ (سورۂ جن، آیت ۱۰)

اور ہم نہیں جانتے کہ (ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے سے) زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے یا ان کے رب نے ان کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے۔

یہ طرزِ کلام ادب کی بات ہے۔ بڑوں کا ادب یہ ہے کہ ان کی شان میں کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکلے جس سے ان کے کسی کام میں برائی کا پہلو نکل سکتا ہو۔ اسی طرح گفتگو میں ادب کا پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے جیسے فرمایا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰھُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝ لِّنَفْتِنَھُمْ فِیْهِ ؕ وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّهٖ یَسْلُکْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝ (سورۂ جن، آیت ۱۶، ۱۷)

اور (مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی کہ) اگر یہ (مکے والے) لوگ (سیدھے) رستے پر قائم ہو جاتے تو ہم ان کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ ان میں ان کا امتحان کریں اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان و اطاعت) سے روگردانی کرے گا اللہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

دنیا میں بھی استقامت علی الحق پر نعمتوں کا وعدہ ہے مثلاً بارش ہونا، مال اور اولاد، حکومت اور ثروت ہونا۔ یہ بات کہ صرف آخرت میں مومنوں کے لیے وعدہ نہیں ہے بلکہ دنیاوی نعمتوں کا بھی وعدہ ہے۔ لنفتنھم فیہ سے ظاہر ہے، کیوں کہ آخرت کی نعمتیں آزمائش نہیں ہوں گی اور نہ باطنی نعمتیں حیاتِ طیبہ، اطمینانِ قلب وغیرہ آزمائش ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ استقامت علی الطریق پر ہے یعنی قوم کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنے میں آزمائشوں اور تکالیف سے بھی گزرنا ہوگا اور یہ عرصہ طویل بھی ہوسکتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی ظاہری، دنیاوی نعمتوں کا وعدہ قوم کے صحیح راستے پر قائم رہنے پر ہے یعنی پوری قوم یا غالب اکثریت خدا کی فرمانبردار ہو جائے اور اس پر استقامت اختیار کرے تب یہ وعدہ ہے۔

یہ ادب کی بات ہے کہ بڑوں کی شان میں کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکلے جس سے ذرا سا بھی ان کی شان میں گستاخی یا برائی کا کوئی شائبہ بھی گزرے۔ یہاں ''شر'' کے ساتھ کسی فاعل کا ذکر نہیں ہے اور ''خیر'' کے ساتھ اللّٰہ تعالیٰ کے فاعل ہونے کا ذکر ہے اس سے اس مقولہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ''باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب'' اور ''التصرف کلہ ادب۔''

دنیا میں بھی ظاہری نعمتوں یعنی دنیاوی نعمتوں کا وعدہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ مومنین سیدھے راستے پر استقامت اختیار کریں۔ دنیاوی نعمتوں کا وعدہ لنفتنھم فیہ سے ظاہر ہے کیوں کہ اگر یہ اخروی نعمتوں کا وعدہ ہوتا تو وہاں کی نعمتیں آزمائش کے لیے نہیں ہیں بلکہ مستقل جزا اور عطا اور کرم ہے۔ دنیا میں استقامت کے بعد فراخیِ رزق اور حکومت ملنا تاریخ سے بھی ثابت ہے۔

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ (سورۃ جن، آیت ۷، ۸)

اور جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا اور ہم نے آسمان (کی خبروں) کی تلاش (موافق عادت سابقہ کے) لینا چاہی سو ہم نے اس کو سخت پہروں (یعنی محافظ فرشتوں) اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔

حضور نبیِ کریم ﷺ کو جو دن میں بہت کام رہتا تھا وہ تمام کا تمام عبادت میں داخل تھا۔ اس میں بھی توجہ تو خالقِ کائنات کی طرف ہوتی تھی لیکن ایک درجے میں مخلوق کی طرف بھی توجہ ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ وقت آدھی رات کا یا اس کے قریب کا اپنے حبیب پاک کے لیے مقرر فرمایا کہ اس وقت تمام امور سے توجہ ہٹا کر صرف اپنے خالق کی طرف متوجہ رہے۔

ان دو آیاتِ کریمہ سے صوفیہ کی اس ہدایت کی اصل نکلتی ہے کہ سالک کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک دوامِ طاعت جس کا ذکر آیت نمبر ۷ میں ہے۔ دوسرے تنہائی میں کچھ وقت اللہ تعالیٰ سے کہنے سننے کے لیے نکالنا۔ جیسے تہجد پڑھنا، استغفار کرنا۔

❁

اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ؕ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْکُمْ فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی ۙ وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۫ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَاللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(سورۃ المزمل، آیت ۲۰)

آپ کے رب کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں بعض آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور رات اور دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کر سکتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ تم اس (تقدیر وقت) کو ضبط نہیں کر سکتے تو اس نے تمھارے حال پر عنایت کی سو (اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔ اس کو معلوم ہے کہ بعض آدمی تم میں بیمار ہوں گے اور بعض تلاشِ معاش کے لیے ملک میں سفر کریں گے اور بعض اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (اس لیے بھی اس حکم کو منسوخ کر دیا) سو (اس لیے بھی تم کو اجازت ہے کہ اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو اور نماز (فرض) کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اخلاص سے) قرض دو اور جو نیک عمل اپنے لیے آگے (ذخیرۂ آخرت بنا کر) بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے اور اللہ سے گناہ معاف کراتے رہو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں تہجد کے بارے میں تفصیلاً ارشاد ہوا ہے۔ ایک اور جگہ مومنوں کی تعریف میں فرمایا گیا ہے بالاسحار یستغفرون۔ حضرت عارفیؒ نے اپنے متبعین کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تہجد کے وقت اٹھ کر تہجد پڑھنا مشکل ہو تھکاوٹ یا کسل کی وجہ سے اور آنکھ کھل جائے تو کم از کم اتنا تو کر لو کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور تین دفعہ کہہ لو "استغفراللہ، استغفراللہ، استغفراللہ۔"

یہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ تہجد کی پابندی کی طرف لے جانے والا۔ اس ناچیز کے ذوق میں اگر اٹھ کر صرف چند آیتوں کی تلاوت زبانی کر لی جائے اور چند بار استغفار کر لیا جائے تو کچھ نہ کچھ مقصد مشغولی بحق تعالیٰ کا ادا ہو جائے گا اور ان شا اللہ تعالیٰ تہجد پڑھنا بھی نصیب ہو جائے گا۔

وما جعلنآ اصحٰب النار الا ملٰٓئکۃ (سورۃ المدثر، آیت ۳۹)

اور ہم نے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں۔

یہاں ''اصحاب النار'' فرشتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اکثر جگہ یہی فقرہ اہلِ نار کے لیے آیا ہے۔ اس سے ان بزعمِ خود ''اہلِ قرآن'' کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ صلوٰۃ کے معنی دعا ہیں اور ایک لفظ اگر کئی جگہ قرآن شریف میں آیا ہو تو ہر جگہ وہی ایک معنی مراد ہوں گے۔

قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَO وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَO

وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَO وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِO

حَتّٰٓی اَتٰنَا الْیَقِیْنُO (سورۃ المدثر، آیت ۴۳ تا ۴۷)

وہ کہیں گے ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور مشغلے میں رہنے والوں کے ساتھ ہم (اس) مشغلے میں رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو موت آ گئی۔

یہ جواب ہے کافروں کا مسلمانوں کے اس سوال کے جواب میں کہ تم کو کون سی بات جہنم میں لے گئی۔ ماسلککم فی سقر۔ دوزخ میں جانے کی جو وجہ سب سے پہلے ان کے زبان سے نکلے گی وہ نماز نہ پڑھنا اور مساکین کو کھانا نہ کھلانا ہوگا۔ اس کے بعد دین کی تکذیب اور استہزا کا ذکر کریں گے۔ دراصل ان برے اعمال کا محرک یہی تکذیب واستہزا تھا جس طرح نیک اعمال کا محرک ایمان ہے۔ علم محرک ہوتا ہے عمل کا اور جتنا عمل کرتے جاؤ گے اتنا علم بڑھتا جائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص کے اعمال تو برے ہیں لیکن وہ دل کا اچھا آدمی ہے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ○ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ○

(سورۃ القیٰمۃ، آیت ۵،۶)

بلکہ بعض آدمی (قیامت کا منکر ہوکر) یوں چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی فسق وفجور کرتا رہے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللّٰہ علیہ نے تفسیر میں لکھا ہے ''بلکہ آدمی چاہتا ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے اپنی اگلی عمر میں جو باقی رہ گئی ہے بالکل بے باک ہوکر فسق وفجور کرتا رہے..'' دل کی خواہش اور ارادے کا پتا کسی دوسرے کو نہیں چلتا لیکن بعض اعمال ایسے ہیں جن سے انسان کے خبثِ نفس کا پتا چل جاتا ہے اسی طرح بعض باتیں اس کے منہ سے ایسی نکل جاتی ہیں جن سے ان کے دل کا حال ایک حد تک معلوم ہو جاتا ہے، مثلاً جو شخص یہ کہے کہ قیامت کب آئے گی یعنی آئے گی بھی یا نہیں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس کا ارادہ فسق پر جمے رہنے کا ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ (سورۃ القیٰمۃ، آیت ۲۲)

بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے۔

ظاہری گناہ تو ظاہر ہیں ہی اگر دل کو بھی معصیت یا لغو خیالات میں مشغول رکھا جائے تو اس پر مواخذہ ہوگا۔ خواہ عذاب ہو خواہ اللّٰہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں۔

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ (سورۃ القیٰمۃ، آیت ۲۳)

(اور) اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

جو چہرے دنیا میں اپنے رب کی طرف تکتے رہے ہوں گے وہ قیامت میں بھی تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف تکتے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہر خوشی کے موقع پر اپنے رب کی طرف دیکھ کر دل سے (قولاً یا زبانِ حال سے) یہ کہتے رہے ہوں گے ''یااللہ تیرا شکر ہے تیرا کرم اور احسان ہے۔'' اور ہر غم اور پریشانی کے وقت بھی ان کی نظر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جاتی ہو گی اور زبانِ حال سے کہتے رہے ہوں گے ''یااللہ بغیر تیرے حکم کے یہ پریشانی اور مصیبت ہم تک نہیں پہنچتی اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اپنا رحم وکرم فرما اور اس پریشانی کو دفع فرما۔''

دوسرا گروہ کافروں کا ہو گا۔ ظاہر ہے جب ان کا ایمان ہی اپنے رب پر نہیں تھا تو وہ شکر یا صبر کیا جانتے اور جب یہاں اپنے رب کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو آخرت میں تو فرمان یقینی ہے۔ اسی گروہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے ان الکافرین لامولیٰ لھم۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ○ (سورۃ القیٰمۃ، آیت ۳۱)

تو اس نے نہ تو (خدا و رسول کی) تصدیق کی تھی اور نہ نماز پڑھی تھی۔

یہ آیت ہے تو کفار کے متعلق لیکن اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ تصدیقِ آخرت کا اور نماز کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ جتنی تصدیق کامل ہو گی یعنی جتنا ایمان کامل ہو گا اتنی ہی نماز کامل ہو گی۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَاشُكُوْرًا○

(سورۃ الدھر، آیت ۹)

ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم تم سے (اس کا فعلی) بدلہ چاہیں اور نہ (اس کا قولی) شکریہ (چاہیں)۔

کسی سے بدلے کی توقع نہ ہو اور نہ خواہش ہو۔ یہاں تک کہ کسی سے احسان مند ہونے یا شکریہ ادا کرنے کی بھی توقع نہ ہو ورنہ وہ عمل لوجہ اللہ نہیں رہے گا۔ جب کھلانے پلانے میں یہ احساس ہے کہ اس کے بدلے کی یا شکریے کی بھی خواہش نہیں ہے تو اور عبادات میں، مثلاً نماز اور حج میں کتنا اخلاص ہو گا!

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ (سورۃ الدھر، آیت ۱۲)

اور ان کی پختگی (یعنی استقامت فی الدین) کے بدلے میں ان کو جنت اور ریشمی لباس دے گا۔

یہاں جنت کو صبر کا بدلہ فرمایا گیا ہے اور ایک اور جگہ تامل کرنے سے پتا چلتا ہے کہ شاکروں کے لیے جنت ہے۔ معلوم ہوا کہ صبر و شکر ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور صبر کرنے کی ضرورت تاعمر رہتی ہے۔ صبر عن المعاص اور صبر علی الظفۃ کیوں کہ فطری خواہشات ختم نہیں ہوتیں۔

اور صبر ایذا اور تکلیف پر بھی کرنا ہے جن سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا رہتا ہے اور فیصلے کے دن تک کا انتظار کرنا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی فیصلہ فرما دیتے ہیں کبھی آخرت تک کے لیے ملتوی فرما دیتے ہیں۔ جیسا اسی سورہ کی آیت ۲۴ میں ہے فاصبر الحکمہ ربک... اوکفورا۔ یہاں مولانا عثمانیؒ نے تفسیر میں لکھا ہے ”تو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر برابر جمے رہیے اور آخری فیصلے کا انتظار کیجیے۔“

اِنَّ هٰذِہٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ وَمَا تَشَآءُ
وْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ يُّدْخِلُ مَنْ
يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (سورة
الدھر، آیت ۲۹ تا ۳۱)

یہ (سب جو کچھ مذکور ہوا کافی) نصیحت ہے۔ سو جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کر لے اور بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لیے خدا کے نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہوتی ہیں کیوں کہ) خدائے تعالیٰ بڑا علم و حکمت والا ہے۔ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور (جس کو چاہے کفر اور ظلم میں مبتلا رکھتا ہے پھر) ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آیت نمبر ۲۹ میں انسان کے اختیار کا ذکر ہے کہ اپنے رب کی طرف کا راستہ یعنی خیر اختیار کرے یا شر۔ اس سے اگلی آیتِ کریمہ میں اس اختیار کے محدود ہونے کا ذکر ہے جو دراصل اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کا اور ظالموں کے انجام کا ذکر ہے۔

ساری عمر اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت کی آس لگائے رہنا ہے۔ ساری عمر اللّٰہ تعالیٰ کے سامنے محتاج ہونے کا استحضار کرتے رہنا ہے کہ وہ جب چاہیں اپنی رحمت روک لیں جو مل جائے اس پر شکر کرنا ہے، خواہ ظاہری نعمت ہو مثلاً بارش، بیماری سے نجات وغیرہ خواہ باطنی نعمت ہو جیسے مسجد جانا، مسنون دعائیں پڑھنا، صدقہ کرنا وغیرہ۔ عادت اللّٰہ یہی ہے کہ جو اس کی رحمت کا آسرا لگائے رکھتا ہے اس پر رحمت کی بارش ہو ہی جاتی ہے۔ شکر کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا لیکن جس حد تک بھی ادا ہو جائے غنیمت ہے اور شکر کی کمی استغفار سے پوری ہو جاتی ہے۔

البتہ جو اپنے اعمال پر نازاں ہو گیا اور جس نے اپنے نیک کام کو یہاں تک کہ اپنے نیک ارادوں کو بھی خدا کا عطیہ اور انعام نہیں سمجھا وہ ظالموں میں سے ہو گیا اور ظلم کا بدلہ عذابِ الیم ہے۔

عجب اور کبر انسان کے لیے بہت بڑا جال ہے جس میں پھنس کر انسان ایمان

ہی کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس عظیم اور مخفی جال سے انسان کو بچانے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے جو اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے کہ اس بات کا ہمیشہ استحضار ہو رہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں اپنی رحمت میں داخل فرما لیں اور جو اس کی رحمت کا امیدوار نہیں ہے وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا O قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا O (سورۃ الشمس، آیت ۷ تا ۹)

اور (قسم ہے انسان کی) جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القا کیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کر لیا۔

ایک آیتِ کریمہ میں اپنے نفس کو پاک کرنے کا حکم ہے دوسری آیت میں نفس کو پاک نہ سمجھنے کا حکم ہے۔ جس کا ترجمہ معارف القرآن میں دو طرح سے کیا گیا ہے۔ ''سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں۔۔۔'' اور ''تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو...'' اور عجب سے بچنے کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کون متقی ہے کون نہیں ہے۔ اگر اس کے علم میں ہم متقی نہیں ہیں تو ہم اپنے کو لاکھ متقی سمجھا کریں یا دوسرے ہماری لاکھ تعظیم کریں کوئی فائدہ نہیں، لیکن نفس کو پاک کرنے کی کوشش کرتے رہنا فرض ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى O وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى O وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى O فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى O وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى O اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى O وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى O

(سورۃ اللیل، آیت ۷ تا ۱۳)

تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لیے سامان دے دیں گے اور جس نے (حقوقِ واجبہ سے) بخل کیا اور (بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (یعنی اسلام) کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لیے سامان دے دیں گے اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا جب وہ برباد ہونے لگے گا (بربادی سے مراد جہنم میں جانا ہے) واقعی ہمارے ذمے راہ کا بتلا دینا ہے اور (جیسی راہ کوئی شخص اختیار کرے گا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے کیوں کہ) ہمارے ہی قبضے میں ہے آخرت اور دنیا۔

انسان کی کوششیں اس کو مختلف راستوں کی طرف لے جاتی ہیں کوئی کسی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے کوئی کسی طرف، لیکن تمام راستوں کو دو عنوانات کے تحت منقسم کیا جا سکتا ہے اور بالآخر تمام کوششیں ان دو میں سے کسی ایک جگہ جا کر ختم ہوتی ہیں جو ابدی ٹھکانے ہیں۔ جنت اور جہنم۔ تین باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ایک گروہ کے لیے اور ان کے برعکس تین باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے دوسرے گروہ کے لیے۔ اعطا یعنی سخاوت کے بالمقابل بخل۔ ایک میں انسانی شرافت سے دوسرے میں رذالت۔

تقویٰ کے بالمقابل استغنیٰ۔ اوّل الذکر میں مومنین آتے ہیں جو منعمِ حقیقی کی نافرمانی سے بچنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کرتے ہیں۔ فسنیسرہ دونوں جگہ آیا ہے، نیکوں کے لیے بھی بروں کے لیے بھی۔ تنگی میں نہیں ڈالتے بلکہ تنگی میں پڑنے کے لیے آسانی پیدا فرما دیتے ہیں۔ پھر اگر وہ نہیں سنبھلا تو وہ رفتہ رفتہ گمراہی کے ایسے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے جس سے اس کے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں رہتی۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىO فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰىO (سورۃ النزعات، آیت ۴۰، ۴۱)

اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہو گا اور
نفس کو حرام خواہش سے روکا ہو گا سو جنت اس کا ٹھکانا ہو گا۔

نفس خواہش کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے اور عقل اس کو چشمِ زدن میں تولتی ہے اور پھر انسان کام کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو جو شخص نفس کو آزاد نہیں چھوڑتا اور وحی کی روشنی میں کام کرنے نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ جنت میں اپنا ٹھکانا بناتا ہے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝ (سورۃ النبا، آیت ۳۵)
وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ (کیوں کہ یہ باتیں وہاں
محض معدوم ہیں)۔

اگر فطرت سلیم ہو تو لغو اور جھوٹ سے طبیعت پر بہت بار پڑتا ہے اسی لیے جنت کی نعمتوں میں اس کو بھی گنایا گیا ہے کہ وہاں لغو اور جھوٹ باتیں نہیں سنی پڑیں گی۔ لٰہذا اگر کسی کو لغو باتوں سے گرانی نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بھی لغو باتوں میں مبتلا رہتا ہے تو اس کی فطرت سلیم نہیں ہے۔ یہی حال جھوٹ کا ہے جو لغو سے زیادہ سنگین بات ہے۔ اسی لیے اہلِ ایمان کی ایک خصوصیت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ وہ لغو باتوں سے بچتے ہیں۔ ھم عن اللغو معرضون۔ حدیث شریف میں اس کی تفصیل بھی آئی ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (سورۃ النبا، آیت ۳۶)
یہ (ان کو ان کی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہو گا۔

یہاں غالباً جنت کے درجات کا ذکر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حساب کتاب

کا ذکر ہو اور جس کی نیکی کا پلّہ بھاری ہو اس کو جنت میں جگہ دی جائے۔ بہت سے لوگوں کو بے حساب جنت میں داخل کر دیا جائے گا یہ عام قاعدے سے استثنا ہو گا۔

اللّٰہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت ایسی رکھی کہ وہ خیر کو اختیار کرے یا شر کو۔ یہی ایک مخلوق تھی جس نے اپنے کو (ایک حد تک) بااختیار رہنے کی ذمہ داری کو قبول کیا۔ پھر یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر اس نے نافرمانی کی تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ عین عدل وانصاف ہے اور اس میں کسی کو شک وشبہ نہیں، چنانچہ جب شیطان نے کہا کہ میں ان سب کو تیری نافرمانی کے لیے بہکاؤں گا تو ارشاد ہوا کہ تجھے اور تیرے سب پیروؤں سے جہنم بھر دوں گا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی اور ان کو جنت سے نکال دیا گیا۔ اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کو توبہ کرنا سکھایا اور پھر ان کو قبول کر کے یہ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی شخص جو اللّٰہ تعالیٰ سے باغی نہ ہو کوئی بھی گناہ کر لے اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ یہ قانون عین رحمت کا قانون ہے اور اگر یہ قانون نہ ہوتا تو کوئی بھی جنت میں نہ جا سکتا، لہٰذا یہ بات بالکل ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ کوئی شخص محض اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جا سکتا جب تک خدا کا فضل اس پر نہ ہو۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل جزا وسزا یومِ حساب کے بعد ہو گی۔ مومنین کے لیے خوف اور حزن سے آزادی جنت ہی کے متعلق ہے اور اگر دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو مومنین ہی کے لیے صلاح وفلاح اور عیش وعشرت ہے کیوں کہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، مثلاً دو ماہ اور پچاس کروڑ سال میں کوئی نسبت نہیں ہے۔

وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى O (سورۃ النزعت، آیت ۱۹)

اور (تیری درستی کی غرض سے) میں تجھ کو تیرے رب کی طرف (ذات و صفات کی) رہنمائی کروں تو تُو یہ سن کر اس سے ڈرنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبیا الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینے پر مامور تھے۔ انھوں نے فرعون کو ایک بہت باریک نکتہ سیدھے طریقے سے سمجھا دیا کہ میں تمھیں بتاؤں کہ خدا کون ہے جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی تو خشیت کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىO فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىO (سورۃ النازعات، آیت ۴۰، ۴۱)

اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہو گا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہو گا سو جنت اس کا ٹھکانا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتے رہنا اور اپنے آپ کو ناجائز اور لایعنی باتوں سے روکے رکھنا یہی جنتیوں کی نشانی ہے۔ سورۂ حٰم السجدۃ میں جو فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اس پر استقامت اختیار کی ان کے لیے جنت کی خوش خبری ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں ایک ہی ہیں اور اعمال کی تقسیم مثبت (positive) اور منفی (negative) اعمال میں عرفی تقسیم ہے، حقیقی نہیں ہے کیوں کہ حقیقت میں دونوں ایک ہی ہیں۔

اس بات کا استحضار کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے یوں تو ہر معاملے میں رہنا چاہیے لیکن نماز میں اس کا استحضار بہت ہی ضروری ہے کیوں کہ وہاں تو فی الوقت ہی آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اس سے خشوع میں بہت مدد ملتی ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰىO فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰىO وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰىO وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰىO وَهُوَ يَخْشٰىO فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰىO

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ (سورۃ عبس، آیت ۵ تا ۱۲)
تو جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے، آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں (آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجیے قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اُس کو قبول کر لے۔

یہ مضمون کئی جگہ پر آیا ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ مزکی بنا کر بھیجے گئے تھے اور تزکیۂ نفس آپ ﷺ کا کام ہی تھا اور رحمت اللعالمین ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی فکر اور پریشانی کہ کسی طرح سردارانِ کفار مسلمان ہو جائیں بجا اور محمود تھی۔ لیکن چونکہ یہ فکر جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اپنے نفس کے لیے نقصان دہ ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی توجہ اس سے زیادہ ضروری کاموں سے ہٹ جاتی ہے، اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کو استغنیٰ کی تعلیم دی ہے اور اس سے عام مسلمانوں کی دل جوئی بھی ہوئی جن کی طرف سے توجہ ہٹ جانے کا خدشہ تھا کیوں کہ کسی کام میں حد سے زیادہ انہماک کسی دوسرے کاموں کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔

اگرچہ ان آیات میں ایک لحاظ سے حضور نبیِ کریم ﷺ کو غیرطالبان کی ہدایت کے بارے میں اس قدر فکر اور اہتمام سے اعراض اور طالبانِ صادق کے حال پر توجہ فرمانے کا امر ہے لیکن دوسرے لحاظ سے یہ منکرین پر اتمامِ حجت بھی ہے کہ دیکھو ہمارا رسول ﷺ تمھاری اصلاح کے لیے اس قدر کوششیں، تبلیغ کر رہا ہے اور تمھاری بھلائی کے لیے اتنا کوشاں ہے کہ ایک مومن کا وہاں پر آنا اس کو ناگوار ہوا پھر بھی تم ایمان نہیں لاتے ہو اور اتنے شفیق اور مخلص کی قدر نہیں کرتے ہو۔

فَاَنۡبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّاO وَّعِنَبًا وَّقَضۡبًاO وَّزَيۡتُوۡنًا وَّنَخۡلًاO وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًاO وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّاO مَّتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡO (سورۃ عبس، آیت ۲۷ تا ۳۲)

پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعض چیزیں) تمھارے اور (بعض چیزیں) تمھارے مواشی کے فائدے کے لیے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے فرمایا (۲۰ مئی ۱۹۸۳ء) کہ شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مقصود کے حاصل ہو جانے کا صرف شکر ادا نہ کرے بلکہ وہ جن واسطوں سے حاصل ہوا ہے ان کا بھی شکر ادا کرے۔ جس طرح اللّٰہ تعالیٰ نے انسان کو سکھایا ہے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے اور پھر دیکھے کہ کس کس حالت سے گزر کر اور کن کن چیزوں کی مدد سے وہ کھانا اس حال میں پہنچا کہ انسان اور جانوروں کے کام آ سکے۔

اسی طرح دوسری نعمتوں کے بارے میں سوچنا ہے، مثلاً اگر کسی کو عمرے کی سعادت نصیب ہوگئی تو وہ سوچے کہ کن کن مرحلوں سے گزر کر وہ خانۂ کعبہ پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی کس طرح اس کی تمام کلفت دور ہوگئی۔ اس طرح نعمتوں کا استحضار کرنے سے ایک نعمت کے اندر سیکڑوں نعمتیں جو پوشیدہ تھیں، وہ نظر آنے لگتی ہیں اور ہر ہر نعمت کے استحضار کے بعد اس پر شکر ادا کرتے رہنے سے انسان شکر کا عادی ہو جاتا ہے جو زندگی کا حاصل ہے اور ایسی چیزیں حاصل ہوں جن سے خوشی حاصل ہوتے رہنے کی امید ہو اور شکر میں جو خوشی ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے اور جو شکر پر لازیدنکم کا وعدہ ہے وہ بذاتِ خود ایسی چیز ہے جس سے آئندہ خوشی کا حاصل ہونا یقینی ہے۔

فَاَيۡنَ تَذۡهَبُوۡنَO اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَO لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَO وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَO
(سورۃ التکویر، آیت ۲۶ تا ۲۹)

تو تم لوگ (اس بارے میں) کدھر کو چلے جا رہے ہو۔ بس یہ تو (بالعموم) دنیا
جہان والوں کے لیے ایک نصیحت نامہ ہے (اور بالخصوص) ایسے شخص کے لیے
جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے اور تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے
کچھ نہیں چاہ سکتے۔

یعنی یہ جو عالمین کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے جو راہِ مستقیم پر ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں۔ گویا قرآن کریم اس دعا کا جواب ہے جو ہمیں سورۂ فاتحہ میں سکھائی گئی ہے اور شروع سورۂ بقرہ میں متقیوں کے لیے اس کو ہدایت بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ متقی وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر چلنا چاہتے ہیں۔

خواہش کے بعد ارادہ ہے اس کے بعد عمل کا درجہ ہے تو جب تمھاری خواہش بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے اور تم نیکی کی خواہش بھی نہیں کر سکتے سوائے اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمھاری طرف متوجہ ہو لہٰذا تمھیں ہر وقت اس کی رحمت کا سہارا ڈھونڈتے رہنا چاہیے۔ آیت ۲۹ میں عجب سے بھی حفاظت ہے اور دوسرے کے ایمان نہ لانے سے بے جا اثر پذیری سے بھی حفاظت ہے۔ اختیار پورا ہے جیسا آیت ۲۸ میں ہے لیکن کسی وقت بھی مالکِ حقیقی کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○ وَاِذَا
الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا
قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ○ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ○
الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ○ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّاشَآءَ
رَكَّبَكَ ○ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ○ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ
لَحٰفِظِيْنَ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ○ اِنَّ الْاَبْرَارَ
لَفِىْ نَعِيْمٍ○ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِىْ جَحِيْمٍ○ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ○

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَO وَمَآ اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِO ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِO يَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًاؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِO (سورۃ الانفطار، آیت ۱ تا ۱۹)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے (ٹوٹ کر) جھڑ پڑیں گے اور جب سب دریا (شور اور شیریں) بہہ پڑیں گے اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی (یعنی ان میں کے مُردے نکل کھڑے ہوں گے اس وقت) ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا۔ اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو (انسان) بنایا پھر تیرے اعضا کو درست کیا پھر تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا (ان سب امور کا مقتضا یہ ہے کہ تم کو) ہرگز (مغرور) نہیں ہونا چاہیے مگر تم باز نہیں آتے (بلکہ تم اس وجہ سے دھوکے میں پڑ گئے ہو کہ تم) جزا و سزا (ہی) کو جھٹلاتے ہو اور تم پر (تمھارے سب اعمال) یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں جو تمھارے سب اعمال کو جانتے ہیں۔ نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بدکار (یعنی کافر) لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے۔ روزِ جزا کو اس میں داخل ہوں گے (اور پھر داخل ہو کر) اس سے باہر نہ ہوں گے (بلکہ اس میں خلود ہوگا) اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روزِ جزا کیسا ہے (اور ہم) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ) آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روزِ جزا کیسا ہے؟ وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے نفع کے لیے کچھ بس نہ چلے گا اور تمام تر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہوگی۔

قیامت کا دن سامنے ہے ذرا اس کا تفصیلی تصور کرو اور پھر بتاؤ کہ کس بات نے تم کو اپنے رب سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے یعنی تم پر کیوں غفلت اور بے حسی کے پردے پڑے ہوئے ہیں؟ وہ ایسا ربِ کریم ہے جس نے تمھیں پیدا کیا۔ تمھیں اپنی پیدائش پر کچھ بھی قدرت نہیں ہے اور سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود اپنی صورت بنانے پر اختیار نہیں ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے تو پھر اپنی قسمت پر کیا اختیار ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا

اقرار کیا جائے اور اسی کی طرف رجوع کیا جائے چونکہ انسان کو طبعًا اپنی صورت پسند ہوتی ہے اس لیے اس کو بھی اپنی نعمتوں میں شمار کیا تو کیا اس کی طرف سے رحم وکرم کی بارش ہوتی رہے اور تم اس کا اعتراف بھی نہیں کرو گے؟ کیا تم پر اس خالق کا کوئی حق نہیں؟ اور کیا تم سمجھے ہوئے ہو کہ ان نعمتوں سے قیامت اور جزا و سزا کا انکار ہے اور پھر یوم الدین کی تفصیل ہے۔

وَاِذَ ا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝

(سورۃ المطففین، آیت ۳۲،۳۳)

اور جب دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں (کیوں کہ کفار اسلام کو غلطی سمجھتے تھے) حالانکہ یہ (کافر) ان (مسلمانوں) پر نگرانی کرنے والے کر کے نہیں بھیجے گئے۔ سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے۔

ممکن ہے وہ کٹھ حجتی کے طور پر کہیں کہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم تمھیں گمراہ ہونے سے روکیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو واقعی مِن اللّٰہ لوگوں کی اصلاح کے لیے مامور ہوتا ہے اس کے شب وروز ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کی گمراہی سے خوش نہیں ہوتا اور ان کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ اسے دلی تکلیف ہوتی ہے دوسروں کی گمراہی سے۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ (سورۃ الانشقاق، آیت ۱۳)

یہ شخص (دنیا میں) اپنے متعلقین میں خوش رہا کرتا تھا (یہاں تک کہ فرطِ خوشی میں آخرت کی تکذیب کرتا تھا)۔

یہ کافر کا مسرور ہونا ہے جو غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے جس پر آیت انہ ظن ان لن یحور شاہد ہے۔ اسی لیے دنیا مسلمانوں کے لیے مثل قید خانہ ہے اس کے برعکس مسلمانوں کی خوشی ہے۔ دونوں سرور میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور دونوں کے خوشی کے اظہار میں فرق ہے۔ اس زمانے میں بھی جب مسلمان اعمال کے لحاظ سے انتہائی پستی میں گر گئے ہیں ان کی عید اور ہندوؤں کی ہولی میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۝ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ۝ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۝ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ۝ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۝

(سورۃ البروج، آیت ۸ تا ۱۶)

اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست (اور) سزوارِ حمد ہے۔ ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور (آگے ظالموں کے لیے عام وعید ہے اور مظلوموں کے لیے عام وعدہ ہے) اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے جنھوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی (اور) پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور (جہنم میں بالخصوص) ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے (آگے مومنین کے حق میں جن میں مظلومین بھی آ گئے ارشاد ہے کہ) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔ آپ کے رب کی داروگیر بڑی سخت ہے (پس کفار پر

سزائے شدید کا واقع ہونا مستبعد نہیں اور نیز) وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے
اور وہی دوبارہ (قیامت میں بھی) پیدا کرے گا اور وہی بڑا بخشنے والا (اور)
بڑی محبت کرنے والا (اور) عرش کا مالک (اور) عظمت والا ہے۔ وہ جو
چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے۔

آج کل سیدھے سادے ایمان دار لوگ خصوصاً اور مسلم اقوام عموماً جس پریشانی کے دور سے گزر رہے ہیں اسے دیکھ کر تو ظاہر بیں یہی سمجھتا ہے کہ نیکی دین داری کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نعوذباللّٰہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ نیکوں پر طرح طرح کی مصیبت ہے اور بدمعاشوں کو عروج حاصل ہے لیکن صاحبِ ایمان کے نزدیک سب کچھ اللّٰہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی مصلحت کے تحت ہو رہا ہے اور مومنوں کے لیے سراسر خیر ہی خیر ہو رہا ہے۔ کہیں گناہ دھل رہے ہیں، کہیں درجات بڑھ رہے ہیں اور کہیں مومنوں کو شہادت کے درجے پر فائز کیا جا رہا ہے۔ جیسا منیٰ میں حج ۱۴۱۷ھ کے موقع پر ہوا تھا اور یہ سب آج سے نہیں ہو رہا ہے، اصحابِ اخدود کے وقت سے ہو رہا ہے۔ اس وقت کے مسلمانوں کا کوئی قصور نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ اللّٰہ تعالیٰ پر ایمان لائے تھے، جو غالب حکمت والا ہے، جو سب باتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس قادرِ مطلق کے حکم سے ہو رہا تھا، غفورو ودود کے حکم سے ہو رہا تھا اس کے محبوب بندوں کے ساتھ، لیکن یہ سب اس کی حکمت کے تحت ہو رہا تھا وہ فعال لمایرید ہیں۔ کب، کس کو، کس طرح آزمایا گیا یہ ان ہی کو معلوم ہے۔ اس تمام فتنہ وفساد، ظلم وتشدد کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں بھیجے جائیں گے اور مظلوم مومن جنت میں بھیجے جائیں گے اور اس دنیا میں بھی ایک مدت تک ڈھیل پانے کے بعد ظالموں کا حشر فرعون اور ثمود جیسا ہوگا۔ دشمنوں کو جہنم میں بھیجنا اور ذلیل کرنا ایک طرح دوستوں کا اعزاز و اکرام ہے۔ اسی لیے جہنم کے ذکر کے ساتھ بھی فبای الآءِ ہے۔

ایک اور ذوقی بات یہ ہے کہ اصحابِ اخدود جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے اس سے خواہ کتنی ہی جسمانی اذیت مسلمانوں کو پہنچ رہی ہو ان کے دل شوقِ شہادت

سے لبریز تھے۔ وہ اس کو اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر جان دے دیں۔ اللہ تعالیٰ یعنی محبوبِ حقیقی نے اپنے محبوب بندوں کو بڑی آزمائش میں ڈالا اور ان کو استقامت بخشی اور تفویض کا پھایا ان کے زخموں پر رکھا۔ جیسے آہوں کو محبوب کے تیر سے مرنے کی خواہش ہے اسی طرح مومنینِ صادقین بھی منتظر ہیں۔ وما بدالوا تبدیلا۔ کسی اور نے اس کو ان الفاظ میں کہا ہے:

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ شوقِ شہادت دراصل جزوِ ایمان ہے۔ ان مومنوں کو معلوم تھا کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے محبوبِ حقیقی، مالکِ کُل کے حکم سے ہو رہا ہے اور اسی احساس نے انھیں اتنی بڑی آزمائش میں ثابت قدم رکھا اور وہ معیتِ الٰہیہ کے درجے پر فائز المرام ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مومن ہونے کے باوجود اتنے عافیت اور آرام سے ہیں اور ہم سے ویسا امتحان نہیں لیا جا رہا ہے جیسا پچھلے مومنوں سے لیا گیا تھا۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ○ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ○ (سورۃ الطارق، آیت ۱۳،۱۴)
یہ قرآن (حق و باطل میں) ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے کوئی لغو چیز نہیں ہے۔

یہ بات سرسری طور پر سن لینے کی نہیں کیوں کہ یہ اللہ عزوجل کا کلام ہے۔ اس کے احکام پر عمل کی توفیق ایمان کے درجے کے حساب سے ہوتی ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَیO الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰیO وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰیO وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰیO فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰیO سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓیO اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰیO (سورۃ الاعلیٰ، آیت ۱ تا ۷)

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں اپنے پروردگارِ عالی شان کے نام کی تسبیح کیجیے جس نے (ہر شے کو) بنایا پھر (اس کو) ٹھیک بنایا اور جس نے تجویز کیا پھر راہ بتلائی اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا پھر اس کو سیاہ کوڑا کر دیا (اس قرآن کی نسبت ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم (جتنا) قرآن (نازل کرتے جائیں گے) آپ کو پڑھا دیا کریں گے (یعنی یاد کرا دیا کریں گے) پھر آپ (اس میں سے کوئی جز) نہیں بھولیں گے مگر جس قدر (بھلانا) اللہ کو منظور ہو (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے)۔

یہی آیت حقیقتِ ازلی کا بیان ہے جب کچھ نہیں تھا اس وقت سے آج تک اور آج کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ یہی کلمہ کارفرما رہا ہے اور رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ماورائے ادراک ہے اور رہے گی۔ بری عن الشرک، بری عن السوال، بری عن الضد، بری عن المثال، دوسرا کلمہ اس کی صفتِ تخلیق کا بیان ہے۔ نہ صرف یہ کہ پیدا فرما دیا بلکہ ٹھیک ٹھیک ہر چیز کی تخلیق ہوئی۔ ہر تخلیق زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہی ہے۔ پھر تقدیر و ہدایت کا معاملہ ہے جو اپنی جگہ تمام باتوں پر حاوی ہے جس کے لیے جو مقدر کر دیا ہے وہ اسی طرف جا رہا ہے۔ جنتی کشاں کشاں جنت کی طرف جا رہے ہیں اور جہنمی کشاں کشاں جہنم کی طرف جا رہے ہیں اور اپنے ارادے اور اختیار سے جا رہے ہیں۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ کس طرح یہ باتیں synchronized ہیں اس کا مشاہدہ تو ہوتا ہے لیکن عقل اس راز کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ آخری جملہ الا... کا یہ مطلب نہیں معلوم ہوتا کہ وحی کا کچھ حصہ بھلا دیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار مقصود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًO فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْO وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْO (سورۃ الفجر، آیت ۲۷ تا ۳۰)

اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش پھر (ادھر چل کر) تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا (کہ یہ بھی نعمتِ روحانی ہے) اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

قال ابنِ عباسؓ (... المطمئنۃ) الامنۃ من عذاب اللّٰہ الصادقۃ بتوحیہ اللّٰہ الشاکرۃ بنعمۃ اللّٰہ الصابرۃ بلاء اللّٰہ الرضیہ بقضا اللّٰہ القافتۃ بعول ء اللّٰہ۔ واقعی پھر وہ نفسِ مطمئنہ بھی ہوسکتا ہے اور اس کے لیے ہر جگہ اطمینان ہی اطمینان ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مرتے وقت اس کو جنت کی خوشخبری سنائی جائے گی۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌO يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالاً لُّبَدًاO اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌO اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِO وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِO (سورۃ البلد، آیت ۵ تا ۹)

کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا (اور) کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور ہونٹ نہیں دیے؟

انسان کی تخلیق میں اللّٰہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں۔ کس مشکل سے انسان پیدا ہوا ہے! ہزارہا کروڑ انسان مر جاتے ہیں، پورا سامان ہوتا ہے ان کے مارنے کا، کئی لاکھ میں سے ایک کامیاب ہو جاتا ہے رحم تک پہنچنے میں، اس کے بعد اس کی حفاظت اور پرورش کا سامان ہو جاتا ہے۔ پھر پیدائش کے وقت کتنی دقّت سے اور کتنی تکلیف سے وہ

پیدا ہوتا ہے پھر اس کی آنکھیں اور لب اور دوسرے اعضا ٹھیک ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں انسان کی قدرت سے باہر ہیں لیکن قادرِ مطلق کے حکم سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب کچھ یوں ہی ہو رہا ہے اور خدا کی قدرت کے قائل نہیں ہیں۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ O فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ O وَمَآ اَدْرٰكَ
مَاالْعَقَبَةُO فَكُّ رَقَبَةٍO (سورۃ البلد، آیت ۱۰ تا ۱۳)
اور (پھر) ہم نے اس کو دونوں رستے (خیر وشر کے) بتلا دیے سو وہ شخص
(دین کی) گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی (سے)
کیا (مراد) ہے وہ کسی (کی) گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے۔

''نجدین'' سے مراد افراط وتفریط کے دو پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں اور ''عقبہ'' سے مراد ان کے واسطے کا راستہ ہے جو ہمارا دین ہے۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے ''سو وہ دین کی کھائی میں سے ہو کر نہیں نکلا۔''

فک رقبۃ سے مراد غلام آزاد کرانا ہے۔ آج کل چونکہ غلاموں کے آزاد کرانے کا موقع نہیں ہے اس لیے غالباً قرض سے گردن چھڑانا اور اسی طرح کسی اور مصیبت سے گردن چھڑانا بھی مقصود ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور شکر بھی ادا ہوتا رہتا ہے جس سے اور زیادہ نعمتیں ملتی ہیں۔ مسائل السلوک میں ہے ''اولیاء اللہ سے جو اپنے کمالات کا اظہار منقول ہے وہ شکراً ہوتا ہے، نہ ریاء اوافتخاراً۔''

درحقیقت یہ تحدیث نعمت قلب کے لیے بہت اچھی تربیت ہے کیوں کہ انسان کو نظر رکھنی پڑتی ہے کہ منشا اس اظہار کا شکر ہے یا کبر۔ دونوں میں خلط نہیں ہو سکتا اور جب قلب کی نگہداشت ہونے لگے گی تو دوسرے اچھے اعمال بھی سرزد ہونے لگیں گے۔

وَالضُّحیٰ O وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی O مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰیO وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰیO وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی O اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی O وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی O وَوَجَدَکَ عَآئِلاً فَاَغْنٰی O فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْO وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْO وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْO

(سورۃ الضحیٰ)

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے (آگے جواب قسم ہے) کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ (آپ سے) دشمنی کی اور آخرت آپ کے لیے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ نعمتیں ملیں گی) اورعنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں بکثرت نعمتیں دے گا) سو آپ خوش ہو جائیں گے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر (آپ کو) ٹھکانا دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا) رستہ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنا دیا تو آپ (اس کے شکریہ میں) یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو مت جھڑکیے (یہ تو شکرِ فعلی ہے) اور اپنے رب کے انعامات (مذکورہ) کا تذکرہ کرتے رہا کیجیے (یعنی زبان سے قولی شکر بھی کیجیے)۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَO وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَO الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَO وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَO فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاO اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاO فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْO وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْO (سورۃ الم نشرح)

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم وحلم سے) کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا سو بے شک موجود مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔ بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونے والی) ہے تو آپ جب (تبلیغ احکام سے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذات خاص میں) محنت کیا کیجیے اور جو کچھ مانگنا ہو اس میں اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھیے۔

ان دونوں سورتوں میں حضور نبیِ کریم ﷺ کی ایسی تعریف کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم نوازی پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے ہمارے سردار کی شان میں دو سورتیں نازل فرما کر ہماری بڑی عزت افزائی فرمائی۔ کسی قوم کی عزت اس کے سردار کی عزت سے ہوتی ہے۔ ماودعک سے ہمارے آقا کی محبوبیت اور اعلیٰ مرتبت پر مہرِ تصدیق لگائی۔ وللآخرۃ خیرلک میں ان کی شان اور ان کے درجات کے لحہ بہ لحہ بڑھاتے رہنے کی خوشخبری ہے۔ ولسوف... اس بات کا ثبوت ہے کہ خالقِ کائنات کو اپنے حبیب ﷺ کو خوش کرنا پسند ہے۔ الم یجدک... سے یہ بات واضح ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ٹھکانا عطا فرمایا اور آپ کو ہدایت بخشی جس کو اللہ تعالیٰ ٹھکانا عطا فرمائیں اس سے بڑھ کر کس کو ٹھکانہ مل سکتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جس کو وہ فرما دیں کہ ہم نے تم کو غنی کر دیا تو اس سے زیادہ کون غنی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح سورۃ انشراح میں ایک طرح سے حضور ﷺ کی خوبیاں بیان فرمائی گئی ہیں جیسے کسی کی خوب صورتی بیان سے باہر ہو تو کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے ان کے اخلاق کو سنوارا ہے۔ اس کے ساتھ ان دونوں سورتوں میں جو جامع نصیحتیں کی گئی ہیں ان کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ۝ (سورۃ الضحیٰ ۹ تا ۱۱)

تو آپ (اس کے شکریہ میں) یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو مت جھڑکیے (یہ تو شکرِ فعلی ہے) اور اپنے رب کے انعامات (مذکورہ) کا تذکرہ کرتے رہا کیجیے (یعنی زبان سے قولی شکر بھی کیجیے)۔

یتیموں اور سائلوں کے متعلق یہ احکامات عام ہیں اگرچہ مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں اور آپ یتیموں پر شفقت فرمانے اور سائلوں کی دست گیری فرمانے میں اخلاق کے اس اعلیٰ معیار پر تھے جہاں فہم وادراک کی رسائی نہیں ہے، یعنی ہمیں اس اعلیٰ معیار کی طرف بڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس ظاہری معنی کے علاوہ ایک اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ جس طرح ہم نے آپ کو بے خبر پایا تو آپ کو راستہ بتلا دیا، اسی طرح آپ بھی ہمارے بھٹکے ہوئے بندوں کی راہنمائی فرمایئے، عموماً والدین کی تربیت سے محروم لڑکے سرکش و آوارہ ہو جاتے ہیں اور سائل وہ ہیں جو راہ سے بھٹکے ہوئے ہدایت کی تلاش میں ہیں۔ دونوں طرح کے لوگ آپ کی توجہ پاتے تھے۔

تحدث بالنعمۃ زبان سے بھی ہے اور اعضا وجوارح سے بھی، جیسا اس سے قبل کی دو آیات میں یتامیٰ اور سائلیں پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح دوسروں کے سامنے تحدیثِ نعمت کی طرح اپنے آپ سے بھی باتیں کرنا اور سوچنا مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاO اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاO (سورۃ الانشراح، آیت ۵،۶)

سو بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔ بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونے والی) ہے۔

دشواری کے بعد تو آسانی ہے ہی، دشواری (عسر) کے ساتھ آسانی (یسر) ہے۔ چنانچہ عقل اور طبیعت میں تضاد کی وجہ سے جو تنگی ہوتی ہے وہ عقل اور شریعت کی بار بار متابعت کرنے سے دور ہو جاتی ہے اور جو چیز پہلے طبعاً مشکل معلوم ہوتی ہے وہ طبعی کی مثل بن جاتی ہے۔ بری عادت چھڑانے میں یہ اکسیر ہے۔ نفس تقاضا کرتا ہے،

عادت کو پورا کرنے کی طرف اور ایمان تقاضا کرتا ہے اس کے خلاف کرنے کا، اور یہ مشکل رفتہ رفتہ دور ہو جاتی ہے۔

یہ ایک طریقہ ہے صبر کی تعلیم کا۔ جس طرح ہر مصیبت کے وقت اناللّٰہ پڑھنے سے اللّٰہ تعالیٰ کے انعامات اور ہدایت کا مورد ہوتا ہے انسان، یہاں تک کہ چراغ کے گل ہونے پر بھی اناللّٰہ پڑھنا سنتِ نبوی ﷺ ہے اسی طرح یہ سمجھنا کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے انسان کو فائزالمرام کرتا ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْO وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْO (سورۃ الانشراح، آیت ۸،۷)

تو آپ جب (تبلیغِ احکام سے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذات خاص میں) محنت کیا کیجیے اور جو کچھ مانگنا ہو اس میں اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھیے۔

اتباعِ نبی ﷺ یہ ہے کہ دن بھر اللّٰہ تعالیٰ کی اطاعت میں اعمال وجوارح سے مشغول رہے کبھی تبلیغِ دین میں، کبھی رزقِ حلال حاصل کرنے میں، کبھی اہلِ خانہ کے حقوق ادا کرنے میں، کبھی انتظامِ مملکت میں (اگر اس کے سپرد مملکت کا کوئی کام ہو) اور کبھی جہاد کرنے میں اور رات کو جب ان تمام امور سے فراغت ہو جائے تو قلب کی پوری یکسوئی کے ساتھ اللّٰہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور راغب ہو جائے۔ تہجد، استغفار اور مناجات میں اور یہ اصل ہے تصوف کی۔

فارغ اوقات میں اللّٰہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جانا نماز کے خشوع میں بہت مدد دینی والی عادت ہے۔ یہ اعظم عملِ قلب ہے اور روزانہ کے تمام اعمال کو اللّٰہ تعالیٰ کی عبادت بنا دینے میں اس کو خاص دخل ہے۔ اس طرح نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اگر انسان دن بھر اپنے کاموں میں مصروف اس طرح رہے کہ اسے فکر نہ

ہو کہ یہ کام قربِ خداوندی کا باعث ہے یا اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہے اور جب فرصت ہوئی تب بھی خدا کی یاد کی توفیق نہیں ہوئی اور اس کے باوجود اتباعِ نبوی کی ہوس ہو تو یہ ہوس ہی ہوس ہے۔ ام للانسان ماتمنیٰ کہاں مشقت کے بعد خدا کی یاد کہاں عافیت کے باوجود خدا سے غفلت!

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہونے میں اور تہجد کی نماز پڑھنے میں نیند میں کچھ کمی آتی ہے تو کسی اور کام میں بھی طبیعت لگی رہے اور اس میں مشغولیت ہو تو اس سے بھی نیند میں کمی آئے گی، لہٰذا نیند میں خلل آنے کی وجہ سے شب بیداری چھوڑ دینا نادانی ہے۔ البتہ کمی اور زیادتی کی جا سکتی ہے جیسا حضور نبیِ کریم ﷺ کی سنت سے معلوم ہوتا ہے اور اعتدال کا راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو سو جائے کیوں کہ اگر غلبے کے باوجود نوافل ادا کیے جائیں گے تو وہ ٹھیک سے ادا نہیں ہوں گے۔

ایک اور بات یہ ذہن میں آئی کہ جب فرصت ہو تو یہ سوچنے سے کہ اس وقت کس امرِ واجبہ کا مطالبہ ہے اگر کوئی اور ضروری بات یاد نہ آئے تو کم از کم شکر کا مطالبہ تو ہے ہی، اس میں مشغول رہنا چاہیے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ○ (سورۃ التین، آیت ۴تا۶)

کہ ہم نے انسان کو بہت خوب صورت سانچے میں ڈھالا ہے پھر (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو ان کے لیے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہو گا۔

انسان کو بہترین سانچے میں ڈھالا گیا پھر اس کو اسفل السافلین تک پہنچا دیا

گیا جیسے ایک خوب صورت آدمی کو کیچڑ میں ملوث کر دیا گیا ہو یعنی اسفل ترین صفات بھی دے دیے گئے تو جب تک وہ اپنے مالک کی طرف متوجہ نہ ہوا ہو اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمارے ان صفاتِ رذیلہ سے پاک نہ کر لیا ہو اس کو لربہ لکنود کہہ لیجیے یا قتل الانسان مااکفرہ کہہ لیجیے سب بجا ہے لیکن جب وہ ان گندگیوں سے باہر آ جائے گا وہ پھر خوب صورت لگنے لگے گا۔ ایمان اور عملِ صالح میں نفس کی خباثت دور کرنے کی ایسی ہی خاصیت رکھی گئی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَO خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍO اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُO الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِO (سورۃ العلق، آیت ۱ تا ۴)
(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے (یعنی جب پڑھیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر پڑھا کیجیے) جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھا کیجیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور ایسا ہے)۔

حدیث شریف میں جو ہے کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''مانا بقاری...'' اس پر بعضوں کو شبہ ہوا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں ''اَن پڑھ'' ہونا نقص تھا۔ حالانکہ یہ حضور ﷺ کی ایک خصوصیت تھی جو اگلے انبیائے کرام علیہم السلام کی بشارتوں میں مذکور تھی۔ اَن پڑھ ہونا اور چیز ہے اور جاہل ہونا اور چیز۔ اسی طرح کسی چیز سے ناواقفیت کوئی عیب نہیں ہے، جیسے ایک انجینئر ڈاکٹری سے ناواقف ہوتا ہے۔ حضور ﷺ چونکہ وحی سے ناواقف تھے اس لیے آپ نے محاورۂ عرب کے مطابق فرمایا کہ میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔

جَزَآءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنْ
خَشِیَ رَبَّهٗ O (سورۃ البینۃ، آیت۸)
ان کا صلہ ان کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) اللّٰہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللّٰہ سے خوش رہیں گے یہ (جنت اور رضا) اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ اس خشیۃ کا پہلا درجہ اللّٰہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا ہے جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ کسی نہ کسی درجے میں اللّٰہ تعالیٰ کے عذاب سے ضرور ڈرے گا۔

دوسرا درجہ اس کا اللّٰہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرنا ہے۔ دنیا کا نقصان برداشت کر لینا کہ ایسا نہ کرنے سے اللّٰہ تعالیٰ کہیں ناراض تو نہیں ہو جائیں گے۔ خواہ عذاب ہو خواہ نہ ہو، اللّٰہ تعالیٰ کی ناراضگی کا عمل نہ ہو۔

رضی اللّٰہ عنہ پہلے ہے پھر رضوا عنہ ہے۔ یعنی اللّٰہ تعالیٰ کے تم سے راضی رہنے کی نشانی یہ ہے کہ تم اس سے راضی ہو، یعنی اس کے احکامِ تشریعی کو دل وجان سے قبول کرتے ہو اور بجا لاتے ہو اور اس کے احکامِ تکوینی پر راضی ہو۔ جو کچھ بھی راحت یا مصیبت پیش آئے اسے منجانب اللّٰہ سمجھ کر شکر ادا کرنا اور صبر کرنا یعنی رضا بالقضا اسی کو کہتے ہیں۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ O (سورۃ الذّٰریٰت، آیت ۱۰)
غارت ہو جائیں بے سند باتیں کرنے والے۔

ای یعلم ان فیہ حب اللّٰہ ام لایعنی اذا رتیٰ بقلب سلیم فقد نجیٰ چونکہ پرستش تو

اصل میں محبت ہی کا اعلیٰ درجہ ہے اور اگر دل میں محبت نہ ہو تو عبادت کسی نہ کسی طرح ہو جائے گی لیکن اس عقلی ایمان کا پائیدار رہنا بہت مشکل ہے۔ حدیث شریف حرامتاً ہے الا لاایمان لمن لامحبۃ لہ، مومن پر مزید رحمت یہ ہے کہ چونکہ ذات باری تعالیٰ جسم سے پاک ہے اس لیے ایک نورِ مجسم کو پیکرِ انسانیت میں بھیج کر اس کی محبت کو اپنی محبت اور اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ O حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ O كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ O
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ O ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ O ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ
عَنِ النَّعِيْمِ O (سورۃ التکاثر)

(دنیاوی ساز و سامان پر) فخر کرنا (جو کہ علامت ہے محبت و طلب کی) تم کو (آخرت سے) غافل کیے رکھتا ہے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں تم کو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی یعنی مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا پھر (دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (تمھاری یہ حالت ٹھیک) نہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا ہرگز نہیں (اور) اگر تم یقینی طور پر (دلائل صحیحہ واجب الاتباع سے اس بات کو) جان لیتے واللہ تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔ پھر (مکرر تاکید کے لیے کہا جاتا ہے کہ) واللہ تم لوگ اس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو کہ خود یقین ہے پھر (اور بات سنو کہ) اس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہو گی۔

زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر انسان کو ہلاک کر دیتی ہے یعنی اس بات سے بے فکر کر دیتی ہے کہ اس کو نعمتوں کا حساب دینا ہو گا۔ اگر آخرت کی فکر ہو تو جو نعمتیں ہیں ان کا حق ادا کرنے اور شکر ادا کرنے سے حرصِ مال یقیناً کم ہو جائے گی اور خوشی میں بھی اضافہ ہو گا۔

آخرت میں تو نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ ذوقاً معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی اسی حساب سے ذمہ داری ہے جس حساب سے نعمتیں انسان کو میسر ہیں، مثلاً ایک پریشان حال سے نماز میں اس درجے کے خشوع کا مطالبہ نہیں ہے جس درجے کا مطالبہ اس شخص سے ہے جو ہر طرح سے عافیت میں ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (سورۃ العصر)

قسم ہے زمانے کی (جس میں نفع ونقصان واقع ہوتا ہے) کہ انسان (بوجہ تضیعِ عمر کے) بڑے خسارے میں ہیں مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے (کہ یہ کمال ہے) اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق (پر قائم رہنے) کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

زمانہ اس پر شاہد ہے اور آئندہ جو زمانہ آئے گا وہ بھی اس کی شہادت دے گا کہ انسانیت تباہی کی طرف جا رہی ہے جس سے روکنے والی چیز صرف ایمان، عملِ صالح اور حق بات اور صبر کی وصیت ہے۔ آج کل انسان اسبابِ معیشت میں جتنی ترقی کرتا جا رہا ہے اتنا ہی وہ تباہی کی طرف بڑھتا جا رہا ہے کیوں کہ دنیا ایسے لوگوں سے محروم ہوتی جا رہی ہے جن کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں ہے۔ اگر معاشرے میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہو تو انسان عافیت میں رہے گا۔ ترقی اور حقیقی تنزلی کی مثال ایسی ہے جیسے چند لوگ ایک بڑے شان دار محل میں رہتے ہوں اور وہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی فکر میں ہر وقت مبتلا ہوں تو ایسا محل جہنم ہے رہنے والوں کے لیے۔ اسبابِ راحت جمع کر لینے سے راحت نہیں مل جاتی۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی اعمالِ صالحہ میں سے ہیں اور جو لوگ ایک دوسرے

کو حق پر رکھنے کی تلقین کرتے رہتے ہوں وہ حق پر رہنے کی خود بھی کوشش کرتے ہوں گے۔
ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نیک باتوں کی مخالفت ہمیشہ ہوتی رہے گی اور ہمیشہ نیکی پر قائم رہنے والوں کو مشکلات کا سامنا کرتے رہنا ہو گا اور ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے رہنا ہو گا۔ زندگی کو سرسری طور پر گزارنا درست نہیں ہے۔ خیرالقرون میں جب نیکی کا غلبہ تھا اور خارجی مخالفت نیکی کی نہیں تھی جب بھی نفس اور شیطان کی مخالفت تو تھی جس کے لیے صبر کی ضرورت تھی۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍO اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِO فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِO الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍO (سورۃ القریش)

چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں تو (اس نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔

چند باتوں کا اشارہ ملتا ہے:

۱۔ قریش پر بدرجۂ اتم شکر واجب ہے۔

۲۔ قریش کی ایک لحاظ سے دوسروں پر برتری مثل آلِ عمران کے۔

۳۔ بھوک سے حفاظت اور امن وامان معلوم ہوتا ہے، آئندہ بھی قریش کو حاصل رہے گا۔

۴۔ ''رب ھذاالبیت'' سے بیت کی خاص فضیلت معلوم ہوتی ہے اور کعبے کے سامنے ہونے کے خیال سے نماز میں خشوع میں مدد ملتی ہے۔

۵۔ رب البیت کی توحید کا بھی ثبوت ہے کیوں کہ قریش اور مکے کے بُت پرست بھی جانتے تھے کہ ربِ کعبہ ایک ہی ہے۔

اَرَءَ يْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِO فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَO وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِO فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَO الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَO الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُ وْنَO وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَO (سورۃ الماعون)

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے۔ سو (اگر آپ اس شخص کا حال سننا چاہیں تو سنیے کہ) وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا دینے کی (دوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا۔ سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کے لیے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے۔

یہ تکذیب بالعمل کی شکلیں ہیں۔ قساوت، بخل اور ریا کا اظہار جن اعمال سے ہوتا ہے ان کا یہاں ذکر ہے۔ یہی بات ہے کہ ایک بلی کو رات بھر بند رکھ کر مار دینے والی عابدہ عورت جہنم میں چلی گئی۔ اگرچہ دیکھنے میں یہ چھوٹی سی بات تھی مگر یہ اس کی قساوتِ قلب کو ظاہر کرتی تھی، برخلاف اس فاحشہ عورت کے جس نے کتے کو پانی پلایا اور جنت میں چلی گئی کیوں کہ اس کا یہ عمل شفقت علی الخلوق کو ظاہر کرتا تھا۔

فویل للمصلین سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا لازمی اثر حسنِ اخلاق اورحسنِ معاشرت ہے؛ اس لیے جو لوگ دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں ان میں اتنی بھی سخاوت نہیں ہوتی کہ عاریتاً کسی کو کوئی چیز دیں خواہ وہ معمولی ہی چیز کیوں نہ ہو۔ یہی حال معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کا جو عادتاً نماز پڑھ لیتے ہیں اور جنھوں نے دین کو رسومات بنا لیا ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَO فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْO اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُO (سورۃ الکوثر)

بے شک ہم نے آپ کو کوثر (ایک حوض کا نام ہے اور ہر خیرِ کثیر بھی اس میں داخل ہے) عطا فرمائی ہے۔ سو (ان نعمتوں کے شکریہ میں) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے۔ بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے۔

اخلاص میں یہ بھی شامل ہے کہ اس عمل سے خدا کی خوشنودی کے علاوہ کوئی اور چیز مطلوب نہ ہو کسی غیر کی خوشنودی ہو نہ اپنی تعریف کی خواہش ہو۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا ۝ (سورۃ النصر، آیت ۳)

تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجیے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجیے وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تمام زندگی کا حاصل بس یہی دو چیزیں ہیں، شکر اور استغفار۔ شکر کی کوئی حد نہیں ہے۔ تمام اعمال انسان کے دنیا میں ختم ہو جائیں گے سوائے شکر کے جو جنت تک ساتھ رہے گا اور استغفار عبدیت کا مقام ہے۔ بندے کا کام ہی استغفار کرتے رہنا ہے۔ حضرت ڈاکٹر عارفیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے

عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

شکر کی تکمیل استغفار سے ہوتی ہے۔ شکر ادا کیا، نہیں ہو سکا، نقص رہ گیا۔ استغفار کر لیا نقص دور ہو گیا جس کام میں نقص رہ جائے اس کی تکمیل استغفار سے ہوتی ہے۔

جب دین کی تکمیل ہوگئی اور حضور نبیِ کریم ﷺ کے وصال کا وقت قریب آیا تو یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ حکم ہوا کہ استغفار کیجیے اور مقامِ عبدیت کا حق ادا کیجیے آپ

کو جو ہم نے نبوت دی اور دین کو آپ ﷺ پر کامل کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے وہ مقام نبوت کا حق ہے اور استغفارِ مقام عبدیت کا حق ہے۔ عبدیت کامل نہیں ہوتی بغیر استغفار کے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے متعلق بتا دیا اور پھر فرشتوں سے سجدہ کروا دیا۔ مسجودِ ملائک وہ بن گئے لیکن خلافتِ الٰہیہ جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے اس کے ابھی تک حق دار نہیں ہوئے تھے۔ اس کے لیے ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ تو کہا جایے جنت میں رہیے اور جب شیطان نے ورغلایا تو نادم ہوئے اور پکار اٹھے ربنا ظلمنا انفسنا... اب اس کے بعد ان سے کہا گیا کہ اب دنیا میں جایئے۔ اب آپ مقامِ عبدیت پر فائض ہو گئے۔ اب جو آپ کا سجدہ ہے وہ سجدۂ عبدیت ہے۔ اس سے پہلے اگر آپ سے سجدہ کرایا جاتا تو وہ سجدۂ شکر ہوتا۔

اس سورت کے نازل ہونے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کثرت سے پڑھتے تھے ''سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ استغفراللّٰہ واتوب الیہ...'' اتباعِ سنت میں ہمیں بھی ایسا کرنا چاہیے جب کسی عمل کا اچھا نتیجہ نکلے تو اللہ تعالیٰ کے انعام پر شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنے عمل کے نقص پر استغفار کرنا چاہیے اور جب کسی عمل کا برا نتیجہ نکلے تو استغفار کرنا ضروری ہے۔

غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی پریشانیاں ہمیں اپنے گناہوں کی وجہ سے پہنچتی ہیں۔ کچھ تو براہِ راست اور کچھ بالواسطہ، ''ظھر الفساد دی... بما کسبت...'' کے کلیے کہ تحت۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ اعتقاد کے مخالف کی مخالفت اپنے ہی افعال کا نتیجہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ تسبب عن المعلّی کا استحضار تو بلاواسطہ کیا جائے اور تسبب عن مشیۃ الحق کا استحضار بواسطہ تسبب اوّل کے کرے یعنی یہ سمجھے کہ یہ نتیجہ میرے معاصی کا ہے اور اس نتیجے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس لیے مرتب فرمایا ہے کہ میرے ماضی کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور مستقبل میں مجھ کو ہدایت ہو جائے۔
(تربیت السالک، جلد سوئم)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِO مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَO (سورۃ الفلق)
آپ (اپنے استعاذہ کے لیے) کہیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں
تمام مخلوقات کے شر سے۔

اس تعوذ میں ہر طرح کے شر سے پناہ ہے۔ نفس اور شیطان کے شر سے بھی اور اپنی شامتِ اعمال سے بھی، کیوں کہ اعمال بھی اللّٰہ تعالیٰ کی مخلوق میں شامل ہیں اور اس سے اگر بُرا نتیجہ نکلتا ہے تو وہ بھی اللّٰہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔

AF:844


لطائفِ قرآنی
سیّد مظفر احمد اشرف
ACADEMY BAZYAFT